دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
نومبر 2014
معراج رسول

جاسوسی ڈائجسٹ

جلد 44 • شمارہ 11 • نومبر 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

ماہِ نومبر کے آغاز ہی سے ملک بھر میں سرد و برفیلی ہوائیں اپنی آمد کا پتا دے دیتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ہر شخص ان موسمی تغیرات کی زد میں آتا چلا جاتا ہے... جب ہر طرف پریشانیوں اور الجھنوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہوں تو چھوٹی سے چھوٹی امید افزا خبر بھی اہمیت اختیار کر لیتی ہے... یہ تو پھر بڑی حقیقت ہے جس نے کھیل کے میدان سے جنم لیا ہے۔ سعید اجمل کے ایکشن پر سنگین اعتراض کر کے پابندی لگانے والے سمجھ رہے تھے کہ پاکستان کے سحر کار بالروں کا زور توڑ دیا گیا۔ حفیظ پر بھی جال پھینکا گیا مگر وہ صاف بچ گئے اور پھر دبئی کے میدان میں پاکستانیوں کے ”سلو پوائزن“ نے آسٹریلوی بلے بازوں کو ایسا ماؤف و مسحور کیا کہ وہ عجلت میں پویلین لوٹ کر آرام کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ صوابی کے یاسر شاہ اور گوجرانوالہ کے ذوالفقار بابر نے وہ کمال دکھایا کہ چار سال کے صبر آزما انتظار کے بعد پاکستان نے آسٹریلیا کے غرور کو پیوندِ خاک کر ہی دیا۔ اس فتح میں یونس خان کا کردار ناقابلِ فراموش رہا۔ چالیس برس بعد آسٹریلیا کے خلاف کسی بلے باز نے دونوں اننگز میں سنچریاں بنائیں اور وہ بھی ایسی کہ وہ اپنے ملک کی طرف سے سنچریاں بنانے میں انضمام الحق سے بھی آگے نکل گئے۔ احمد شہزاد نے بھی بلے بازی کے خوب جوہر دکھائے اور نہایت اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یونس خان کے پیشہ ورانہ مشوروں کی اہمیت کا کھلا اعتراف کیا۔ یوں جونیئرز اور سینئرز کی گروہ بندی سے بے نیاز ہو کر سارے ہی کھلاڑی جیتنے کے جذبے سے سرشار ہو کر یک جہتی سے کھیلے اور فتح کا تاج ہمارے سروں پر سجا دیا... کاش ہمارے قائدین اور نمائندے بھی کھوکھلے دعووں کو ترک کر کے ملک و قوم کی بہبود کے لیے ان کھلاڑیوں سے ہی سبق لیں اور کسی جماعتی تفریق کے بغیر یک جا ہو کر تیز رفتاری سے ایسی قانون سازی کریں جس کے نتیجے میں تھر کے بھوکے پیاسوں، وزیرستان کے خیمہ زن پریشان حالوں اور ہولناک سیلاب کے ڈسے ہوئے تباہ حالوں کے چہروں پر بھی مسرت کی سرخی اور رونق دوڑ سکے... ان طبقات کا بھلا ہوگا تو ہم سب بھی ایسے قوانین کے ثمر سے فیض یاب ہو سکیں گے۔ لڈو ٹوٹتا ہے تو بھورا بہرحال جھڑتا ہے... برائے خدا! جمود کو توڑیں اور فلاحی قوانین سازی میں سرعت سے پیش رفت کریں ورنہ آنے والا وقت کچھ اچھا نظر نہیں آتا... اب نظر ڈالتے ہیں آپ کی محفل پر اور دیکھتے ہیں کہ کون چھکے چھڑا رہا ہے اور کون چوکے مار رہا ہے...

کورنگی سے محمد خواجہ کے دلی احساسات ”اکتوبر 2014ء کا شمارہ اس دفعہ فوراً ہی وصول ہوا۔ سرورق پر ایک حسین دوشیزہ کا حیرت زدہ چہرہ، ایک پُرفریب مردانی چہرہ اور تیسرا ایک مجرم۔ اگر دوشیزہ کا چہرہ نہ ہوتا تو بڑا بے رنگ سرورق ہوتا۔ ملک کی حالت اور ہر وقت کی بری خبر سننے اور پڑھنے کو ملتی ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ایک ہی بات سننے کو ملی۔ ملک بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ میں جب بھی بہت بے چین ہوتا ہوں جاسوسی، سسپنس یا پھر سرگزشت لے کر کسی خاموش گوشہ میں بیٹھ جاتا ہوں۔ اس دفعہ جاسوسی میں کہانیوں کا انتخاب بہترین ہے۔ جواری انتہائی پسندیدہ، رفتار سے گزرتے پُراسرار واقعات، قدم قدم نئی آزمائشیں، نئے فتنے۔ احمد اقبال کی تحریر کہیں بور نہیں ہونے دیتی، طوالت بھی خوب، اختصار بھی خوب۔ آوارہ گرد بہت ہی عمدہ تحریر۔ حالانکہ یہ ایک کہانی مسافر کے نزدیک ہے۔ لیکن ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے بہت دلچسپی کے سامان پیدا کیے ہیں۔ ایکشن اور تیزی سے گزرتے واقعات پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ مسافت گزیدہ ایک معصوم بچے کی کہانی جو ہر جگہ قاتلوں میں گھرا ہوا اپنی زندگی بچانے کے لیے کیا کیا جتن کرتا رہا۔ عزم و ہمت اور خدا کی تائید ہی ہے جس نے ایسے ہمدرد پیدا کر دیے جو بچے کو موت کے ہاتھوں سے کھینچ لائے۔ امجد رئیس مبارک باد کے حق دار ہیں۔ خارِ راہ، محمد عفان کی کہانی ایک کمپنی کے مالک اور ملازمین کے ناخوش گوار تعلقات کی اچھی عکاسی کرتی ہے۔ کہانی بہت سادہ اور طرزِ تحریر بھی اچھی ہے۔ خلائی فرار، صوفیہ شکیل نے ایک عجیب کہانی کا اقتباس لیا ہے، کچھ مزہ نہیں آیا۔ یقین سے بالاتر ابتدا اور انجام بھی۔ خونی جوا، یہ بھی ایک عجیب کہانی تھی۔ ایک شوہر کی انتہائی ماہرانہ چال جس سے بیوی قتل بھی ہو گئی اور الزام بھی نہ آیا۔ چور بھوت، سراغ رسانی کی ایک اچھی مثال، ہلیکر کی ذہانت نے سارا مسئلہ حل کر دیا اور مجرم پکڑے گئے۔ آزارِ عشق، اپنی نوعیت کی عجیب تحریر تھی۔ یہ یورپ کی گندی سوسائٹی۔ دو ہم جنس پرست دوستوں نے درمیان سے ایک عورت جو ایک دوست کی بیوی تھی قتل کر دیا۔ بڑی مہذب قومیں ہیں۔ سرپرائز، ایک مختصر تحریر۔ اتنے عرصے بعد ملنے والے دوست کے بھونڈے مذاق سے دوسرا دوست مر گیا۔ مرنے والا سوچ سمجھ سے بالاتر ہو کر اپنے دل پر لے گیا۔ حقیقت سے دور کہانی۔ لیکن شاید ایسا بھی ہوتا ہوگا۔ گیتوں کا شکاری، مختصر لیکن اچھی تحریر تھی۔ بھونرا، سرور اکرام نے کسی غیر ملکی کہانی سے ماخوذ یہ قصہ لکھا۔ عجیب طلسماتی، جادوئی، عقل حیران کرنے والی کہانی۔ بہرحال حقیقی دنیا سے ہٹ کر کہانی پڑھ لینے میں اور ایک جادوئی، طلسماتی مزہ لینے میں کیا حرج ہے۔ خطوط کی محفل بڑی رنگا رنگ تحریروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ آپ کی جانب سے چینی نکتہ چینی بڑی حقیقت پسندانہ ہوتی ہے۔ اس میں چینی کہاں ہے۔ سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔“

فیصل آباد سے روشی روز کی معطر آمد ”گزشتہ چھ سال سے جاسوسی کی قاری ہوں۔ پہلی بار شرکت کر رہی ہوں، امید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ (یقیناً) سرورق ہمیشہ کی طرح بہت زبردست ہے۔ دلکش رانی اپنے اسمارٹ راجا کے ساتھ مستقبل کے خواب دیکھنے میں مصروف ہے اور ان کا باڈی گارڈ ظالم سماج کو تنبیہ کر رہا ہے کہ رنگ میں بھنگ مت ڈالنا۔ اشتہارات کو نظر انداز کر کے سیدھا محفلِ دوستاں میں پہنچے تو مدیرِ اعلیٰ ہمارے دل کی آواز بیان کرتے نظر آئے۔ دل دکھی ہو گیا۔ ہمارے حکمران کس طرح عوام کو بے وقوف بناتے ہیں اور یہ عوام 67 سال سے مسلسل بے وقوف بن رہے ہیں۔

اب تو کوئی معجزہ ہی وطنِ عزیز کو بچا سکتا ہے۔ حاجی سعید احمد کا تبصرہ اچھا لگا۔ اپنی پسندیدہ کہانی آوارہ گرد بھی، ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ شہزی کسی سپرمین کی طرح اتنے بڑے طوفان سے بچ نکلنے میں کامیاب رہا۔ جواری کچھ خاص نہیں رہی۔ ٹائم کی کمی کی وجہ سے باقی کہانیاں پڑھ نہیں پائی، انشاء اللہ اگلی دفعہ جامع تبصرے کے ساتھ آؤں گی۔''

(ہمیں انتظار رہے گا)

لاہور سے ابن نیامت کی شاندار عنایت ''اکتوبر کا شمارہ 30 ستمبر کو مارکیٹ میں دیکھ کر اتنی حیرت ہوئی کہ پاکستان اگر ورلڈ کپ 2015 بھی جیت جائے تو اتنی حیرت یقیناً نہ ہوگی۔ سرورق کی تعریف کرنا گو سورج کو چراغ دکھانا ہی ہے مگر میں آج تک انگشت بدنداں رہ جاتا ہوں ڈاکر صاحب کی مہارت دیکھ کر۔ ہر ماہ ایک نیا انداز، ہر ماہ ایک نیا رنگ واہ بھئی واہ۔ لیکن سرورق کے اوپر اس بار عید مبارک کے الفاظ آویزاں کیوں نہیں کیے گئے جبکہ ڈائجسٹ عید سے پہلے ہی مارکیٹ میں آچکا ہے۔ خیر یہ معرفت کی باتیں ہیں ہم نادان لوگ کہاں سمجھ سکتے ہیں جی، بہرحال مجموعی طور پر سرورق جاسوسی ڈائجسٹ کے شایانِ شان ہے۔ چینی نکتہ چینی میں جناب حاجی سعید احمد صاحب کے نام کے ساتھ چکھڑا کی سمجھ نہیں آئی۔ کاظمی صاحب ہمیشہ کی طرح دل آویز تبصرہ لے آئے اور میری طرح ہمایوں سعید کو یاد فرما رہے تھے۔ عرفان راجہ، کبیر عباسی، برادر مظہر سلیم اور محمد وقاص خالد کے ساتھ ساتھ سید ذیشان حیدر کا پہلا تبصرہ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ تمام احباب کے سیر حاصل تبصرے مزہ دے گئے۔ کہانیوں کا آغاز امجد رئیس کی مسافت گزیدہ سے ہی کیا۔ سسپنس اور تجسس سے بھرے اس ناول کو ایک بار شروع کیا تو پلکیں جھپکانا بھول گئے، بہت خوب! ڈاکٹر صاحب کی آوارہ گرد کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ وہ آئے اور چھا گئے۔ مختصر کہانیوں میں منظر امام کی خواب زدہ اور کاشف زبیر کی قاتل دوست ٹاپ پر رہیں، چور بھوت اور خلائی فرار بھی عمدہ تحاریر ثابت ہوئیں لیکن گیتوں کا شکاری اور جمال دستی صاحب کا سر پرائز مجھ جیسے بدذوق بندے کے ذوق پر پوری نہیں اتریں، خونی جوا، گمشدگی، خارِ راہ اور آزارِ عشق بھی ٹھیک رہیں اور یوں 30 ستمبر کی شام کو موصول ہونے والا ڈائجسٹ 3 اکتوبر کو اختتام پذیر ہوا۔ اب اجازت درکار ہے۔''

ہری پور سے محمد قاسم رحمان کی التماس ''سات ماہ سے جاسوسی کا خاموش قاری ہوں۔ لکھنے کی جسارت پہلی مرتبہ کر رہا ہوں، امید ہے کہ ناگوار نہیں لگے گا۔ اکتوبر کا جاسوسی تین اکتوبر کو ملا۔ حسینہ ذرا بھی خوب صورت نہ تھی مگر اوپر والا مرد کافی پرکشش لگا۔ (کیوں، آپ سے مشابہ تھا؟) کہانیوں کی ابتدا جاسوسی کی جان آوارہ گرد سے کی۔ شہزی فل ایکشن میں ہے۔ اس مرتبہ کی قسط بھی حسبِ معمول فنٹاسٹک تھی۔ روبینہ رشید کی سرورق کی آخری کہانی زبردست تھی۔ امجد رئیس نے ابتدائی صفحات پر بہت ہی خوب لکھا۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ آپی طاہرہ گلزار، بھائی ادریس احمد خان کے تبصرے زبردست تھے۔ آخر میں ایڈیٹر صاحب پلیز خط ضرور شائع کرنا ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔''

کبیر عباسی عرف شہزادہ کو ہسار فرام مری اور مست ملنگ انکل سیانے کی مشترکہ دھمال ''8 تاریخ کو جاسوسی کے درشن ہوئے۔ ٹائٹل گرل کو دیکھتے ہی انکل سیانے چلائے یو فون والی، یو فون والی، ان کے کہنے کا مطلب تھا کہ ٹائٹل گرل کی شکل یو فون کے اشتہار والی ماڈل سے ملتی ہے۔ ساتھ موجود دو بھوت نما بندوں (یعنی آپ سے کافی ملتے تھے) کو دیکھ کے انکل سیانے نے اپنے برے سے منہ کو اور برا بنایا لیکن پستول کا رخ اپنی جانب دیکھ کے بولے چل پتر نکل چل۔ فہرست میں اولین صفحات میں امجد رئیس کا نام دیکھ کے ہم نے بہ آوازِ بلند یاہو کا نعرہ لگایا۔ یقیناً یہ ایسی تحریر تھی کہ انکل سیانے کی طرح تمام قارئین نے ہر لمحہ اپنے آپ کو کہانی کا حصہ سمجھا ہوگا۔ آوارہ گرد میں انکل سیانے کے دل اور پھیپھڑوں کی حالت بری ہوگئی کہ ایکشن، سسپنس اور تیز رفتاری کی وجہ سے ان دونوں اعضا کو کام کرنے کا روٹین سے زیادہ موقع ملا۔ جواری تیزی سے انجام کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ انتہائی دلچسپ اندازِ تحریر اس کہانی میں دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ صوفیہ شکیل کی خلائی فرار کا پلاٹ تو اچھا تھا مگر کہانی بس سو سو رہی۔ عفان آزاد کی خارِ راہ شروع سے ہی بور لگی مگر ملتن کے منصوبے کے بارے میں جاننے کے لیے بور ہونے کے باوجود پڑھتے رہے مگر اینڈ میں ''چوہا'' ہی برآمد ہوا۔ (اب اسے پال لیں) کاشف زبیر کے قاتل دوست پڑھ کے انکل سیانے کو ففٹی ففٹی بسکٹ یاد آگئے۔ سمجھ تو گئے ہوں گے آپ؟ بشریٰ امجد کی گیتوں کا شکاری مختصر کہانیوں میں بازی لے گئی۔ للکاری یاد دلاتی ماہ نور کی خونی جوا بھی مزہ دے گئی۔ منظر امام کی خواب زدہ دلچسپی کے ساتھ ساتھ اداسی کا سبب بنی۔ خطوط کی محفل میں انکل سیانے اپنا نام ہمارے نام سے بھی پہلے دیکھ کے ڈسکو ڈانس میں مصروف ہوگئے۔''

داجل سے ذاکم علی گورچانی کی نشاندہی ''اس ماہ کا جاسوسی عید سعید سے دو دن قبل ہی موصول ہوا۔ سرورق پر سفید فام حسینہ نینوں کے تیکھے تیر چلا رہی تھیں، پیچھے بے چارہ ناصحِ بنگی پستول سے گولی کے بجائے دھواں نکال رہا تھا۔ فہرست میں انٹری دی۔ ستارہ نما تصویریں خوب صورت منظر پیش کر رہی تھیں۔ چینی نکتہ چینی میں اداریے میں واقعی اہم پہلو کی جانب نشاندہی کی گئی تھی کہ جہاں سیلاب سب کچھ بہا لے جائے وہاں چند سکوں یا کسی بوگس چیک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خطوط میں سب سے اول ہمارے عزیز کا خط تھا لیکن کمپوزنگ کی دو اہم غلطیاں سامنے تھیں۔ ایک راجن پور کو راحت پور، اور دوسری چکھڑا کے بجائے چکھڑا لکھا ہوا تھا۔ (اس سہو پر معذرت خواہ ہیں) خیر حاجی سعید صاحب کو دلی مبارک باد۔ کراچی سے حملہ آوروں کا گروپ خاصا سرگرم نظر آیا۔ محترم عزیز اسد صاحب! اچھلی تو پانی میں چھپک چھپک کرتی ہے مگر آپ سڑک پر کھڑے پانی میں کیسے چھپک کر پہنچے؟ علی پور جتوئی سے ہارٹ کیچر صاحب کی انٹری دلچسپ لگی لیکن ہارٹ کیچر صاحب آپ کو کسی کا ہارٹ کیچ کرنے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑے گی۔ اپنا نام آخری میں دیکھ کر بھی بہرحال خوشی محسوس ہوئی، کہانیوں میں اسٹارٹ آوارہ گرد سے کیا۔ ایک ہی سانس میں کہانی ختم کی تو آخر میں دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی مصیبتوں کے باوجود بھی شہزی بے چارہ مات کھا گیا۔ جواری بھی شروع میں اچھی رہی لیکن یہ کیا، جہاں سے شروع ہوئی اب دوبارہ وہیں چلی گئی۔ خاور سلیم کا جیل سے فرار مگر اب دوبارہ پولیس کے ہتھے چڑھ جانا کچھ عجیب سا لگا۔ سرورق کی آخری کہانیاں کچھ خاص نہیں تھیں۔ مسافت گزیدہ کا آغاز شاندار رہا لیکن پھر

اب تو کوئی معجزہ ہی وطنِ عزیز کو بچا سکتا ہے۔ حاجی سعید احمد صاحب کا تبصرہ جاندار تھا۔ ماہا ایمان کی کمی ہمیشہ کی طرح بہت محسوس ہوئی۔ عبدالجبار رومی کا تبصرہ اچھا لگا۔ اپنی پسندیدہ کہانی آوارہ گرد پڑھی، ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ شہزی کسی سپرمین کی طرح اتنے بڑے طوفان سے بچ نکلنے میں کامیاب رہا۔ جواری کچھ خاص نہیں رہی۔ ٹائم کی کمی کی وجہ سے باقی کہانیاں پڑھ نہیں پائی، انشاء اللہ اگلی دفعہ جامع تبصرے کے ساتھ آؤں گی۔"
(ہمیں انتظار رہے گا)

لاہور سے ابن نیامت کی شاندار عنایت "اکتوبر کا شمارہ 30 ستمبر کو مارکیٹ میں دیکھ کر اتنی حیرت ہوئی کہ پاکستان اگر ورلڈ کپ 2015 بھی جیت جائے تو اتنی حیرت یقیناً نہ ہوگی۔ سرورق کی تعریف کرنا گو سورج کو چراغ دکھانا ہی ہے مگر میں آج تک انگشت بدنداں رہ جاتا ہوں ذاکر صاحب کی مہارت دیکھ کر۔ ہر ماہ ایک نیا انداز، ہر ماہ ایک نیا رنگ واہ بھئی واہ۔ لیکن سرورق کے اوپر اس بار عید مبارک کے الفاظ آویزاں کیوں نہیں کیے گئے جبکہ ڈائجسٹ عید سے پہلے ہی مارکیٹ میں آچکا ہے۔ خیر یہ معرفت کی باتیں ہیں ہم نادان لوگ کہاں سمجھ سکتے ہیں جی، بہرحال مجموعی طور پر سرورق جاسوسی ڈائجسٹ کے شایانِ شان ہے۔ چٹنی نکتہ چینی میں جناب حاجی سعید احمد صاحب کے نام کے ساتھ چکھوا کی سمجھ نہیں آئی۔ کاظمی صاحب ہمیشہ کی طرح دل آویز تبصرہ لے آئے اور میری طرح ہمایوں سعید کو یاد فرما رہے تھے۔ عرفان راجہ، کبیر عباسی، برادر مظہر سلیم اور محمد وقاص خالد کے ساتھ ساتھ سید ذیشان حیدر کا پہلا تبصرہ دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ تمام احباب کے سیر حاصل تبصرے مزہ دے گئے۔ کہانیوں کا آغاز امجد رئیس کی مسافت گزیدہ سے ہی کیا۔ سنسنی، سسپنس اور تجسس سے بھرے اس ناول کو ایک بار شروع کیا تو پلکیں جھپکانا بھول گئے، بہت خوب! ڈاکٹر صاحب کی آوارہ گرد کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ وہ آئے اور چھا گئے۔ مختصر کہانیوں میں منظر امام کی خواب زدہ اور کاشف زبیر کی قاتل دوست ٹاپ پر رہیں، چور بھوت اور خلائی فرار بھی عمدہ تحاریر ثابت ہوئیں لیکن گیتوں کا شکاری اور جمال دستی صاحب کا سرپرائز مجھ جیسے بدذوق بندے کے ذوق پر پوری نہیں اتریں، خونی جوا، گمشدگی، خارِ راہ اور آزارِ عشق بھی ٹھیک رہیں اور یوں 30 ستمبر کی شام کو موصول ہونے والا ڈائجسٹ 3 اکتوبر کو اختتام پذیر ہوا۔ اب اجازت درکار ہے۔"

ہری پور سے محمد قاسم رحمان کی التماس "سات ماہ سے جاسوسی کا خاموش قاری ہوں۔ لکھنے کی جسارت پہلی مرتبہ کر رہا ہوں، امید ہے کہ ناگوار نہیں لگے گا۔ اکتوبر کا جاسوسی تین اکتوبر کو ملا۔ حسینہ ذرا بھی خوب صورت نہ تھی مگر اوپر والا مرد کافی پُرکشش لگا۔ (کیوں، آپ سے مشابہ تھا؟) کہانیوں کی ابتدا جاسوسی کی جان آوارہ گرد سے کی۔ شہزی فل ایکشن میں ہے۔ اس مرتبہ کی قسط بھی حسبِ معمول لفانٹسک تھی۔ روبینہ رشید کی سرورق کی آخری کہانی زبردست تھی۔ امجد رئیس نے ابتدائی صفحات پر بہت ہی خوب لکھا۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ آپی طاہرہ گلزار، بھائی ادریس احمد خان کے تبصرے زبردست تھے۔ آخر میں ایڈیٹر صاحب پلیز خط ضرور شائع کرنا ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار فرام مری اور مست ملنگ انکل سیانے کی مشترکہ دھمال "8 تاریخ کو جاسوسی کے درشن ہوئے۔ ٹائٹل گرل کو دیکھتے ہی انکل سیانے چلائے یوفون والی، یوفون والی۔ ان کے کہنے کا مطلب تھا کہ ٹائٹل گرل کی شکل یوفون کے اشتہار والی ماڈل سے ملتی ہے۔ ساتھ موجود دو بھوت نما بندوں (یعنی آپ سے کافی ملتے تھے) کو دیکھ کے انکل سیانے نے اپنے برے سے منہ کو اور برا بنایا لیکن پستول کا رخ اپنی جانب دیکھ کے بولے چل پتر نکل چل۔ فہرست میں اولین صفحات میں امجد رئیس کا نام دیکھ کے ہم نے بآوازِ بلند یاہو کا نعرہ لگایا۔ یقیناً یہ ایسی تحریر تھی کہ انکل سیانے کی طرح تمام قارئین نے ہر لمحہ اپنے آپ کو کہانی کا حصہ سمجھا ہوگا۔ آوارہ گرد میں انکل سیانے کے دل اور پھیپھڑوں کی حالت بری ہوگئی کہ ایکشن، سنسنی اور تیز رفتاری کی وجہ سے ان دونوں اعضا کو کام کرنے کا روٹین سے زیادہ موقع ملا۔ جواری تیزی سے انجام کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ انتہائی دلچسپ اندازِ تحریر اس کہانی میں دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ صوفیہ شکیل کی خلائی فرار کا پلاٹ تو اچھا تھا مگر کہانی بس سو سو رہی۔ عفان آزاد کی خارِ راہ شروع سے ہی بور لگی مگر ملٹن کے منصوبے کے بارے میں جاننے کے لیے بور ہونے کے باوجود پڑھتے رہے مگر اینڈ میں "چوہا" ہی برآمد ہوا۔ (اب اسے پال لیں) کاشف زبیر کے قاتل دوست پڑھ کے انکل سیانے کو ننھی ننھی بسکٹ یاد آ گئے۔ سمجھ تو گئے ہوں گے آپ؟ بشریٰ امجد کی گیتوں کا شکاری مختصر کہانیوں میں بازی لے گئی۔ للکار کی یاد دلاتی ماہ نور کی خونی جوا بھی مزہ دے گئی۔ منظر امام کی خواب زدہ دلچسپی کے ساتھ ساتھ اداسی کا سبب بنی۔ خطوط کی محفل میں انکل سیانے اپنا نام ہمارے نام سے بھی پہلے دیکھ کے ڈسکو ڈانس میں مصروف ہوگئے۔"

داجل سے ذاکم علی گورجانی کی نشاندہی "اس ماہ کا جاسوسی عید سعید سے دو دن قبل ہی موصول ہوا۔ سرورق پر سفید فام حسینہ نینوں کے تیکھے تیر چلا رہی تھیں، پیچھے بے چارہ ناتھن بیگی پستول سے گولی کے بجائے دھواں نکال رہا تھا۔ فہرست میں انٹری دی۔ ستارہ نما تصویریں خوب صورت منظر پیش کر رہی تھیں۔ چٹنی نکتہ چینی میں اداریے میں واقعی اہم پہلو کی جانب نشاندہی کی گئی تھی کہ جہاں سیلاب سب کچھ بہا لے جائے وہاں چند سکوں یا کسی بوگس چیک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خطوط میں سب سے اول ہمارے عزیز کا خط تھا لیکن کمپوزنگ کی دو اہم غلطیاں سامنے تھیں۔ ایک راجن پور کو راحت پور، اور دوسری چکھوا کے بجائے چکڑ الکھا ہوا تھا۔ (اس سہو پر معذرت خواہ ہیں) خیر حاجی سعید صاحب کو دلی مبارک باد۔ کراچی سے حملہ آوروں کا گروپ خاصا سرگرم نظر آیا۔ محترم عزیز اسد صاحب! مچھلی تو پانی میں چھپک چھپک کرتی ہے مگر آپ سڑک پر کھڑے پانی میں کیسے چھپک کر پہنچے؟ علی پور جتوئی سے ہارٹ کیچر صاحب کی انٹری دلچسپ لگی لیکن ہارٹ کیچر صاحب آپ کو کسی کا ہارٹ کیچ کرنے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑے گی۔ اپنا نام آخری میں دیکھ کر بھی بہرحال خوشی محسوس ہوئی۔ کہانیوں میں اسٹارٹ آوارہ گرد سے کیا۔ ایک ہی سانس میں کہانی ختم کی تو آخر میں دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی مصیبتوں کے باوجود بھی شہزی بے چارہ مات کھا گیا۔ جواری بھی شروع میں اچھی رہی لیکن یہ کیا، جہاں سے شروع ہوئی اب دوبارہ وہیں چلی گئی۔ خاور سلیم کا جیل سے فرار مگر اب دوبارہ پولیس کے ہتھے چڑھ جانا کچھ عجیب سا لگا۔ سرورق کی آخری کہانیاں کچھ خاص نہیں تھیں۔ مسافت گزیدہ کا آغاز شاندار رہا لیکن پھر

ایکشن ختم۔ ناتھن بے چارہ دو جگہوں پر مرتے مرتے رہ گیا۔ (ایکشن کو کہاں تک جاری رہنا تھا... کہانی ختم ہونے کے بعد بھی؟) کترنوں میں کاشف عبید بٹ گرام اور سحرش افضل فرام ستوہ کی چوائس زبردست تھی۔"

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی تبصرہ نگاری "اکتوبر کا شمارہ اور سرورق کی حسینہ سے لگ رہا تھا جیسے سیلاب متاثرین کو حسرت و یاس کی تصویر بنے دیکھ رہی ہوں۔ بہت خوب صورت ٹائٹل ہے۔ خطوط کی تبصرہ نگاری دلچسپی سے پڑھی۔ سید شکیل حسین کاظمی کا تبصرہ اچھا لگا۔ اقصیٰ رانی اور ان کی ٹیم کو ویلکم۔ لگتا تھا سب نے آپس میں اپنے جملوں کا تبادلہ خیال کر کے بھیج دیا ہے، اچھا لگا۔ ایم عزیر اسد آپ نے ویلکم کیا، تھینکس جناب۔ مسفرہ حسین تو واقعی کوہ پیما ہیں مگر ہم آپ کو مشکوک نہیں کہتے اور سیانے انکل جی مجھے تو آپ بھی بہت باتونی لگے ہیں۔ واقعی خوش فہمی بھی اچھی چیز ہے ہاہاہا... مسکراتے رہو۔ ہارٹ کیچر کی بیان بازی بھی متاثر کن تھی۔ سید ذیشان ویلکم ڈیئر پہلی کوشش سے ہی کامیابی کی سیڑھی چڑھنا ممکن ہوتا ہے۔ آخر میں بشریٰ افضل بھی اپنے انداز سے اچھی باتیں سنا گئیں اپنے تبصرے میں۔ خطوط پڑھ کے سیدھے آوارہ گرد کی محفل میں پہنچے تو اسے پہلی فرصت میں ہی بالی وڈ فلموں کے ایکشن میں دیکھا۔ اول خیر تو جیسے شرلاک ہومز کے دماغ سے آگے بڑھتا ہے اور کا کا بھی اس کی تائید میں اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آخر میں ڈینگی مہم والوں نے سب کو سلا دیا، اللہ خیر کرے۔ میڈیا کوریج کے ساتھ جڑی ایکشن سے لبریز کہانی مسافت گزیدہ میں شیرف نے کمال مہارت سے ناتھن کی جان بچالی تو ڈیزی نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اچھی مسافت طے ہوئی ہے۔ یقیناً ستارے پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ صوفیہ شکیل کی خلائی فرار بھی مختصر مگر اچھی کاوش تھی۔ جس طرح آپ خواب دیکھتے ہیں اب میں بھی دیکھنے لگی۔ منظر امام نے خواب زدہ میں بہت اچھی منظر کشی کی ہے۔ پُراسراریت سے بھرپور سرورق کی پہلی کہانی زبردست تھی۔ سرور اکرام نے بھوزا میں بہت دلچسپ پہلو دکھائے ہیں۔ واقعی دنیا کے اس پار کے پُراسرار بے شمار واقعات ہیں جنہیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ واہ جی سرورق کی دوسری کہانی بھی ایک دم سے زبردست ہے محبتوں کے ساتھ نادر کے ثبوت نے روبینہ رشید کا معما بھی حل کر ہی دیا۔"

صوبہ بٹگرام سے کاشف عبید کاوش کی کوشش "جاسوسی اس دفعہ عید کے چوتھے روز ملا۔ ایک ہی رات میں سرورق کہانیاں اور خطوط کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھ پایا۔ جلدی میں خط لکھا کہ شائع ہو جائے۔ اب آپ کی مرضی شائع کرتے ہیں کہ نہیں۔ پہلا رنگ بھوزا سرور اکرام نے بہت ہی اچھا لکھا تھا اور دوسرا رنگ معما روبینہ رشید نے آخری صفحات کی قیمت ادا کی اور خطوط بھی اچھے تھے۔ آپ سے پھر گزارش ہے کہ خطوط کے صفحات بڑھائیں۔ آوارہ گرد ابھی جاری ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی میرے پسندیدہ قلم کار ہیں۔ وہ دوسرے رسالوں میں بھی لکھتے ہیں؟ (لکھتے ہیں) میں ان کی تحریروں کو شوق سے پڑھتا ہوں۔ ایک اور بات کہنی تھی کہ میں نے بک اسٹال والے سے بات کی تھی وہ کہہ رہا تھا کہ میں بھی ادارے سے کہوں کہ وہ پاکیزہ بھیجا کریں۔ ادارے سے گزارش ہے کہ ہر ماہ تقریباً 10 پرچے بھیجا کریں۔"

ناظم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی توصیف "جاسوسی ڈائجسٹ اپنے وقت پر مل گیا۔ سرورق کھلتے چہروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا لہٰذا کھلتے چہرے سے ہی استقبال کیا۔ اندر چینی نکتہ چینی میں حاجی سعید احمد سرفہرست تھے۔ نئے اور پرانے دوستوں کی شرکت نظر آ رہی تھی۔ آوارہ گرد کی یہ قسط بھرپور دلچسپی لیے ہوئے تھی۔ جواری بھی مزید دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ مسافت گزیدہ نے بھی اچھا تاثر دیا۔ ناتھن کو جینے کا نیا حوصلہ ملا۔ اسے اپنے بچنے کی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ خارِ راہ بھی اچھی تحریر تھی۔ خلائی فرار بھی اچھی لگی۔ خواب زدہ میں لیاقت کے دیکھے ہوئے خواب ادھورے رہ گئے۔ اس بات سے ثابت ہوا کہ جو کچھ انسان کی زندگی میں پیش آنے والا ہوتا ہے وہ پہلے سے ہی کاتبِ تقدیر نے لکھ دیا ہوتا ہے۔ قاتل دوست نے بھی متاثر کیا۔ بیچ بیچ میں اقوالِ زریں پر مشتمل کترنوں نے مزہ دیا۔ گیتوں کا شکاری اور خونی جوا بھی اچھے انداز کی تحریریں تھیں۔ خونی جوا میں شوہر نے شاطرانہ ذہن سے کام لیتے ہوئے اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کیا اور خود شبے سے بالاتر ہو گیا۔ سرپرائز میں آرتھر کے دوست کا کیا ہوا مذاق آرتھر کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیوں نے اپنی روایت قائم رکھی اور بہترین لگیں۔"

لاہور سے حاجرہ ہاشمی اینڈ مہرین ناز کا تنقید و توصیف نامہ "دلفریب جاسوسی تین اکتوبر کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل اچھوتا اور حسین تھا۔ چینی نکتہ چینی میں حاجی سعید احمد کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ سید شکیل کاظمی نے پہلے اپنی پڑوسن اور اب اس کے بھائی کو بھی متعارف کروا دیا۔ سید کاظمی جی کیا آپ دھرنے میں گئے ہوئے ہیں جو حالات سازگار ہیں۔ اقصیٰ رانی کی پانچ ممبرز پر مشتمل ٹیم کے نام، نام بڑے درشن چھوٹے۔ ایم عزیر، دریا میں تو مگر مچھ بھی ہوتے ہیں۔ مسفرہ چینی نکتہ چینی میں آپ کا نام شائع ہو گیا، کافی ہے۔ عبدالجبار رومی، آپ کی دوسری جسارت دیکھ کر نہیں لگتا کہ آپ نئے کھلاڑی ہیں۔ ہارون بیبرس برادر طاہر چودھری صاحب کا دل اچھل کر کہاں چلا گیا، ذرا پتا تو کریں۔ جاسوسی اسٹاف کی بھی آپ نے خوب کہی۔ تصویر العین صاحب، شوکت شہریار کا تبصرہ دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ اپنے گھر کا ایڈریس تک بتا دیا۔ ذیشان حیدر آپ اپنے وڈے شاہ جی کے ساتھ اکٹھے ایک ہی تبصرہ لکھ دیا کریں تاکہ آپ اداس نہ ہوں۔ طاہرہ گلزار آپ اپنے تبصرے میں شکوہ کے علاوہ بھی کچھ لکھا کریں۔ صوبیہ جتول، روشنی زینت ایک طرف تو آپ ریچھوں پر معلومات چاہتی ہیں یعنی آپ بولڈ ہیں، دوسری طرف چھپ کر خط لکھتی ہیں۔ کبیر بابا کا تبصرہ شائع نہیں ہوا تو انکل سیانے کی سفارش لے کر آ گئے۔ وقاص خالد کا تبصرہ اچھا تھا۔ ہارٹ کیچر آپ اپنا دل سنبھال کر رکھیں، کہیں وہ لمبے دورے پر نہ چلا جائے۔ اب اپنی شاندار اسٹوریز پر تنقید و تعریف کی جائے۔ احمد رئیس کی مسافت گزیدہ سنسنی خیز اور ایکشن سے بھرپور ہے۔ JDC کا پڑھ کر JDP کا خیال آ گیا۔ دولت کے لالچ میں ناتھن اور اس کے چچا نے معصوم بچے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن مائیکل اور ڈیزی نے اپنی صاف گوئی سے اس کی جان بچالی۔ خارِ راہ، محمد عفان آزاد، راہ جتنی بھی خاردار ہو انسان اگر صبر و تحمل سے کام لے تو گھی سیدھی انگلی سے بھی نکالا جا سکتا ہے، جس طرح ملٹن نے گمنام کال کے ذریعے رچرڈ کے فراڈ کا پول کھول دیا [illegible]

عزت اور ملازمت بچالی۔ خلائی فرار صوفیہ شکیل کی اچھی کاوش تھی۔ خواب زدہ منظر امام، ادھورے خواب انسان کو نہ جینے دیتے ہیں نہ ہی مرنے، فیاض کے جاہل سسر نے پولیو کے قطرے نہ پلا کر اس کے خواب چکنا چور کر دیے۔ آوارہ گرد کامیابی کے مراحل تیزی سے سر کرتی جا رہی ہے، شہزاد بڑے بڑے معرکے بہادری کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ اب اگلی قسط میں پتا چلے گا کہ وہ گھر اجیرے والوں سے کیسے بچتا ہے۔ کاشف زبیر کی قاتل دوست، دوستی میں اعتماد ہی سب سے بڑا جذبہ ہے اگر اس میں بدگمانی آجائے تو سب کچھ ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ جلال کی بدگمانی اور شبیر کا دوستی کا حق ادا کرنا اور اصل قاتلوں کو بے نقاب کرنا شاندار رہا، گیتوں کا شکاری، بشریٰ امجد، گولڈی ہینڈرسن نے مرنے کے بعد بھی اپنے سریلے گیت کے ذریعے اپنے محسن کار جوڑی کی جان بچالی۔ خونی جوا، ماہ نور، بددماغی اور تکبر کا انجام برا ہوتا ہے۔ جیسا کہ مسز ڈولان کے ساتھ ہوا۔ جواری احمد اقبال کی زبردست جاری ہے۔ فرید کا نادر شاہ کو معاف کر دینا، ایسا لگا کہ اگلی قسط آخری ہوگی لیکن جواری ایک بار پھر جوا کھیلنے کو تیار ہے۔ چور بھوت عقار آزاد، ہاکس کو اپنی بیوی کا نظر آتا وہم نہیں، بلکہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے تھے۔ لیکن جلد ہی نے ان کو بے نقاب کیا۔ گمشدگی ابن کبیر کی سبق آموز کہانی تھی۔"

قصور سے کاشف علی میراں کی عرق ریزی "محفلِ جاسوسی میں آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح دل کو اداس کر گیا۔ آپ بھی کیا کریں آپ کو اداریہ لکھنے کے لیے خوشی کی خبریں وطنِ عزیز میں کم کم ہی ملتی ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر ہی ہمارے حال پر رحم کرے۔ خطوط میں ضلع راجن پور سے حاجی صاحب کی ریاضت سرفہرست تھی۔ اسلام آباد سے وڈے شاہ جی نہ صرف خود تشریف لائے بلکہ اپنے کزن کو بھی ساتھ لائے نارووال سے۔ شاہ جی آتے رہا کریں۔ کبیر عباسی صاحب کی شکایت پر ادارے سے گزارش ہے کہ وہ اس شکایت کو سنجیدگی سے لیں۔ کیونکہ ہم لوگ بہت محبت اور مان سے تبصرہ بھیجتے ہیں اور اگر وہ شائع نہ ہو تو بہت دکھ بھی ہوتا ہے۔ (ہمیں بھی آپ کا تبصرہ شائع کر کے خوشی ہوتی ہے۔ بلاوجہ کسی کا خط غائب نہیں ہوتا کچھ نہ کچھ وجہ ہوتی ہو گی) عرفان راجہ، مسرورہ حسین، انور یوسف زئی۔ ہارون بھرس وقاص خالد اور خصوصاً مظہر سلیم کے تبصرے جاندار تھے۔ محترم برادر ہمایوں سعید سے گزارش ہے وہ ادارے سے اپنی ناراضی ختم کر دیں ہماری طرح۔ لاہور سے زویا اعجاز اور حافظ آباد والی آپا کی کمی محسوس ہوئی، محفل میں اعجاز احمد راحیل اور تحسیر عباس بابر بھی اپنی حاضری لگوائیں اگلے ماہ۔ اب کچھ بات ہو جائے کہانیوں کی۔ پتا نہیں باقی قارئین جاسوسی کو کس ترتیب سے پڑھتے ہیں مگر میری یہ عادت ہے فہرست میں موجود اپنے پسندیدہ لکھاریوں کی تحاریر کو اولین ترجیح دیتا ہوں۔ قاتل دوست کم صفحات پر ایک اسکی پر فیکٹ تحریر تھی جس کے پلاٹ میں وسعت کی گنجائش موجود تھی اور کاشف زبیر جیسے لکھاری چاہتے تو اسی تحریر کو وسعت بخش کر ابتدائی صفحات کی بھی زینت بنا سکتے تھے۔ عقار آزاد کی تحریر چور بھوت دوسرے نمبر پر زیرِ مطالعہ آئی جو کہ مجرم ذہن مغربی معاشرے کی تصویر تھی۔ مغربی معاشرے میں شاید ہر کوئی جرم کرنے کے نت نئے طریقے ہی ڈھونڈتا رہتا ہے۔ گمشدگی کے آگے ابن کبیر لکھا ہوا دیکھا تو ایک سیکنڈ کے لیے تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ اپنے شہزادہ کو ہسار کا بیٹا تو ابھی محض چھ ماہ کا ہی ہوا ہے اور جاسوسی میں لکھاری بھی بن گیا۔ خیر جی پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ پانچ صفحات پر مشتمل کہانی سسپنس سے بھرپور تھی۔ صوفیہ شکیل صاحبہ کی خلائی فرار تو سر پر سے گزر گئی، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ معاشرتی مسائل پر جس خوب صورت انداز میں منظر امام کہانیاں لکھتے ہیں یہ کچھ انہی کا خاصہ ہے۔ خواب زدہ بہت پسند آئی جس میں خوب صورتی کے ساتھ پولیو کے مرض سے جڑے ہمارے معاشرے کو درپیش مسائل سے ہمیں آگاہ کر دیا گیا۔ بہت خوب جی۔ جمال دستی کا سرپرائز کچھ خاص سرپرائز نہیں کر سکا۔ اپریل فول کے موضوع پر بہت کچھ لکھا اور پڑھا جا چکا ہے۔ سلیم انور کا آزارِ عشق بھی بیمار مغربی تہذیب کی عکاسی کر رہا تھا۔ جو فطرت کے قوانین سے متصادم ہوتے ہیں ان کا انجام ایسو کل جیسا ہی ہوتا ہے۔ خونی جوا نے تو للکار کی یاد تازہ کر دی جس طرح عمران نے چھوٹی میڈم کو اس کھیل کی آڑ میں انتقام کا نشانہ بنایا تھا ویسے ہی قسمت اس کھیل کی صورت میں ڈولان پر بھی مہربان ہوئی اور اسے اپنی بیوی سے چھٹکارا ملا۔ اب بات ہو جائے اسٹوری آف دی منتھ کی۔ جی ہاں، امجد رئیس صاحب کی مسافت گزیدہ۔ بلاشبہ ایک ایسا شاندار ناول جو برسوں بعد تخلیق ہوتا ہے۔ ایکشن سے بھرپور ایک ایسا ناول تھا جو ایک ہی نشست میں پڑھے جانے کے قابل ہے۔ گریٹ امجد رئیس صاحب، یہ ناول ادارے کی جانب سے عید گفٹ لگا۔"

میانوالی سے احسان سحر کے خیالات "اس ماہ کا تازہ اور تر و تازہ پھول دو تاریخ کو ہی مل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ صبح صبح اچھی چیزیں مل جائیں تو دن اچھا ہی گزرتا ہے اور یہ جھوٹ بھی نہیں کیونکہ ایک دن نہیں جب تک جاسوسی ختم نہ کر لیں ہمارے تو دن سہانے ہی گزرتے ہیں۔ سب سے پہلے نظریں ہمیشہ ٹائٹل پر ہی جاتی ہیں۔ بھالو نما انسان کو اپنی طرف گن کرتے پایا تو سانسیں رک گئیں۔ پھر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بھالو صاحب کسی اور پر گولی چلا بھی چکے ہیں اور رخ بس ایسے ہماری طرف تھا۔ صنفِ نازک کے گلاب کی پتیوں کی طرح دلکش ہونٹ بھی ہمیں تو قابلِ ذکر لگے۔ خوشی میں بھی اور غم میں بھی ہمیشہ آنکھیں نم ہوتی ہیں۔ ہماری خوشی کی وجہ ہماری برتھ ڈے ہے جو کہ 27 اکتوبر کو ہم منا رہے ہیں۔ 22 سال کے ہم ہینڈسم نوجوان ہو گئے۔ یقیناً ہمیں جاسوسی کی طرف سے مبارک باد ضرور ملے گی۔ (اچھی زبردستی ہے۔ خیر... مبارک ہو بہت بہت، 78 سالگرہیں اور منتظر ہوں آپ کی) خطوط کی مارد ھاڑ میں عاجزی سے تشریف لائے، ہمارا بھی اس چیز پر حق ہے اور جس چیز پر حق ہو اسے جتایا بھی جاتا ہے (پھر زور آوری) حاجی سعید صاحب کے ساتھ باقی سب لوگوں کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ اس ماہ جو ناول پیش کیا گیا، وہ سسپنس اور ایکشن کے لحاظ سے فٹ تھا، جدوجہد اور کچھ دکھانے کی لگن سے ہی انسان ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ ناگن کی بھاگ دوڑ آخر رنگ لائی۔ جیت ہمیشہ سچائی کی ہوتی ہے۔ خارِ راہ، واقعی قانون شکنی تو چھوٹی سی تھی، پر بہت ہی اچھی ثابت ہوئی۔ جھوٹ، مکر و فریب چھپ تو جاتے ہیں مگر ختم کبھی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہو کر ہی رہتے ہیں اور جب یہ ظاہر ہوتے ہیں تو اپنے ایک دن میں سو دن کی کسر نکال لیتے ہیں جیسے سو دن چور کے اور ایک دن مالک کا۔ ملٹن کی محنت آخر رنگ لائی اور آرچ کو اپنے کیے کا بھرنا پڑا۔ خلائی فرار، انسان کو ناوانیوں کی سوچوں پر بھی کبھار حیرت ہی ہوتی ہے۔ آرتھر بھی مکافاتِ عمل کا شکار ہوا جو دوسروں کے ساتھ برا کرتے ہیں قدرت انہیں کبھی نہیں چھوڑتی۔ پر نادان انسان سمجھتا پھر بھی نہیں۔ خواب زدہ اور اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ یہی حال مسلمانوں کا بھی ہے جو اسلام کے حوالے سے اندھیرے میں ہیں۔

آوارہ گرد نے تو اس دفعہ تیزی میں ریکارڈ قائم کر دیا۔ شہزاد کی بھاگ دوڑ اور ہر لمحہ موت سے قریب تر ہوتا جانا۔ پھر بھی تدبیروں سے بازی کا پانسا پلٹ رہا ہے، کب تک یہ گیم چلے گا یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ویلڈن، قاتل دوست، کاشف اچھی کاوش کے ساتھ حاضر تھے۔ گیتوں کا شکاری بھی اچھی کاوش تھی۔ رنگوں میں پہلا رنگ بھونرا کافی پُراسرار اور دلچسپ تھی۔ سرور اکرام کا نام ہی کافی ہے اور ہمیں بھی سوچوں میں ڈال دیا کہ واقعی ایسا ہے۔ دوسرا رنگ معما، محبت میں ناکامی انسان کو پاگل بنا دیتی ہے، نادر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ خسرو کی بھاگ دوڑ آخر رنگ لائی۔ گزرے تلخ لمحوں کی تلخیاں انسان کو زہریلا ہی بنا دیتی ہیں، پھر زہریلے انسان اور سانپ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ دونوں اپنوں کو بھی نہیں بخشتے۔ خونی جوا کافی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔“

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کی کرم فرمائی ”محبتوں بھری محفل کی محبت نے ایک بار پھر پہلی محبت کی سی شدت سے سر اٹھایا اور پہلی سی محبت کی ڈیمانڈ کی۔ تو ہم نے بھی فطرت اور حکومت وقت کے برعکس مطالبہ تسلیم کیا۔ سرورق والی لڑکی ایوریج جبکہ کیپر لوشن والی لاجواب تھی۔ محفل کے طور سے شکیل کاظمی، انور یوسف زئی، کبیر عباسی اور تصویر الحسن جیسے مایہ ناز تبصرہ نگاروں کا ہمیں مخاطب کرنا ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ حاجی سعید صاحب کی محبت اور ریاضت نے متاثر کیا۔ کراچی سے اقصیٰ رانی تا صوبیہ بھارانی کا مشترکہ حملہ یقیناً مسفرہ کے نام پر تھا۔ اور کوثر ناز پائلٹ آپ نے یقیناً پائلٹ ہوا بازوں کی نسبت سے لگایا ہوگا۔ مگر یقین کریں پائلٹ تو بس کا بھی ہوتا ہے۔ توصیف برادر، سعدیہ صاحبہ کے تمام کارنامے ہی ناقابل فہم ہوتے ہیں۔ لہٰذا سوال مت اٹھائیں۔ صرف سنتے جائیں اور سوچتے جائیں کہ کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں۔ مسفرہ کی شمولیت خوب رہی۔ مصدق بھائی آپ نے وضاحت نہیں کی کہ آپ کو مسفرہ کی کون سی جسارت پسند آئی۔ کبیر برادر کسی سیانے انکل کے ساتھ آئے اور چھا گئے۔ تصویر الحسن صاحب حاضری دے کر آپ کے ذاتی خیال کی تردید کر دی ہے۔ مظہر بھائی آپ آسان بات کو سوچ سوچ کر اتنا مشکل کیوں بنا دیتے ہیں اور ایسی کون سی مصروفیت تھی جس کے باعث ہفت اقلیم کی دولت کو تین ماہ تک ملتوی رکھا؟ ذیشان برادر کا مزے مزے سے بھرپور تبصرہ تھا۔ کم گو اور سلجھے ہوئے وقاص برادر کی شرکت اچھی لگی۔ واقعی انکل جی آپ نے درست کہا، طاہرہ گلزار صاحبہ سے کام کی باتیں نکلوانا کارِ دارد ہے۔ بشریٰ صاحبہ آج بھی جب کسی پرانے ڈائجسٹ میں آپ کے شاندار حملے اور جارحانہ اسٹروکس پڑھتا ہوں اور اسے آپ کے تازہ خطوط سے کمپیئر کرتا ہوں تو ہول آنے لگتے ہیں کہ کیا پچیس سال بعد ہم بھی ایسی سدھری سدھری سی باتیں کریں گے؟ (کیا اب پچیس سال بعد...) امجد رئیس کی اولین صفحات پہ بھی تیز رفتار اور سنسنی خیز کہانی مسافت گزیدہ عید گفٹ ثابت ہوئی۔ منظر امام کی کہانی خواب زدہ موجودہ دور کے بڑے مسئلے پولیو اور اس کے والدین کے خوابوں کا خون کرتے اثرات کا احاطہ کرتی سبق آموز کہانی تھی۔ خلائی فرار کچھ زیادہ ہی تصوراتی تھی۔ کاشف زبیر کی کہانی قاتل دوست ہمیشہ کی طرح اعلیٰ معیار کی رہی۔ جمال دستی کی سرپرائز انسانی نفسیات پر متاثر کن تحریر تھی۔ سرور اکرام کی کہانی بھونرا حقیقت اور ہمارے اسلامی نظریے سے کوسوں دور اور غیر دلچسپ کہانی تھی۔ جبکہ سرورق کی دوسری کہانی نے کافی حد تک حق ادا کر دیا۔ بے شک محبت ایسا معما ہے جس کے الجھے سرے سلجھانا ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ محبت خود محبت کی جان بھی لے سکتی ہے۔ نادر نے جو کیا سو کیا مگر جو نازلی صاحبہ کر رہی تھیں وہ بھی کسی طور مناسب نہیں تھا۔ آزارِ عشق بیمار ذہنی معاشرے میں پھیلی غیر انسانی وبا کے موضوع پہ لکھی دلچسپ کہانی تھی۔ سمجھ نہیں آتا کہ مغرب ہم جنس پرستی کی روک تھام کیوں نہیں کرتا؟“

آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی موسمی مجبوریاں ”اکتوبر 2014ء کا جاسوسی عید سے قبل ہی مل گیا اور عید کی خوشیوں کو دوبالا کر گیا۔ کشمیر کا موسم کافی تبدیل ہو چکا ہے۔ پہاڑوں پر چاندی جیسی برف دھوپ میں خوب نظارہ پیش کر رہی ہے۔ نیچے وادی میں ٹھنڈی ہوائیں رقص کر رہی ہیں۔ حالیہ بارشوں نے خوب ادھم مچا رکھی ہے۔ اس سے قبل کہ یہ بارشیں روڈ بلاک کر دیں سوچا محفل میں اپنی حاضری لگا دوں۔ کیا پتا پھر چار پانچ ماہ اس کا موقع نہ مل سکے۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ کافی عرصے بعد اتنا خوب صورت سرورق دیکھنے کو ملا۔ حسینہ ٹائٹل بلاشبہ انتہائی خوب صورت تھی۔ آنکھوں میں زندگی کے سارے ہی رنگ قوسِ قزح کا تاثر دے رہے تھے۔ فہرست کا سرسری جائزہ لینے کے بعد من پسند سلسلے وار کہانی آوارہ گرد کے در پر دستک دی۔ آوارہ گرد کی یہ قسط انتہائی تیز اور ایکشن سے بھرپور رہی۔ شہزاد عرف شہزی کا بار بار بچ جانا اور موت کے منہ سے بخیر و عافیت نکل جانا یقیناً اس کی گڈ لک ہے۔ موت کے کنوئیں میں آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگانے کے بعد زندہ بچنا، یقیناً معجزہ ہی ہے اور معجزے بار بار نہیں ہوتے۔ شکار جتنا سیانا بھی ہو آخر کار دام میں آ ہی جاتا ہے۔ آسیہ کی دلیری قابلِ دید تھی۔ جواری اپنی مخصوص رفتار سے مخصوص ڈگر کی طرف بڑھ رہی ہے اور حالات و واقعات سے لگ رہا ہے کہ کہانی کو سمیٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو کہ اچھا شگون نہیں ہے۔ اب جواری بہترین ہو چکی ہے لہٰذا میں اس حق میں نہیں ہوں کہ اتنی جلدی سمیٹا جائے۔ ملک انور کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ حالات انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ یہ عشق تو آگ کے دریا میں کودنے پر مجبور کر دیتا ہے پھر انور اپنی ساری جائداد و جاگیر کیونکر نہ بیچتا۔ استاد گامارستم کی زندگی کا بھی یہ دوسرا پہلو اچھا لگا۔ ملک سلیم کا پولیس کے ہتھے چڑھنا، سنسنی خیز موڑ پر اینڈ کیا گیا جس نے اگلی قسط کا انتظار بڑھا دیا۔ پہلا رنگ بھونرا نام سے تو لگ رہا تھا کہ ایک رومینٹک اسٹوری ہوگی اور رومانوی باتیں پڑھنے کو ملیں گی۔ لیکن یہ تو ایک ماورائی اور پُراسرار کاوش ثابت ہوئی۔ دل و دماغ قطعی طور پر یہ ماننے کو تیار نہیں کہ آیا ایسا بھی ہوتا ہے۔ صدیوں پرانی محبت کسی انسانی وجود میں زندہ پائی جاتی ہے۔ مانا کہ عشق کبھی نہیں مرتا مگر یہ ناممکن ہے کہ روحیں جسم تبدیل کر سکتی ہیں۔ (کہانیوں کو مذہب کے خانے میں کیوں فٹ کرتے ہیں؟) معما، روبینہ رشید کا دوسرا رنگ بھی کچھ خاص نہیں لگا۔ بعض معاملات و واقعات کو خوامخواہ طول دیا گیا ہے۔ خسرو وکیل کے بجائے پرائیویٹ سراغ رساں لگا۔ جو پولیس سے بھی تیز ثابت ہوا۔ آخر تک یہ توقع نہیں تھی کہ نازی کا قتل نادر نے کیا ہوگا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سرورق کے دونوں رنگ کچھ خاص تاثر نہیں دے پائے۔ خاص رنگ نہیں جما سکے۔ مسافت گزیدہ امجد رئیس کی کاوش انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ پولیس کے لیے تھکا دینے والا سفر اور چوہے بلی کا کھیل، بارہ سالہ ناتھن انڈر ورلڈ کے ڈان اور محکمہ پولیس کے لیے لوہے کے چنے ثابت ہوا۔ ناتھن خداداد صلاحیتوں سے مالا مال اور فوری عمل کرنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال تھا۔ کسی پیشہ ور کمانڈو کی طرح لگا۔ مسٹر مائیکل اور اے جی جس کو جنگلی بلی کا خطاب ملا ہوا تھا، ان کا کردار

بہت جاندار اور لائقِ تحسین تھا۔ مجموعی طور پر مسافت گزیدہ اس ماہ کی نمبرون کاوش تھی۔“

راجن پور سے ماہ تاب گل رانا کی بے تابیاں ”لمبے عرصے کی غیر حاضری کے بعد حاضرِ خدمت ہوں۔ میرے غائب ہونے کی وجہ میری آٹھ ماہ کی بیٹی زینب نور ہے۔ خیر خط نہ لکھنے کی کمی کو میں نے ایف بی پر جاسوسی فین کلب کو جوائن کر کے پورا کیا جہاں بہت سے رائٹرز اور تبصرہ نگار موجود ہیں لیکن دو چیزوں کی وہاں شدت سے کمی محسوس ہوئی، ایک پیاری، لاج ولاری تپھی اور دوسرے انکل جی کے چٹ پٹے جوابات۔ ڈیئر تپھی! میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔ سو اب میرے خط پہ ہاتھ ہولا رکھنا۔ اچھا اب بات ہو جائے سرورق کی۔ اس مرتبہ کافی عرصے کے بعد سرورق پسند آیا۔ ڈاکر انکل! ویسے اس مرتبہ آپ کو ایسا بنانا چاہیے تھا کہ گجر اچراکر بھاگتے قمرتی۔ ان کے پیچھے پستول بدست ہمایوں سعید، مولاجٹ پکڑے اعجاز احمد راحیل اور سامنے سے آتے تفسیر عباس بابر صاحب اور دروازے کے پیچھے سے جھانکتی حیران، پریشان ماہا ایمان۔ کم از کم اس طرح ان تمام غائب لوگوں کا دیدار تو ہو جاتا۔ (خود کو بھی کہیں فٹ کرنا تھا نا) ارے بھئی کہاں ہیں آپ سب۔ ام ثمامہ اور عذرا ہاشمی! آپ بھی واپس آجائیں۔ فہرست کی سجاوٹ اچھی لگی۔ انکل جی کا ابتدائیہ اداس کر گیا۔ حاجی سعید احمد! مبارک باد۔ سید شکیل حسین! پڑوسن کے بعد اس کا بھائی؟ یا اللہ! ہم کہاں جائیں؟ کراچی کی سوہنی کڑیوں ویلکم! کبیر عباسی! خدا تعالیٰ نے آپ کو اپنی نعمت سے نوازا مبارک باد۔ تصویر العین! ہمایوں سعید کی شادی نہیں ہوئی البتہ وہ مناسب ترین تاریخ طے کرنے کے چکروں میں گم ہیں۔ کہانیوں کی دنیا میں پہنچے تو آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ اپنے بہت زبردست مصور شاہد حسین صاحب کو نہ پاکر۔ میرا مطلب ہے ان کے اسکیچز۔ جواری بہت زبردست ہو گئی ہے، کہانی نے اچھا موڑ لیا ہے، یہ والی قسط تو تمام اقساط میں بہترین تھی۔ ابتدائی صفحات پر مسافت گزیدہ بہت زبردست تحریر رہی۔ ڈیزی کا کردار بہت پسند آیا۔ کاشف زبیر بھی اچھی تحریر لائے۔ لیکن ہم انتظار کر رہے تھے اپنے جانے پہچانے کرداروں کا، عیدالاضحی کے موقع پر تو شامی یا جلیل کو آنا چاہیے تھا۔ باقی ابھی کچھ نہیں پڑھا کیونکہ ایک تو رسالہ بہت لیٹ ملا اور دوسرے میری کیوٹ سی بیٹی جو ماما کے ہاتھ میں ڈائجسٹ دیکھتے ہی شروع ہو جاتی ہے اور تیسری وجہ گھر کے کام کاج اور چوتھی وجہ اسٹڈی ٹائم اور، اور، اور...... انکل جی میرے خط کو ضرور، ضرور شامل کیجیے گا۔ اور ہاں آپ اپنے رائٹرز کو جتنا بھی سات پردوں میں چھپا لیں ایف بی پر تو ہم نے دیکھ ہی لیا۔“ (چلیں جی، بہت بہت مبارک ہو)

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کا نکتۂ اعتراض ”جاسوسی اس ماہ 2 تاریخ ہی کو مل گیا اور عید کا لطف دوبالا کر گیا۔ سرورق اس بار دل کش تھا۔ خطوط کی محفل کے سردار اس بار حاجی سعید صاحب رہے۔ میرے ہم شہری شکیل کاظمی صاحب بھی ہمایوں سعید کے لیے میرے ہم نوا نکلے۔ بی بی بشریٰ افضل اور تصویر العین کی واپسی پر خوش آمدید! بی بی تصویر کا خیال درست لگتا ہے کہ بھائی ہمایوں سعید بیوی کو پیارے ہو گئے ہیں ویسے ہم پٹھانوں کی یہ روایت نہیں۔ علی پور کے ہارٹ کیچر کا تبصرہ بے حد اچھوتا تھا۔ قسط وار کہانی جواری بے حد کمی کر گئی کہ فریدالدین کے لیے نورین کی موت کی تصدیق کے بعد اب کچھ نہیں رہا۔ ریشم بھی اپنے گھر کی ہونے لگی ہے۔ انور نے ثابت کر دیا کہ وہ عام جاگیرداروں سے ہٹ کر ہے۔ دوسری قسط وار کہانی آوارہ گرد میں شہزی نے مار دھاڑ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں بھونرا اور معما بس گزارے لائق تھیں۔ اس ماہ کی بہترین کہانی مغربی ناول کی تلخیص مسافت گزیدہ رہی۔ شاید اس پر ہالی ووڈ میں فلم بھی بن چکی ہے۔ (جی ہاں) دیسی دو کہانیوں میں سے کاشف زبیر کی قاتل دوست بہتر تھی۔ کترنوں میں کاشف عبید کی بس اور رکشا بہترین رہی۔ گزشتہ کچھ ماہ سے مقامی کہانیاں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا اتنے سارے مصنفین زیادہ ہی معروف ہو گئے ہیں یا آپ کے معیار میں کچھ تبدیلی آئی ہے؟“ (شمارے میں پہلے بھی مقامی کہانیاں کم ہی ہوا کرتی تھیں)

کراچی سے انعم ریاض کا اختصاری انداز ”اس بار جاسوسی بروقت مل گیا لیکن عید کی مصروفیت کی وجہ سے صرف تبصرے پڑھ کر رکھ دیا۔ خطوط میں سب سے پہلا خط سعید احمد کا پڑھ کر بس اتنا کہہ سکی کہ واہ کیا محبت ہے؟ سید شکیل صاحب! اب تو آپ بھی مظہر سلیم کی طرح ایسے خطوط لکھنے لگے ہیں کہ ہمیں بھی لغت دیکھنی پڑ جاتی ہے۔ تبصروں میں راحیل اعجاز، کبیر عباسی، شکیل حسین، تصویر العین اور قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ تو ضرور پڑھتی ہوں۔ اس بار خطوط میں کچھ نئے نام بھی شامل نظر آئے ان سب کو میری طرف سے خوش آمدید۔ اپنی بہن کے کہنے پر کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس کی مسافت گزیدہ پڑھی۔ بہت زبردست کہانی تھی۔ بہت اعلیٰ، بھرپور سسپنس تھا۔ اس کے بعد سرورق کی پہلی کہانی بھونرا پڑھی۔ اس کہانی کے آخر تک بہن سے یہی پوچھتی رہی کہ کیا حقیقت کا اس سے کوئی تعلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ہوگا۔ میرا آپ سے بھی یہی سوال ہے۔ روبینہ رشید کی معما بہت پسند آئی۔ نادر پر تو آخر تک شک نہ ہوا کہ وہ قاتل نکلے گا۔ منظر امام کی کہانیاں مختصر مگر جامع ہوتی ہیں۔ کاشف زبیر کی قاتل دوست بھی پسند آئی۔“

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کا استفسار ”جاسوسی کا ٹائٹل اس بار بدلے ہوئے رنگوں کے ساتھ منفرد سا تھا۔ تصاویر کے ہمراہ فہرست کا ڈیزائن اچھا جاذبِ نظر تھا۔ خطوط کی محفل حسبِ معمول خیالات کی سویٹ ڈش تھی۔ مسافت گزیدہ اچھا، سنسنی خیز اور پُرتجسس ناول ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ خلائی فرار، خواب زدہ، قاتل دوست، گمشدگی، بھونرا اور معما اچھی تحریریں تھیں۔ مختصر کہانیوں کے معیار پر توجہ کی ضرورت ہے۔ آوارہ گرد بھی زیرِ مطالعہ ہے اس کی تصویر اچھی نہیں لگ سکی۔“

ملک شاہد اقبال میلسی سے لکھتے ہیں کہ ”گزشتہ دس سال سے کراچی کے سائنسی جریدے ماہنامہ گلوبل سائنس سے منسلک ہوں اور اس وقت گلوبل سائنس میں اعزازی مدیر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اپنے سائنسی میلان کی وجہ سے اولاً کوشش کے تحت ایک نہایت مختصر کہانی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔“ (آپ کی کہانی موضوع کی مناسبت سے سسپنس میں دے دی گئی ہے)

اسلام آباد سے ماریہ خان کے خدشات ”اکتوبر کا شمارہ طویل انتظار کے بعد اپنی مخصوص چمک دمک کے ساتھ نظر نواز ہوا مگر یہ کیا؟ ہمارا

زندگی میں پہلی بار کسی ڈائجسٹ میں بھیجا گیا تبصرہ شامل ہی نہیں کیا گیا، دل میں ایک چھناکا سا ہوا اور پہلا خیال ہی یہ آیا کہ شاید ہم دھرنا زدہ شہر یعنی اسلام آباد سے متعلق ہیں اس لیے ہمیں نظرانداز کیا گیا لیکن ہم آپ کو بتا دیتے ہیں کہ سیاست سے ہمارا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے، چلیے خیر جانے دیتے ہیں کیونکہ ہم بڑا دل رکھتے ہیں اور ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ (گڈ) ٹائٹل خالصتاً جاسوسی اور ایکشن کی بھرپور عکاسی کرتا نظر آیا، کہانیوں میں ابتدائی کہانی جو ہمیشہ جاسوسی کا جھومر ہوتی ہے، مسافت گزیدہ بہت شاندار کہانی تھی، جواری نے بھی اس بار مزہ دیا، لگتا ہے جواری کا اینڈ قریب ہے، آوارہ گرد نے پہلی ہی قسط سے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ شہزی ایک بار پھر خود کو بے گناہ ثابت کرنے میں ناکام رہا، سرورق کا پہلا رنگ بھونڈا کسی ہارر ڈائجسٹ میں شائع ہونا چاہیے تھا، باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں، اس ماہ کے لیے اتنا ہی، حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھرپور تبصرہ ہوگا انشااللہ۔''

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کے جذبات ''ایک محتاط اندازے کے مطابق جاسوسی ڈائجسٹ کا حصول ہمیں چار تاریخ کو ہوا۔ سرورق اس دفعہ بھی اپنے معیار کا حامل نظر آیا۔ چائنی نکتہ چینی میں وارد ہوتے ہی حاجی سعید احمد سے ملاقات ہوئی۔ ابتدائی تبصرہ مختصر مگر اچھا تھا۔ صبیحہ بتول، روشنی زینب اور سید ذیشان حیدر کاظمی کو اس محفل میں خوش آمدید اماموں زاد بھائی کی موجودگی کافی تقویت کا باعث ثابت ہوئی۔ مظہر سلیم نے اپنی لفاظی سے طبیعت ہشاش بشاش کردی۔ زویا اعجاز اور ماہا ایمان آپ دونوں کے تبصروں کا منتظر ہوں۔ کبیر عباسی اور انکل سیانے کی جوڑی نے خوب لطف دیا۔ باقی تبصروں میں محمد وقاص خالد، تصویر الحسین، ادریس احمد، عرفان راجہ اور ہارون ہیرس کے تبصرے عمدہ انداز میں لکھے گئے تھے۔ کہانیوں کی طرف آتے ہی ہماری پہلی ترجیح آج کل آوارہ گرد ہی ہے۔ یہ قسط بھی ایکشن اور مار دھاڑ سے بھرپور رہی۔ شہزاد اور اول خیر کافی مشکل سے بچ پائے مگر اس قسط کے آخر میں شاید وہ اس سے بھی بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ جواری انتہائی کوشش کے باوجود پڑھنے کا دل نہیں کیا اس دفعہ بھی۔ اس لیے اولین صفحات پر امجد رئیس کی مترجم کہانی کا مطالعہ کیا۔ بہت عمدہ پلاٹ اور واقعات کی ترتیب تھی۔ مائیکل کا کردار بہت شاندار تھا اور ہر لمحہ تجسس اور ایکشن سے بھرپور کہانی پڑھ کے بے ساختہ ادارے کے لیے ستائش کے جذبات پیدا ہوئے۔ (ہماری طرف سے تشکر کے ٹوکرے) بارہ سال کے بچے سے اتنا ایکشن اور سمجھداری تھوڑی غیر حقیقی محسوس ہوئی مگر پھر بھی یہ ایک جاندار کہانی تھی۔ سرورق کا پہلا رنگ جاسوسی کے معیار سے ذرا مطابقت نہیں رکھتا تھا، نہ کوئی منطقی انجام اور نہ کہانی کا کوئی رخ۔۔۔ دوسرا رنگ بہت بہتر تھا۔ کہانی کے وسط میں ہی نادر مشکوک ٹھہرا اور حسبِ توقع وہی سارے معمے کے پس منظر میں تھا۔ خسرو اور سعدیہ سلمان دونوں جاندار کردار تھے کہانی میں۔ صوفیہ شکیل صاحب کی سائنس فکشن کہانی خلائی فرار اچھی کاوش تھی، انسان قدرت کے رازوں سے کبھی آشنا نہیں ہوسکتا کیونکہ خالق اور مخلوق کے درمیان جو فرق ہے وہ کائنات کی تمام وسعتیں طے کرنے سے بھی ختم نہیں ہوسکتا۔ کاشف زبیر کی قاتل دوست مغربی انداز میں لکھی گئی کہانی پسند آئی۔ جمال دستی کا مختصر سرپرائز بھی خوب رہا۔ موت کا انتظار زیادہ خوفناک ہوتا ہے بجائے سامنے آتی ہوئی موت کا مقابلہ کرنا۔ آزارِ عشق، سلیم انور صاحب کی مغربی تہذیب کی مکمل عکاسی تھی۔''

رحیم یار خان سے طاہر چوہدری کی چوہدراہٹ ''اس بار دیدارِ جاسوسی 5 تاریخ کو ہی نصیب ہوگیا۔ گویا عید سے قبل ہی عیدی مل گئی، سرورق پہ نظر دوڑائی تو وعدہ یاد آگیا، الحسین سے بچتے ذرا پیچھے دیکھا تو میر جی کا مصرع یاد آگیا ''پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے'' آگے تسی سمجھدار او۔ محفل میں پہنچے تو حاجی سعید صاحب کو ابتدائی تبصرے پر براجمان پایا، دوسرے نمبر پہ وڈے شاہ جی رہے، عمدہ اندازِ تحریر شاہ جی اگر آپ بجائے بھائی کے پڑوسن پہ توجہ دیں تو شاید آپ کی دال گل ہی جائے۔ انکل سیانے ساڈے حساب سے تو پہلے نمبر پہ رہے، باقی عبدالجبار رومی، ہارٹ کچر، مظہر سلیم بھائی کے تبصرے بہترین تھے، ایم عزیر اسد صاحب وعدہ نبھانا واقعی اچھی عادت ہے اور دیکھ لیں اس مرتبہ بھی ہم نے نبھایا ہے۔ ہارون لالہ اچھلنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی آپ بیٹھے بٹھائے بھی پڑھ سکتے تھے۔ مسفرہ حسین کچھ رنجیدہ نظر آئیں۔ ہمارا تو مشورہ ہے کہ کسی کی بات پہ کان دھرا نہیں کرتے بلکہ دونوں کانوں کا باہم استعمال کیا کرتے ہیں۔ ذیشان حیدر کاظمی، نوید احمد فراز کو خوش آمدید، جن لوگوں نے ہمیں خوش آمدید کہا ان کا نہایت ہی شکریہ۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف تو ابتدا تو جواری سے ہی ہوئی تھی جو کہ تیزی سے انجام کی طرف گامزن ہے، ملک سلیم کے پاس ضرور گیدڑ سنگھی ہے جو ہر کسی کو رام کرلیتا ہے۔ اس کے بعد مسافت گزیدہ پڑھی۔ جان گلسٹر یپ کے ناصر رن کا اردو ترجمہ امجد رئیس صاحب نے حقِ قلم ادا کردیا، بہت عمدہ، چند مہینوں سے مترجم کہانیوں کا معیار بلند ہوتا جارہا ہے۔ پھر جاسوسی کے ''سلطان راہی'' شہزی کی خبر لی تو وہ حسبِ سابق پاکستان کی آبادی کم کرنے میں ہی مصروف نظر آئے، ایک بات سمجھ نہیں آئی، منڈی میں پہنچتے ہی شہزی کو خانم شاہ کا ایڈریس کیسے سمجھ آگیا، شاید نقشہ گھول کے پی لیا ہو، خیر سانوں کی۔ کاشف زبیر کی قاتل دوست، کنفیوشس نے کہا تھا 'بدگمانی کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ ہوتی ہے' جلال نے صرف شک کی بنا پہ اپنے دیرینہ دوست کی جان لے لی، اور قاتل وہ دونوں لڑکے نکلے۔ پہلا رنگ بھونڈا پڑھ کے ایم اے راحت اور انوار صدیقی صاحب یاد آگئے۔ ماورائی طرز کے کارن بالکل متاثر نہیں کرپائی جبکہ دوسرا رنگ معمار و بینہ رشید خالص جاسوسی تحریر، خسرو کی ساری بھاگ دوڑ ضائع جاتی اگر جمشید کو وہ ڈائری نہ ملتی، کافی اچھی ہوئی تحریر تھی، اختتام تک جکڑے رکھا۔ مختصر تحریروں میں سے جمال دستی صاحب کی سرپرائز پڑھ کے حقیقتاً دل جکڑ سا گیا، سوچ کا مقام ہے ہمارے لیے کہ کیسے ہمارا ایک چھوٹا سا مذاق کسی کی جان بھی لے سکتا ہے۔ مجموعی طور پہ شمارہ بہترین رہا۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔
عرفان راجہ، راولپنڈی۔ معراج محبوب عباسی، ہری پور ہزارہ۔ صوبیہ مہاروپ، اقصیٰ رانی، کوثر ناز پائلٹ، انجی گل، ماریہ مانو، کراچی۔ ثنا خان، کراچی۔ ہارون ہیرس اینڈ آپا، مردان۔

جزوی گمشدگی

ایچ اقبال

انسانی زندگی کا ہر دور مختلف رویّوں کی نشاندہی کرتا ہے... بچپن میں معصومیت... جوانی میں الھڑپن اور بڑھاپا واعظ و نصیحت میں گزار کر انسان اپنے ہی اعمال اور رویّوں پر خود احتسابی کی نظر ڈالتا ہے... تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام عمر خفیہ ارادوں اور کارناموں میں گزر گئی... ایسے دور میں جہاں منافقت، مصلحت میں بدل جائے... رویوں میں انسانیت کم، حیوانیت کا عنصر غالب آجائے... وہاں انسان مٹی کے کھلونوں اور گاؤں کے کچے گھروندوں کی طرح توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتا ہے... سود و زیاں کی کشمکش اور زندگی کی حرارت سے بھرپور نوجوان کی داستانِ حیات... اس کے روز و شب سکون و سکوت اور عشق و محبت کی چاشنی میں گزر رہے تھے... کہ اچانک ہی اس کی شوخیاں... جوانی کی نوخیزیاں... خزاں رسیدہ پتوں کی طرح مرجھا کے بکھر گئیں... اس کی سہانی یادیں ذہن کے نہاں خانوں میں اس طرح پوشیدہ ہوگئیں کہ وہ اپنی شناخت... اپنا ماحول اور محبت کو بھی بھلا بیٹھا...

گمشدہ لمحوں کی کھوج و جستجو میں پل پل رنگ بدلتی کہانی کے

پیچیدہ معمے

صرف قمیص پتلون میں ملبوس وہ ساحل کی زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اسے ایک بارہ سالہ لڑکے نے دیکھا جو ساحل پر سیپیاں اور گھونگے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ وہ ساحل پر پڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر چونکا بھی اور کچھ گھبرا بھی گیا۔ اس نے گاؤں کی طرف رخ کر کے چیخنا شروع کر دیا۔

گاؤں کے لوگوں نے اس کی چیخ پکار سنی تو کئی افراد دوڑے چلے آئے۔ لڑکا ساحل پر پڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخے جا رہا تھا۔

گاؤں کے لوگ بھی اس بے حس و حرکت شخص کو دیکھ کر چونکے اور اس کی طرف لپکے۔ وہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے سے بہتے ہوئے خون نے اس کے قریب کی ریت بھی سرخ کر دی تھی۔

دو نوجوانوں نے اس شخص کو سیدھا کیا۔ اس کی عمر پچیس تیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ وہ اچھے نقش و نگار کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی جس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ اس کے سر سے خون زیادہ مقدار میں بہہ گیا ہوگا۔ اس کی سانس اکھڑی اکھڑی سی چل

رہی تھی۔ اس کا پھولا ہوا پیٹ ظاہر کر رہا تھا کہ اس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

"اس کے پیٹ سے پانی نکالنا ہوگا۔" ایک نوجوان نے دوسرے سے کہا۔

ایک ادھیڑ عمر شخص بولا۔ "نہیں! پہلے اسے اٹھا کر حکیم سائیں کے پاس لے چلو۔ اس کی سانس ٹھیک نہیں ہے۔"

دوسروں نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ وہ لوگ اجنبی کو اٹھا کر تیزی سے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

اندرونِ سندھ کے اس چھوٹے سے گاؤں میں مقامی آبادی کے علاوہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے وہ لوگ بھی تھے جن کی مادری زبان اردو تھی لیکن ساٹھ سال سے وہاں آباد رہنے کے باعث وہ سندھ کی روایتی ثقافت و معاشرے میں رچ بس چکے تھے۔ بڑے پائنچوں کی شلواریں، کڑھا ہوا کرتہ اور اجرک ہی اب ان کا لباس تھا۔ سندھی زبان وہ کسی اہلِ زبان کی طرح بولتے تھے۔ ان کی وہ پہلی نسل جو یہاں آ کر آباد ہوئی تھی، ان میں سے اب شاید ہی کوئی زندہ ہو لیکن دوسری اور تیسری نسل موجود تھی۔

حکیم رجب علی کا تعلق دوسری نسل سے تھا۔ ان کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کے مرحوم باپ بھی حکیم تھے۔ اس گاؤں کے وہ واحد شخص تھے جنہوں نے اپنی وضع قطع میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ اب بھی چوڑی دار پاجامہ، کرتہ اور انگرکھا پہنتے تھے۔ پیروں میں سلیم شاہی ہوتی تھی۔ سر پر کبھی کبھی دوپلی ٹوپی بھی نظر آ جاتی تھی۔ گاؤں کے سبھی لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب وہ صرف اپنی جوان بیٹی ماروی کے ساتھ رہتے تھے۔ اسی گھر کے ایک کمرے میں ان کا "کارخانہ حکمت" بھی تھا۔

اجنبی کو اسی کمرے میں پہنچا کر لٹا دیا گیا۔ حکیم رجب علی نے بڑے دردمند انداز میں اپنی ساری توجہ اجنبی پر مرکوز کر دی۔ دو نوجوانوں کو روک کر انہوں نے باقی لوگوں کو رخصت کر دیا تھا۔ ان نوجوانوں کی مدد سے انہوں نے اجنبی کے پیٹ سے سمندری پانی نکالا۔ اس کے زخمی سر کی مرہم پٹی خود کی۔ اس کے منہ میں کئی قسم کے عرق بمشکل ٹپکائے جا سکے کیونکہ اس کے دانت ایک دوسرے پر سختی سے جمے ہوئے تھے۔

جوان اور شوخ و شنگ ماروی اندرونی دروازے میں کھڑی نہایت دلچسپی سے وہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ اسے زیادہ دلچسپی اس اجنبی کی شخصیت سے تھی۔ اس نے پہلے بھی کوئی "شہری" نہیں دیکھا تھا۔

اجنبی کے جسم پر کیونکہ قمیص پتلون تھی اس لیے گاؤں کے سبھی لوگوں نے اسے شہری ہی سمجھا تھا۔

گاؤں کے سبھی لوگ شہر جاتے آتے رہتے تھے۔ خود حکیم رجب علی کو بھی دواؤں کی خریداری کے سلسلے میں قریبی شہر تو کیا، کبھی کبھی کراچی بھی جانا پڑتا تھا لیکن ماروی کو وہ اپنے ساتھ کبھی نہیں لے گئے تھے۔ نہ جانے کیوں وہ چاہتے تھے کہ ماروی کو کسی شہر کی ہوا بھی نہ لگے۔

جب وہ کراچی جاتے تھے تو صبح کے گئے شام ہی کو لوٹتے تھے لیکن اتنی دیر تک ماروی کو تنہا نہیں رہنا پڑتا تھا۔ قریب ہی کے ایک گھر میں رہنے والی "لاچی موُ" سارا دن ماروی ہی کے ساتھ گزارتی تھی۔ اسے ماروی کی مرحوم ماں نے اپنی بہن بنا لیا تھا اور اس بہناپے کو وہ اب بھی نباہ رہی تھی۔

اس دن لاچی موُ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی ورنہ اس وقت وہ بھی وہاں ہوتی۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں اجنبی کی خبر پھیلنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد حکیم رجب علی کے گھر کے سامنے جمع ہو گئی تھی۔ اجنبی کو ساحل سے وہاں لانے والوں پر سوالات برسنے لگے تھے لیکن وہ بے چارے بھی کسی کو کیا بتاتے۔ وہ بس اتنا ہی قیاس کر سکتے تھے کہ اجنبی نوجوان سمندر کی لہروں پر بہتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا اور لہریں اسے ساحل پر پٹخ کر واپس ہو گئی تھیں۔ وہ لوگ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ وہ اجنبی نوجوان سمندر میں کیسے گرا ہوگا اور اس کے سر پر وہ چھوٹ کیسے لگی ہوگی جس نے اس کا بہت سا خون ضائع کیا تھا۔

اجنبی نوجوان کو اسی کمرے میں ایک چارپائی بچھا کر آرام دہ بستر پر لٹا دیا گیا تھا۔ اس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی کے پچھلے حصے پر خون کا ایک بڑا دھبا تھا لیکن خون کا بہاؤ رک چکا تھا۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں بھی اعتدال پر آ گئی تھیں لیکن اس نے ابھی تک اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

"اسے اب تک تو ہوش آ جانا چاہیے تھا۔" حکیم صاحب بڑبڑائے، پھر ان کی نظر اندرونی دروازے میں کھڑی ماروی پر پڑی۔ وہ نرمی سے بولے۔ "تم جا کر باورچی خانہ دیکھو نا بیٹیا!"

"سب کام ختم ہو گیا ابا سائیں!" ماروی نے جواب دیا۔

گاؤں میں جن لوگوں کی مادری زبان اردو تھی، وہ بھی گھروں کے باہر سندھی ہی بولا کرتے تھے۔ کوئی بھی ''ابا'' نہیں کہتا تھا۔ سبھی ''ب'' پر تشدید لگائے بغیر ''ابا'' یا ''ابو'' بولا کرتے تھے۔ وہی عادت ماروی کو بھی پڑ گئی تھی حالانکہ اردو وہ گاؤں کے دوسرے اردو بولنے والوں سے زیادہ اچھی جانتی تھی۔ اس نے گاؤں کے پرائمری اسکول میں پانچویں تک پڑھا تھا لیکن گھر میں حکیم رجب علی نے اسے اردو بہت اچھی طرح پڑھائی تھی۔

''تو یہاں آ کر بیٹھ جا۔'' حکیم رجب علی نے اس سے کہا۔

ماروی دوپٹا اپنے سینے پر ٹھیک کرتی ہوئی آگے آئی اور بان کی ایک چوکی پر بیٹھ گئی۔

جن دو نوجوان کو حکیم رجب علی نے روکا تھا، وہ بھی بان کی چوکیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ماروی بچپن میں گاؤں کی لڑکیوں کے علاوہ ان دونوں نوجوانوں کے ساتھ بھی بہت کھیلی کودی تھی۔ جب وہ بڑی ہو گئی تھی تو حکیم صاحب نے اسے سمجھایا کہ اب اسے لڑکوں کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں بات بھی نہیں کرنا چاہیے۔

ماروی نے کان دبا کر حکیم صاحب کی نصیحت سن لی تھی مگر عملاً اس نصیحت کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔ وہ گاؤں کی سب سے شوخ و چنچل لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ نوجوانوں کو چٹکیوں میں اڑانے کا فن اسے خوب آتا تھا۔

حکیم صاحب بہرحال باپ تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی کسی حرکت سے بے خبر نہیں رہتے تھے۔ انہوں نے بس چشم پوشی سے کام لینا اس لیے بھی مناسب سمجھا کہ ماروی گاؤں کے جن نوجوانوں سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتی تھی، ان نوجوانوں کے کردار پر انہیں مطلق شبہ نہیں تھا۔

جن دو نوجوانوں کو انہوں نے روکا تھا، ان میں سے ایک کا نام تو نذیر تھا لیکن سب اسے نذیرو کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ اس وقت بھی ماروی کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہا تھا جب وہ دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔

نذیرو کا ''شرمیلا پن'' گاؤں بھر میں مشہور تھا لیکن وہ شرمیلا، ماروی کو کن انکھیوں سے ضرور دیکھا کرتا تھا۔ نظر بھر دیکھنے کی ہمت اسے نہیں ہوتی تھی۔ وہ بس اس وقت کھل جاتا تھا جب بھی ماروی خود ہی اسے مخاطب کر کے اس سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ اس وقت نذیرو کو موقع ملتا تھا کہ وہ ماروی کو اچھی طرح دیکھ سکے۔

ماروی کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ نذیرو کو اچھی لگتی تھی لیکن اس نے نذیرو کے ان جذبات کو سنجیدہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ خود بھی نذیرو کو پسند کرتی تھی لیکن اس کی وہ پسندیدگی ایسی ہی تھی جیسے وہ اپنی دو ایک اور دوست لڑکیوں کو پسند کرتی تھی۔

ایک قدیم طرز کی کرسی ماروی اپنے بچپن سے اس گھر میں دیکھتی چلی آئی تھی۔ حکیم صاحب اس وقت اسی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب کی نظریں اجنبی نوجوان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ خود ان کے چہرے پر تشویش کے تاثرات تھے۔

''کیا بات ہے ابا سائیں؟'' ماروی نے پوچھا۔ ''آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں؟''

''ہاں بٹیا!'' حکیم صاحب نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''پریشانی کی بات تو ہے۔ اتنی دیر کی بے ہوشی کا سبب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ حکیم صاحب خاصے چونک گئے۔ ان کا اس حد تک چونکنا بے جواز نہیں تھا۔ انہوں نے جن لوگوں کو اپنے گھر سے باہر بھیجا تھا، ان سے کہہ بھی دیا تھا کہ اس وقت کوئی بھی ان کی یکسوئی میں رخنہ انداز نہ ہو۔

گاؤں کے لوگ حکیم صاحب کی اتنی ہی عزت کرتے تھے کہ ان کی کہی ہوئی کسی بات کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتے تھے۔

''نذیرو! دیکھو تو، کون ہے؟''

نذیرو اٹھ کر جلدی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ گاؤں کے لوگ اب بھی باہر جمع تھے لیکن دستک دینے والا ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ یہ حرکت جیرا نے کی تھی جو گاؤں کے وڈیرے حشمت ابڑو کے کمداروں میں سے ایک تھا۔

وڈیرے کے خاص ملازمین جو زمینوں پر بھی کام کرتے ہیں، انہیں اندرونِ سندھ میں ''کمدار'' کہا جاتا ہے۔

''کیا بات ہے جیرا؟'' حکیم صاحب جلدی سے کھڑے ہوئے۔ ''دھاڑو سائیں کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟'' حکیم صاحب نے یہ سوال سندھی زبان میں کیا تھا۔ ''دھاڑو سائیں'' کے الفاظ انہوں نے وڈیرے حشمت ابڑو کے لیے استعمال کیے تھے۔

حشمت ابڑو کا مزاج وڈیروں ہی کی طرح بڑا اکھڑ تھا لیکن حکیم صاحب کی عزت وہ بھی کیا کرتا تھا جس کی ا

خاص وجہ بھی تھی۔

ماروی نے جیرا کا جواب نہیں سنا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر تیر کی طرح اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اسے جیرا سے شدید نفرت تھی اور اس نفرت کا جواز بھی تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ جیرا جب بھی اس کی طرف دیکھتا تھا، اس کی آنکھوں میں ہوس کی چنگاریاں چمکتی رہتی تھیں۔

دروازے سے دوسری طرف نکل کر وہ وہیں دیوار سے چپک کر کھڑی ہوگئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ جیرا اس وقت کیوں آیا تھا۔ اس نے حکیم صاحب اور جیرا کی باتیں سنیں۔

اجنبی نوجوان کی خبر وڈیرے حشمت ابڑو کی حویلی تک بھی پہنچ گئی تھی۔ اس خبر کے حوالے سے حشمت ابڑو بھی متجسس ہو گیا تھا۔ اسی نے جیر... کو اس خبر کی تفصیلات جاننے کے لیے بھیجا تھا۔

جو "تفصیلات" حشمت ابڑو تک پہنچ گئی تھیں، ان میں حکیم صاحب اتنا ہی اضافہ کر سکے کہ ابھی اس اجنبی نوجوان کو ہوش نہیں آیا ہے جو ایک تشویش ناک بات ہے۔ اگر اسے مزید آدھے گھنٹے تک ہوش نہ آیا تو انہیں کسی کو شہر بھیج کر ایک دوا منگوانا پڑے گی جو ان کے پاس ختم ہو چکی تھی۔

جیرا واپس چلا گیا تو ماروی پھر اس کمرے میں داخل ہوئی۔ حکیم صاحب نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ اس طرح اچانک کیوں چلی گئی تھی۔ وہ ایک سرد گرم چشیدہ شخص تھے۔ انہیں خوب اندازہ ہوگا کہ ماروی اس طرح کیوں چلی گئی تھی۔

جیرا کو رخصت کرنے کے بعد نذیرو دروازہ بند کر کے واپس اپنی بان کی چوکی پر آ بیٹھا تھا۔

"اوہ!" دفعتاً حکیم صاحب اجنبی نوجوان کی طرف لپکے۔ "اسے ہوش آرہا ہے۔"

نورا، نذیرو اور ماروی کی نظریں بھی اجنبی نوجوان کی طرف گئیں جس نے ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ کروٹ لینے کی کوشش کی تھی لیکن شاید کمزوری کی وجہ سے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

حکیم صاحب اجنبی نوجوان کی نبض دیکھنے لگے۔ ماروی نے ان کے چہرے پر اطمینان کا تاثر ابھرتے دیکھا۔

"ہوش آگیا ہے اسے۔" حکیم صاحب کسی کی طرف دیکھے بغیر بولے۔ "اب بس یہ سو رہا ہے۔ دراصل نقاہت بہت زیادہ ہوگی۔ خیر، اس کی نقاہت تو دور کر دی جائے گی۔ فی الحال اسے سونے دیا جائے تو بہتر ہے۔" پھر وہ نذیرو اور نورا کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "اب تم دونوں بھی جاؤ۔ ابھی تک تمہیں اس لیے روکے ہوئے تھا کہ شاید تمہیں ایک دوا لانے کے لیے شہر بھیجنا پڑے۔ اب اس دوا کی ضرورت نہیں رہی۔ اب میں خود جس دن جاؤں گا، اسی دن لے آؤں گا۔"

نورا اور نذیرو جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔

"ابا سائیں!" ماروی بولی۔ "گاؤں والے اس شہری کی حالت جاننے کے لیے ابھی تک باہر کھڑے ہیں۔"

جب جیرا آیا تھا تو ماروی نے کھلے دروازے سے ان لوگوں کو دیکھا تھا۔

"اچھا، ہاں۔" حکیم صاحب ان لوگوں کو بھول ہی گئے تھے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے نورا اور نذیرو نے بھی قدم بڑھا دیے۔

ماروی پلنگ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اس کی نظریں اجنبی نوجوان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ یکایک وہ خفیف سا مسکرائی اور اس کے منہ سے نکلا۔ "سٹھو شہری۔"

وہ نوجوان اسے اچھا لگا تھا۔

حکیم صاحب واپس آگئے۔ انہوں نے خود ہی دروازہ بند کیا اور دوبارہ اپنی کرسی پر جم گئے۔ ان کی توجہ نوجوان کی طرف تھی۔

ماروی بولی۔ "ابا سائیں! یہ سمندر میں بہتا ہوا جانے کہاں سے یہاں پہنچا ہوگا اور اس کے سر پر چوٹ بھی لگی ہوئی تھی۔"

"چوٹ بھی وہ معمولی نہیں تھی۔" حکیم رجب نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ان کے چہرے پر تشویش کا تاثر بھی گہرا ہو گیا۔

"کیا بات ہے ابا سائیں؟" ماروی نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جب گاؤں والے اسے یہاں لائے تھے تو میں نے یہی سمجھا تھا کہ آپ اس کی حالت کی وجہ سے پریشان ہیں لیکن اب تو اسے ہوش آگیا ہے۔ آپ بتا رہے تھے کہ اب یہ سو رہا ہے۔ تو اب آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟"

"اس کے سر کی چوٹ کی وجہ سے۔"

"آپ نے مرہم پٹی تو کر دی ہے۔ چوٹ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ہاں، ٹھیک تو ہو جائے گی... لیکن..." وہ کچھ سوچتے ہوئے خاموش ہو گئے اور گم صم سے انداز میں بیٹی کا چہرہ تکنے لگے۔

باپ کی پریشانی دیکھ کر ماروی کا ذہن الجھا۔ ”لیکن کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھو!“ حکیم صاحب نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تاکید کی۔ ”یہ بات گاؤں کے کسی فرد کے سامنے بھی تمہاری زبان پر نہ آئے۔“

ماروی کا ذہن اور زیادہ الجھ گیا۔ وہ باپ کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔

حکیم صاحب دھیمے لہجے میں بولے۔ ”نہ جانے کیوں میرے دماغ میں خیال آیا ہے کہ تم سے یہ بات نہ چھپاؤں۔“

ان تمہیدی جملوں سے ماروی کے تجسس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر یکایک اسے یوں لگا جیسے اس کے قریب ہی کہیں کوئی دھماکا ہو گیا ہو۔

”اس نوجوان کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔“ حکیم صاحب نے کہا تھا۔

ماروی کا سارا جسم سنسنانے لگا اور اسے ابن صفی کے کئی ناول یاد آ گئے۔

”ہاں بٹیا!“ حکیم صاحب کچھ توقف سے بولے۔ ”زخم کی نوعیت ایسی نہیں تھی کہ میں اسے اتفاقی چوٹ سمجھ لوں۔ اس کے سر پر بہت گہرا زخم لگایا گیا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ زندہ کیسے بچ گیا۔ بس وہی بات دماغ میں آتی ہے کہ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے!“

”پھر تو اس کی اطلاع پولیس کو دینی چاہیے نا۔“ ماروی کا جسم اب بھی سنسنا رہا تھا۔

حکیم صاحب نے ایک طویل سانس لی اور ایک عجیب فقرہ کہا۔ ”میری خوش قسمتی ہے کہ دو دن سے یہاں پولیس چوکی نہیں ورنہ گاؤں کا کوئی بھی شخص اطلاع پہنچا چکا ہوتا۔“

دو دن قبل دہشت گردی کی ایک واردات میں پولیس چوکی تباہ ہو گئی تھی۔ دو کانسٹیبل زخمی اور باقی ہلاک ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں ان کا انچارج اے ایس آئی بھی تھا۔ یہ ضلعی انتظامیہ کی غفلت، یا بے پروائی تھی یا شاید کوئی اور وجہ ہو کہ نئی پولیس چوکی ابھی تک قائم نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں دو دن تو گزر گئے۔“ ماروی بولی۔ ”لیکن... دو ایک دن میں نئی چوکی قائم ہو جائے گی۔“

”اس سے پہلے میں وہ کر لوں گا جو چاہتا ہوں۔ میں حویلی جاؤں گا۔ دھارو سائیں سے ملوں گا۔ اسے اس پر آمادہ کر لوں گا کہ پولیس کو اگر کچھ معلوم بھی ہو تو وہ لوگ اس میں رخنہ نہ ڈالیں کیونکہ میں اس نوجوان کو کم از کم اس وقت تک اپنے گھر میں رکھنا چاہتا ہوں جب تک یہ پوری طرح تندرست نہ ہو جائے۔ میں دھارو سائیں کو منا لوں گا تو پولیس کی مجال نہیں کہ ہمارے گھر میں قدم بھی رکھ سکے۔“

یہ ماروی بھی جانتی تھی کہ وڈیرا حشمت ابڑو ہی نہیں بلکہ سبھی دیہات کے وڈیروں کی اتنی دھاک تھی کہ پولیس چوکیوں کے افسروں کو بھی سب سے پہلے انہی کو سلام کرنے کے لیے ان کی اوطاق میں جانا پڑتا تھا۔

”مگر آپ اسے اپنے گھر میں کیوں رکھنا چاہتے ہیں ابا سائیں؟“ ماروی باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بان کی چوکی پر بیٹھ گئی پھر دفعتاً چونکی۔ اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”ابھی آپ نے کہا تھا، یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ دو دن سے پولیس چوکی یہاں نہیں۔ اس میں خوش قسمتی کیوں؟“

”خوش قسمتی اس لیے کہ پھر یہ نوجوان پولیس کے قبضے میں چلا جاتا۔“

ماروی نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں۔ ”اور آپ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں۔“

”مگر کیوں ابا سائیں؟“

”اس سے مجھے انسیت ہو گئی ہے۔“ حکیم صاحب نے ٹھنڈی سانس لی۔

ماروی نے حیرت سے کہا۔ ”اتنی جلدی انسیت ہو گئی آپ کو اس سے؟“

حکیم صاحب نے محبت آمیز نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس نے مجھے جمیل کی یاد دلا دی ہے۔ یہ بالکل جمیل جیسا ہے۔“

”جمیل کون؟“

حکیم صاحب نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”جب ہم لوگ یہاں آئے تھے تو میرے ایک چچا دہلی ہی میں رہ گئے تھے۔ جمیل ان کا پوتا تھا۔ گویا میرا بھتیجا! انیس سال پہلے وہ تن تنہا کسی طرح پاکستان آ گیا تھا۔ تم اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اس نے کراچی میں سکونت اختیار کی تھی۔ مجھ سے ملنے کبھی کبھی یہاں آیا کرتا تھا۔ شاید اس کی موت ہی نے اسے دہلی سے کراچی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ یہ مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ اسے پاکستان کے شہری حقوق کیسے مل گئے تھے۔ کراچی میں اس کا ایک سال ہی

گزرا تھا کہ وہاں بہت زبردست ہنگامے ہوئے، بہت خوں ریزی ہوئی۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور بہتوں کا پتا ہی نہیں چلا کہ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان! انہی غائب ہو جانے والوں میں جمیل بھی تھا۔"

ماروی کھوئے کھوئے سے انداز میں باپ کی طرف دیکھتی رہی۔

حکیم صاحب نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے نقش و نگار بالکل جمیل جیسے ہیں۔"

"جمیل!" ماروی سوچتے ہوئے بولی۔ "وہ آپ کے بھتیجے تھے۔ تو وہ ذرا دور کے رشتے سے میرے چچازاد بھائی ہوئے۔"

"ہاں۔"

ماروی نے اس طرح سر ہلایا جیسے اب حکیم صاحب کے جذبات اس کی سمجھ میں آ گئے ہوں۔

حکیم صاحب نے اس سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔

ماروی نے جواب دیا۔ "میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔ سب تیار ہے۔ کیا نکالوں؟"

"میں تو ابھی اس کے جاگنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تمہیں اگر بھوک لگ رہی ہو تو کھا لو۔"

"بھوک تو ابھی کچھ زیادہ نہیں ہے ابا سائیں، لیکن ایک تو بج گیا ہے۔ آپ اس وقت کھانا کھا لیتے ہیں۔"

"آج ذرا دیر سے کھا لوں گا۔ شاید یہ ایک آدھ گھنٹے میں جاگ جائے۔ ارے ہاں، اچھا یاد آیا۔ تم اس کے لیے ایک مرغی کی یخنی بنا لو۔"

"اچھا ابا سائیں!" ماروی سعادت مند بیٹی کی طرح کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "مرغی حلال کرنے کے لیے نورا کو بلوا لوں۔ باہر بچے کھیل رہے ہوں گے۔ کسی سے کہلوا دوں گی۔"

"ہاں، اسی کو بلوا لو۔ میں حلال کر دیتا لیکن میں اس کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتا۔" حکیم صاحب نے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

ماروی کو موقع مل گیا تھا کہ نورا پر اپنا غصہ اور اتارے۔ اس نے شہر سے نورا سے ناول منگوائے تھے، جو وہ اب تک لایا نہیں۔ اس نے نورا کو بلوا کر اس سے مرغی حلال کروائی اور پھر اسے اس وقت بھی روکے رکھا جب مرغی کا گوشت دھو رہی تھی۔ گوشت دھوتے ہوئے وہ سندھی زبان میں نورا پر بگڑتی رہی۔

نورا گاؤں کا واحد لڑکا تھا جسے اردو بولنا نہیں آتی تھی۔

وہ شاید اندرونِ سندھ کا واحد گاؤں تھا جہاں مقامی اور ہندوستان سے آ کر بسنے والوں کی تعداد میں انیس بیس کا فرق تھا۔ اسی لیے جن کی مادری زبان اردو تھی، وہ اچھی خاصی سندھی بول لیتے تھے جو معمولی حد تک اردو آمیز ہوتی تھی اور جن کی مادری زبان سندھی تھی، وہ سندھی آمیز اردو بول لیتے تھے لیکن نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں، سبھی دونوں زبانیں بہت اچھی طرح بول اور سمجھ لیتے تھے۔ ماروی کی سمجھ میں کبھی نہیں آ سکا تھا کہ نورا کو اردو زبان کیوں نہیں آ سکی تھی۔

ماروی نے اپنے دل کی بھڑاس خوب نکالی۔

حکیم صاحب کے معاشی حالات اس گاؤں میں سب سے اچھے بلکہ بہت اچھے تھے۔ ان کی حکمت کی کامیابی کا یہ عالم تھا کہ آس پاس کے دیہات سے بھی لوگ انہی سے علاج کروانے آیا کرتے تھے۔ علاج معالجے کے علاوہ حکیم صاحب کو اپنے مرحوم والد سے ایک خاص قسم کے معجون اور خمیرے کے ایسے نسخے ملے تھے کہ اس معجون اور خمیرے کی مانگ ان کے والد کے زمانے میں بھی بہت تھی جو پوری نہیں ہو پاتی تھی۔

خمیرے اور معجون کی تیاری جس کمرے میں ہوتی تھی، اسی کا نام حکیم صاحب کے باپ نے "کارخانۂ حکمت" رکھا تھا اور وہی نام اب تک چلا آ رہا تھا۔ خمیرے اور معجون کی پیکنگ کے علاوہ اپنی معاونت کے لیے بھی انہوں نے نذیر کو ملازم رکھ لیا تھا جو اس وقت تک اچھا خاصا عطار بن چکا تھا۔

اتوار کو حکیم صاحب کارخانۂ حکمت بند رکھتے تھے اور اس دن اتوار ہی تھا۔ چھٹی کا وہ دن ایسا تھا جب حکیم صاحب صرف اسی مریض کو دیکھتے تھے جس کی حالت زیادہ خراب ہو۔

یہ اتفاق تھا کہ چھٹی کے اس دن ان کے پاس ایک ایسا مریض آیا جس کی حالت سنگین حد تک خراب تھی۔

"سٹھو شہری۔" ماروی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑاتی، کارخانۂ حکمت کی طرف بڑھی۔ اس نے نورا کو رخصت کر کے یخنی چولھے پر چڑھا دی تھی۔

حکیم صاحب اس وقت بھی خیالات میں ڈوبے، اجنبی نوجوان کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''بتی چڑھادی ہے ابا سائیں!'' ماروی کہتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''اچھا بٹیا!'' حکیم صاحب نے کہا اور دفعتاً چونکے۔

ان کے چونکنے کا سبب ماروی سے پوشیدہ نہیں رہا۔ اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ اجنبی نوجوان نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکاتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر حکیم صاحب کے علاوہ ماروی پر بھی پڑی تھی۔

''تم جاگ گئے بیٹا!'' حکیم صاحب نے بڑی شفقت سے کہا۔

ماروی پلنگ کے قریب پہنچ کر کھڑی ہوگئی اور اس کی نظریں اجنبی نوجوان کے چہرے پر جم گئیں۔ نوجوان نے حکیم صاحب کی بات کے جواب میں شاید کچھ کہنا چاہا تھا مگر کہہ نہیں سکا۔ اس کے ہونٹ کھلے ضرور تھے لیکن پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر ابھر آیا تھا جیسے وہ کسی شدید الجھن کا شکار ہو۔ یکایک وہ تیزی سے اٹھا تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس کا ایک ہاتھ سر کے اس حصے پر پہنچ گیا جہاں زخم تھا۔

حکیم صاحب نے جلدی سے اٹھ کر نوجوان کو سہارا دیا اور اسے پھر آہستگی سے لٹاتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں اتنے جھٹکے سے نہیں اٹھنا چاہیے تھا۔ اس طرح سر میں تکلیف وہ دھمک تو ہوگی۔ تمہارے سر کا زخم خاصا گہرا ہے۔''

نوجوان نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ اتنی لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا جیسے تھک گیا ہو۔

''لیٹے رہنا۔'' حکیم صاحب نے اس کا شانہ تھپک کر کہا اور الماری سے ایک بوتل نکال کر اس میں بھرا ہوا عرق ایک پیالی میں انڈیلتے ہوئے ماروی سے بولے۔ ''جلدی سے ایک چمچہ لے آؤ۔''

ماروی دوڑ کر چمچہ لے آئی۔

حکیم صاحب نے آنکھیں بند کیے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ تم بہت بھوک محسوس کر رہے ہوگے لیکن ابھی یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تمہیں کھانے کے لیے کچھ دیا جائے۔ میں حکیم ہوں اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ میں تمہیں یہ عرق پلا رہا ہوں جس سے تم کچھ توانائی پاؤ گے۔''

حکیم صاحب اسے چمچے سے عرق پلانے لگے۔ وہ آنکھیں بند کیے پیتا رہا۔

''یہ عرق مزے دار بھی ہے۔'' حکیم صاحب بولے۔

اس وقت نوجوان نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ ان آنکھوں میں جو تاثر تھا، وہ ماروی نہیں سمجھ سکی لیکن تجربہ کار حکیم صاحب نے محسوس کرلیا کہ نوجوان کی آنکھوں سے اچانک وحشت جھانکنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے، انہیں بھی ماروی کوئی معنی نہیں پہنا سکی۔

عرق پلانے کے بعد حکیم صاحب نے پیالی ایک طرف رکھ دی۔ پھر انہوں نے نوجوان سے پوچھا۔ ''تم سمندر میں کیسے گر گئے تھے؟''

نوجوان کے ہونٹ پھر پھڑپھڑائے۔ ماروی کے اعصاب اس وقت تناؤ کا شکار ہوگئے تھے۔ وہ خود کو کسی جاسوسی ناول کی فضا میں محسوس کرنے لگی تھی اور اس کے دماغ میں یہ خیال گردش کرنے لگا تھا کہ نوجوان اب جو کچھ بھی بتائے گا، وہ بڑے سنسنی خیز انکشافات ہوں گے۔

''تم نے بتایا نہیں بیٹے!'' حکیم صاحب پھر بولے۔ ''کیا کسی نے دھکا دے کر تمہیں سمندر میں گرایا تھا؟''

''دھکا...!'' نوجوان کا انداز بڑبڑانے جیسا تھا۔ ''سمندر...''

ماروی نے ایک طویل سانس لی۔ ایک لمحہ پہلے اسے خیال آیا تھا کہ یہ نوجوان کہیں گونگا نہ ہو۔

''ہاں۔'' حکیم صاحب نے اس سے کہا۔ ''موجوں نے تمہیں ساحل پر لا پھینکا تھا۔''

''میں کہاں ہوں؟'' نوجوان کی نظریں حکیم صاحب کے چہرے پر تھیں۔

''تم ساحل کے قریب ایک گاؤں میں ہو۔ یہ میرا گھر ہے۔ میں حکیم ہوں۔ میں نے ہی تمہاری دیکھ بھال کی ہے۔''

نوجوان کچھ سوچنے لگا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''میں یہاں کیسے آیا؟''

''تمہیں گاؤں کے لوگ ساحل سے اٹھا کر لائے تھے۔''

''ساحل سے؟'' نوجوان نے دہرایا اور پھر ماروی کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ میری بیٹی ماروی ہے۔'' حکیم صاحب نے اسے بتایا۔

''بیٹی ہے۔'' نوجوان نے پاگلوں کی طرح دہرایا۔ ''یہ بیٹی ہے... اور میں؟... میں کون ہوں؟''

اس سوال نے ماروی اور حکیم صاحب، دونوں ہی کو

چونکا دیا۔

"یہ تم نے کیسا سوال کیا ہے بیٹے؟" حکیم صاحب حیرت سے بولے۔ "یہ تو تم ہی بتاؤ گے کہ تم کون ہو؟"

"میں... " نوجوان کا انداز ہیجانی ہو گیا۔ "میں کون ہوں... مجھے نہیں معلوم! مجھے نہیں معلوم، میں کون ہوں؟"

ماروی نے اپنے اعصاب پر زناٹا سا محسوس کیا۔ ناولوں میں اس نے ایسے کردار پڑھے تھے جن کی یادداشت ختم ہو گئی تھی۔

حکیم صاحب سکتے کی سی حالت میں بیٹھے نوجوان کا منہ تکنے لگے۔

"میں کون ہوں؟" نوجوان چیخ سا پڑا۔ اس نے وحشت میں اٹھنے کی... کوشش کی۔ حکیم صاحب نے اس کے سینے پر ایک ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔

"لیٹے رہو۔" وہ نرمی سے بولے تھے۔

نوجوان کا ہاتھ اپنے سر پر چلا گیا۔

"دبانا مت۔" حکیم صاحب جلدی سے بولے۔ "اس سے تکلیف ہوگی تمہیں... سر پر گہرا زخم لگا ہے۔"

"زخم؟... کیوں؟" اگرچہ سوال نامکمل نہیں تھا لیکن ماروی کو یوں محسوس ہوا جیسے نوجوان نے ٹوٹے پھوٹے لفظ بولے ہوں۔

"تم سو جاؤ تو اچھا ہے۔" حکیم صاحب نے نرمی سے کہا۔ "چوٹ لگنے کی وجہ سے تم بہت کچھ بھول گئے ہو۔ ایک گہری نیند لے لو گے تو حالت سنبھل سکتی ہے۔"

نوجوان اس طرح حکیم صاحب کی طرف دیکھنے لگا جیسے ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم نقاہت بھی محسوس کر رہے ہو گے؟" حکیم صاحب نے کہا۔

نوجوان نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

حکیم صاحب نے ماروی سے یخنی کے بارے میں پوچھا۔

"دیکھتی ہوں۔" وہ جواب دے کر وہاں سے دوڑ گئی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اتنی دیر میں یخنی کا سارا پانی خشک ہو گیا ہو۔ وہ اس وقت نوجوان کے پاس سے ہٹنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ نوجوان کی گمشدہ یادداشت نے اس کے وجود میں بھی ہیجان برپا کر دیا تھا۔

یخنی کا پانی کچھ کم تو ہو گیا تھا لیکن خشک نہیں ہوا تھا۔ اس نے وہ ایک پیالے میں انڈیلی۔ اس میں تھوڑا سا نمک اور پسی ہوئی کالی مرچ ڈالی اور پیالے کی یخنی چمچے سے گھولتی ہوئی کارخانہ حکمت کی طرف بڑھی۔

نوجوان اس وقت آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ نیند سے کوسوں دور ہو۔ اس نے ماروی کی آہٹ سن کر آنکھیں کھولیں۔

ماروی متجسس تھی، جاننا چاہتی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں نوجوان نے اور کیا کہا تھا، لیکن وہ اس بارے میں فوری طور پر اپنے باپ سے کوئی سوال نہیں کر سکتی تھی۔

حکیم صاحب نے چمچے سے نوجوان کو یخنی پلائی۔

چمچہ بھر یخنی حلق سے اتارنے میں نوجوان کو اتنا وقت لگتا رہا جیسے تفکرات اس کے حلق میں بھی رکاوٹ ڈال رہے ہوں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جو شخص اپنے بارے میں سب کچھ بھول چکا ہو، اس کی پریشانی کی شدت کا کیا عالم ہوگا۔

"اب تم سو کر اٹھو گے تو تمہیں ہلکی پھلکی غذا دی جا سکے گی۔" حکیم صاحب نے یخنی پلانے کے بعد کہا۔

نوجوان نے غور سے ان کی طرف دیکھا، ایک اچٹتی سی نظر ماروی پر بھی ڈالی، پھر آنکھیں بند کر لیں۔

حکیم صاحب نے کرسی سے اٹھتے وقت پیالہ ماروی کو دے دیا اور اسے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندرونی دروازے کے قریب پہنچے۔

"نذیرو کو بلوالو کسی سے۔" وہ مدھم آواز میں بولے۔ "میرے کمرے میں جو خاص خاص چیزیں ہیں، وہ یہاں منتقل کروا دو۔ میں اب رات کو بھی یہیں رہا کروں گا۔" پھر انہوں نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جاگ جائے تو میں اسے اپنے کمرے میں منتقل کرا دوں گا۔ اسے یہاں نہیں رکھا جا سکتا۔ مریض آئیں گے تو مجھے دشواری ہوگی۔"

"ابا سائیں!" ماروی بولی۔ "اس کی یادداشت ختم ہو گئی ہے نا؟"

"ہاں۔" حکیم صاحب نے متفکر لہجے میں کہا۔ "اور اس کی وجہ وہ کاری ضرب ہی ہو سکتی ہے جو اس کے سر پر لگائی گئی ہے۔"

"آپ نے کہا تھا کہ جب یہ سو کر اٹھے گا تو اسے سب یاد آ جائے گا۔ ایسی ہی کوئی بات کہی تھی آپ نے۔"

"اس کی ڈھارس بندھانے کے لیے کہہ دی تھی۔ وہ ہیجان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ سو لے گا، آرام کر لے گا، تو دیکھ

بھائی کیفیت نہیں رہے گی۔"

"تو کیا اسے اب بھی کچھ یاد نہیں آئے گا؟"

"ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں علاج تو کروں گا۔ کوشش کروں گا کہ اس کی یادداشت واپس آجائے۔"

"جب کسی کی یادداشت چلی جاتی ہے تو اسے اپنی زبان یاد رہتی ہے؟ وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بول رہا تھا۔"

حکیم صاحب دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، نوجوان کی طرف دیکھے جارہے تھے اور ماروی سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "اس قسم کا کوئی مریض پہلے کبھی میرے تجربے میں تو کیا، مشاہدے میں بھی نہیں آیا۔ اس قسم کے مریض کے بارے میں میری معلومات کتابوں کی حد تک ہیں، اور وہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ شاید ایسے مریض کو اپنی زبان اور کچھ اور اک دوسری چیزوں کا بھی ہوتا ہے لیکن میں نے ایک ایسے مریض کے بارے میں بھی پڑھا ہے جو سبھی کچھ بھول گیا تھا۔ اس کی حالت کسی نوزائدہ بچے کی سی ہوگئی تھی۔ اس نے بچوں ہی کی طرح نئے سرے سے زبان سیکھی اور اپنی دوسری زندگی کا آغاز کیا۔ اپنی پچھلی زندگی اسے کبھی یاد نہیں آسکی تھی۔"

"اور ابا سائیں..."

یکایک حکیم صاحب نے اسے گھور کر دیکھا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم بہت زیادہ متجسس ہوتی جارہی ہو بٹیا! اب تم جاکے کھانا نکال لاؤ۔ خاصا وقت گزر گیا۔ اب کھانا کھالینا چاہیے۔ کھانے کے بعد اس کے لیے مونگ کی کھچڑی پکادینا۔"

"یہ جاگ تو جائے ابا سائیں! کھچڑی تو ذرا سی دیر میں پک جائے گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" حکیم صاحب نے کہا اور واپس اپنے اس عجیب مریض کی طرف بڑھ گئے جو اپنی یادداشت کھو چکا تھا اور جسے کسی نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

کھانا کھانے کے بعد حکیم صاحب نے ماروی سے کہا۔ "میں اب جاکے ذرا لاچی موکو دیکھ آؤں۔ آج اسے دیکھنے جا ہی نہیں سکا۔ میری واپسی تک اس کا خیال رکھنا۔"

ان کا اشارہ نوجوان کی طرف تھا۔

ان کے جانے کے بعد ماروی نے بان کی ایک چوکی پلنگ کے قریب رکھی اور اس پر بیٹھ کر نوجوان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتی رہی کہ اس "سٹو شہری" کی یادداشت کیا صرف علاج سے واپس آسکے گی؟

ناولوں میں ماروی نے پڑھا تھا کہ اس قسم کے مریضوں کو ڈھیرے ڈھیرے ماضی کی باتیں سنائی جائیں یا ایسی چیزیں دکھائی جائیں جو ماضی میں اس کی شخصیت سے بہت قریب رہی ہوں تو کسی موقع پر یکایک اس کی یادداشت واپس آجاتی ہے مگر اس نوجوان کے سلسلے میں یہ سب کچھ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کے ماضی سے باخبر کوئی شخص وہاں نہیں تھا جو یہ سب کچھ کرسکتا۔ اگر اس کی تصویر شہر کے کسی اخبار میں چھپوادی جاتی تو اس کا کوئی جاننے والا مل سکتا تھا لیکن ایسی کوئی تدبیر اس نوجوان کے لیے خطرناک ثابت ہوتی۔ تصویر ان لوگوں کی نظر میں بھی آسکتی تھی جنہوں نے اسے قتل کرنا چاہا تھا۔ تصویر دیکھ کر وہ لوگ اس گاؤں کی طرف دوڑ پڑتے اور دوبارہ اس نوجوان کی زندگی ختم کرنے کے لیے کوئی اقدام کرتے۔

ماروی یوں محسوس کرنے لگی جیسے وہ کسی جاسوسی ناول کا کردار بن گئی ہو جس کا سابقہ ایک ایسے نوجوان سے پڑا تھا جس کی یادداشت چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد حکیم صاحب واپس آگئے۔ انہوں نے بتایا کہ مریضہ لاچی موکی طبیعت اب کافی سنبھل گئی تھی اور اگلے دن تک اسے بالکل تندرست ہوجانا چاہیے تھا۔ اجنبی کی خبر اسے بھی مل چکی تھی اور اس نے حکیم صاحب سے اس کے بارے میں متعدد سوالات کر ڈالے۔

"اب میں بھی لاچی موکو دیکھ آؤں؟" ماروی نے باپ سے اجازت چاہی۔

"ہاں، مل آؤ اس سے۔ وہ بھی تمہیں پوچھ رہی تھی۔ بہت چاہتی ہے وہ تمہیں، اور تم ہو کہ آج اسے دیکھنے بھی نہیں گئیں۔"

"کیسے جاتی ابا سائیں! یہ معاملہ جو ہوگیا تھا۔"

"خیر، جاؤ... بس ذرا جلدی آجانا۔ ابھی مجھے حویلی بھی جانا ہے۔"

ماروی کو یکایک کچھ یاد آیا اور وہ بولی۔ "آپ نے کہا تھا ابا سائیں کہ یہ گاؤں والوں کو نہ بتایا جائے کہ اس شہری کو کسی نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ تو کیا یہ بھی کسی کو نہیں بتانا کہ اس کی یادداشت ختم ہوگئی ہے؟"

"اچھا کیا جو تم نے پوچھ لیا۔ ہاں بٹیا! یہ بات بھی کسی کو بتانے کی ضرورت کیا ہے۔ محتاط رہنا ہی بہتر ہے۔ یہ دونوں باتیں میں بھوتار سائیں کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ بس اتنا کہوں گا اس سے کہ اس کے نقش ونگار کیونکہ جمیل کی طرح

ہیں اس لیے میں اس سے انسیت محسوس کرنے لگا ہوں اور اسے اپنے گھر پر رکھ کر اس کا علاج کرنا چاہتا ہوں۔ بہانہ کر دوں گا کہ یہ کچھ بیمار بھی ہے۔''

''اچھا ابا سائیں، میں آتی ہوں ابھی۔''

جب وہ لاچی موسے مل آئی تو حکیم صاحب وڈیرے حشمت ابڑو سے ملنے چلے گئے۔ ماروی کو اطمینان تھا کہ وہ ناکام نہیں لوٹیں گے۔ گاؤں والوں کے سلسلے میں تو حشمت ابڑو بہت سخت گیر تھا لیکن حکیم صاحب کی بہت عزت کرتا تھا، انہیں بہت مانتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی زندگی ایک اعتبار سے حکیم صاحب کی مرہونِ منت تھی۔

پندرہ سال پہلے حشمت ابڑو کو کسی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس دن موسم بہت خراب تھا۔ شدید آندھی طوفان کی وجہ سے ممکن نہیں تھا کہ حشمت ابڑو کو کسی بڑے شہر کے کسی اچھے اسپتال تک پہنچایا جاسکتا یا کسی ڈاکٹر کو شہر سے گاؤں لایا جاسکتا۔ بجلی اتنے تسلسل سے کڑک رہی تھی کہ موبائل فون بھی ناکارہ ہوگئے تھے۔ اس موسم میں حکیم صاحب ہی حویلی جاسکے تھے اور ان کی حکمت ایک گھنٹے کے اندر اندر اسے خطرے کی حد سے باہر لے آئی تھی اور دوسرے دن تک وہ بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس کے بعد تو پھر یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ اپنے یا اپنے گھر والوں کے کسی مرض کے معاملے میں شہر کے کسی ڈاکٹر کے بارے میں سوچتا بھی نہیں تھا۔ اسے حکیم صاحب ہی کی یاد آتی تھی۔ اس طرح وہ حشمت ابڑو کے ''فیملی حکیم'' بن گئے تھے۔

جب حکیم صاحب حویلی سے لوٹے تو ماروی نے انہیں بہت زیادہ متفکر دیکھا۔

''کیا ہوا ابا سائیں؟'' ماروی نے تشویش سے پوچھا۔ ''کیا دھارو سائیں نے آپ کی بات نہیں مانی؟''

حکیم صاحب نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولے۔ ''اچھا ہے کہ یہ دیر تک سوتا رہے۔''

''آپ مجھے ٹال رہے ہیں ابا سائیں!'' ماروی بولی۔ ''ایسی کیا بات ہے جو آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ پہلے تو شاید کبھی ایسا نہیں ہوا۔ آپ مجھے ہر بات بتا دیتے ہیں۔ بتائیے نا ابا سائیں!'' ماروی کا لہجہ اور انداز ایسا ہو گیا جیسے ضد کر رہی ہو۔

حکیم صاحب نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، پھر کچھ رک کر بولے۔ ''دھارو سائیں نے میری بات مان لی ہے۔ پولیس چوکی قائم ہونے کے بعد بھی وہ پولیس والوں کو ہمارے گھر کا رخ نہیں کرنے دیں گے۔''

''تو پھر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

حکیم صاحب نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ ان کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات تھے۔ شاید وہ کوئی خاص بات اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتے تھے لیکن آخر کار انہوں نے کسی وجہ سے یہی فیصلہ کیا کہ ماروی سے یہ بات بھی نہیں چھپانا چاہیے۔

''دراصل۔'' وہ دھیرے دھیرے کہنے لگے۔ ''دھارو سائیں نے اطلاع ملتے ہی مجھے اپنی اوطاق میں بلا لیا تھا حالانکہ کراچی سے ان کے دو مہمان آئے ہوئے تھے۔ جب میں اوطاق میں داخل ہوا تو وہ اپنے مہمانوں کو رخصت کر رہے تھے۔ ان دونوں میں سے ایک نے چلتے چلتے دھارو سائیں سے انگریزی میں ایک ایسی بات کہی جو میرے لیے پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ وہ لوگ یہی سمجھے ہوں گے کہ میں انگریزی زبان سے واقف نہیں ہوں گا۔ تم جانتی ہو کہ مجھے انگریزی بولنا بالکل پسند نہیں، اور صرف تم ہی جانتی ہو کہ مجھے والد مرحوم نے انگریزی بھی پڑھائی تھی۔ اسی لیے میرے پاس طب کی انگریزی کتابیں بھی ہیں جو میں پڑھتا بھی رہتا ہوں۔''

''اس آدمی نے کیا کہا تھا؟'' ماروی نے بے چینی سے پوچھا۔

حکیم صاحب طویل سانس لے کر بولے۔ ''اس نے کہا تھا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں، جب باس نے اپنے بھائی کو قتل ہی کروا دیا ہے تو اب کوئی گڑبڑ کیسے ہوسکتی ہے۔''

ماروی اپنے والد کا منہ تکنے لگی پھر کچھ توقف سے بولی۔ ''اس قسم کے لوگ بھی دھارو سائیں سے ملنے آتے ہیں؟''

''ہاں بٹیا!'' حکیم صاحب نے سر ہلایا۔ ''میں نے کوئی سال بھر پہلے بھی دھارو سائیں کی اوطاق میں کچھ اس قسم کی باتیں سنی تھیں جن سے میں یہ اندازہ لگا سکا تھا کہ کراچی میں کوئی ایسی مجرمانہ سرگرمی جاری ہے جس سے دھارو سائیں کا بھی کچھ تعلق ضرور ہے۔''

''او، یہ جاننے کے بعد بھی آپ نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی؟''

''اور کیا کرتا بٹیا؟ شور مچاتا؟ پولیس کو اطلاع دیتا؟ نہیں بٹیا! یہ میری حماقت ہوتی۔ ہم جیسے لوگوں کو اس قسم کے معاملات سے دور ہی رہنا چاہیے۔ زمانہ ایسا ہی آگیا ہے۔ یہ بڑے لوگ کوئی بھی جرم کریں، ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔

بربادی ہم جیسے لوگوں کی ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں یہ سب کچھ بتا تو دیا ہے لیکن تم یہ بات کسی کے سامنے اپنی زبان پر نہ لانا۔ قیامت آجائے گی اگر دھارو سائیں تک ایسی کوئی بات پہنچی۔ اس گاؤں میں عزت سے زندگی گزر رہی ہے۔ اسے عزت ہی سے گزر جانا چاہیے۔"

حکیم صاحب کو یہ احساس تو بڑی شدت سے تھا کہ وہ ایک جوان بیٹی کے باپ ہیں۔

ماروی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "ایسی کوئی بات ہے تو بھی آپ کسی کے قتل کے ذکر سے اتنا پریشان کیوں ہو گئے؟"

حکیم صاحب نے اجنبی نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے بھی قتل ہی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔"

ماروی چونکی۔ "تو آپ کا یہ خیال ہے کہ قتل کا وہ ذکر اسی کے بارے میں تھا؟"

"ہوسکتا ہے یہ میرا وہم ہو لیکن جب سے میں نے یہ بات سنی ہے، دماغ میں یہی خیال چکرا رہا ہے۔"

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا ابا سائیں! آپ نے بتایا ہے کہ دھارو سائیں کے وہ مہمان کراچی سے آئے تھے۔ آپ کا اندازہ یہ بھی ہے کہ وہاں ہونے والے کسی قسم کے غلط کاموں میں دھارو سائیں کا بھی کچھ ہاتھ ہے۔ میں کبھی کراچی نہیں گئی لیکن میں نے نصاب کی کتابوں میں پاکستان کا نقشہ تو دیکھا ہے۔ خود آپ بھی مجھے بتا چکے ہیں کہ کراچی یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے۔ اگر اس کو وہاں قتل کرنے کی کوشش کے بعد سمندر میں پھینکا گیا تھا تو یہ وہاں سے بہتا ہوا یہاں تک زندہ کیسے پہنچ گیا۔ اس کے پیٹ میں زیادہ پانی بھی نہیں بھرا تھا۔ اگر یہ کراچی سے بہتا ہوا یہاں تک آتا تو اس کے پیٹ میں بہت پانی بھر جاتا۔"

حکیم صاحب نے سر ہلایا۔ "تمہاری دلیل تو مضبوط ہے بیٹا مگر جانے کیوں، میرے دماغ میں یہی خیال جم گیا ہے۔"

"میں تو کہوں گی ابا سائیں کہ آپ یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دیں۔ دھارو سائیں کے مہمان نے جس کے قتل کا ذکر کیا ہوگا، وہ کوئی اور ہی ہوگا۔"

"اچھا۔" حکیم صاحب نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اگر تم کہتی ہو تو میں یہ خیال اپنے دماغ سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

ماروی نے محبت سے اپنا سر حکیم صاحب کے سینے پر رکھ دیا۔

ان دونوں باپ بیٹی نے یہ گفتگو بہت دھیمی آواز میں کی تھی اور اجنبی نوجوان سے ان کا فاصلہ بھی کم نہیں تھا۔ اگر اس کی آنکھ کھل بھی جاتی تو وہ اس گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن پاتا۔

دو بجے تھے جب وہ سویا تھا۔ وہ آٹھ بجے کے قریب بیدار ہوا۔ اس وقت وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ اندرونی دروازہ بند تھا لیکن اس کی دوسری جانب حکیم صاحب اور ماروی موجود تھے۔ دروازے میں کئی جھریاں تھیں جن سے وہ دونوں برابر جھانکتے رہے تھے۔ اس طرح انہوں نے دو گھنٹے گزارے تھے۔ حکیم صاحب کو یہ دیکھنا مقصود تھا کہ بیداری کے بعد وہ نوجوان تنہائی میں کیا کرتا ہے، اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات کیا ہوتے ہیں۔ دراصل حکیم صاحب کو تھوڑا سا شبہ یہ ہوا تھا کہ وہ نوجوان کسی وجہ سے یادداشت کھو جانے کی اداکاری تو نہیں کر رہا ہے؟

نوجوان نے بیداری کے بعد آہستگی سے سر دائیں بائیں گھمایا، ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ جب وہ بیدار ہوا تھا تو اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے لیکن دھیرے دھیرے وہ الجھا ہوا نظر آنے لگا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے سر پر بھی ہاتھ پھیرا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بستر کے قریب ریک میں حکمت کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر ایک کتاب نکال لی۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر اسے کھول کر بھی دیکھا۔ چہرے پر الجھن کا تاثر بدستور قائم رہا۔ اس نے کتاب اسی جگہ رکھ دی جہاں سے نکالی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک اس کی نظر بجلی کے بلب پر جمی رہی۔ اس کے بعد وہ کمرے کی دوسری اشیا پر طائرانہ نظریں دوڑانے لگا۔

حکیم صاحب کو یقین ہو گیا کہ ان کا شبہ غلط تھا۔ نوجوان کی یادداشت واقعی جاتی رہی تھی۔

"تم اس کے لیے اب کھچڑی چڑھا دو بیٹیا!" انہوں نے مدھم سرگوشی کی۔

ماروی ہوا کی طرح باورچی خانے کی طرف گئی۔ اس نے تیزی کے ساتھ کھچڑی چڑھا دی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نوجوان کی بیداری کے وقت وہ اس کے قریب ہو۔

وہ ہوا کی طرح باورچی خانے کی طرف گئی تھی، ہوا کی طرح واپس بھی لوٹی۔ اس وقت حکیم صاحب اپنی کرسی پر

بیٹھے ہوئے تھے اور نوجوان کہہ رہا تھا۔

''حکیم صاحب! آپ نے کہا تھا کہ میں سو کر اٹھوں گا تو مجھے سب کچھ یاد آجائے گا۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں آیا۔ میں کون ہوں، میرا نام کیا ہے، میں یہاں کیوں ہوں۔ آپ نے بتایا تھا کہ یہ ساحل سمندر کے قریب کوئی گاؤں ہے۔''

وہ ماروی کو تیزی سے اندر آتا دیکھ کر چپ ہو گیا یا شاید وہ اپنی بات مکمل کر چکا تھا۔

''ہاں بیٹے!'' حکیم صاحب نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے یہ کہا تو تھا لیکن اس وقت تم ہیجانی کیفیت کا شکار تھے۔ تم نے پہلی بار جانا تھا کہ تم اپنے بارے میں سب کچھ بھول گئے ہو۔ اب تمہاری کیفیت ویسی نہیں۔ نیند لینے کی وجہ سے تمہاری طبیعت سنبھل گئی ہے۔ اب میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تمہارے سر پر جو گہری چوٹ لگی ہے، اس کی وجہ سے تمہارا حافظہ ختم ہو گیا ہے۔''

ان باتوں نے نوجوان کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا کر دیے۔

حکیم صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ تمہارا حافظہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہو۔ دھیرے دھیرے تمہاری یادداشت واپس آسکتی ہے۔ میں تمہیں ایسی دوائیں دوں گا جو دماغ کے لیے مقوی ہوتی ہیں۔ تمہیں آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آجائے گا۔ پریشان نہ ہو۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ اس گاؤں کے سبھی لوگوں کو تم اپنا ہمدرد پاؤ گے۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ جب تک تمہاری یادداشت بحال نہیں ہو جاتی، تم بڑے اطمینان اور سکون سے یہاں رہ سکتے ہو۔ مجھے خدا سے امید ہے کہ میں تمہارا علاج کرنے میں کامیاب رہوں گا۔''

ماروی ایک طرف خاموشی سے کھڑی وہ سب باتیں سنتی رہی۔

حکیم صاحب نے اور بہت سی باتیں بھی کیں جن سے نوجوان کی ڈھارس بندھ سکے۔ انہی باتوں کے دوران میں ماروی باورچی خانے کا چکر لگا آئی تھی۔ اس نے کھچڑی کی دیگچی کا ڈھکنا تھوڑا سا کھول دیا تھا۔ وہ دوبارہ کارخانۂ حکمت میں گئی تو حکیم صاحب نے اس سے کہا۔ ''نورا اور نذیرو کو بلواؤ کسی سے۔''

ماروی پھر لوٹی اور دوسرے دروازے سے باہر نکلی۔ گھر سے کہیں جانے آنے کے لیے وہی دوسرا دروازہ استعمال ہوتا تھا۔

رات ہو چکی تھی اس لیے اب بچے وہاں کھیلتے نظر نہیں آئے۔ گاؤں وغیرہ میں رات گئے تک تو کیا، اوائل رات میں بھی چہل پہل نہیں رہتی لیکن جب سے اس گاؤں میں بجلی آئی تھی، اتنی جلدی بالکل سناٹا بھی نہیں ہوتا تھا۔

قریب سے گزرتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص نے جس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا حقہ بھی تھا، ماروی کو متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے پایا تو اس کے پاس رکتا ہوا شفقت سے بولا۔

''کیا بات ہے لاڈو!''

گاؤں کے زیادہ عمر کے لوگ ماروی کو ''لاڈو'' ہی کہا کرتے تھے۔

''نذیرو اور نورا کو بلوانا ہے چاچو!'' ماروی نے کہا۔

''میں ابھی جا کے نذیرو سے بول دیتا ہوں۔ وہ نورا کو بھی لے آئے گا۔ حکیم سائیں کو کام ہوگا ان سے کوئی۔''

''ہاں چاچو۔''

''شہری سائیں کیسا ہے اب؟''

''اس کی حالت اب ٹھیک ہے لیکن ابھی کچھ دن اس کا علاج ہوگا۔ ابا سائیں اسے گھر میں ہی رکھیں گے۔ جب اس کا علاج پورا ہو جائے گا تو وہ واپس چلا جائے گا۔''

''حکیم سائیں، سٹھو ماڑو۔'' وہ شخص زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے لہجے میں حکیم صاحب کے لیے عقیدت تھی۔

نذیرو اور نورا جلد ہی آگئے۔ انہوں نے حکیم صاحب کے کمرے سے ان کی تمام خاص چیزیں کارخانۂ حکمت میں منتقل کر دیں۔ اس کے بعد انہوں نے نوجوان سمیت اس کا پلنگ اٹھایا۔ نوجوان خاموشی سے پلنگ پر لیٹا رہا۔ حکیم صاحب اسے سب کچھ بتا چکے تھے۔

جب اسے حکیم صاحب کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تو ماروی اس کے لیے کھچڑی بھی نکال لائی۔

نذیرو اور نورا کو رخصت کیا جا چکا تھا۔

''میں ایک دوا بنا کے لاتا ہوں۔ تم یہیں بیٹھو۔'' حکیم صاحب نے ماروی سے کہا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''شاید ہمارے مہمان کو زیادہ بھوک ہو۔ کھچڑی اور لا دینا۔ اور ہے نا؟''

''جی ابا سائیں۔''

نوجوان نے ان دونوں پر اچٹتی سی نظریں ڈالی تھیں اور خاموشی سے کھچڑی کھاتا رہا تھا۔ اب اس کے چہرے پر کچھ زیادہ الجھن یا پریشانی نہیں تھی۔ شاید اس نے اپنی

حالت سے سمجھوتا کرلیا تھا، یا کرنے کے لیے کوشاں تھا۔

حکیم صاحب کے جانے کے بعد ماروی خاموشی سے ایک اسٹول پر بیٹھی نوجوان کی طرف دیکھتی اور سوچتی رہی۔

جب سے اس نوجوان کو بے ہوشی کی حالت میں ساحل سے لایا گیا تھا، وہ یوں محسوس کرنے لگی تھی جیسے اس کے دماغ میں جاسوسی ناولوں کے واقعات چکرانے لگے ہوں۔ پھر جب یہ دو باتیں سامنے آئی تھیں کہ اس نوجوان کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا، ماروی یوں محسوس کرنے لگی تھی جیسے یہ سارے واقعات کوئی جاسوسی کہانی ہیں اور وہ خود بھی اس کہانی کا ایک کردار ہے۔ کرداروں کے جنگل میں اس کا ذہن الجھتا چلا گیا۔

کافی دیر بعد اس نے سر جھٹک کر اپنے دماغ سے جاسوسی ناولوں کے خیالات نکالنے کی کوشش کی۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان کھچڑی کھا چکا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں بھرت کا جگ تھا جس سے وہ گلاس میں پانی نکالنا چاہتا تھا۔

بھرت کا جگ اور اس قسم کی کئی چیزیں، ماروی بچپن ہی سے اپنے گھر میں دیکھتی چلی آئی تھی۔ اس کی مرحوم ماں نے اسے بتایا تھا کہ اس قسم کا کچھ سامان حکیم صاحب کے والد اور والدہ ہی اپنے ساتھ اس گاؤں میں لائے تھے۔

''کیا اور کھچڑی لاؤں؟'' ماروی نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' نوجوان نے جواب دیا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''تم پہلے ہی اتنی زیادہ کھچڑی لے آئی تھیں۔ اگر میں زیادہ بھوکا نہ ہوتا تو اتنی کھچڑی کھا نہیں پاتا۔'' جواب دینے کے بعد اس نے گلاس میں پانی انڈیلا اور پینے لگا۔

ماروی نے وہ گول تھالی اٹھائی جس میں وہ کھچڑی کی پلیٹ اور رائتے کا پیالہ رکھ کر لائی تھی۔ نوجوان نے رائتا بھی سب کھا لیا تھا۔

''میں برتن رکھ کر آتی ہوں۔'' ماروی نے نوجوان کی طرف دیکھے بغیر کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ نوجوان سے چند ہی باتیں کر کے اس کے جسم میں سنسناہٹ سی پھیلنے لگی تھی جس کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

باورچی خانے میں اس نے برتن اس جگہ رکھے جو برتن دھونے کی جگہ تھی۔

''میں کہیں اس سے محبت تو نہیں کرنے لگی۔'' وہ بڑبڑائی اور پھر خود ہی ہنس پڑی۔ ''چپ رہ پگلوٹ!''

وہ جلدی جلدی چلتی ہوئی واپس کمرے میں پہنچی۔

اب اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

جب سے وہ نوجوان اس گھر میں آیا تھا، اس کے سامنے ماروی پر سادگی اور سنجیدگی طاری رہی تھی جو اب یک لخت جیسے کافور ہوگئی تھی اور اس کا چلبلاپن اس کی آنکھوں میں بھی عود کر آیا تھا۔

''تم بڑے سنٹوشہری ہو۔'' وہ نوجوان سے بولی۔

''سنٹو؟'' نوجوان بولا۔ ''اس لفظ کا مطلب مجھے نہیں معلوم۔''

''یہ سندھی زبان کا لفظ ہے۔'' ماروی نے عالمانہ انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے... اچھا۔''

''اچھا!'' نوجوان مسکرایا۔ ''میں اچھا ہوں؟''

''اچھے ہو، جبھی تو ابا سائیں نے تمہیں اپنے گھر میں رکھ لیا ہے۔''

''تم بھی سنٹو ہو۔'' وہ بولا۔

''سچ؟'' ماروی نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

نہ جانے اس کے لہجے میں کیا بات تھی، یا اس کے چہرے پر کیا تاثر تھا کہ نوجوان نہ صرف یک لخت سنجیدہ ہوا بلکہ شاید کچھ بوکھلا بھی گیا۔

حکیم صاحب کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو ماروی فوراً سنجیدہ ہوگئی۔

حکیم صاحب ایک چھوٹی سی پیالی میں دوا لے کر آئے تھے۔ انہوں نے پیالی ایک طرف رکھ دی اور بستر پر نوجوان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔

''آج میں نے احتیاط کے طور پر تمہارے لیے ہلکی غذا مناسب سمجھی تھی۔ کل سے تم سب کچھ کھا سکو گے۔ اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ بس سر کے پچھلے حصے میں تکلیف ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ میرے سر میں کوئی زخم لگا ہے۔''

''ہاں۔'' حکیم صاحب نے اپنے کرتے کی جیب میں کچھ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ زخم تمہیں ابھی بہت زیادہ تکلیف دیتا لیکن میں نے تمہیں ایک خاص قسم کا عرق پلایا ہے جس کی وجہ سے تکلیف کم ہوگی۔''

حکیم صاحب کا ہاتھ کرتے کی جیب سے باہر آیا تو ان کی انگلیوں میں ایک چابی تھی۔ وہ انہوں نے بستر پر رکھ دی اور پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بڑبڑائے۔ ''نہ جانے کہاں چلی گئی۔'' ان کی نظریں نوجوان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہیں ابا سائیں؟'' ماروی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' حکیم صاحب نے جیب سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا اور جو چابی بستر پر ڈال دی تھی، وہ اٹھالی۔

نوجوان نے اس چابی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور پھر حکیم صاحب کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

ماروی نے وہ چابی پہلے کبھی اپنے والد کے پاس نہیں دیکھی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' حکیم صاحب نے نوجوان کو چابی دکھاتے ہوئے پوچھا۔

نوجوان کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا جیسے اس سیدھے سادے سوال پر اسے تعجب ہوا ہو۔ خود ماروی کو بھی اپنے باپ کا سوال عجیب لگا تھا۔

''یہ چابی ہے۔'' نوجوان نے سادگی سے جواب دیا۔

''پہلے کبھی دیکھی ہے؟'' حکیم صاحب نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، خصوصاً یہ چابی؟''

نوجوان عجیب سے انداز میں دھیرے سے ہنسا اور بولا۔ ''حکیم صاحب! آپ مجھ سے اچانک کیسی باتیں کرنے لگے؟ یہ آپ کی چابی ہے۔ یہ میں نے پہلے کبھی کیسے دیکھی ہوگی؟''

حکیم صاحب نے ایک طویل سانس لی۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ چابی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری اشیا بھی تمہارے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں تھیں۔ تم اپنی زبان بھی بول رہے ہو، وہ بھی نہیں بھولے۔ اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ تمہاری یادداشت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔''

''جی!'' نوجوان الجھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

''لیکن یہ چابی۔'' حکیم صاحب نے زور دے کر کہا۔ ''یہ تمہاری چابی ہے۔''

''میری؟'' نوجوان حیرت سے بولا۔

ماروی بھی اس وقت حیرت زدہ سی تھی۔

''ہاں۔'' حکیم صاحب نے کہا۔ ''جب تمہیں یہاں لایا گیا تھا تو سب سے پہلے تمہارے جوتے اتارے گئے تھے۔ یہ تمہارے بائیں پیر کے جوتے میں تھی۔''

نوجوان نے بے تابی سے ہاتھ بڑھایا۔ وہ چابی لینا چاہتا تھا۔ حکیم صاحب نے چابی اسے دے دی۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''تمہارے لباس کی تلاشی بھی میں نے خود لی تھی۔'' حکیم صاحب بولے۔ ''لیکن اس چابی کے علاوہ تمہارے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ یہ تم نے چھپانے کے لیے ہی اپنے جوتے میں رکھی ہوگی۔ عام طور پر چابی جیب میں یا پرس میں رکھ لی جاتی ہے۔ اسے جوتے میں چھپانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس پر کسی اور کی نظر نہ پڑے۔ یہ رازداری ظاہر کرتی ہے کہ یہ چابی تمہارے لیے کوئی خاص اہمیت رکھتی ہے۔''

''مجھے بالکل یاد نہیں آرہا ہے۔'' نوجوان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ وہ اب بھی چابی کو الٹ پلٹ کر دیکھے جارہا تھا۔

''اس پر ایک نمبر بھی کندہ ہے۔'' حکیم صاحب بولے۔

''جی ہاں، تیرہ نمبر ہے۔''

''گویا تم انگریزی ہندسے بھی پڑھ سکتے ہو؟''

''میں انگریزی زبان بھی جانتا ہوں۔'' نوجوان نے جواب دیا۔ پھر انگریزی ہی میں اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ انگریزی جانتے ہیں؟''

''جانتا ہوں۔'' حکیم صاحب نے اردو میں جواب دیا۔ ''لیکن بولنا پسند نہیں کرتا۔ ہاں پڑھ ضرور لیتا ہوں۔ وہ مجبوری ہے۔ جدید طبی معلومات انگریزی کتابوں ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ خیر، اب یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تم انگریزی بھی جانتے ہو اور بھولے بھی نہیں ہو لیکن تمہیں اس چابی کے بارے میں کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔''

نوجوان نے پریشان سے انداز میں سر ہلایا۔

''یہ اپنے پاس ہی رکھو اور اسے وقتاً فوقتاً دیکھتے رہا کرو۔ شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔'' حکیم صاحب نے کہا، پھر اٹھتے ہوئے اسے دوا پلادی۔

ماروی وہ چابی دیکھنے کے بعد سے سوچ بچار میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت چونکی جب حکیم صاحب نے اسے نام لے کر مخاطب کیا اور کہا۔ ''ہمارا یہ مہمان شاید جلدی نہ سوسکے۔ اسے کوئی ناول لادو۔'' پھر انہوں نے مسکرا کر نوجوان سے پوچھا۔ ''ناول پڑھو گے؟''

ماروی جلدی سے بولی۔ ''میرے پاس ابن صفی کے بہت ناول ہیں۔ ان میں سے کوئی لادوں؟'' وہ نوجوان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ابن صفی؟'' نوجوان کچھ سوچتا ہوا بڑبڑایا۔

حکیم صاحب غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور

بولے۔ ''واقف ہو تم اس نام سے؟''

''واقف۔'' اس مرتبہ بھی نوجوان کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا پھر اس نے کہا۔ ''مجھے بس ایسا لگا تھا جیسے یہ نام میں نے پہلے بھی کہیں سنا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی علامت ہے۔'' حکیم صاحب نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''تمہاری یادداشت واپس آنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگنا چاہیے۔''

نوجوان پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

ماروی نے اس کے لیے ابن صفی کا ایک ایسا ناول منتخب کیا جو اسے بہت پسند تھا۔ پھر اس نے ایک پرانا سا رومانی ناول بھی اٹھا لیا۔ اس ناول کا سرورق اور ابتدائی چند اوراق پھٹے ہوئے تھے۔ ناول کا اور اس کے مصنف کا نام ان پھٹے ہوئے صفحات میں چلا گیا تھا۔ نور را وہ ناول اس لیے لے آیا تھا کہ وہ اسے ایک ٹھیلے والے سے بہت سستا مل گیا تھا۔

ماروی دونوں ناول لے کر حکیم صاحب کے کمرے میں پہنچی جو اب اس اجنبی نوجوان کا کمرا بن گیا تھا۔ حکیم صاحب اس وقت وہاں نہیں تھے۔

ماروی نے دونوں ناول اجنبی نوجوان کو دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو موٹا والا ہے نا، یہ رومانی ناول ہے۔ اگر تمہیں جاسوسی ناول اچھا نہ لگے تو یہ پڑھ لینا۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا۔'' ماروی نے ایک مرتبہ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا، پھر رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''یہ ناول تکیے کے نیچے چھپا کر رکھنا۔ یہ ابا سائیں کی نظر میں نہ آئے۔''

''کیوں؟''

''رومانی ناول میں چھپ کر پڑھتی ہوں... ابا سائیں منع کرتے ہیں۔''

''کیوں؟''

ماروی دھیرے سے ہنس دی۔ دراصل اس کے دماغ میں ایک خیال جم گیا تھا کہ حکیم صاحب اسے رومانی ناول پڑھنے سے کیوں روکتے تھے۔ اس کے خیال میں حکیم صاحب کا خیال تھا کہ رومانی ناول پڑھتے پڑھتے وہ بھی ''رومینٹک'' ہو جائے گی اور شاید گاؤں میں کسی سے رومانس شروع کر دے۔

نوجوان خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''میں نے کوئی ایسا سوال تو نہیں کیا تھا جس پر ہنسی آئے۔''

''ہنسی مجھے تمہارے سوال پر نہیں، کسی اور بات پر آئی تھی۔'' ماروی نے کہا۔

"کس بات پر؟"

"ابھی نا سمجھ لگتے ہو۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو بتاؤں گی۔" یہ جواب دیتے دیتے ماروی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس سے پہلے کہ نوجوان کچھ کہتا، وہ دوڑنے کے سے انداز میں تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر گر سی گئی۔ پھر سیدھی ہو کر لیٹی۔ چپلیں اس وقت بھی اس کے پیروں میں تھیں۔ اس نے ٹانگوں کو جھٹکا دے کر چپلیں اِدھر اُدھر پھینک دیں اور پھر اوندھی ہو کر لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور تصور میں اجنبی نوجوان تھا۔

"ستھاشہری۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

☆☆☆

ماروی کے جانے کے بعد نوجوان ذرا دیر تک مسکراتا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر یک بہ یک سنجیدہ ہو گیا۔ اسے اس چابی کا احساس ہو گیا تھا جو اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ وہ اسے پھر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ چابی اس کے جوتے میں کیوں تھی؟

اس نے اتنا سوچا کہ اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ اس درد کی وجہ سے سر کے زخم کی تکلیف بھی بڑھی۔ نوجوان لمبی سانسیں لیتا ہوا لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نہ جانے کتنا وقت لگا لیکن اس کے سر کا درد جاتا رہا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ بھرت کا جگ اور گلاس اس کے بستر کے قریب ہی رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گلاس پانی پیا اور بیٹھے بیٹھے لمبی سانسیں لیتا رہا۔ اس وقت اس کی نظر ان ناولوں پر پڑی جو اس نے ماروی سے لے کر بستر پر ایک طرف ڈال دیے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ موٹا ناول اوپر رکھا تھا۔ اس نے وہی اٹھا لیا اور لیٹ کر پڑھنے لگا۔ اسے چابی کا خیال بار بار آ رہا تھا اور وہ اسے اپنے ذہن سے جھٹکے جا رہا تھا پھر وہ کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس نے جاسوسی ناول پڑھنا شروع کر دیا۔ چند صفحات پڑھنے کے بعد وہ اس کی دلچسپی میں کھو گیا۔ ناول کے کردار علی عمران کی حرکتوں پر کئی مرتبہ وہ دھیرے سے ہنس بھی پڑا۔ جب ناول کے پندرہ سولہ صفحے باقی رہ گئے تو اس پر غنودگی طاری ہونے لگی لیکن کہانی ایسی تھی کہ وہ اس کا انجام ضرور پڑھنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ناول ختم کر لیا اور اسے اپنے سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جلد ہی وہ نیند کی آغوش میں تھا۔

اس نے خواب میں مچھیروں کا ایک خاصا بڑا ٹرالر دیکھا۔ وہ ٹرالر کے ایک کنارے پر کھڑا ہوا تھا۔ ہر طرف سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ حدِ نظر تک کہیں زمین نظر نہیں آ رہی تھی۔ ٹرالر پر ایک لمبا تڑنگا ماہی گیر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک کلہاڑا اور چہرے پر بڑے سنگین تاثرات تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کلہاڑے سے نوجوان کا سر پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نوجوان کے چہرے پر بھی ایسے تاثرات تھے جیسے وہ خطرہ بھانپ چکا ہو اور خود کو کلہاڑے کی ضرب سے بچانے کے لیے تیار ہو۔

"بس اب جا!" ماہی گیر نے کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے کلہاڑا اوپر اٹھاتے ہوئے نوجوان کا سر پھاڑ دینا چاہا۔

نوجوان نے برقی سرعت سے اچھل کر اپنی دائیں ٹانگ اس طرح گھمائی کہ وہ اینٹی کلاک وائس کے انداز میں گھومی اور اس کے جوتے کی ٹھوکر ماہی گیر کے سینے پر پڑی۔ اس وقت وہ کلہاڑے کا وار کر چکا تھا مگر اسی حالت میں کلہاڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

نوجوان نے ٹانگ اتنی طاقت سے گھمائی تھی کہ اس کی پشت ماہی گیر کی طرف اور چہرہ سمندر کی طرف ہو گیا تھا۔ یہ پوزیشن بن جانے کی وجہ سے ماہی گیر کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا کلہاڑا اس کے سر کے پچھلے حصے پر پڑا۔

کلہاڑا نہایت وزنی اور اتنا تیز دھار تھا کہ اس کی ضرب سے نوجوان کی چیخ نکل گئی۔

وہ چیخ سوتے ہوئے اجنبی نوجوان کے منہ سے بھی نکلی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ لیٹے لیٹے لمبی سانسیں لے رہا تھا کہ بوکھلائے ہوئے حکیم صاحب اور ماروی پھر اس کے پاس پہنچ گئے۔

"کیا ہوا بیٹے؟" حکیم صاحب نے تیزی سے پوچھا۔ "کیا بہت خوف ناک کہانی ہے اس ناول کی؟"

نوجوان نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

ماروی بھی تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

حکیم صاحب بولے۔ "پھر تم چیخ کیوں پڑے؟"

نوجوان کو اس وقت اپنا حلق خشک محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے آدھا گلاس پانی پینے کے بعد بتایا کہ اس نے کیا خواب دیکھا تھا۔

حکیم صاحب نے ماروی کی طرف اور ماروی نے ان

کی طرف دیکھا۔ ان دونوں ہی کے چہروں پر یکساں تاثرات تھے۔

''حکیم صاحب!'' نوجوان بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کیا یہ خواب سچا ہوسکتا ہے؟ کیا واقعی میرے ساتھ ایسا ہوا ہے؟ مجھے زخم بھی سر کے پچھلے حصے ہی میں لگا ہے۔''

''ہوں۔'' حکیم صاحب نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا، پھر بولے۔ ''ضروری نہیں کہ آدمی جو خواب دیکھے، وہ سچا ہی ہو لیکن تمہارے سر پر لگنے والی ضرب کی نوعیت ایسی ہی تھی جیسے وہ زخم کسی تیز دھار وزنی چیز کا ہو۔''

نوجوان نے ایک اچٹتی سی نظر ماروی پر ڈالی، پھر کہا۔ ''حکیم صاحب! اگر اس خواب کو سچا مان لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ماضی میں میرے ساتھ یہی ہوا تھا اور اس طرح مجھے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔''

''اس امکان کو مسترد تو نہیں کیا جانا چاہیے لیکن ضروری بھی نہیں کہ تمہارے ساتھ واقعی وہی سب کچھ ہوا ہو جو تم نے خواب میں دیکھا تھا۔'' پھر انہوں نے پوچھا۔ ''کیا یہ ناول تم نے پڑھ لیا؟''

''جی ہاں، یہ میں پورا پڑھ کر ہی سویا تھا۔'' نوجوان نے جواب دیا اور پھر ماروی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بہت دلچسپ اور اچھا ناول تھا۔''

ماروی خفیف سا مسکرا دی۔ شاید اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ اس ناول کی نہیں بلکہ اس کی تعریف کی گئی تھی۔

حکیم صاحب بولے۔ ''جاسوسی ناولوں کے واقعات بھی دماغ پر اثر انداز ہوکر اس قسم کے خواب دکھا دیتے ہیں۔''

''خیر!'' نوجوان نے ایک طویل سانس لی۔ ''بات جو کچھ بھی ہو۔ میری وجہ سے آپ لوگ اچھے خاصے پریشان ہورہے ہیں۔''

''ایسی باتیں نہ کرو شہری سائیں!'' اس مرتبہ ماروی بول پڑی۔ ''مہمان تو اللہ میاں کی رحمت ہوتے ہیں، اور پھر تم تو مریض بھی ہو۔ ابا سائیں اپنے مریضوں کا جتنا خیال رکھتے ہیں، اتنا تو یہ اپنا بھی نہیں رکھتے۔''

''مہمان تو خیر میں زبردستی کا ہوں۔'' نوجوان نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ایسا نہ کہو بیٹے!'' حکیم صاحب نے کہا۔ ''یہاں تم خود کو مہمان نہ سمجھو، اس گھر کا فرد سمجھو۔ تم نہیں جانتے کہ مجھے تم سے کتنی انسیت ہوگئی ہے۔ اس وقت میں تم کو بتا دوں کہ تم میرے ایک مرحوم چچازاد بھائی جمیل سے بہت مشابہ ہو۔''

نوجوان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا ہو۔

''جمیل!'' اس کے منہ سے نکلا۔

''کیوں؟'' حکیم صاحب غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ''تم یہ نام سن کر چونک کیوں گئے؟''

''پتا نہیں کیا ہوا تھا۔'' نوجوان نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ نام سن کر میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا تھا۔''

''شاید اس نام کا تمہارے ماضی سے کوئی تعلق ہو۔''

''جی، ہوسکتا ہے۔'' نوجوان نے آہستہ سے کہا پھر بولا۔ ''رات خاصی ہوچکی ہے۔ اب آپ لوگوں کو جا کے آرام کرنا چاہیے۔ خدا کرے کہ اب مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جو آپ لوگوں کی پریشانی کا سبب بنے۔''

''تم نے پھر ایسی باتیں کیں۔'' حکیم صاحب کے لہجے کی ہلکی سی خفگی میں بلا کی اپنائیت تھی۔ ''تمہاری وجہ سے جو کچھ بھی ہوگا، وہ ہمارے لیے ہرگز پریشان کن نہیں ہوگا۔ تم اپنے ذہن میں یہ بات بٹھالو کہ تم میرے چچازاد بھائی جمیل ہو۔''

''بہتر ہے۔'' نوجوان نے اتنی سعادت مندی سے کہا کہ ماروی کو ہنسی آگئی لیکن پھر اس نے بہ عجلت اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبا لیا کیونکہ حکیم صاحب اسے گھورنے لگے تھے۔

ان دونوں کے جانے کے بعد وہ پھر لیٹ گیا۔ وہ باتیں اس کے علم میں نہیں آسکیں جو اس کمرے سے جانے کے بعد حکیم صاحب اور ماروی میں ہوئی تھیں۔

''ابا سائیں!'' ماروی نے کہا۔ ''اپنے مریض سے تو آپ نے یہی کہا کہ جو خواب دکھائی دے، وہ ضروری نہیں کہ سچا ہو لیکن مجھے آپ کے چہرے سے ایسا لگا جیسے آپ اسے سچا خواب سمجھ رہے ہیں۔''

''ہاں بیٹیا!'' حکیم صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کیونکہ اس کے سر کا زخم دیکھ چکا ہوں اس لیے اس کے بارے میں اب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کلہاڑے ہی کا ہوگا۔ قوی امکان ہے کہ اس نے خواب میں وہی کچھ دیکھا ہو جو اس کے ساتھ گزر چکی ہے۔ یہ سب کچھ بڑا خوش آئند ہے۔ اگر وہ اپنے ماضی کے واقعات خوابوں میں دیکھتا رہا تو امکان ہے کہ اس کی یادداشت جلد واپس آجائے گی۔''

اس موقع پر ماروی کا منہ اس طرح کھلا جیسے وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہو لیکن پھر کسی وجہ سے اس نے اپنا

ارادہ ترک کر دیا۔

حکیم صاحب بولے۔ ''جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔''

رات خاصی گزر چکی تھی۔ سوچتے سوچتے کسی وقت ماروی کو بھی نیند آ گئی۔ اتنی تاخیر سے سونے کے باوجود صبح اس کی آنکھ معمول کے مطابق فجر کی اذان سن کر کھلی۔ حکیم صاحب بھی اسی وقت اٹھتے تھے اور فوراً وضو کر کے گاؤں کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے تھے۔ ان کی واپسی تک ماروی ناشتا تیار کر لیتی اور خود بھی ان کے ساتھ ناشتا کرتی۔ ناشتا کرنے کے بعد حکیم صاحب حکمت کی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو جاتے اور ماروی اپنے کمرے میں جا کر ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے پھر سو جایا کرتی تھی۔

اس روز ماروی ناشتا کرنے کے بعد سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ حکیم صاحب نے مطالعے کے لیے ایک کتاب اٹھاتے وقت اس سے کہا تھا۔

''وہ تو دیر سے اٹھے گا۔ شہر میں بہت کم لوگ اتنی جلدی اٹھتے ہیں۔ بہرحال، تم اس کا خیال رکھنا۔ جاگ جائے تو فوراً ناشتا کرا دینا۔ جب تک اس کی کمزوری ختم نہیں ہو جاتی، اس کی خوراک کا خاص خیال رکھنا۔ آنولے کا مربا ختم ہو گیا ہے۔ وہ میں اس کے لیے آج ہی شہر سے منگواؤں گا۔ نذیرو کو بھیج دوں گا۔''

ماروی کو یہ ہدایات ملتیں یا نہ ملتیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تو خود ہمہ وقت اپنے ''سٹھو شہری'' کا خیال رکھنا چاہتی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جا کر کمرے میں جھانکتی رہی۔ شہری نوجوان گہری نیند سو رہا تھا۔

جب صبح کی روشنی ہر طرف پھیلنے لگی تھی تو نذیرو کسی مریض کی آمد سے پہلے ہی حاضر ہو چکا تھا۔ اس وقت ماروی نے اپنے والد سے کہا۔

''آپ کا مریض تو ابھی تک سو رہا ہے۔ جگا دوں اسے؟''

حکیم صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جگا ہی دو تو اچھا ہے۔ اس کے لیے مناسب نہیں کہ بھوکا پڑا سوتا رہے۔ ناشتا تیار کر لیا اس کے لیے؟''

''بس پراٹھا ڈالنا باقی ہے ابا سائیں۔''

ماروی جواب دے کر باورچی خانے کی طرف لپک گئی۔ اس نے واقعی باقی سب کچھ تیار رکھا تھا۔ سب چیزیں ایک طباق میں رکھی ہوئی تھیں۔ دہی، دودھ، بالائی، میٹھی چٹنی اور وہ سب کچھ جو گھر میں تھا اور جو ناشتے میں کھایا جا سکتا تھا۔ وہ گھی ملا کے آٹا بھی گوندھ چکی تھی۔ اس نے توا چولھے پر رکھا، پھر باورچی خانے سے نکل کر شہری نوجوان کے کمرے میں جھانکا۔

وہ جاگ چکا تھا اور اب بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ ماروی کمرے میں داخل ہوئی۔ نوجوان چونکا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

ماروی شرارت سے بولی۔ ''توہان جو چھا حال آ ہے؟''

نوجوان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ بولا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔ تم یقیناً سندھی بولی ہو۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن مفہوم سمجھ میں آ گیا۔''

''سندھی سیکھو گے؟''

''یہاں زیادہ عرصے رہ گیا تو سیکھ ہی لوں گا۔''

''لو، میں باتوں میں لگ گئی۔ ناشتا بس تیار ہے تمہارا۔ ابھی آئی پانچ منٹ میں، منہ ہاتھ بعد میں دھو لینا۔ ابھی تو بس دو ایک کلیاں کر لو اگال دان میں۔''

''اگال دان؟''

''ہاں، پلنگ کے نیچے ہے۔'' ماروی نے خود ہی جھک کر اگال دان نکال دیا۔

''گاؤں میں یہ سب کچھ بھی ہوتا ہے۔'' نوجوان حیرت سے بولا۔

''کم از کم ہمارے گھر میں تم ایسی بہت سی چیزیں دیکھو گے جو گاؤں کے کسی گھر میں نہیں ہوں گی۔ لو، میں پھر بک بک کرنے لگی۔ میں تمہارے لیے ناشتا لے کر آتی ہوں۔''

ماروی کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں پہنچی۔

ذرا دیر بعد ناشتے کا طباق نوجوان کے سامنے تھا۔

''کیا مطلب؟'' نوجوان کے منہ سے نکلا۔ ''یہ سب کچھ صرف میرے لیے ہے؟''

''ہاؤ۔''

''یہ میرے بس کی بات نہیں۔''

''ابا سائیں کا حکم ہے، سائیں شہر جو۔''

''ان سے کہو، پہلے میرا ہاضمہ اتنا بڑھا ئیں۔''

''تم شروع تو کرو۔''

نوجوان نے بہ مشکل آدھا پراٹھا بالائی سے کھا کر دودھ پی لیا۔

''اس سے زیادہ کھاؤں گا تو پیٹ پھٹ جائے گا۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ پھر اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”چائے نہیں مل سکتی کیا؟“

”چائے یاد ہے تمہیں؟“

”بہت کچھ یاد ہے، اور کچھ بھی یاد نہیں ہے۔“ نوجوان نے ٹھنڈی سانس لی۔

”گاؤں میں تو چائے کا رواج بڑھتا جارہا ہے لیکن ابا سائیں کو پسند نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بس کبھی دل چاہے تو پی لو ورنہ نہیں۔ اب تم کہتے ہو تو بنا لاتی ہوں۔“

ماروی پانچ منٹ میں چائے بنا کر لے آئی۔

”تم نہیں پیو گی؟“ نوجوان نے پوچھا۔

ماروی نے نفی میں سر ہلایا، پھر بولی۔ ”تمہارے لیے ناشتا لانے سے پہلے میں نے جھانک کر دیکھا تھا۔ تم جاگ گئے تھے۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ سوچ رہے تھے۔ کیا سوچ رہے تھے؟“

نوجوان کے چہرے پر گمبھیرتا چھا گئی۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ”میں نے پھر ایک خواب دیکھا تھا۔“

”کیا؟“ ماروی چونکی۔ اس نے تیزی سے پوچھا۔ ”کیا دیکھا تھا خواب میں؟“

نوجوان نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ خواب دیکھنے کے بعد مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا پہلا خواب بھی سچا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ماضی میں وہ سب کچھ میرے ساتھ واقعی ہوا تھا۔“

”دوبارہ کیا خواب دیکھا؟“ ماروی نے بے تابی سے پوچھا۔

نوجوان ماروی کی طرف دیکھے بغیر گم صم انداز میں کہنے لگا۔ ”میں غالباً بے ہوش تھا اور پانی میں ڈوبتا چلا جارہا تھا۔ میرے سر سے بہتا ہوا خون پانی میں بہتا اور غائب ہوتا جارہا تھا۔ یک بہ یک مجھے ہوش آگیا۔ کیسے آگیا، کیوں آگیا، یہ میں نہیں جانتا۔ میں بے تحاشا ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اس وقت مجھے اپنے سر کی تکلیف کا بالکل احساس نہیں تھا۔ یہ خیال بھی نہیں تھا کہ میں کون ہوں، کہاں ہوں۔ حواس بالکل پراگندہ تھے۔ زندگی بچانے کی جبلت تھی کہ میں ہاتھ پیر مارنے لگا۔ میں کسی نہ کسی طرح سطح سمندر پر آگیا۔ میں سمندر میں ڈوب رہا تھا لیکن قدرت مجھے ہوش میں لے آئی۔“

ماروی ساکت بیٹھی نوجوان کا منہ تکے جارہی تھی۔

نوجوان سوچ میں ڈوبے لہجے میں پھر بولنے لگا۔ ”نہ جانے کہاں سے ایک تختہ بہتا چلا آرہا تھا۔ وہ اس طرح میرے ہاتھ میں آگیا جیسے کسی فرشتے نے مجھے سہارا دے دیا ہو۔ میں اس تختے کے سہارے کسی جانب بہنے لگا۔ دھیرے دھیرے میرے حواس بحال ہونے لگے۔ میں سر کی تکلیف کے باوجود سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ اب یہ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا تھا۔ میرے دماغ میں کیا خیال گردش کررہے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں اس تختے کے سہارے کب تک بہتا رہا تھا۔ ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ ایک جانب سے ایک سرکش موج آئی اور مجھ سے ٹکرا گئی۔ تختہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے سمندر میں ایک غوطہ کھایا لیکن پھر فوراً ہی ہاتھ پیر چلا کر سطح پر آگیا۔ میں نے ایک طرف تیرنا شروع کردیا۔“

”تیرنا آتا ہے تمہیں؟“ ماروی بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

نوجوان اس طرح چونکا جیسے اس دورانیے میں ماروی کو بالکل بھولا رہا ہو۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے تیرنا آتا ہے یا نہیں آتا لیکن خواب میں تو میں تیر ہی رہا تھا۔“

اس وقت ماروی نے ایک جھرجھری سی لی۔ وہ بھی بھول ہی گئی تھی کہ وہ کوئی واقعہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ سب کچھ ایک خواب تھا۔

”اچھا!“ اس نے ایک طویل سانس لی۔ ”تو تم تیرتے رہے؟“

نوجوان اس وقت چائے کا گھونٹ لے رہا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں تیرتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم، میں کتنی دیر تک تیرتا رہا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا ایک پیر زمین سے ٹکرایا تھا۔“

”تو تم ساحل پر آگئے تھے؟“ ماروی جلدی سے بولی۔

”ہاں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔ ”میں ساحل پر پہنچ گیا، ہاں یہ کہو کہ میں ساحل کے قریب تھا۔ میں اپنے قدموں پر چلتا ہوا ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ کمزوری اور پانی کے دباؤ کی وجہ سے میں کئی مرتبہ پانی میں گرا اور پھر اٹھ کر چلنے لگا۔“

نوجوان خاموش ہوگیا۔

ماروی چند لمحے انتظار کے بعد بولی۔ ”پھر کیا ہوا؟ تم ساحل پر پہنچ گئے نا؟“

”خواب میں نے یہیں تک دیکھا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

"تو... تو... تو یہ..." ماروی ہیجانی سے انداز میں بولی۔ "تو یہ تمہارے پہلے خواب کا دوسرا حصہ تھا؟"

"شاید۔" نوجوان پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

"ابا سائیں کو بلاتی ہوں۔ انہیں بھی سناؤ یہ دوسرا خواب۔"

نوجوان کی نظریں اس وقت دروازے کی طرف گئیں اور اس کی مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی۔ "حکیم صاحب کی عمر بہت بڑی ہے۔ ابھی ان کا نام آیا اور ابھی وہ آ گئے۔"

قدموں کی آہٹ ماروی نے بھی سن لی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

"کیوں بھئی۔" حکیم صاحب ہلکی سی ہنسی کے ساتھ قریب آتے ہوئے بولے۔ "کیوں آیا تھا میرا نام؟" پھر انہوں نے پوچھا۔ "ناشتا کر لیا ٹھیک سے؟"

"ابا سائیں!" ماروی جلدی سے بولی۔ "انہوں نے ایک خواب اور دیکھا ہے۔"

حکیم صاحب کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو گئی۔ وہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ قریب آئے اور نوجوان کے بستر ہی پر بیٹھ گئے۔

"اب کیا خواب دیکھ لیا تم نے؟" انہوں نے پوچھا۔

نوجوان نے وہ سب کچھ دہرا دیا جو وہ ماروی کو بتا چکا تھا۔

حکیم صاحب نے تحمل سے سنا اور سوچ میں ڈوب گئے۔

"اب آپ کیا تبصرہ کریں گے حکیم صاحب؟" نوجوان سے صبر نہ ہو سکا اور وہ پوچھ بیٹھا۔

حکیم صاحب مسکرائے۔ ماروی بہرحال ان کی بیٹی تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ مسکراہٹ مصنوعی تھی۔

حکیم صاحب نے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا، خواب بہرحال خواب ہوتے ہیں۔ لازم نہیں کہ وہ مبنی بر حقیقت ہوں مگر کبھی کبھی ان میں کچھ سچائی بھی ہوتی ہے۔ تمہارے دماغ میں جو خیال گردش کر رہا ہے، وہ میں نے پڑھ لیا ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ جب تک تمہارے سر کا زخم ٹھیک نہ ہو جائے، تم زیادہ فکر و تردد نہ کرو۔ جو خواب دیکھو، اسے بس یاد رکھو۔ جو اہم خیال دماغ میں آئے، اسے بھی فراموش نہ کرو۔ اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ تمہاری یادداشت جلد واپس آ جائے گی اور یہ ساری باتیں آسانی سے تمہاری سمجھ میں آ جائیں گی۔ بس یہ سب کچھ مجھے بتاتے رہنا۔ میں غور کرتا رہوں گا۔"

نوجوان نے طویل سانس لی۔ "تو میں یہ نہ سوچوں کہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی؟"

حکیم صاحب بولے۔ "میں تمہاری سوچ پر کوئی قدغن نہیں لگانا چاہتا۔"

وہ کچھ اور بھی کہتے لیکن اسی وقت نذیرو آ گیا۔ اس نے ایک مریضہ کی آمد کی اطلاع دی۔

"ہوں، چلو۔" حکیم صاحب نے اس سے کہا۔ "ہاں اجو آ یم۔"

نذیرو چلا گیا۔

"تین مریضوں کو نمٹا کر آیا تھا۔" حکیم صاحب نے ماروی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نذیرو سے کہہ دیا تھا کہ کوئی آئے تو وہ مجھے اطلاع دے دے۔" پھر وہ نوجوان کی طرف متوجہ ہوئے۔ "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم سوچو ضرور! یہ تو دماغ کا ایک قدرتی فعل ہے۔ کوشش بس یہ کرو کہ دماغ پر زیادہ بوجھ نہ پڑنے دو۔ اس سے سر میں تکلیف ہو گی۔ اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنا۔ خواب تو ویسے بھی من و عن درست نہیں ہوتے۔"

نوجوان نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ حکیم صاحب سے کم از کم خواب کے معاملے میں متفق نہیں تھا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔" حکیم صاحب بولے۔ "کوئی مریضہ آ گئی ہے۔"

"کیا میرے سر کی پٹی بدلے گی نہیں؟" نوجوان نے پوچھا۔

"بدلے گی۔" حکیم صاحب نے رک کر جواب دیا۔ "لیکن ابھی نہیں، کل دوپہر کو۔ یہ سارا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس اپنی خوراک کا خیال رکھو۔ جسمانی صحت بہت ضروری ہے۔ میں تمہیں ایک ایسی دوا بھی دے رہا ہوں جس سے تمہاری بھوک زیادہ سے زیادہ کھل سکے اور ہاضمہ بھی درست رہے۔"

"اس وقت تو میرے پاس کوئی دوا نہیں ہے۔"

"نذیرو تیار کر رہا ہے۔ ابھی بھجواتا ہوں۔" حکیم صاحب نے کہا، پھر ماروی سے بولے۔ "تم چلو میرے ساتھ، دوا لے آنا۔"

ماروی فوراً حکیم صاحب کے ساتھ کمرے سے نکلی اور بہت دھیمی آواز میں بولی۔ "ابا سائیں! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میری طرح آپ کو بھی اس کے دونوں خواب بالکل

"بچے لگ رہے ہیں۔"

حکیم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اس کے ذہن میں نہ بیٹھ جائے کہ اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ بہت منتشر ہو جائے گا۔"

"وہ تو مجھے لگتا ہے کہ اس کے دماغ میں بیٹھ گئی ہے۔"

"تم کوشش کرنا کہ اس کا دھیان بٹ سکے۔"

یہ گفتگو زیادہ آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ وہ کارخانۂ حکمت میں داخل ہو چکے تھے اور حکیم صاحب کو اپنی مریضہ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

ماروی نے دوا کی پیالی لیتے ہوئے نذیرو کو آنکھ ماری۔ وہ گھبرا کر حکیم صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ ماروی مسکراتی ہوئی دروازے کی طرف مڑ گئی۔ نذیرو کو چھیڑنے میں اسے بہت مزہ آتا تھا مگر اس وقت یکایک اس کے دماغ میں ایک ایسا خیال آیا کہ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے شہری سائیں سے محبت ہو گئی ہے اور نذیرو اسے چاہتا ہے۔ یہ معاملہ آخر کیسے چلے گا؟

☆☆☆

نوجوان خود کو اتنا کمزور نہیں سمجھ رہا تھا کہ چلنے پھرنے سے بالکل قاصر رہے لیکن حکیم صاحب کا حکم تھا کہ دو دن تک وہ بستر سے بس اتنا اٹھے جو حوائج ضروریہ کا تقاضا تھا۔ نوجوان سے اس حکم کی تعمیل کرانے کے لیے ماروی موجود تھی۔ دو دن بعد نوجوان کو اپنے کمرے کی حد تک چہل قدمی کی اجازت مل گئی۔ ماروی زیادہ تر اس پر مسلط رہتی۔ نورا اس کے لیے ابن صفی کا نیا ناول لے آیا تھا۔ وہ اسے بہ آواز بلند پڑھ کر سناتی رہتی، کبھی اسے سندھی زبان کے الفاظ کے معنی یاد کرانے بیٹھ جاتی۔ اس کا مسخرا پن کبھی کبھی نوجوان کو بے تحاشا ہنسا دیتا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ حکیم صاحب نے اس کی صحت کے لیے نہ جانے کیا کچھ کر ڈالا تھا کہ اس کے چہرے پر سرخی دوڑنے لگی۔ وہ خود بھی اب اپنے آپ کو خاصا توانا محسوس کرنے لگا تھا۔

آٹھویں دن ماروی نے اس سے کہا۔ "آج ماں توہانجو گاؤں جی سیر کرٹ لے چلوں گی۔" وہ اپنی آدھی سندھی اور آدھی اردو پر خود ہی زور سے ہنس پڑی۔

نوجوان مسکرایا۔ "تم مجھے کئی سندھی لفظ سکھا چکی ہو۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا... تم آج مجھے گاؤں کی سیر کرانے لے جاؤ گی اگر..."

"مگر؟"

"کڈھن؟"

"ماں صدقے۔" ماروی نے بڑی بوڑھیوں کی طرح اپنی انگلیاں کنپٹیوں پر رکھ کر چٹخائیں۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ "تم بہت جلدی سندھی سیکھ جاؤ گے۔"

"میری بات کا جواب تو دو، کب لے چلوگی؟"

"ہاڑیں۔" ماروی نے سندھی میں کہا، پھر اردو میں بولی۔ "بس جلدی سے کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔"

"کپڑے ٹھیک تو ہیں۔"

"قمیص کے کالر پر دھبے لگ گئے ہیں۔ ابا سائیں نے آج پٹی بدلی تھی نا۔"

اس دن نوجوان کے سر کی پٹی چوتھی بار بدلی گئی تھی۔

"نیا سوٹ پہن لو۔" ماروی پھر بولی۔

حکیم صاحب نے کسی کے ذریعے شہر سے نوجوان کے لیے تین شلوار سوٹ، ایک چپل اور موکیشن جوتا منگوا دیا تھا۔ نوجوان نے اس پر احتجاج کیا تھا کہ حکیم صاحب اس پر اتنے اخراجات نہ کریں لیکن حکیم صاحب نے اسے بڑی شفقت سے سمجھا دیا تھا کہ وہ اس کے لیے بیٹے جیسا ہے اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

ماروی کے کہنے پر جب وہ نیا شلوار سوٹ پہننے کے لیے تیار ہو گیا تو ماروی نے کہا۔ "میں باہر کھڑی ہوں۔ کپڑے بدل کر مجھے پکار لینا۔"

نوجوان نے سر ہلا دیا۔ ماروی باہر نکل کر دروازے کے قریب ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کے دماغ میں نوجوان سے اپنی محبت کے حوالے سے متعدد خیالات گردش کر رہے تھے پھر وہ اس وقت چونکی جب نوجوان کی آواز آئی۔

"میں تیار ہو گیا ماروی۔"

ماروی کمرے میں داخل ہوئی۔ نوجوان اب ہلکے نیلے شلوار سوٹ میں تھا جس کے کرتے پر سرخ کڑھائی کی گئی تھی۔ شلوار کے پائنچے بھی بڑے بڑے تھے۔ وہ خالص سندھی طرز کا سوٹ حکیم صاحب نے ایک ہی منگوایا تھا۔ اس کے ساتھ سندھی ٹوپی بھی منگوائی تھی لیکن سر پر بندھی ہوئی پٹی کی وجہ سے فی الحال ٹوپی پہننا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

"بہت اچھے لگ رہے ہو۔" ماروی چہکی۔

"گاؤں سے پہلے تو میں تمہارا گھر دیکھوں گا۔" نوجوان نے کہا۔

"ضرور۔" ماروی نے کہا۔

وہ نوجوان کو لے کر باہر نکلی۔

حکیم صاحب کا گھر چھوٹا سا تھا۔ کارخانۂ حکمت کی کشادگی بھی بارہ بائی چودہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ باقی دونوں کمرے لگ بھگ آٹھ بائی دس کے ہو سکتے تھے مگر ان کمروں کے ساتھ باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ بھی تھے۔

ماروی نے نوجوان کو بڑے فخر سے بتایا کہ گھر دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ کسی گاؤں میں ہوگا۔

ماروی نے نوجوان کو اپنا کمرا بھی دکھایا۔

"یہ کیا رکھا ہے؟" نوجوان نے ایک گوشے میں رکھی ہوئی بوری کی طرف اشارہ کیا۔

ماروی منہ بنا کر بولی۔ "یہ نورا، ابا سائیں سے ڈانٹ کھائے گا۔ ایک ہفتہ ہوگیا اس سے کہے ہوئے کہ یہ بوری سمندر میں پھینک آئے۔"

"اس میں ہے کیا؟" نوجوان بوری کے قریب چلا گیا۔

ماروی اسے بتانے لگی کہ اس نے سارے رومانی ناول اور رسالے اس بوری میں بھر دیے تھے۔ ابا سائیں کو پتا چلا تو وہ بہت زیادہ ناراض ہوں گے اس لیے اس نے پہلے ہی تمام رسالے اور رومانی ناول ٹھکانے لگانے کا سوچ لیا تھا۔

ماروی جب بول رہی تھی تو نوجوان نے بوری میں اوپر ہی پڑا ہوا ایک رسالہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس رسالے میں کراچی میں ہونے والی ایک خوفناک بارش کے بارے میں مضمون تھا۔ پانی سے بھری ہوئی سڑکوں اور محلوں کی کئی تصویریں بھی تھیں۔ ایک تصویر پر نوجوان کی نظریں ٹھٹک گئیں۔ وہ کسی سڑک کی تصویر تھی۔ تصویر میں سڑک کی دکانیں وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں ایک بینک بھی تھا۔ نوجوان کی نظر اس بینک پر ہی جمی ہوئی تھی اور اس کے دماغ میں کئی جھماکے ہو چکے تھے۔

ماروی نے اس کی متغیر حالت محسوس کر لی۔ "کیا بات ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

نوجوان نے چونک کر رسالہ بند کر دیا۔ اس کی سانسیں کچھ غیر ہموار ہوگئی تھیں۔ پیشانی پر پسینا چمکنے لگا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" ماروی نے تشویش سے کہا۔ "تم کمرے میں چل کر لیٹو۔ میں ابا سائیں کو خبر کرتی ہوں۔"

"ارے نہیں۔" نوجوان زبردستی ہنسا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ اب ہم گاؤں گھومنے چلیں گے۔" پھر اس نے پوچھا۔ "یہ رسالہ میں لے لوں؟ پڑھوں گا۔"

"لے لو۔" ماروی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری طبیعت واقعی بالکل ٹھیک ہے؟"

"ہاں ہاں۔" نوجوان پھر ہنسا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اچھا۔" ماروی سوچتے ہوئے بولی۔ "تو چلو۔"

"یہ رسالہ کمرے میں رکھ دیتا ہوں۔"

"رکھ دو، لیکن ابا سائیں کو یہی بتانا کہ یہ تم نے خود لیا ہے۔ یہ مت کہنا کہ میں نے دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" نوجوان نے سر ہلا دیا۔

اس نے رسالہ اپنے کمرے میں رکھا اور ماروی کے ساتھ گھر سے نکلا۔

حکیم صاحب اس وقت اپنے مریضوں کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ نوجوان کو اپنا کمرا دکھانے سے پہلے، ماروی نوجوان کو وہیں لے گئی تھی اور اس نے حکیم صاحب کو بتایا تھا کہ وہ انہی کی ہدایت کے مطابق ان کے مریض کو گاؤں دکھانے لے جا رہی تھی۔

اس وقت نذیرو نے نوجوان کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا اور ماروی اس کے اس انداز سے بے خبر نہیں تھی۔

گاؤں میں ماروی کے ساتھ ایک طرف بڑھتے ہوئے نوجوان کو اندازہ ہوا کہ حکیم صاحب کا مکان اس گاؤں میں ایک عجوبہ ہی تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے سب گھر گارے، لکڑی اور کھجور کی چھال سے بنے ہوئے تھے۔

راہ میں گاؤں کے لوگ بھی ملتے رہے۔ انہوں نے سندھی زبان میں اس پر خوشی کا اظہار بھی کیا کہ اجنبی نوجوان شہری کے سر کا زخم اب کافی مندمل ہوگیا تھا۔ انہوں نے حکیم صاحب کی تعریفیں بھی کیں جن کے پاس حکمت کے نہایت قدیم نسخے تھے جو تیر بہ ہدف ثابت ہوتے تھے۔

حکیم صاحب کا قائل تو نوجوان بھی ہو چکا تھا۔ صرف ایک ہفتے بعد اس کے سر کے زخم میں ذرا بھی تکلیف نہیں رہی تھی۔ صرف ہاتھ لگانے ہی سے اس کا اندازہ ہوتا تھا۔

گاؤں میں ماروی کا سامنا اپنی سہیلیوں سے بھی ہوا۔ ان میں سے دو ایک نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کچھ ایسے فقرے بھی کہے کہ جواب میں ماروی نے کسی کو منہ چڑایا اور کسی کو مکا دکھا کر مارنے کی دھمکی دی۔ وہ فقرے بازیاں کیونکہ سندھی میں

ہوئی تھیں اس لیے نوجوان کی سمجھ میں زیادہ نہیں آسکیں۔

دو گھنٹوں میں وہ دونوں سارا گاؤں گھوم کر واپس آ گئے۔ اس وقت حکیم صاحب دوپہر کے کھانے کے لیے ان کا انتظار کر رہے تھے۔

کھانے کے بعد انھوں نے ہدایت کی کہ اب سب کو آرام کرنا چاہیے۔

ماروی اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ اب اس کا بیشتر وقت اس نوجوان کے بارے میں سوچتے ہوئے ہی گزرتا تھا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں شروع ہی سے چبھتا رہا تھا کہ وہ نوجوان سمندر میں آخر کتنی دیر تک تیرتا رہا ہوگا، لیکن اب وہ یقین کر سکتی تھی کہ وہ نوجوان عام لوگوں سے زیادہ دیر تک تیر سکتا تھا۔ اس کا جسم ورزشی اور بازوؤں کے پٹھوں میں بلا کا کساؤ تھا۔ زخم سے خون بہہ جانے کے بعد اس کی نقاہت اب ختم ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ زخم لگنے سے پہلے وہ زیادہ ہی طاقتور ہوگا۔

اسے ایک ماہی گیر نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

ماروی کے دماغ میں یہ سوال بھی چبھتا رہا تھا کہ کسی ماہی گیر کو اس نوجوان سے آخر کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟

اس سوال کے جواب میں ماروی کا دماغ کسی ایسے شخص کے بارے میں سوچنے لگا جو شاید اس نوجوان کا بڑا بھائی ہو، لیکن اس خیال کو وہ اپنے ذہن سے جھٹک دیتی تھی کہ ان دونوں کا اختلاف کسی لڑکی کی وجہ سے ہوگا۔

اس نوجوان سے کسی لڑکی کی وابستگی کا تصور بھی اب ماروی کے لیے اذیت ناک بن چکا تھا۔

ان خیالات میں ڈوبے ڈوبے اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ جب وہ اس غنودگی سے چونکی تو سلاخوں دار کھڑکی کے باہر کی فضا نے اسے احساس دلایا کہ سہ پہر گزر چکی تھی۔

ایسی ہی سہ پہریں، شامیں اور راتیں گزرتی رہیں۔

آخر نوجوان کے سر کا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا۔ حکیم صاحب نے اس کی آخری پٹی کھلنے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "اب پٹی کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن ابھی اس جگہ کھجانا مت، دو ایک دن میں کھرنڈ آجائے گا۔ اسے بھی نوچنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ خود ہی اکھڑ جائے گا۔"

ماروی اسے روزانہ ہی گھر سے باہر لے جاتی تھی۔ اِدھر اُدھر گھماتی رہتی۔ نوجوان نے سارا گاؤں دیکھ لیا تھا۔ مسجد، دکانیں، کوڑا کنڈی جہاں گاؤں والے سارا کوڑا لے جاکر پھینکتے تھے۔ ایک مرتبہ ماروی اسے پولیس چوکی کی طرف بھی لے گئی جو اس گاؤں میں اس کی آمد کے ایک دن بعد ہی قائم ہو گئی تھی لیکن پولیس والوں نے حکیم صاحب کے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

وہ اسے ساحلِ سمندر کے اس حصے میں بھی لے گئی جہاں وہ بے ہوش پڑا ملا تھا۔ لیکن وہ اسے زیادہ تر تورا کے باپ کے کھجوروں کے باغ میں لے جایا کرتی تھی جہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بہانے کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ اس سے باتیں کیا کرتی تھی۔

"اب میں ٹھیک ہو چکا ہوں۔" نوجوان نے ماروی سے اس دن کہا جب اس کے سر کا کھرنڈ خود ہی اکھڑنے... لگا تھا۔

یہ بات اس نے ماروی سے اس شام کہی جب وہ کھجوروں کے باغ سے گھر کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔

"تو پھر؟" ماروی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

نوجوان نے کہا۔ "اب مجھے اپنے ماضی کا کھوج لگانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"

"کیا کرو گے؟"

"جس دن سے پٹی اتری ہے، یہی سوچ رہا ہوں لیکن آج صبح سے میرے دماغ میں یہ خیال آرہا ہے کہ مجھے...."

اسے خاموش ہو جانا پڑا۔ ایک لینڈ کروزر اتنی تیزی سے کچی سڑک پر چلی آرہی تھی کہ دھول کا اچھا خاصا غبار اٹھ رہا تھا۔

وہ کچی سڑک گاؤں اور کھجوروں کے باغ کے درمیان میں تھی۔

ماروی اور نوجوان رک گئے تاکہ لینڈ کروزر گزر جائے لیکن گزر جانے کے بجائے وہ ایک جھٹکے سے رکی۔ ماروی اور نوجوان سے اس کا فاصلہ بہت کم تھا لیکن وہ دونوں یہ دیکھنے سے قاصر رہے کہ اس لینڈ کروزر میں کتنے لوگ بیٹھے تھے۔ اس گاڑی کے شیشے تاریک تھے۔

وہ بمشکل پندرہ سیکنڈ رک کر پھر حرکت میں آئی اور تیزی سے نکلتی چلی گئی۔ اب تک نوجوان نے اس گاؤں میں چند موٹر سائیکلیں اور دو تین سوزوکی ہی دیکھی تھیں۔

"یہ گاڑی۔" نوجوان سوچتا ہوا بولا۔ "یہ رکی کیوں تھی؟ یہ مجھے نظر بھی پہلی بار آئی ہے۔"

ماروی نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اتفاق ہے کہ تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ یہ حماد سائیں کی گاڑی ہے۔

دھاروسائیں اور اس کے چیلے ہی ہوں گے اس میں! دھارو سائیں شاید تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر رکا ہوگا اور اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ تم ہی ہو جس کے بارے میں ابا سائیں نے اس سے بات کی تھی۔''

ماروی کے ساتھ نوجوان بھی قدم بڑھانے لگا۔

''تمہارے دھاروسائیں کا نام کیا ہے؟'' وہ یونہی پوچھ بیٹھا۔

''حشمت ابڑو۔''

''کیا؟'' نوجوان چونکا۔

''حشمت ابڑو۔''

نوجوان کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اس قسم کے جھماکے اس کے دماغ میں کئی مواقع پر ہو چکے تھے۔

''حشمت ابڑو۔'' نوجوان زیرلب بڑبڑایا۔

''کیا تم اس نام کے کسی ..... آدمی کو جانتے ہو؟''

''مجھے محسوس ہوا تھا جیسے یہ نام میں نے پہلے بھی سنا ہو۔''

نوجوان کا یہ احساس غلط نہیں تھا۔ لینڈ کروزر میں بیٹھا ہوا حشمت ابڑو بھی اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ گاڑی اسی نے رکوائی تھی۔ وہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی تھیں۔

گاڑی جب دوبارہ حرکت میں آئی تھی تو حشمت ابڑو نے فوراً اپنے موبائل فون پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے اپنا موبائل بند کر رکھا تھا۔ حشمت ابڑو زیرلب کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

''کیا بات ہے سائیں؟'' حشمت ابڑو کے منہ چڑھے ''کم دار'' جیرا نے پوچھا۔ ''کوئی پریشانی کی بات ہے کیا؟''

حشمت ابڑو نے اسے بڑی تیکھی نظروں سے دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس وقت اپنے خیالات میں کسی کی رخنہ اندازی برداشت نہ کرنا چاہتا ہو۔

''معافی سائیں!'' جیرا نے آہستہ سے کہا اور خاموشی اختیار کر لی۔

لینڈ کروزر میں تین کم دار اور بھی بیٹھے تھے۔ وہ معنی خیز نظروں سے جیرا کی طرف دیکھنے لگے۔

حویلی پہنچنے میں لینڈ کروزر کو پانچ منٹ بھی نہیں لگے لیکن اس دوران میں اس نے موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے کی ایک ناکام کوشش اور کر ڈالی تھی۔

تیسری کوشش اس نے حویلی میں پہنچ کر کی، اور اس مرتبہ وہ کامیاب رہا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی اور پھر ایک آواز آئی۔

''کیا بات ہے سائیں؟ خیریت تو ہے نا سب؟''

حشمت ابڑو غرایا۔ ''مجھے یہ غلط اطلاع کیوں دی گئی تھی کہ کوکب کو قتل کروا دیا گیا ہے؟''

دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز سنائی دی، پھر کہا گیا۔ ''یہ خیال تمہیں کیوں آ گیا سائیں کہ تمہیں غلط اطلاع دی گئی تھی؟''

''تم نے اسے کس طرح قتل کیا تھا؟''

''میں نے خود نہیں کیا تھا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں، اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کر سکتا۔ ہم نے دواؤں کی اسمگلنگ کے لیے اپنے جن لوگوں کو ماہی گیر بنایا ہے، انہی میں سے ایک کے حوالے کیا تھا کوکب کو۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ ٹریلر کو سمندر میں بہت دور لے جا کر کوکب کو ختم کرے اور اس کی لاش سمندر میں پھینک دے۔ اسی نے یہ کام کیا تھا۔ اب تک تو سمندر میں اس کی سڑی گلی لاش بھی نہیں ہوگی۔ مچھلیاں اسے کھا چکی ہوں گی۔'' پھر ہنس کر کہا گیا۔ ''اس کی ہڈیاں بھی شاید بڑی مچھلیوں نے نگل لی ہوں۔''

حشمت ابڑو کے چہرے سے غصہ اور جھلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی لیکن اس نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اسے قتل کس طرح کیا گیا تھا؟''

''مانجو نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے کلہاڑے سے کوکب کے سر پر اتنا کاری وار کیا تھا کہ وہ اپنے خون میں نہائے ہوئے خود ہی سمندر میں جا گرا تھا۔''

''بہت کاری وار۔'' حشمت ابڑو نے تلخی سے کہا۔ ''اتنا کاری کہ وہ اب تک زندہ ہے۔''

''اچھا!'' دوسری طرف سے پھر ہنس کر کہا گیا۔ ''یہ اطلاع تمہیں کہاں سے مل گئی سائیں؟''

''اطلاع نہیں ملی، میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو سائیں!'' اس مرتبہ دوسری طرف سے بولنے والا سنجیدہ ہو گیا۔

''وہ میرے ہی گاؤں میں موجود ہے۔'' حشمت ابڑو نے بتایا۔ ''وہ گاؤں والوں کو ساحل پر بے ہوش پڑا ملا تھا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ گاؤں کے ایک حکیم نے

اس کا علاج کیا اور اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔"
"ہاں۔" دوسری طرف سے ایک طویل سانس لے کر کہا گیا۔ "میں ابھی جا کے مانجو کی خبر لیتا ہوں۔ تمہیں یقین ہے نا سائیں کہ وہ کوکب ہے؟"
"میں اس پر پہلی نظر پڑتے ہی چونک پڑا تھا پھر میں نے اسے غور سے دیکھنے کے لیے اپنی گاڑی رکوائی تھی۔ وہ مقامی لباس پہنے ہوئے تھا اس لیے مجھے خیال آیا تھا کہ میری آنکھیں دھوکا نہ کھا گئی ہوں لیکن میں نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا۔ وہ کوکب کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ جو حالات میرے علم میں آئے ہیں، ان کی وجہ سے بھی یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوکب ہی ہوگا۔"
"اگر ایسا ہے تو وہ بھی تمہیں دیکھ کر چونک گیا ہوگا۔ وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھ چکا ہے۔"
"اس نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں اپنی گاڑی میں تھا جس کے شیشے تاریک ہیں۔"
"لیکن اگر وہ اتنے دن سے وہاں ہے تو اس نے کسی سے تمہارا نام بھی تو سن لیا ہوگا؟"
"شاید سن لیا ہو مگر اس سے اب تک کوئی فرق نہیں پڑا۔ دراصل وہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔" حشمت ابڑو نے کہا۔ "میں اپنے گاؤں کے حالات سے بے خبر نہیں رہتا۔ حکیم نے تو یہ بات چھپائی تھی لیکن اس کی ایک لڑکی ہے۔ ماروی نام ہے اس کا۔ بہت بولتی ہے۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کو بتا دیا تھا۔ اس کی سہیلی نے اپنے باپ کو بتا دیا۔ اس طرح یہ بات گاؤں میں پھیلی تو مجھے بھی معلوم ہو گئی۔"
"شاید سر کی چوٹ کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی ہو۔" دوسری طرف سے متفکر لہجے میں کہا گیا۔ "لیکن یادداشت واپس بھی آ سکتی ہے۔"
"اس کی یادداشت واپس آنے سے پہلے اسے ختم کر دیا جائے گا۔" حشمت ابڑو نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔ "آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔"
"اگر تم خود یہ کام کروا سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں یہاں سے کسی کو بھیجتا۔"
"نہیں جمیل سائیں!" حشمت ابڑو نے منہ بنا کر کہا۔ "اب میں تمہارے کیا، اپنے آدمیوں پر بھی یقین نہیں کروں گا۔ میں اسے آج رات صرف اغوا کرواؤں گا۔ یہاں اپنے سامنے اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کرواؤں گا اور اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہی زمین میں دفن کرواؤں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ تم یہ کام کروا ڈالو۔ یہاں میں مانجو کی خبر لیتا ہوں کہ اس نے اتنا اوچھا وار کیوں کیا تھا؟"
حشمت ابڑو نے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کیا اور جیرا کو آواز دی۔ جیرا نے حاضر ہونے میں دیر نہیں لگائی۔
حشمت ابڑو نے اس سے کہا۔ "اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں نے راستے میں رک کر اسے غور سے کیوں دیکھا تھا۔"
"وہی تو حکیم سائیں کا مریض مہمان ہے۔ ماروی کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔"
"آج آدھی رات کے بعد اسے اغوا کر کے حویلی میں لے آؤ۔"
"ماروی کو؟" جیرا کچھ خوش ہو گیا کیونکہ شیر کا بچا کھچا گیدڑوں کو مل جاتا تھا۔
"میں اس آدمی کی بات کر رہا ہوں۔" حشمت ابڑو نے ڈپٹ کر کہا۔
"او، اچھا! ٹھیک ہے سائیں! میں آدھی رات کو یہ کام کر ڈالوں گا۔ اپنے ساتھ تین آدمی لے جاؤں گا۔ زیادہ آدمیوں کی ضرورت بھی نہیں ہے مگر سائیں! حکیم رکاوٹ ڈالے گا۔ آپ اس کی عزت بھی بہت کرتے ہیں۔"
"اس معاملے میں تو مجھے حکیم سائیں کی بھی پروا نہیں۔ تم ان کے ساتھ کوئی بھی سلوک کرو، میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ بس اس کا مریض مہمان آج رات کو میرے سامنے ہونا چاہیے۔"
"وہ ہوگا سائیں۔" جیرا نے بڑے اعتماد سے کہا۔
"حکیم کو یا کسی کو بھی تم لوگوں کے چہرے دکھائی نہ دیں۔" حشمت ابڑو نے تاکید کی۔

☆☆☆

اس دن آخری مریض سے حکیم صاحب کا پیچھا اس وقت چھوٹا جب رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ انہوں نے نذیرو کو رخصت کیا پھر ماروی کو آواز دے کر اس سے کھانا نکالنے کے لیے کہا، پھر کارخانۂ حکمت کا بیرونی دروازہ بند کرنے لگے۔
جب سے حکیم صاحب نے نوجوان مریض کو چلنے پھرنے کی اجازت دی تھی، اس کے بعد سے وہ ان کے اور ماروی کے ساتھ ہی کھانا کھایا کرتا تھا۔ کھانے کا دسترخوان ماروی کے کمرے میں لگا کرتا تھا۔
حکیم صاحب نے غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھویا، تولیے سے چہرہ اور ہاتھ خشک کرنے کے بعد انہوں

نے بال بھی درست کیے۔ جب وہ ماروی کے کمرے میں پہنچے تو دسترخوان لگ چکا تھا۔ نوجوان اور ماروی ان کے منتظر تھے۔ حکیم صاحب نے خلاف معمول ان دونوں کو بہت سنجیدہ دیکھا۔

''خیریت تو ہے بھئی؟'' انہوں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''آج تم دونوں کی لڑائی تو نہیں ہو گئی کسی بات پر؟'' پھر وہ نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''بھئی میری جو بیٹیا ہے نا، یہ کچھ پاگل سی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہیں بہت پریشان کرتی ہے۔ آج تم نے اسے کسی بات پر ڈانٹ دیا ہوگا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں حکیم صاحب!'' نوجوان نے کہا۔ ''ماروی سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

اسی وقت ماروی بول پڑی۔ ''یہ آپ سے آج کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں ابا سائیں۔''

حکیم صاحب نے غور سے نوجوان کی طرف دیکھا، پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''چلو پہلے کھانا تو کھالو، پھر اطمینان سے باتیں بھی ہو جائیں گی۔''

''بہتر۔'' نوجوان نے کہا۔

کھانے کے دوران میں خاموشی رہی جبکہ ماروی کو کھانے کے دوران میں بھی بولتے رہنے کی عادت تھی۔ حکیم صاحب کھانے کے دوران میں سوچتے رہے کہ ماروی کے چہرے پر اداسی کیوں تھی۔ گزرے ہوئے دنوں میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ماروی اس نوجوان سے کافی مانوس ہو گئی تھی لہٰذا اب اس کی اداسی کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نوجوان نے وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کرلیا ہو۔

کھانے کے بعد جب گفتگو شروع ہوئی تو وہی بات سامنے آئی جو حکیم صاحب نے سوچی تھی۔

''تم کہاں جانا چاہتے ہو بیٹے؟'' وہ نرمی سے بولے۔ ''مجھے تو یقین تھا کہ میرے علاج سے تمہاری یادداشت ضرور واپس آجائے گی۔ بس وقت لگ رہا تھا اس میں۔''

''یہ گزرتا ہوا وقت ہی تو میرے لیے اذیت ناک بن گیا ہے حکیم صاحب!'' نوجوان نے کہا۔ ''میں ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا ہوں۔ وہ میں کسی نہ کسی طرح برداشت کر رہا تھا لیکن آج مجھے شاید ایک سراغ مل گیا ہے۔ ممکن ہے اس سراغ کی وجہ سے میں اپنے ماضی کا کچھ کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاؤں۔''

''کیا سراغ ملا ہے تمہیں؟'' حکیم صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ذرا وہ رسالہ دو۔'' نوجوان نے ماروی سے کہا۔

ماروی نے اٹھ کر اپنے بستر کے تکیے کے نیچے رکھا ہوا رسالہ نکالا اور نوجوان کے ہاتھ میں دے دیا۔

نوجوان نے رسالہ کھول کر اس کے ورق پلٹے اور پھر رسالہ حکیم صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ دو سال پہلے کا رسالہ ہے۔''

''اس سے تمہیں کیا سراغ ملا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کراچی میں شدید بارش ہوئی تھی۔ یہ مضمون اسی کے بارے میں ہے۔ یہ پانی سے بھری ہوئی سڑک ہے۔ اس میں دکانوں کے علاوہ ایک بینک بھی نظر آرہا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر مجھے بار بار خیال آتا رہا ہے کہ میرا اس بینک سے کوئی تعلق ہے۔ شاید اس بینک میں میری ملازمت ہو۔ اس تصویر سے یہ تو ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کراچی کی کسی سڑک کی تصویر ہے لیکن اس سڑک کا نام میں نے آج دیکھا۔ دراصل اس جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔ میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ آج گاؤں سے واپس آکر میں پھر یہ رسالہ دیکھنے لگا۔ اتفاق سے مٹی جھڑ گئی تو میں نے اس تصویر کے نیچے لکھی ہوئی سطر پڑھ لی۔''

حکیم صاحب نے آواز سے وہ سطر پڑھی۔ ''آئی آئی چندریگر روڈ پر ڈھائی فٹ پانی کھڑا ہے۔''

''آئی آئی چندریگر روڈ۔'' نوجوان بولا۔ ''یہ نام بھی مجھے کچھ شناسا معلوم ہوا اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کراچی چلا جاؤں۔ وہاں میں اپنا کھوج لگانے میں ضرور کامیاب ہو سکتا ہوں۔ میں نے ماروی کو اپنے اس ارادے کے بارے میں بتا دیا تھا۔''

حکیم صاحب نے ایک طویل سانس لی۔ ''تمہیں کراچی کا نام بھی یاد ہے... تمہاری یادداشت یقیناً جزوی طور پر گم ہوئی ہے۔ خیر، مجھے اندازہ ہے کہ اپنے ماضی سے بے خبری کی وجہ سے تم ہیجان میں مبتلا ہو گے اس لیے میں تمہیں کراچی جانے سے روکوں گا نہیں۔ ہاں اگر وہاں تم اپنا کھوج لگانے میں کامیاب نہ ہو سکو تو ہمارے پاس واپس آجانا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟''

''ماروی نے بتایا تھا کہ صبح ساڑھے تین بجے کوئی پسنجر ٹرین یہاں سے گزرتی ہے اور اسٹیشن یہاں سے آٹھ میل دور ہے۔ میں اتنی دور تک پیدل بھی چل سکتا ہوں۔''

حکیم صاحب کچھ لمحے کسی سوچ میں ڈوبے رہے، پھر

بولے۔ ''تمہیں پیدل جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی نذیرو تھوڑی دیر میں آئے گا۔ مجھے اپنی حکمت کے سلسلے میں اس سے کچھ کام ہے۔ وہ آئے گا تو میں اسی سے نورا کو بلوا لوں گا اور اس سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہیں اسٹیشن چھوڑ آئے۔''

''دوسری بات۔'' حکیم صاحب نے کہا۔ ''تم اکیلے کراچی نہیں جاؤ گے۔ نذیرو کو اپنے ساتھ لے جانا۔ میں تمہیں اکیلا ہرگز نہیں جانے دوں گا۔ اگر تم اتنے عرصے میں مجھے اپنا کچھ سمجھنے لگے ہو تو اسے میرا حکم سمجھو۔ نذیرو کراچی شہر سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ تمہارا ایک اچھا مددگار ثابت ہوگا۔ اخراجات کے لیے ایک معقول رقم میں تم کو ابھی دیے دیتا ہوں۔''

''لیکن...''

''میں نے کہا نا کہ اسے میرا حکم سمجھو۔'' حکیم صاحب نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ ''کیا میں نے گزرے ہوئے دنوں میں تم کو اتنی محبت نہیں دی کہ تم مجھے اپنے باپ کے بجائے سمجھ سکو۔''

نوجوان نے سر جھکا دیا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''نذیرو کے نہ ہونے سے آپ کو پریشانی ہوگی۔ وہ آپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔''

''وہ میں سنبھال لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں ابھی تمہیں کچھ رقم لا کر دیتا ہوں۔ وہ احتیاط سے رکھنا۔'' حکیم صاحب کھڑے ہو گئے۔

''ابا سائیں!'' ماروی آہستہ سے بولی۔ ''نذیرو کے ساتھ میں بھی چلی جاؤں؟''

حکیم صاحب نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن ان کی تیکھی نظروں میں چھپا ہوا جواب ماروی سمجھ سکتی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ وہ آبدیدہ ہو گئی تھی۔

''ماروی!'' نوجوان نے حکیم صاحب کے جانے کے بعد کہا۔ ''تم یہ ہرگز مت سمجھو کہ میں اب یہاں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔''

ماروی نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ شاید اس کے آنسو بہہ گئے تھے اور وہ انہیں چھپانا چاہتی تھی۔

جلد ہی حکیم صاحب واپس آئے۔ انہوں نے براؤن رنگ کا ایک موٹا سا لفافہ نوجوان کو دیا۔ ''اب تم جا کر چند گھنٹے آرام کر لو۔''

نوجوان لفافہ لے کر اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔

''بیٹیا!'' حکیم صاحب نے ماروی کی طرف دیکھے بغیر نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے اندازہ ہو گیا ہے تمہارے جذبات کا! مجھے اس نوجوان سے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ میں تمہیں ڈھیل دیے رہا۔ غالباً یہ میری زندگی کی پہلی حماقت تھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن مجھے امید ہے کہ میری بیٹی سمجھ دار ہونے کا ثبوت دے گی۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ یوں سوچنا کہ تم حکیم صاحب کی بیٹی ہونے کے باوجود ایک دیہاتی لڑکی ہو اور وہ ایک پڑھا لکھا شہری ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔ امیر گھرانے کا نہ بھی ہو تو ایک شہری اور ایک دیہاتی لڑکی کا کوئی جوڑ نہیں بنتا... کوشش کرنا کہ اپنے دل و دماغ سے سب کچھ جھٹک دو۔''

اسی وقت کسی نے بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا۔

''نذیرو آیا ہوگا۔'' حکیم صاحب بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی ماروی کی حالت غیر ہو گئی۔ اب تک اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ نکلے۔

اس شام ماروی کو پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس نوجوان کو اس شدت سے چاہنے لگی تھی۔ گزرے ہوئے دنوں میں اسے یہ خیال تو برابر رہا تھا کہ وہ اسے پسند کرنے لگی تھی لیکن پسندیدگی کی ایسی شدت کا اندازہ اسے شام کو گھر آنے کے تھوڑی دیر بعد ہوا تھا جب نوجوان نے اس کے کمرے میں آ کر اسے بتایا تھا کہ وہ کراچی جانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

کچھ دیر بعد اس کے رونے کی شدت میں کمی آئی تو وہ بستر پر جا لیٹی۔ مزید کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کے آنسو تھم گئے لیکن چہرے پر اداسی جیسے کسی دبیز تہ کی طرح جم گئی۔

رات گزرتی رہی اور اس کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اسے محسوس ہو چکا تھا کہ گاؤں پر اب سناٹا چھا چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ نہ جانے کتنا وقت اس طرح گزر گیا۔ پھر وہ رہ نہ سکی اور دبے قدموں اپنے کمرے سے نکل کر نوجوان کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ماروی نے جھانک کر دیکھنا چاہا تو نوجوان کی آواز سنائی دی۔ ''اندر آ جاؤ ماروی۔''

ماروی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اندر داخل ہوتے وقت اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

نوجوان سرہانے سے ٹیک لگائے اور ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔

"مجھے خیال تھا کہ تم آؤ گی۔" وہ بولا۔

"تم سوئے نہیں؟" ماروی نے کہا۔ "چند گھنٹے تو سو لیتے۔ پسنجر ٹرین کا سفر بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

"یہی کہنے کے لیے آئی تھیں؟" نوجوان پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

ماروی کی آنکھوں میں پھر آنسوؤں کی چمک آگئی۔ اس نے چہرہ جھکا کر اپنی آنکھیں چھپانے کی کوشش کی۔ وہ نوجوان کے بستر پر پائنتی کی طرف بیٹھ گئی۔

"کراچی میں تمہارے دشمن ہوں گے۔" اس مرتبہ ماروی کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ "اپنا بہت خیال رکھنا۔"

"ماروی!" نوجوان نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ احساس تو مجھے ہوگیا تھا کہ میں تمہیں اچھا لگنے لگا ہوں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس پسندیدگی میں اتنی شدت آچکی ہے۔ یہ مجھے بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ میرا ایک اندازِ فکر ہے۔ میرے کچھ جذبات ہیں، احساسات ہیں۔ میں اس دنیا کے طور طریق سے واقف ہوں۔ بس یہ بھول گیا ہوں کہ میرا کوئی جانی دشمن بھی ہے۔ میں صرف اسی ایک حوالے سے اپنی یادداشت کھوئے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کے پچھلے واقعات یاد نہیں رہے۔ میں کون ہوں، کہاں رہتا تھا، میرے ساتھ اور کون کون لوگ تھے، بس یہی بھولا ہوں میں۔ یہ مجھے یاد ہے کہ میں اکیسویں صدی میں ہوں۔ دنیا کہاں سے کہاں جا چکی ہے۔ ارسطو، سقراط، گراہم بیل اور آئن اسٹائن مجھے یاد ہیں لیکن میں اپنا نام بھول چکا ہوں۔ یہ بھی میں جانتا ہوں کہ کسی حادثے کے سبب انسان کی یادداشت کبھی کلی طور پر اور کبھی جزوی طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ یاد ہے مگر یہ یاد نہیں کہ اگر میں اپنی کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا تو میرے سامنے کیا حالات ہوں گے۔ شاید ایسا ہو کہ میری شادی ہو چکی ہو۔ کراچی میں میرے بیوی بچے بھی ہوں۔"

ماروی سب کچھ سر جھکائے خاموشی سے سنتی رہی لیکن نوجوان کے آخری فقرے ایسے تھے کہ اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔

"کچھ بھی سامنے آسکتا ہے ماروی۔" نوجوان کہتا رہا۔ "اور انسان کو ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، لیکن یہ وعدہ میں تم سے کر چکا ہوں اور اب بھی کر رہا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں، میں واپس ضرور آؤں گا۔ میں تمہیں اور حکیم صاحب کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہاں ایک خطرہ ضرور ہے۔ میں اپنے دشمنوں کو شاید نہ پہچان سکوں لیکن وہ تو مجھے پہچانتے ہی ہوں گے۔ اگر وہ کراچی ہی میں ہیں اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو وہ مجھے پھر ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے، اور ضروری نہیں کہ وہ دوسری بار بھی ناکام ہی رہیں۔"

"خدا کے لیے۔" ماروی شاید چیخ ہی پڑتی۔ اس لیے بڑی مشکل سے اپنی آواز دبالی۔ "خدا کے لیے ایسی باتیں زبان پر مت لاؤ۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اب وہ اگر وہاں رکی تو نوجوان سے لپٹ کر رونے لگے گی، اور وہ مناسب نہ ہوتا۔ وہ ایک دم اٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

نوجوان ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اداسی اس کے چہرے پر بھی تھی۔

☆☆☆

اندھیرے میں ایک لینڈ کروزر بہت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی حکیم صاحب کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے چلانے والا احتیاط کر رہا تھا کہ گاڑی کے انجن کی آواز زیادہ نہ ہو۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی بجھا دی گئی تھیں۔

گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کہیں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز اس تاریک سناٹے کو چیر دیتی تھی۔

لینڈ کروزر حکیم صاحب کے گھر کے سامنے جا کر رکی۔ اس کا انجن بند کر دیا گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص بدستور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جو چار آدمی گاڑی سے اترے، انہوں نے اپنے منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ باقی تینوں بظاہر غیر مسلح تھے۔

رائفل والے کے اشارے پر ایک آدمی "کارخانہ حکمت" کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ باقی تینوں گھر کے اس دروازے پر جا رکے جہاں سے عموماً آمد و رفت رہتی تھی۔

رائفل والے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ فوری طور پر اندر کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ رائفل والے نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ساتھ ہی اپنے قریب کے آدمی کو ٹہوکا دیا۔ وہ آدمی خاصے زور سے کراہا۔

"حکیم سائیں!" اس نے کراہتے ہوئے پکارا۔

اس مرتبہ اندر قدموں کی آواز ہوئی۔ اندر سے حکیم صاحب نے سندھی ہی میں پوچھا۔ "کیر آہے؟"

"حکیم سائیں!" کراہتے ہوئے کہا گیا۔ "دسمن حم

تنگ میں کتو... آ...'' ایسا لگا جیسے تکلیف کی وجہ سے وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا ہو۔

اندر سے حکیم صاحب نے ہدایت کی کہ وہ کارخانۂ حکمت کے دروازے پر آئے۔

اندر قدموں کی آواز بھی پلٹ گئی۔

رائفل والے نے ایک آدمی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور باقی دو کے ساتھ گھر کے دوسرے دروازے پر پہنچ گیا جہاں اس کا ایک ساتھی پہلے ہی سے موجود تھا۔

رائفل والے کا ساتھی اس وقت بھی کراہتا رہا۔

اندر روشنی کی گئی جس کا اندازہ دروازے کی جھریوں سے لگایا جا سکتا تھا۔ پھر قدموں کی آہٹ دروازے کی طرف آئی۔ دروازہ کھلا اور باہر کا منظر دیکھتے ہی حکیم صاحب کے چہرے سے بوکھلاہٹ ظاہر ہوئی۔ لمبا تڑنگا ڈھاٹے بردار رائفل کی نال سے ان کو پیچھے دھکیلتا ہوا خود اندر پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے اس کے دونوں ساتھی بھی جن میں سے ایک نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' حکیم صاحب چیخ پڑے۔

''شور نہ کر حکیم!'' رائفل والے نے کوشش کی تھی کہ اس کی اصل آواز ظاہر نہ ہو۔ ''وہ تیرا مریض کدھر ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہیں اس سے کیا لینا؟''

''جواب دے حکیم، ورنہ گولی تیرے سینے میں اتر جائے گی۔'' رائفل والے نے کہتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ اپنی جیبوں سے ریوالور نکالتے ہوئے اندرونی دروازے کی طرف لپکے۔

ماروی اس وقت جاگ رہی تھی۔ حکیم صاحب کے چیخنے کی آواز سن کر وہ دوڑتی ہوئی اندر آئی۔ رائفل والے کے ساتھیوں نے اسے ایک طرف دھکا دیا اور دوسری طرف نکل گئے۔

خوف زدہ ماروی، حکیم صاحب کے شانے سے جا لگی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ جاگتی بھی رہی اور روتی بھی رہی تھی۔

حکیم صاحب نے رائفل والے سے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے لیکن اب وہ میرے گھر میں نہیں ہے۔''

''بک بک نہ کر حکیم۔'' رائفل والے نے کہا۔ ''ابھی میرے دونوں آدمی اسے باندھ کر یہاں لے آئیں گے۔''

وہ اب اردو میں بول رہا تھا لیکن اس کے لہجے سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ اس کی مادری زبان سندھی ہو گی۔

''وہ اب یہاں نہیں ہے۔'' حکیم صاحب نے اپنی بات دہرائی۔ ''وہ شام ہی کو یہاں سے چلا گیا تھا۔''

''چپ رہ۔'' رائفل والے نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

اسے اپنے دونوں ساتھیوں کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ واپس آئے اور انہوں نے سندھی زبان میں رائفل والے کو بتایا کہ وہ جس کی تلاش میں یہاں آئے تھے، وہ اب اس گھر میں نہیں تھا۔

''کہاں گیا وہ؟'' رائفل والا حکیم صاحب کی طرف دیکھتا ہوا دہاڑا۔

''میں بتا چکا ہوں۔ وہ شام کو یہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ لاہور جائے گا۔ میں اسے روک تو نہیں سکتا تھا۔''

''کیوں بھگایا ہے تو نے اُسے؟''

''میں کیوں بھگاؤں گا؟''

''سچ سچ بتا، وہ کہاں ملے گا۔ اگر وہ مجھے نہ ملا تو...''

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جیرا تھا جسے خوف تھا کہ وہ ناکام لوٹا تو اسے حشمت ابڑو کی جھاڑ پھٹکار سننا پڑے گی۔

حکیم صاحب نے کہا۔ ''میں اب کیا بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں ملے گا۔''

جیرا کھسیا گیا تھا۔ اس نے رائفل پلٹ کر پکڑی اور اس کا بٹ بڑی زور سے حکیم صاحب کے منہ پر مارنا چاہا۔ اگر وہ ضرب حکیم صاحب کے منہ پر پڑ جاتی تو ان کا جبڑا ٹوٹ سکتا تھا۔ انہوں نے فوراً اپنا بایاں ہاتھ اوپر اٹھا دیا تھا۔ ضرب ان کے جبڑے پر لگی تو مگر ہاتھ بیچ میں آجانے کی وجہ سے اس کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ زیادہ چوٹ ہاتھ پر آئی۔

''ابا سائیں!'' ماروی کرب سے چیخ اٹھی۔

جیرا اور اس کے دونوں ساتھی مڑ کر تیزی سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

''ابا سائیں!'' ماروی روتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے گال سے خون بہہ رہا ہے اور... اور... یہ آپ کا ہاتھ سوجتا جا رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں بیٹیا!'' حکیم صاحب تکلیف کے باوجود مسکرائے۔ ''تمہارا استھو شہری تو بچ کر نکل گیا نا اپنے دشمنوں سے! اب تو اس کی ٹرین اسٹیشن سے نکل بھی چکی ہو گی۔''

''وہ جیرا تھا ابا سائیں!'' ماروی ہیجانی انداز میں بولی۔ ''میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ جیرا تھا۔ میں اس کی

آنکھیں پہچانتی ہوں۔"

"تو پھر میرا خیال درست ثابت ہو گیا نا۔" حکیم صاحب نے کہا۔ "دھارو سائیں کا تعلق بھی انہی لوگوں سے ہے جنہوں نے اسے ختم کرانے کی کوشش کی تھی۔ اسے کراچی سے آنے والے دو آدمیوں نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کروا دیا ہے تو اب کوئی گڑبڑ کیسے ہو سکتی ہے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

ماروی چپ رہ گئی۔ جب حکیم صاحب نے اسے یہ بات بتائی تھی تو اسے یقین نہیں آیا تھا لیکن اب یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا اور ایک عجیب بات یہ منکشف ہوئی تھی کہ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کروانے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

پسنجر ٹرین جب لانڈھی کے اسٹیشن پر رکی تو نوجوان نے نذیرو سے کہا۔

"ہمیں یہیں اتر جانا چاہیے۔"

"کیوں سائیں؟" نذیرو حیرت سے بولا۔

"پتا نہیں کیوں۔" نوجوان نے الجھے ہوئے سے انداز میں کہا۔ "مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم کراچی کے اسٹیشن پر اترتے ہی کسی خطرے میں پڑ جائیں گے۔ تمہاری تو شاید خیریت رہے لیکن میری جان کے دشمن تو وہ ہیں ہی۔"

اس جواب سے نذیرو کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثر اس لیے نہیں ابھرا کہ ماروی اسے نوجوان کے بارے میں وہ سب کچھ باتیں بتا چکی تھی جو حکیم صاحب نے گاؤں کے سارے لوگوں سے چھپا رکھی تھیں۔

وہ لانڈھی اسٹیشن پر اتر گئے۔

"یہاں سے کراچی جانے کے لیے بسیں مل جاتی ہیں نا؟" نوجوان بولا۔

اس وقت نذیرو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ آپ کو یاد ہے سائیں؟"

"ہاں۔" نوجوان نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بہت کچھ یاد ہے، اور جو یاد ہونا چاہیے تھا بس وہی یاد نہیں۔"

گاؤں کا سیدھا سادہ نذیرو الجھا ہی نظر آتا رہا۔

بس سے وہ دونوں کراچی پہنچ گئے۔

"کسی معمولی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہیے۔" نوجوان نے نذیرو سے کہا۔

"نذیرو نے ایک رکشا روکا اور اس سے ریلوے اسٹیشن چلنے کی بات کی۔

"اسٹیشن پر چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہیں۔" نذیرو نے رکشے میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ "ہم کو وہیں ٹھہرنا چاہیے۔"

نوجوان سمجھ گیا کہ نذیرو نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ ان دونوں کی وضع قطع ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی بڑے ہوٹل کا رخ کر سکتے۔ نذیرو تو معمولی لباس میں تھا ہی، نوجوان کے سندھی شلوار سوٹ پر بھی پسنجر ٹرین میں کئی دھبے لگ گئے تھے۔ اس کے باقی شلوار سوٹ اور اس کی قمیص پتلون ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس میں تھی جو حکیم صاحب ہی نے دیا تھا۔ قمیص پتلون ماروی نے دھو کر رکھ دی تھی لیکن اس پر استری نہیں تھی۔ اسی قمیص پتلون میں وہ گاؤں والوں کو ساحل سمندر پر بے ہوش پڑا ملا تھا۔

چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرنے کے لیے بھی شناختی کارڈ ہونا ضروری تھا جو نوجوان کے پاس نہیں تھا اس لیے تدبیر یہ کی گئی کہ پہلے نذیرو ہوٹل میں گیا۔ اس نے ایک کمرا کرائے پر حاصل کیا اور بعد میں نوجوان بھی وہاں پہنچ گیا۔

اس وقت گیارہ بجے تھے۔

"اب آرام کر لیا جائے۔" نوجوان نے نذیرو سے کہا۔ "ٹرین کا سفر بہت طویل تو نہیں تھا لیکن میں بہت تھک گیا ہوں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی ضروری سمجھ رہا ہوں کہ دن کی روشنی کی بہ نسبت رات کو باہر نکلنا میرے لیے کم خطرناک ثابت ہوگا۔"

نذیرو تو اس کے ساتھ آیا ہی اس لیے تھا کہ اس کی باتوں اور اس کی ہدایات پر عمل کرتا رہے۔

ناشتا کرنے کے بعد دونوں ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ رات بھر کا جاگا ہوا نذیرو بھی تھا۔ اس نے فرش پر اپنے لیے چادر بچھالی تھی کیونکہ کمرے میں بستر ایک ہی تھا۔

اس روز نوجوان نے دن میں بھی ایک خواب دیکھا۔

وہ سوٹ میں ملبوس ایک بینک میں داخل ہوا تھا۔ اس نے اس کیبن کا رخ کیا جس پر "منیجر" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ منیجر اس وقت کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ نوجوان کو دیکھ کر وہ احتراماً کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ نوجوان کو جانتا ہو۔ اس نے نوجوان سے مصافحہ کیا اور کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔ نوجوان بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے منیجر سے کچھ کہا۔

یہاں خواب ختم ہو گیا لیکن کچھ دیر بعد نوجوان نے پھر دیکھا کہ وہ منیجر کے سامنے بیٹھا ہوا کسی فارم پر دستخط کر رہا تھا۔ منیجر نے مسکرا کر اس کا فارم لے لیا اور اعتراف کا...

اٹھا کر اس کا ایک نمبر دبایا۔ کچھ توقف سے اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس میں کچھ کہا اور پھر ریسیور رکھ کر نوجوان سے مخاطب ہوگیا۔

جلد ہی ایک آدمی منیجر کے کمرے میں داخل ہوا۔ نوجوان کرسی سے کھڑا ہوگیا اور اس آدمی کے ساتھ منیجر کے کیبن سے نکلا۔

خواب یہاں پھر ختم ہوگیا لیکن ایک بار پھر وہ سلسلہ شروع ہوا تو نوجوان نے خود کو بینک کے اسٹرانگ روم میں دیکھا۔ وہ تیرہ نمبر کا ایک لاکر بند کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ آدمی کھڑا تھا جو منیجر کے کیبن سے اس کے ساتھ نکلا تھا۔

نوجوان نے لاکر بند کر دیا تو اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا منیجر کا آدمی قریب آیا۔ اس نے لاکر میں ایک چابی لگائی۔

لاکر بند کرنے کے بعد نوجوان نے وہ چابی اپنی جیب میں رکھ لی تھی جس پر ''تیرہ'' کا ہندسہ کندہ تھا۔ بینک کے آدمی کی چابی اسی کے پاس رہی تھی۔ نوجوان اور وہ آدمی اسٹرانگ روم سے نکل آئے۔ نوجوان نے بینک کے آدمی سے مسکرا کر کچھ کہا، دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور پھر نوجوان بینک سے باہر آگیا۔ بینک کے سامنے فٹ پاتھ سے لگی ہوئی ایک کار کھڑی تھی۔ نوجوان نے جیب سے ایک اور چابی نکالی اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر بینک کے بورڈ پر ڈالی اور پھر کار آگے بڑھا دی۔ وہ رفتار بڑھاتا جا رہا تھا کہ کسی جانب سے کوئی شخص دوڑتا ہوا اس کی کار کے سامنے آگیا۔ نوجوان کے منہ سے کچھ نکلا اور اس نے بریک لگائے لیکن حادثہ ہو کر رہا۔ سامنے آنے والا گاڑی کے آگے آکر کچل گیا۔

نوجوان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے نذیرو کو دیکھا جو فرش پر بچھی چادر پر بیٹھا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر نوجوان کے قریب آیا۔

''کیا ہوا سائیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''آپ پریشان نظر آرہے ہیں؟''

''بھائی صاحب میری گاڑی کے نیچے آگئے۔'' نوجوان کے منہ سے نکلا۔

''گاڑی کے نیچے؟ لیکن آپ تو بستر پر...'' وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر بولا۔ ''آپ نے شاید کوئی خواب دیکھا ہے۔''

نوجوان کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا جیسے وہ چونک گیا ہو۔ نیند سے اٹھنے کے بعد اس خواب کی وجہ سے اس کے حواس پراگندہ سے تھے۔ نذیرو کی بات سن کر وہ اپنے حواس میں آیا۔

''ہاں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''خواب دیکھا تھا۔''

''اب رات ہونے والی ہے سائیں۔'' نذیرو بولا۔ ''اگر کہیں چلنا ہو تو تیار ہو جائیں۔''

''ہاں، ابھی چلتے ہیں۔'' نوجوان نے کہا اور اپنی جیب سے وہ چابی نکالی جو اسے حکیم صاحب سے ملی تھی۔ اس پر تیرہ کا ہندسہ کندہ تھا۔ نوجوان نے خواب میں جس چابی سے لاکر بند کیا تھا، وہ ایسی ہی تھی۔

نوجوان کے دماغ میں ہیجان سا برپا ہوگیا۔ اس نے جلدی سے وہ رسالہ نکالا اور اس کا وہ صفحہ نکالا جس کی ایک تصویر اسے شناسا محسوس ہوئی تھی۔ اس نے غور سے تصویر میں نظر آنے والے بینک کی طرف دیکھا۔ اس نے خواب میں یہی بینک دیکھا تھا۔

''آئی آئی چندریگر روڈ۔'' وہ بڑبڑایا۔

اس نے خواب میں جس سڑک پر کار چلائی تھی، وہ تصویر اسی سڑک کی تھی۔ جوش سے نوجوان کے چہرے پر سرخی پھیلنے لگی۔

''کیا ہے اس رسالے میں سائیں؟'' نذیرو نے پوچھا۔ ''آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں۔''

''ہاں نذیرو!'' نوجوان نے پُرجوش آواز میں کہا۔ ''اگر میرا یہ خواب بھی سچا ہے تو شاید میں اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔''

نذیرو اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

نوجوان بستر سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ اس بینک میں شاید ملازم ہو لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا خواب سچا ہے تو پھر بات یہ ہوگی کہ اس نے اس بینک میں ایک لاکر لے رکھا ہوگا۔ اس لاکر میں اس کی کچھ ایسی چیزیں ہو سکتی ہیں جن سے شاید اس کی شخصیت اور اس کے ماضی پر کوئی روشنی پڑ سکے۔

''نذیرو!'' نوجوان اس کے سامنے رک کر بولا۔ ''تم جانتے ہو، یہ آئی آئی چندریگر روڈ کہاں ہے؟'' اس نے رسالے کی طرف اشارہ کیا جو بستر پر کھلا پڑا تھا۔ ''یہ اس سڑک کی تصویر ہے نا؟''

''ہاں سائیں!'' نذیرو نے کہا۔ ''یہ چندریگر روڈ کی تصویر ہے۔''

''تم مجھے وہاں لے جا سکتے ہو؟''

''ہاں سائیں! چلیں۔''

''ابھی نہیں۔'' نوجوان نے سوچتے ہوئے کہا اور بستر پر بیٹھ کر وہ لفافہ نکالا جو اسے حکیم صاحب نے دیا تھا۔ اس میں پانچ پانچ سو روپے کے نوٹ تھے۔ نوجوان نے اس میں سے صرف ایک نوٹ نکال کر نذیرو کو ٹرین کا ٹکٹ خریدنے کے لیے دیا تھا۔ اس میں سے جو باقی پیسے بچے تھے، وہ نوجوان نے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔ اس وقت اس نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ لفافے میں کتنے نوٹ تھے۔

''دس ہزار۔'' نوٹ گن کر وہ زیرِلب بڑبڑایا، پھر اس نے نذیرو سے کہا۔ ''اتنی بڑی رقم دے دی حکیم صاحب نے مجھے۔''

''وہ آپ سے بہت محبت کرنے لگے تھے سائیں!'' نذیرو نے جواب دیا۔ ''جب مریض نہیں ہوتے تھے تو وہ مجھ سے آپ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ آپ کی شکل کا کوئی رشتے کا بھائی تھا اُن کا۔''

نوجوان نے اس بات کے جواب میں فوراً کچھ نہیں کہا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ کچھ توقف سے اس نے پوچھا۔ ''یہاں ایسی دکانیں بھی ہیں نا جہاں سے سلے سلائے سوٹ مل جاتے ہیں؟''

نوجوان نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اگلی صبح بینک جائے گا۔

نذیرو نے پوچھا۔ ''آپ کو سوٹ خریدنا ہے؟''

''ہاں۔''

''چلیے سائیں! میں لے چلتا ہوں آپ کو۔''

''کیا چائے کا بندوبست ہوسکتا ہے؟'' نوجوان نے کہا۔ ''چائے پینے سے بشاشت آجائے گی۔''

نذیرو نے فوراً چائے منگوائی۔ اسی دوران میں نوجوان نے منہ ہاتھ دھوکر دوسرا صاف ستھرا شلوار سوٹ پہننے کے بعد سندھی ٹوپی بھی اوڑھ لی تھی۔

''ہاں... ایک ضروری بات تمہیں سمجھا دوں۔ رکشا یا ٹیکسی میں تو ہم دونوں کو ساتھ ہی بیٹھنا پڑے گا لیکن جب پیدل چلنا پڑے تو تم مجھ سے چند قدم آگے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ میں کسی خطرے میں پڑوں تو تم بھی اس کی زد میں آجاؤ۔''

''یہاں آپ کے لیے کیا خطرہ ہوسکتا ہے؟''

''میرے دشمن اسی شہر میں ہوں گے۔''

''مگر انہیں یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے سائیں کہ آپ زندہ ہیں اور یہاں آگئے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا کہ انہیں کیا معلوم ہوسکتا ہے اور کیا نہیں معلوم ہوسکتا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ میں یہاں کسی خطرے میں پڑسکتا ہوں۔''

''چھٹی حس؟'' نذیرو نے پلکیں جھپکائیں۔

نوجوان پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''تم زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہو ورنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ چھٹی حس کیا ہوتی ہے۔ یہ انسان کی ایک ایسی حس کو کہتے ہیں جو کبھی کسی ایسے خطرے کا احساس بھی دلا دیتی ہے جس خطرے کی موجودگی کا بظاہر کوئی سبب نظر نہیں آتا۔''

یہ باتیں گاؤں کے سیدھے سادے وزیرو کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں لیکن اس نے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس وقت اس کے دماغ میں ایک اور ہی بات آگئی جو وہ اپنی زبان پر لے آیا۔ ''سائیں!'' اس نے کہا۔ ''جب آپ خواب سے جاگے تھے تو آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے بھائی صاحب آپ کی گاڑی کے نیچے آگئے۔''

''ہاں۔'' نوجوان نے طویل سانس لی۔ ''میں نے خواب میں اپنے آپ کو کار چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک شخص میری گاڑی کے نیچے آگیا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ بھائی صاحب تھے، جمیل فخری۔'' یہ جواب دے کر نوجوان خود ہی چونک گیا۔ ایک نام اس کی زبان پر بے اختیار آگیا تھا۔ اس میں اس کے ارادے کو قطعی دخل نہیں تھا، اور دخل شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

نذیرو نے پوچھا۔ ''آپ ان کو کس طرح ڈھونڈ سکتے ہیں؟''

''میں ابھی کسی کو بھی نہیں ڈھونڈنا چاہتا۔'' نوجوان نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''جب تک مجھے اپنا ماضی یاد نہ آجائے، مجھے بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔''

نذیرو کچھ سمجھا ہو کہ نہیں، لیکن اس نے سر ہلا دیا۔

چائے پی کر وہ دونوں ہوٹل سے نکلے۔ نوجوان بہت چوکنا رہا۔ آس پاس نظر آنے والے ہر شخص کا چہرہ وہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق کوئی ایسی شکل اس کے سامنے آسکتی تھی جو اسے کچھ یاد دلا دے۔

لیکن اسے کوئی ایسی شکل نظر نہیں آئی، کوئی خطرہ بھی پیش نہیں آیا۔ وہ دونوں خریداری کرکے واپس آگئے۔ نوجوان نے اپنے لیے ایک سوٹ، ایک قمیص، ایک بنیان، جوتے اور موزے خریدے تھے۔ ایک اچھا شلوار سوٹ نذیرو کے لیے بھی خریدا تھا۔ نذیرو کو اس وقت کچھ حیرت ہوئی جب نوجوان نے کپڑے کا ایسا تھیلا بھی خریدا جو گلے میں لٹکایا جاسکتا تھا۔

''یہ کیوں خریدا ہے سائیں؟'' نذیرو نے ہوٹل پہنچنے کے بعد اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

نوجوان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”اس قسم کے تھیلے آج کل بعض صحافی اپنی گردن میں لٹکا لیتے ہیں۔ یہ پہلو تک جاتا ہے۔ جب کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا تو یہ تھیلا تم اپنی گردن سے لٹکا لینا۔ شاید اس کی ضرورت پڑے۔“

حقیقتاً نوجوان نے دوسرے دن کے لیے ایک منصوبہ بنا لیا تھا جس پر اگلے دن عمل کیا جاتا۔ اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس تھیلے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد نوجوان نے نذیرو سے کہا۔ ”مجھے اتنا یاد ہے کہ اس شہر میں جراح بھی ہوتے ہیں لیکن یہ یاد نہیں آرہا ہے کہ وہ کہاں ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس بارے میں بھی جانتے ہو گے؟“

”ہاں سائیں! مجھے معلوم ہے۔“

”کل بینک پہنچنے سے پہلے کسی جراح کے پاس چلنا ہوگا۔“

”کیوں سائیں؟“ نذیرو حیران ہوا۔

”بتا دوں گا۔“ نوجوان نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔ وہ اس وقت اپنے اگلے دن کے منصوبے کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لینا چاہتا تھا۔

دوسری صبح وہ دونوں ناشتا کرنے کے بعد روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

”کیا بات ہے نذیرو؟“ نوجوان اچانک پوچھ بیٹھا۔ ”کیا تمہیں میرے ساتھ رہتے ہوئے ڈر لگنے لگا ہے؟ میں آج جب سے جاگا ہوں، تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔“

”ڈر کی کوئی بات نہیں ہے سائیں!“ نذیرو نے جواب دیا۔ ”میں پریشان اس لیے ہوں کہ کل رات بھی باپو سے بات نہیں ہو سکی۔“

”باپو؟ یعنی تمہارا باپ؟“

”ہاں سائیں۔“

”مگر وہ تو گاؤں میں ہوگا۔ اس سے تمہاری بات کیسے ہو سکتی ہے؟“

”موبل پر سائیں!“ جواب دیتے ہوئے نذیرو نے اپنی جیب سے ایک معمولی قسم کا موبائل فون نکالا۔ اسی کو اس نے ”موبل“ کہا تھا۔

”موبائل فون ہے تمہارے پاس؟“ نوجوان کو تعجب ہوا۔

”ہاں سائیں! یہ ہے نا!“ نذیرو نے جواب دیا۔ ”پرسوں رات کو جب آپ سو گئے تھے تو بھی میں نے کوشش کی تھی۔ کل رات بھی کوشش کرتا رہا۔ جواب ہی نہیں ملتا۔“

”گاؤں میں لوگوں کے پاس موبائل فون ہیں؟“

نوجوان نے جلدی سے پوچھا۔

”سبھی کے پاس ہیں سائیں۔“

”میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ شاید یہ اتفاق ہو لیکن حکیم صاحب یا ماروی کا موبائل فون تو میری نظر میں آ ہی جانا چاہیے تھا۔“

”گاؤں میں بس انہی دونوں کے پاس نہیں ہے۔ حکیم سائیں کہتے ہیں، اس سے کان میں جو آواز آتی ہے، اس سے کان کمزور ہو جاتے ہیں۔“

نذیرو شاید حکیم صاحب کے خیالات کی صحیح وضاحت نہیں کر سکا تھا۔

”اسی لیے انہوں نے کبھی ماروی کو بھی موبائل فون خریدنے نہیں دیا۔“ نذیرو بولا۔

”ذرا اس وقت ملاؤ اپنے باپ کا نمبر۔“ نوجوان نے بے تابی سے کہا۔

نذیرو نمبر ملاتا ہوا بولا۔ ”انگریزی میں کوئی عورت بولتی سنائی دیتی ہے۔“ اس نے نمبر ملا کر موبائل فون نوجوان کو دے دیا۔

نوجوان کسی حد تک ہیجان کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے یہ امید ہو گئی تھی کہ اگر نذیرو کے باپ کا نمبر نہ ملا تو گاؤں کے کسی اور آدمی سے رابطہ کر کے وہاں کے حالات معلوم کیے جا سکتے تھے۔

نوجوان نے موبائل اپنے کان سے لگایا تو نذیرو کے کہنے کے مطابق اسے ایک نسوانی آواز انگریزی بولتی سنائی دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نذیرو کے باپ نے اپنا موبائل بند کر رکھا تھا۔

نوجوان نے جب یہ بات نذیرو کو بتائی تو وہ بولا۔ ”باپو تو اپنا فون کبھی بھی بند نہیں کرتا۔“

یہ جواب تشویش ناک تھا لیکن نوجوان نے اس پر غور کیے بغیر نذیرو سے کہا۔ ”گاؤں کے کسی اور آدمی کا نمبر ملاؤ۔“

”مجھے کسی کا نمبر نہیں معلوم... میں تو بس باپو سے بات کر لیا کرتا تھا۔“

اس جواب نے نوجوان کی امید پر پانی پھیر دیا۔ اس کی کچھ امید بندھی تھی جو ختم ہو گئی۔ کراچی میں رہتے ہوئے گاؤں کے حالات معلوم نہیں کیے جا سکتے تھے اور یہ بات کسی حد تک فکرمندی کی تھی کہ نذیرو کا باپ جو کبھی اپنا موبائل بند نہیں رکھتا تھا وہ گزشتہ رات سے ہی بند تھا۔

اب نوجوان کو نذیرو کی پریشانی کا سبب معلوم ہو گیا۔ ”یہ بات تو واقعی عجیب ہے۔“

''ہاں سائیں۔''

''اس بارے میں سوچنا پڑے گا... خیر، ابھی تو ہمیں یہاں سے روانہ ہونا ہے۔''

''چلیے سائیں۔''

ہوٹل سے نکلنے کے بعد نوجوان نے رکشے کے بجائے ٹیکسی کرنا مناسب سمجھا کیونکہ رکشے میں بیٹھنے والوں کے چہرے راہ گیروں کو بھی صاف نظر آجاتے ہیں۔

نذیرو نے ایک ایسی سڑک پر ٹیکسی رکوائی جہاں جراحوں کی کئی دکانیں تھیں۔ نوجوان نے کرایہ ادا کر کے ٹیکسی چھوڑ دی اور جراحوں کی دکان کا جائزہ لینے لگا۔

''یہ جراح ٹھیک رہے گا۔'' نوجوان ایک دکان کی طرف بڑھا۔ نذیرو اس سے چند قدم پیچھے رہا۔ راستے ہی میں نوجوان نے اسے سمجھا دیا تھا کہ بعض جگہ اسے چند قدم آگے رہنے کے بجائے چند قدم پیچھے رہنا پڑے گا۔

نوجوان نے جس دکان کا انتخاب کیا تھا، وہ دوسری دکانوں سے چھوٹی تھی۔ دوسری دکانوں پر جراح بھی دو دو، تین تین تھے مگر اس دکان پر ایک ہی بوڑھا جراح بیٹھا تھا اور صرف اسی کی دکان پر کوئی مریض نہیں تھا۔

اس نے بڑی خوش مزاجی سے نوجوان کا استقبال کیا۔ پھر اس وقت وہ بہت حیران ہوا جب نوجوان نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس کے دائیں ہاتھ پر ایسی پٹی باندھی جائے کہ اس کی انگلیاں بھی نظر نہ آئیں۔

''دراصل۔'' نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ''میں جن صاحب کے دفتر میں ملازمت کرتا ہوں، وہ بہت سخت گیر قسم کے انسان ہیں۔ ایک دن کی چھٹی بھی بڑی مشکل سے دیتے ہیں اور مجھے ایک ہفتے کی چھٹی چاہیے۔ اب اس کی صورت یہی ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ میں کچھ دن تک کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہا ہوں۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ میرا ہاتھ بچھو نے کاٹ لیا ہے اور اس کی وجہ سے سارا ہاتھ متورم ہو گیا ہے۔''

''اچھا۔'' بوڑھا جراح ہنسا۔

''بہت اچھی ڈریسنگ کر دیجیے۔'' نوجوان نے کہا۔

''آپ جو کچھ بھی طلب کریں گے، پیش کر دوں گا۔''

بوڑھا جراح یہ کام کرنے کے لیے فوراً تیار ہو گیا۔ ڈریسنگ کرتے ہوئے وہ ان پیسے والوں کو برا بھلا کہتا رہا جو اپنے ملازمین کو جانور سمجھتے تھے۔

چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا نذیرو وہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

ڈریسنگ نوجوان کی خواہش کے مطابق اطمینان بخش ہوئی۔

وہاں سے ایک ٹیکسی میں روانگی ہوئی تو نذیرو نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''تم نہیں سمجھ سکو گے۔'' نوجوان نے جواب دے کر اسے خاموش کر دیا۔

نوجوان نے یہ سب کچھ اس خواب کی وجہ سے کیا تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ اس خواب کے مطابق لاکر تک پہنچنے سے پہلے بینک منیجر سے مل کر کسی فارم پر دستخط کرنا پڑے تھے اور نوجوان اپنے دستخط تو کیا، اپنا نام تک بھولا ہوا تھا۔

لیکن یہ تیاری کرنے کے باوجود نوجوان مطمئن نہیں تھا۔ یہ ممکن تھا کہ اس کا یہ کھیل کارگر ثابت نہ ہوتا اور منیجر اس کے دستخط لیے بغیر اسے اسٹرانگ روم میں جانے کی بھی اجازت نہ دیتا۔

نوجوان نے سوچا تھا کہ اگر اس کی یہ تدبیر کامیاب نہ ہو سکی تو پھر اسے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔

اس نے نذیرو سے کہا۔ ''جب وہ بینک بیس پچیس قدم کے فاصلے پر رہ جائے تو ٹیکسی رکوا لینا۔ تم ٹیکسی سے اتر جانا اور پیدل چلتے ہوئے بینک میں پہنچنا۔ وہاں میں تم کو منیجر کے کمرے میں ملوں گا۔'' اس نے اپنی آواز اتنی دھیمی رکھی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور نہ سن سکے۔

نذیرو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ وہ ٹیکسی رکوا کر اتر گیا۔

''مجھے ذرا آگے بینک کے سامنے اتار دینا۔'' نوجوان نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

ٹیکسی آگے بڑھی اور بینک کے سامنے جا کر رک گئی۔ نوجوان نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے کرایہ ادا کیا اور غور سے ادھر ادھر دیکھتا بھی رہا۔ حالانکہ اس کی یہ احتیاط بظاہر بے معنی سی تھی۔ اگر وہاں اس کا کوئی دشمن تھا بھی تو وہ اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔

کرایہ ادا کر کے وہ ٹیکسی سے اترا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا بینک میں داخل ہوا۔ اس نے کن انکھیوں سے نذیرو کو اس طرف آتے دیکھ لیا تھا۔

بینک میں داخل ہونے کے بعد اسے یک گونہ مسرت ہوئی۔ منیجر کا کیبن اسی طرف تھا جہاں اس نے خواب میں دیکھا تھا۔

وہ نہایت پُراعتماد انداز میں چلتا ہوا منیجر کے کمرے میں داخل ہوا۔

''اوہ، کوکب!'' منیجر اسے دیکھتے ہی چونکا اور اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے خوشی ظاہر ہو رہی

تھی۔ وہ میز کے گرد گھوم کر نوجوان کے قریب آیا اور والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گیا۔ ”اتنے دن تک کہاں غائب رہے میری جان! تمہارا موبائل فون بھی مجھے بند ہی ملا۔“

نوجوان کو فوراً اندازہ ہو گیا، جو ہونا بھی چاہیے تھا کہ منیجر اس کا کوئی پرانا اور بے تکلف دوست تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا نام کوکب تھا۔

”مجھے اچانک انگلینڈ جانا پڑ گیا تھا۔“ نوجوان کو صحیح جواب سوجھ گیا۔

”اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہوا؟“ منیجر نے تشویش سے پوچھا۔

”جو ہونا ہوتا ہے، ہو ہی جاتا ہے۔“ نوجوان نے ہنس کر کہا۔ ”ایک سڑک پر پیر پھسل گیا تھا قریب سے ایک موٹر سائیکل گزر رہی تھی۔ میں خود تو اس سے نہیں ٹکرایا لیکن میرا ہاتھ اس کے پہیے میں پھنس کر زخمی ہو گیا۔“

”تو کیا...“

”نہیں نہیں۔“ نوجوان نے اس کی بات کاٹی۔ ”زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔ کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ دس پندرہ دن میں ہاتھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

”شکر ہے، اچھا بیٹھو تو سہی۔“

نوجوان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت نذیرو اندر آیا۔

”یہ میرے ساتھ ہیں۔“ نوجوان جلدی سے بولا۔ ”اندرونِ سندھ کے ایک صحافی ہیں۔ نذیر احمد۔“

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ منیجر نے نذیرو سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام سجاد پرویز ہے۔ کوکب نے آپ کو بتا ہی دیا ہوگا کہ ہم بچپن کے دوست ہیں۔ اوہ! تشریف رکھیے نا آپ بھی۔“

نذیرو مسکراتا ہوا بیٹھ گیا لیکن اندر سے وہ خاصا نروس تھا۔

منیجر نے چپراسی کو بلا کر ٹھنڈے مشروب کی بوتلیں منگوائیں اور پھر نوجوان سے کہا۔ ”انگلینڈ سے کب آئے؟“

”آج ہی صبح آیا ہوں۔“

”اور تمہارے بھائی صاحب کا کیا حال ہے؟ ان سے مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہوئی یا نہیں؟“

اس سوال نے نوجوان کو باور کرا دیا کہ اپنے بڑے بھائی سے اس کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے جس کا علم بینک منیجر سجاد کو بھی تھا۔

”یاد مت دلاؤ وہ سب۔“ نوجوان نے کہا۔

”اور ہاں!“ منیجر سجاد کو کچھ یاد آیا۔ ”تم انگلینڈ کیا گئے، زرفشاں کو بھی بھول گئے! بہت پریشان ہے وہ! کئی مرتبہ مجھے بھی فون کر چکی ہے۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ تم نے مجھ سے بھی رابطہ نہیں کیا۔ کمال ہو تم بھی۔ اس سے تو رابطہ کیا ہوتا، یا آج اس سے بات کر چکے ہو؟ مگر کیسے کرو گے؟ اس کا نیا نمبر تو تمہیں معلوم ہی نہیں ہوگا؟“

”کیا مطلب؟“ نوجوان کے منہ سے نکلا۔ وہ اس وقت کسی حد تک ہیجانی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پے در پے کچھ باتیں اس کے سامنے آ رہی تھیں۔

منیجر سجاد نے بتایا۔ ”موبائل فون پر اسے کوئی بہت تنگ کر رہا تھا۔ پرسوں اس نے اپنے موبائل کی سم تبدیل کر لی ہے اور نیا نمبر اپنے کچھ خاص خاص جاننے والوں کو بتا دیا ہے۔ کل بھی اس نے مجھے فون کر کے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کا نیا نمبر ہے میرے پاس۔“

”وہ نمبر مجھے دے دو۔“ نوجوان نے اپنے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”میں اسے سرپرائز دوں گا۔“

سجاد نے میز پر پڑا ہوا اپنا موبائل اٹھایا اور بولا۔ ”بتاتا ہوں۔ تم اپنے موبائل میں فیڈ کر لو۔“

نوجوان کو بروقت سوجھی۔ اس نے اپنی اِدھر اُدھر کی جیبیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو شاید میں کہیں بھول آیا ہوں۔“

”کہیں کیا؟“ سجاد نے منہ بنایا۔ ”باہر اپنی کار میں ہی بھول آئے ہو گے۔ پرانی عادت ہے تمہاری... خیر، میں یہ سلپ پر لکھ دیتا ہوں۔“

نوجوان سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ قدرت اس پر مہربان ہے۔

سجاد نے سلپ پر ایک نمبر لکھ کر نوجوان کو دیا۔

”اب بھی اکیلے ہی رہ رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”وہیں؟ ساویری اپارٹمنٹ میں؟“ سجاد نے کہا، پھر ہنس کر بولا۔ ”شاید بے وقوفانہ سوال کر بیٹھا میں! دو مہینے پہلے ہی تو لیا ہے وہ تم نے! اتنی جلدی کیوں چھوڑو گے... میں وہاں کے بھی دو چکر لگا چکا ہوں۔ چوکیدار نے بتایا تھا کہ تمہارا اپارٹمنٹ اسی دن سے بند پڑا ہے جس دن تم کراچی سے غائب ہوئے تھے۔ یہ تو اب معلوم ہوا ہے مجھے کہ تم غائب نہیں ہوئے تھے بلکہ انگلینڈ چلے گئے تھے۔“

سجاد کو غالباً زیادہ اور مسلسل بولنے کی عادت تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”مگر اچانک انگلینڈ جانے کی تمہیں سوجھی کیوں؟“

نوجوان کو اس کا جواب نہیں دینا پڑا کیونکہ سجاد کی توجہ چپراسی کی طرف مبذول ہو گئی تھی جو ایک ٹرے میں

مشروب کی بوتلیں اور گلاس لایا تھا۔

"گلاسوں میں تم ہی انڈیل دو۔" سجاد نے چپراسی سے کہا۔

چپراسی نے مشروب کی بوتلیں گلاسوں میں خالی کیں اور بوتلیں لے کر چلا گیا۔

سجاد اپنا سوال شاید بھول ہی گیا تھا۔ وہ بولا۔ "اور سناؤ، ابھی مجھ سے ہی ملنے آئے ہو یا کچھ کیش نکلوانا ہے، یا پھر لاکر؟"

نوجوان سمجھ گیا کہ اس بینک میں اس کا اکاؤنٹ بھی تھا۔

"کیش کی بھی ضرورت ہے اور لاکر سے بھی کچھ نکالنا ہے۔" نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ میں دستخط نہیں کر سکتا۔"

"چیک تو دستخط کے بغیر کیش نہیں ہو سکتا میری جان! لیکن یہ مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں اپنے اکاؤنٹ سے نکلوا کر دے دیتا ہوں۔ بعد میں لوٹا دینا۔ کتنے روپوں کی ضرورت ہے۔ پچاس ہزار سے کام چل جائے گا۔"

"چل جائے گا۔" نوجوان نے سرسری انداز میں کہا لیکن اس کا ہیجان یہ جان کر اور بڑھ گیا تھا کہ وہ مالی طور پر خاصا خوش حال ہے۔

"اب رہا لاکر کا سوال۔" سجاد بولا۔ "دستخط اس کے لیے بھی ضروری ہیں۔ تم بائیں ہاتھ سے اوندھے سیدھے دستخط کر دو۔ میں اس پر ویری فکیشن کی مہر لگا کے اپنے دستخط کر دوں گا۔ یا چھوڑو! میں کچھ اور کر لوں گا۔ جب ہاتھ ٹھیک ہو جائے تو دستخط کر دینا آ کر... لاکر دیکھ لو جا کر، لیکن پہلے یہ تو ختم کر لو۔" اس کا اشارہ مشروب کے گلاس کی طرف تھا۔

نوجوان کے دل کی دھڑکنیں خوشی کے مارے تیز ہو گئیں۔ نہ صرف یہ کہ اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ اسے کچھ نئی باتیں بھی معلوم ہو گئی تھیں؟"

نذیرو اس دوران میں خاموشی سادھے رہا تھا۔

سجاد نے اپنی چیک بک نکال کر پچاس ہزار کا ایک "سیلف" چیک کاٹا اور بینک کے کسی آدمی کو بلا کر اس سے کہا۔ "یہ لے جاؤ، اور روپے فوراً لا کر دو۔"

سجاد نے کوئی پرانا مزاحیہ واقعہ سنانا شروع کر دیا جو نوجوان کو بالکل یاد نہیں تھا لیکن وہ مسکراتا اور سر ہلاتا رہا۔ اسی دوران میں پچاس ہزار کی رقم بھی آ گئی جو نوجوان نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔

نوجوان نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ "کبھی بھائی صاحب کا اِدھر سے گزر ہوا؟"

سجاد ہنسا۔ "ان حضرت کو معلوم ہی کہاں ہے کہ میں اس برانچ کا منیجر ہوں اور میں نے ان سے تمہارے خراب تعلقات کے پیشِ نظر بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ہاں انہیں میرا موبائل نمبر یقیناً معلوم ہو گا کیونکہ تمہارے اچانک چلے جانے کی وجہ سے پریشان ہو کر میں نے انہیں فون کیا تھا۔ میرے سوال پر انہوں نے جواب دیا کہ تم بیرونِ ملک گئے ہوئے ہو۔ انہوں نے انگلینڈ کا نام نہیں لیا تھا۔ اس وقت ان کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن ان کے لہجے سے مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے انہوں نے بہت ٹیڑھا منہ کر کے جواب دیا تھا۔"

نوجوان مسکرا کر رہ گیا۔

سجاد نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر دبایا اور کچھ توقف سے بولا۔ "خلیل صاحب! ذرا میرے پاس آیئے! کوکب آیا ہے۔ اسے اسٹرانگ روم میں لے جانا ہے۔"

اس وقت تک نوجوان اور نذیرو اپنے گلاس خالی کر چکے تھے۔

"آپ بہت کم گو معلوم ہوتے ہیں؟" سجاد نے نذیرو سے کہا۔

"ہاں۔" نوجوان جلدی سے بولا۔ "ان کا خیال ہے کہ زبان کم ہلائی جائے تو انرجی بھی کم ضائع ہوتی ہے۔"

سجاد ہنسا۔ "صحافت کے پیشے میں یہ کیسے ممکن ہے بھئی؟"

"دراصل۔" نوجوان نے کہا۔ "میں نے انہیں صحافی اس اعتبار سے کہا تھا کہ یہ اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں۔ کسی پریس کانفرنس میں نہیں جاتے، کبھی کسی کا انٹرویو نہیں لیتے۔"

یہ بات زیادہ آگے نہیں چلی۔ چالیس سال کا ایک شخص اندر آیا۔ اس نے نوجوان کو سلام کیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہت دن بعد آئے کوکب صاحب!"

نوجوان سمجھ گیا کہ اس شخص کا نام خلیل تھا جسے سجاد نے بلایا تھا۔

"کچھ ایسی ہی بات تھی۔" نوجوان نے ہنس کر مبہم سا جواب دیا اور کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔ "آیئے نذیر صاحب۔"

"انہیں یہیں بیٹھا رہنے دو۔" سجاد بولا۔ "تم اپنا کام کر آؤ۔"

"نہیں سجاد! انہیں بھی جانے دو۔ یہ اسٹرانگ روم کے باہر کھڑے رہیں گے۔ میں بھی وہیں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے کئی کام کرنے ہیں اور تم سے باتوں میں خاصا وقت گزر گیا۔ اب تم سے کل یا پرسوں ملوں گا۔"

سجاد چاہتا تھا کہ بینک سے باہر جا کر اپنے دوست کو

اس کی کار تک چھوڑ کر آئے۔ نوجوان اسے بمشکل ٹال سکا۔ اس کے پاس کار تھی ہی نہیں۔ کار نہ ہونے کا بھی اسے کوئی بہانہ بنانا پڑتا۔

وہ خلیل کے ساتھ بینک کے اسٹرانگ روم میں گیا۔ تیرہ نمبر لاکر کی چابی اس کی جیب میں تھی جو اسے حکیم صاحب سے ملی تھی۔

لاکر سے اسے تین چیزیں ملیں۔ ایک بڑا اور پھولا ہوا براؤن لفافہ، ایک ڈائری اور ایک چابی۔

ڈائری اسی بینک کی شائع کردہ تھی جو بینک کے خاص خاص کلائنٹس کو دی گئی ہوگی۔ اس کی چرمی جلد کے ایک کونے پر سنہری حروف میں ''کوکب فخری'' چھپا ہوا تھا۔

اس نے بے تابانہ ڈائری کھول کر دیکھی۔ پہلے ہی ورق پر نام کی جگہ بھی ''کوکب فخری'' لکھا ہوا تھا۔ اسے سجاد نے بھی اسی نام سے مخاطب کیا تھا لہٰذا اب اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ اس کا نام کوکب تھا۔ اس نام کے نیچے ہی پتا بھی لکھا تھا۔ اس پتے میں ''ساویری اپارٹمنٹس'' بھی لکھا تھا جس کا حوالہ سجاد نے دیا تھا۔ سجاد کے ایک فقرے سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی تھی کہ وہ چار ماہ سے اسی اپارٹمنٹ میں اکیلا رہ رہا تھا۔

''میں کوکب ہوں، کوکب فخری۔'' وہ ہیجانی انداز میں بڑبڑایا۔

چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے خلیل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں کوکب صاحب؟''

''نہیں، میں کچھ پڑھنے لگا تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

اس کی بے تابی اس قدر تھی کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے ڈائری پڑھ لینا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

لاکر بند کرنے کے بعد کوکب اور خلیل دروازے کی طرف بڑھے لیکن کوکب ایک قدم اٹھا کر ہی رک گیا اور بولا۔ ''آپ میرا ایک کام کردیں گے خلیل صاحب!''

''حکم دیجیے! میں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی۔''

''میرے ساتھ ایک سندھی صاحب بھی تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا انہیں۔''

''جی ہاں، وہ ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ غالباً اسٹرانگ روم کے باہر کھڑے ہوں گے۔ سجاد صاحب نے آپ کے بعد ان سے بھی مصافحہ کیا تھا۔''

''وہی۔'' کوکب نے کہا، پھر مسکرا کر بولا۔ ''دراصل میرے دو ایک جاننے والے بینک کے باہر موجود ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں لاکر سے کچھ نکلواتا ہوں یا نہیں... اور میں چاہتا ہوں کہ وہ بے خبر رہیں۔ آپ یہ تینوں چیزیں انہی صاحب کو دے دیجیے گا۔ ان سے کہیے گا کہ یہ چیزیں وہ اپنے کپڑے کے تھیلے میں رکھ لیں اور اپنے ہوٹل پہنچیں۔ میں وہاں آکر ان سے یہ تینوں چیزیں لے لوں گا۔'' وہ چیزیں براؤن لفافہ، ڈائری اور ایک چابی تھی۔

خلیل ہنسا۔ ''یہ تو بڑا پُراسرار سا طریقہ کار ہوگا آپ کا۔''

جواب میں کوکب نے بھی مسکرانے کی کوشش کی مگر اندرونی طور پر وہ بے حد مضطرب تھا۔ اگرچہ سجاد نے یہ بات بتائی تھی کہ اس کے بڑے بھائی کو اس بینک کے بارے میں کچھ نہیں معلوم لیکن کوکب اس موقع پر بہت محتاط رہنا چاہتا تھا، جب وہ اپنے ماضی کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی ڈائری کے اندراجات یقینی طور پر اس کے ماضی کا دروازہ کھول دیتے۔

وہ اسٹرانگ روم سے نکل کر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ نذیرو کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم ایک منٹ یہیں رکنا۔''

پھر کوکب نے مڑ کر نہیں دیکھا اور تیزی سے چلتا ہوا بینک سے نکل گیا۔ بینک سے نکلتے وقت وہ اضطرابی کیفیت میں تھا۔ وہ کیفیت بینک سے نکلنے کے بعد بھی رہی لیکن اس نے ظاہری طور پر خود پر قابو پالیا ورنہ اس کی حالت دیکھ کر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوسکتے تھے۔

وہ بظاہر پُرسکون انداز میں قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا۔ نہ جانے کیوں یہ بات اس کے دماغ میں گھس گئی تھی کہ وہ جیسے ہی بینک سے نکلے گا، اس پر اَن جانے دشمنوں کی یلغار ہوجائے گی اسی لیے اس نے لاکر سے نکالی ہوئی تینوں چیزیں نذیرو تک پہنچوادی تھیں اور اپنے خیال کے مطابق انہیں محفوظ کردیا تھا۔

جب وہ سو ڈیڑھ سو قدم چل چکا اور کسی بھی خطرے سے دوچار نہیں ہوا تو اس کی اضطرابی کیفیت دھیرے دھیرے کم ہوتی چلی گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ چھٹی حس ہمیشہ ہی درست اشارے نہیں دیتی۔

اب وہ ایک جگہ رکا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے کسی ٹیکسی کی تلاش تھی۔ زیادہ تر ٹیکسیاں بھری ہوئی گزرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ تاہم اسے ایک خالی ٹیکسی بھی دکھائی دے گئی۔ وہ اسی طرف سے آرہی تھی جدھر سے وہ آیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور شاید کسی سواری کا متلاشی ہوگا۔ کوکب نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس میں بیٹھتا ہوا بولا۔ ”ریلوے اسٹیشن چلو۔“

”کون سے ریلوے اسٹیشن صاحب! سٹی اسٹیشن تو قریب ہی ہے۔“

”کینٹ اسٹیشن۔“ کوکب نے جواب دیا۔

یہ نام اس نے نذیر ہوری سے سنا تھا۔

ٹیکسی نے ایک چوراہے سے ”یوٹرن“ لے کر رفتار بڑھانا شروع کی۔

کوکب کا دماغ ایک بار پھر خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ ان خیالات میں ایک نام زرفشاں کا بھی تھا۔ سجاد کی باتوں کے مطابق وہ اس کے لیے بہت پریشان تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ ان دونوں کے گہرے روابط تھے۔ کوکب کو زرفشاں کے موبائل نمبر کا بھی خیال آیا جو اسے سجاد نے دیا تھا۔

”سنو!“ کوکب نے ٹیکسی ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”راستے میں کوئی ایسی دکان ملے گی جہاں سے ایک موبائل فون خریدا جاسکے؟“

”موبائل خریدنا ہے آپ کو؟“

”ظاہر ہے، ورنہ میں کیوں پوچھتا؟“

”میں آپ کو لے چلتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد ٹیکسی ایک جگہ روک کر ڈرائیور نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”وہ ہے صاحب دکان۔“

کوکب ٹیکسی سے اترا۔

”تم ذرا دیر میرا انتظار کرو۔ میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”آپ اطمینان سے آؤ صاحب!“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

کوکب تیزی سے چلتا ہوا دکان میں پہنچا۔ وہاں سے اس نے ایک موبائل فون خریدا۔ انتخاب کے چکر میں پڑ کر اس نے وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ دکان دار ہی کے مشورے سے اس نے ایک کمپنی کی سم خرید کر دکان دار سے ہی موبائل فون میں ڈلوائی اور دکان سے نکل کر پھر ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

کوکب کو موبائل فون خریدنے کا خیال اس لیے آیا تھا کہ وہ زرفشاں کو فون کر کے اس کی آواز تو سنے! زرفشاں سے باتیں کرنے کے بارے میں اس نے قطعی نہیں سوچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے اپنی ڈائری پڑھ لے۔ اپنے بارے میں جاننے کے بعد ہی وہ زرفشاں سے بات کرتا۔ ڈائری پڑھ کر اسے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ زرفشاں سے اس کے مراسم کی نوعیت کیا تھی۔ اسے سجاد کی باتوں سے کچھ اشارہ تو ملا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان مبہم اشاروں سے کوئی غلط اندازہ قائم کرلے۔

جب وہ زرفشاں کا نمبر ملا رہا تھا تو اسے نذیر ہو کے موبائل کا خیال آیا۔ اسے اس کا نمبر پوچھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اگر وہ نمبر اس کے پاس ہوتا تو وہ اس سے بھی بات کرلیتا۔

زرفشاں کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد موبائل کان سے لگاتے ہوئے بھی کوکب کو نذیر ہوری کا خیال تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نذیر ہو رکشا کر کے ہوٹل پہنچا ہوگا۔ اس کی جیب خالی نہیں تھی۔ ہوٹل سے چلتے وقت کوکب نے پانچ سو کا ایک نوٹ اس کی جیب میں بھی ڈال دیا تھا کہ شاید اسے بھی کوئی ضرورت پڑ جائے۔

دو گھنٹی بعد کوکب نے دوسری طرف سے آنے والی ایک سریلی سی نسوانی آواز سنی۔ ”ہیلو!“

کوکب خاموش رہا۔ فی الحال اس کے دماغ میں صرف یہ خیال تھا کہ شاید وہ زرفشاں کی آواز پہچان لے اور اسے کچھ یاد آجائے۔

”ہیلو!“ اس مرتبہ دوسری طرف سے کچھ بلند آواز میں کہا گیا۔

کوکب اب بھی خاموش رہا تو دوسری طرف سے کچھ برا بھلا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

کوکب نے مایوسانہ انداز میں اپنا موبائل بھی آف کیا۔ اسے زرفشاں کی آواز نہ تو مانوس محسوس ہوئی تھی اور نہ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

عجیب بات ہے، وہ سوچنے لگا۔ ناول پڑھتے ہوئے بھی اسے اپنے دماغ میں کسی یاد کا جھما کا سا محسوس ہوا تھا۔ خواب میں اس کی کار کسی کار سے ٹکرائی تھی تو اسے اپنے بڑے بھائی کا خیال آیا تھا۔ حکیم صاحب سے ان کے بھائی جمیل کا نام سن کر بھی اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں۔ اخبار میں بینک کی تصویر دیکھ کر بھی اس کے دماغ میں جھماکے سے ہوتے رہے تھے۔

یادداشت کھونے کا ایک عجیب کیس! کوکب نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا، اسے کچھ یاد آجاتا تھا اور کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ زرفشاں سے اس کے خاصے روابط تھے لیکن اس کی آواز سن کر اسے کچھ یاد نہیں آیا تھا۔

ٹیکسی کی رفتار کم ہوئی اور ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ ”کینٹ اسٹیشن تو آگیا صاحب! آپ کو ادھر ہی اترنا ہے؟“

کوکب کو وہاں نہیں اترنا تھا لیکن اس نے ٹیکسی

رکوائی۔ اتر کر کرایہ ادا کیا اور ایک طرف چل پڑا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ ہوٹل ادھر ہی ہونا چاہیے تھا جہاں اس نے نذیرو کے ساتھ قیام کیا تھا۔

جلد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ بھٹک گیا ہے، لیکن وہ پریشان نہیں ہوا۔ ہوٹل کا نام اسے یاد تھا۔ وہ لوگوں سے پوچھتا ہوا ہوٹل پہنچ گیا۔

نذیرو پہنچ تو گیا ہوگا، اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے سوچا۔ خود اسے تو کچھ دیر ہوگئی تھی۔

دروازہ کھولنے والا نذیرو ہی تھا۔

''اچو سائیں!'' وہ بے اختیاری میں اپنی زبان بول گیا۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی نا نذیرو؟'' کوکب نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نا سائیں!'' جواب دیتے ہوئے وہ دروازہ بند کرنے لگا۔

''بینک کے ایک صاحب نے تمہیں کچھ چیزیں دی ہوں گی؟'' کوکب نے پوچھا۔

''جی سائیں!'' نذیرو نے لپک کر ایک طرف رکھا ہوا کپڑے کا تھیلا اٹھایا۔

ڈائری اور براؤن لفافے کے ساتھ چابی بھی تھی۔

کوکب کا خیال تھا کہ وہ چابی شاید اس کے اپارٹمنٹ کی ہوگی۔

کوکب نے چابی جیب میں ڈالی، پھر ڈائری اور براؤن لفافہ ایک طرف رکھ کر اپنے دائیں ہاتھ کی وہ ڈریسنگ کھولنے لگا جو اس نے ایک جراح سے کروائی تھی۔ ڈریسنگ کھولنے کے بعد اس نے سوٹ اتار کر شلوار قمیص پہنی۔ اب وہ لیٹ کر اپنی ڈائری پڑھنا چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون آگیا؟'' وہ چونک کر بولا اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

''ہوٹل کا لڑکا ہوگا سائیں!'' نذیرو نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''صبح ناشتا لایا تھا نا، برتن یہیں پڑے ہیں۔''

نذیرو نے دروازہ کھولا۔ وہ ہوٹل کا لڑکا ہی تھا۔ وہ برتن لے کر چلا گیا لیکن کوکب پر پھر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ کہیں بینک سے کسی نے اس کا تعاقب نہ کیا ہو۔ اس کے دماغ میں اندیشہ ابھرا۔ اسے ٹیکسی والے کا بھی خیال آیا۔ وہ بھی اس کے دشمنوں کا آدمی ہوسکتا تھا۔

''نذیرو!'' کوکب نے چپل پہنتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے کہیں اور چلا جانا چاہیے، فوراً۔''

''کیوں سائیں؟'' نذیرو حیرت سے بولا۔

''میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔'' کوکب نے کہا۔ ''تم جلدی سے نیچے جا کر ہوٹل والے کا حساب کتاب کرو، میں سامان سمیٹتا ہوں۔''

نذیرو چون وچرا کیے بغیر کمرے سے چلا گیا۔

کوکب نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ اس نے نذیرو سے سامان سمیٹنے کی بات کی تھی جبکہ ایسا کوئی خاص سامان تھا ہی نہیں۔ اس نے گزشتہ شام کا خریدا ہوا سوٹ پلاسٹک کے اسی شاپر میں رکھا جس میں وہ لایا گیا تھا جو دوسری چیزیں خریدی گئی تھیں، ان کے شاپر بھی تھے۔ ان میں کوکب اور نذیرو کے شلوار سوٹ بھی آگئے۔ ان کی گٹھڑی بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔

لاکر سے ملی ہوئی چابی اس نے کوٹ سے قمیص کی جیب میں منتقل کرلی۔

نذیرو کے ساتھ ہوٹل کا لڑکا بھی آیا جسے کمرا چیک کرنا تھا۔ نذیرو نے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر دے دی تھی جو اب اس لڑکے کے پاس تھی۔

''اب کہاں چلنا ہے سائیں؟'' نذیرو نے ہوٹل سے نکلتے وقت پوچھا۔

کوکب نے کوئی جواب دیے بغیر نذیرو کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کی جہاں اسے ایک خالی ٹیکسی کھڑی نظر آئی تھی۔

ڈائری میں لکھا ہوا ساویری اپارٹمنٹ کا پتا کوکب کو یاد تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اس علاقے کا نام بتا دیا۔

ٹیکسی ان دونوں کو لے کر چل پڑی۔ نذیرو الجھا ہوا سا خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں یقیناً نہیں آرہا ہوگا کہ اب اس کے شہری سائیں نے کہاں جانے کا ارادہ کرلیا ہے۔

بتائے ہوئے علاقے میں پہنچ کر ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔ ''کہاں اترنا ہے صاب؟''

''ساویری اپارٹمنٹس دیکھے ہیں؟'' کوکب نے پوچھا۔

''جی صاب!''

''بس وہیں جانا ہے۔''

دو منٹ بعد ہی ٹیکسی جس عمارت کے سامنے رکی، وہ چار منزلہ تھی۔ اس پر ''ساویری اپارٹمنٹس'' بھی لکھا ہوا تھا۔

کرایہ ادا کر کے وہ دونوں ٹیکسی سے اترے۔ شاپنگ بیگ ان کے ہاتھوں میں تھے۔

جب وہ دونوں اپارٹمنٹس کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئے تو ایک ایسے شخص سے سامنا ہوا جو وہاں کا چوکیدار معلوم ہوتا تھا۔ وہ کوکب کو دیکھ کر چونکا اور پھر مسکرا کر بولا۔

''بہت دن بعد آئے صاحب؟''

''ہاں، ذرا اندرونِ سندھ کی طرف نکل گیا تھا۔'' کوکب نے یہ جواب اس لیے دیا کہ وہ سندھی شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے نذیرو کی وضع قطع بھی ویسی ہی تھی۔

''زرفشاں میم صاب کئی بار پوچھ گئی ہیں آپ کو۔ ایک صاحب اور بھی آئے تھے۔ انہوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ بس آپ کو پوچھا اور چلے گئے۔''

کوکب سمجھ گیا کہ چوکیدار نے سجاد کے بارے میں بتایا ہوگا۔ وہ نذیرو کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ چوکیدار اس مختصر سی گفتگو کے بعد وہیں رک گیا تھا۔

لفٹ کے ذریعے وہ اوپر پہنچے۔ کوکب کو اپارٹمنٹ کا نمبر بھی یاد تھا۔ وہ اسی کے سامنے رکا اور جیب سے چابی نکالی۔ چابی لگاتے وقت اس کے دل کی دھڑکن اس خیال سے بڑھی تھی کہ اگر یہ چابی اس اپارٹمنٹ کی نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟

سکون کی سانس اس نے اس وقت لی جب دروازہ کھل گیا۔ وہ نذیرو کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

نذیرو نے اپنے سامنے ایک شان دار ڈرائنگ روم دیکھا تو حیرت سے بولا۔ ''یہ کس کا گھر ہے سائیں؟''

اس وقت کوکب کے دماغ میں ایک بار پھر جھماکے ہونے لگے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم اسے اجنبی نہیں لگا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس اپارٹمنٹ میں ایک لاؤنج اور دو بیڈ روم بھی ہیں۔ وہ نذیرو کو ساتھ لیے پُرجوش انداز میں آگے بڑھا۔ نذیرو حیرت زدہ اس کے ساتھ رہا۔

کوکب نے سارے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ اسے کوئی جگہ بھی اجنبی نہیں لگی۔ وہ اس کمرے میں رک گیا جہاں ایک خوب صورت لڑکی کی خاصی بڑی تصویر آویزاں تھی جو آئل پینٹ سے بنائی گئی تھی۔

''زرفشاں۔'' کوکب نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی آواز میں ایسی لرزش تھی جیسے وہ جذباتی ہو گیا ہو۔ اس کے دماغ میں پھر جھماکے ہونے لگے۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ وہ زرفشاں کے ساتھ کسی باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے جھماکے نے اسے دکھایا کہ وہ زرفشاں کے ساتھ کلفٹن کے برج پر کھڑا تھا۔ تیسرا جھماکا اس منظر کا تھا کہ وہ اور زرفشاں ایک کار میں کہیں جا رہے تھے۔

چوتھا، پانچواں، چھٹا جھماکا! ہر مرتبہ اس نے خود کو زرفشاں کے ساتھ دیکھا۔

''ہم کس کے گھر میں ہیں سائیں؟'' نذیرو نے دوبارہ پوچھا۔

اس مرتبہ کوکب چونک گیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ میرا گھر ہے نذیرو! یہ میرا گھر ہے، یہ تمہارا گھر ہے۔'' اس کے لہجے میں وحشت سی تھی۔ ''یہ حکیم صاحب کا گھر ہے، یہ مار...''

وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ ماروی کا نام اس کی زبان پر نہیں آسکا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ کو جھٹکا سا لگ گیا۔ ماروی یقیناً بہت اچھی لڑکی تھی، اسے پسند بھی کرتی تھی لیکن وہ تو زرفشاں سے محبت کرتا تھا۔ اسے زرفشاں کے باپ کا نام بھی یاد آ گیا تھا۔ سلمان علی جو ایک ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس تھے۔

''یہ آپ کا گھر ہے سائیں؟'' نذیرو کچھ خوش ہو گیا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''بس چل گیا پتا۔'' کوکب کی آواز میں لرزش تھی۔ ''مجھے بالکل خیال نہیں تھا کہ کراچی پہنچنے کے دوسرے ہی دن اتنا کچھ معلوم ہو جائے گا۔ امید ہے کہ آج ہی ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی، بلکہ یاد ہی آجانا چاہیے۔''

زرفشاں کی تصویر دیکھ کر اس کے دماغ میں جو جھماکے ہوئے تھے، انہی کی وجہ سے اسے خیال آرہا تھا کہ اب اسے سب کچھ یاد آجائے گا۔ سجاد سے زرفشاں کا نام سن کر اسے کچھ یاد نہیں آیا تھا لیکن تصویر کو دیکھتے ہی اسے یاد آگیا تھا کہ وہ زرفشاں کی تصویر ہے۔

''یہ تو بہت اچھا ہو گیا سائیں!'' نذیرو سچ مچ بہت خوش تھا۔

''میری چیزیں مجھے دے دو۔''

کوکب کی ڈائری اور براؤن لفافہ اسی تھیلے میں تھا جو اس وقت بھی نذیرو ہی کے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔ ہوٹل سے چلتے وقت بھی کوکب نے وہ دونوں چیزیں اپنے پاس نہیں رکھی تھیں۔

نذیرو نے دونوں چیزیں اسے دے دیں۔ کوکب نے وہ بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھیں، پھر نذیرو کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

''اب تم یہاں بیٹھو، یا کسی صوفے پر لیٹ کر آرام کرو۔''

اس اپارٹمنٹ کے دوسرے کمرے میں بہت معمولی سا سامان پڑا ہوا تھا۔ اس کی آرائش نہیں کی گئی تھی۔ اگر وہاں صرف بستر ہی پڑا ہوتا تو کوکب نذیرو کو ڈرائنگ کے بجائے وہیں لے جاتا۔

''میں اب اس کمرے میں جا کر ڈائری پڑھوں گا۔'' کوکب نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔

''ڈائری؟''

''ہاں۔'' کوکب مسکرایا۔ ''وہ کتاب جو تمہیں بینک کے ایک آدمی نے دی تھی۔ تم نے شاید وہ کھول کر بھی نہیں دیکھی ہوگی؟''

''آپ کی اجازت کے بغیر کیسے دیکھ لیتا سائیں؟''

کوکب نے اس کا شانہ تھپکا اور اسے وہیں چھوڑ کر اس کمرے میں آگیا جہاں زرفشاں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ یہ اسی کا بیڈ روم تھا۔

بستر پر لیٹ کر کوکب نے ڈائری پڑھنا شروع کی۔ اس نے اپنی تحریر بھی پہچان لی تھی۔ ڈائری کا آغاز پہلی جنوری سے ہوا تھا۔ فروری تک کے اندراجات پڑھتے ہوئے کوکب نے جان لیا کہ اس کے والد کا نام فخر الدین اور خود اس کا نام کوکب فخری اور اس کے بڑے بھائی کا نام جمیل فخری باپ کے نام کی رعایت سے تھا۔

جمیل فخری کا نام پڑھتے ہوئے کوکب کو یہ بھی یاد آگیا تھا کہ حکیم صاحب کی زبان سے جمیل کا نام سن کر اس کے دماغ کو جھٹکا کیوں لگا تھا۔

فخر الدین ایک بزنس مین تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا بزنس اور ان کا سارا بینک بیلنس کوکب اور جمیل کے حصے میں آیا۔ وہ بزنس ایک بہت بڑی دوا ساز فیکٹری کا تھا۔ اس کاروبار کے سلسلے میں کوکب اور جمیل میں کشیدگی پیدا ہونے لگی جس کا سبب فوری طور پر یہ ظاہر ہوا کہ کوکب کاروبار میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فطری طور پر ایک آرٹسٹ تھا۔ پروفیشنل نہ ہونے کے باوجود اس کو صرف مصوری سے دلچسپی تھی۔ وہ باپ کی زندگی میں بھی خود کو کاروبار سے الگ تھلگ رکھتا تھا۔ فخر الدین نے چھوٹے بیٹے کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس کی کاروبار سے عدم دلچسپی پر بھی خفگی ظاہر نہیں کی تھی۔

انہی اندراجات سے کوکب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اور ایس پی سلمان علی کی بیٹی زرفشاں کالج کے زمانے ہی میں ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد ان کی شادی اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ زرفشاں کی والدہ کسی بات پر اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اپنے باپ کے پاس چلی گئی تھیں جو نیروبی میں بزنس کرتے تھے۔ سلمان علی کی کوشش تھی کہ کسی طرح بیوی سے صلح ہو جائے، تبھی وہ زرفشاں کی شادی اس کی خواہش کے مطابق کر دیں لیکن یہ معاملہ دو سال سے کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔

اس دوران میں زرفشاں اور کوکب کا ملنا جلنا برقرار رہا تھا۔ وہ دونوں محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر ساری زندگی خوش نہیں رہ سکیں گے۔

کوکب کے سامنے ایک اہم بات یہ آئی کہ اندرونِ سندھ کے ایک وڈیرے حشمت ابڑو سے اس کے بڑے بھائی جمیل کی دوستی کچھ پُراسرار سی تھی۔ حشمت ابڑو جب بھی جمیل سے ملنے فخری ہاؤس آتا تھا تو وہ دونوں کبھی ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھتے تھے۔ ان کی گفتگو صرف لان میں ہوتی تھی جہاں ان کے آس پاس کوئی نہ ہو جو اُن کی باتیں سن سکے۔

حشمت ابڑو کی شخصیت نے بھی کوکب پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔

مارچ کے اندراجات سے کوکب کو معلوم ہوا کہ انہی دنوں میں اس پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا تھا۔

کوکب کاروبار میں تو دلچسپی لیتا نہیں تھا اور فیکٹری بھی بہت کم جاتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیکٹری گیا تو اسے ایک بڑی عجیب بات معلوم ہوئی۔ فیکٹری کا ایک چوتھائی حصہ باقی فیکٹری سے الگ کر دیا گیا تھا۔ دونوں حصوں میں کام کرنے والے بھی ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔

جب حشمت ابڑو کراچی آتا تھا تو جمیل اسے فیکٹری کے ''ممنوعہ'' حصے کا دورہ ضرور کراتا تھا۔

یہ باتیں سامنے آنے کے بعد کوکب نے اس معاملے کی ٹوہ لینا شروع کی۔

ٹوہ لینے کے وہ سارے واقعات بڑی تفصیل سے لکھے گئے تھے جس کا لب لباب یہ تھا کہ فیکٹری کے اس حصے میں جعلی دوائیں تیار کی جاتی تھیں۔

اگر وہ دوائیں اپنے ہی ملک میں پھیلائی جاتیں تو جلد یا بہ دیر قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کو اس کا علم ہو ہی جاتا اس لیے ان جعلی دواؤں کو قریب کے ایک اور ملک میں اسمگل کیا جاتا تھا۔

اسمگلنگ کرنے والے افراد جرائم پیشہ تھے۔ انہوں نے ماہی گیروں کی وضع قطع بنالی تھی اور کسی نہ کسی طرح ان بستیوں میں پھیل گئے تھے جہاں واقعی ماہی گیر آباد تھے۔ اسمگلنگ کے لیے انہیں بڑے بڑے ٹرالر دلوائے گئے تھے۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کوکب کو اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ قانون کو اس غیر قانونی اور انسانیت سوز کام کی اطلاع دے دیتا لیکن کشیدگی کے باوجود اس کے دل میں بھائی کی محبت تھی۔ اسے یہ گمان بھی تھا کہ اس کے بھائی کو اس غلط راہ پر ڈالنے میں حشمت ابڑو کا ہاتھ ہوگا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے بھائی

کو بچانے کے لیے پہلے تو اس غیر قانونی کام کے ثبوت جمع کرے اور پھر اپنے بھائی کو سمجھائے کہ اگر اس نے یہ کام نہ چھوڑا تو وہ اس بارے میں پولیس کو اطلاع دے دے گا۔

اپریل کے اندراجات سے معلوم ہوا کہ کوکب نے آدھی آدھی رات کو چھپ چھپ کر فیکٹری کے ممنوعہ حصے میں جانا شروع کیا تھا اور وہاں کی تصویریں کھینچنا شروع کی تھیں۔ ایک مرتبہ حشمت ابڑو اور جمیل آدھی رات کے وقت وہاں کا معائنہ کرنے آئے تھے۔ کوکب نے اس موقع پر بھی کئی تصویریں کھینچی تھیں۔

کسی کی بات چیت ریکارڈ کرنے کے خفیہ آلات کیونکہ عام طور پر بازار میں ملنے لگے تھے اس لیے ان کے حصول میں بھی کوکب کو قطعی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کو جب کسی طرح حشمت ابڑو کے آنے کی اطلاع مل جاتی تو وہ خفیہ آلات لان کے کئی حصوں میں چھپا دیا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے ان دونوں کی باتوں کے کئی آڈیو کیسٹ ریکارڈ کر لیے تھے۔

ان دونوں کی باتوں ہی سے کوکب کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ مہینے کی دو مخصوص تاریخوں کو فیکٹری سے وہ دوائیں ساحل سمندر کے ایک خاص حصے میں پہنچائی جاتی تھیں اور انہیں ان ٹریلر پر بار کر دیا جاتا تھا جو انہیں قریب کے ایک ملک اسمگل کرتے تھے۔

کوکب کو اس بات سے بھی بڑی اذیت ہوئی تھی کہ ساحل کی نگرانی کرنے والی پولیس کے دو بڑے افسر بھی حشمت اور جمیل سے ملے ہوئے تھے۔ اگر انہیں نہ ملایا جاتا تو یہ اسمگلنگ غالباً ممکن نہ ہوتی۔

یہ معلومات حاصل ہو جانے کے بعد کوکب نے ان اوقات کی تصاویر لینا بھی ضروری سمجھا جب دوائیں فیکٹری سے لے جائی جاتی تھیں اور ٹریلرز پر بار کی جاتی تھیں... ان دونوں مواقع کی تصاویر لینے کے لیے کوکب خود کو خطرات میں ڈالنے پر مجبور ہوا تھا۔ ان اوقات میں جمیل اور حشمت کے مسلح آدمی آس پاس کے علاقے کی نگرانی کیا کرتے تھے۔

اتنا مواد اکٹھا کرنے کے بعد کوکب نے جعلی دواؤں کا ذکر کیے بغیر بڑے بھائی سے کہنا شروع کیا کہ وہ حشمت ابڑو سے اپنی دوستی ختم کر دے ورنہ اس کی وجہ سے وہ کسی مصیبت میں پھنس جائے گا۔

ایک موقع پر کوکب یہاں تک کہہ بیٹھا کہ "حشمت ابڑو مجھے تو کوئی جرائم پیشہ معلوم ہوتا ہے۔"

کیونکہ اس وقت تک کوکب نے کوئی واضح بات نہیں کی تھی اس لیے جمیل اس کی باتیں کبھی ہنسی میں اور کبھی کچھ خفگی کا اظہار کر کے اُڑا دیا کرتا تھا۔

اس سارے دورانیے میں کوکب اور زرفشاں کی ملاقاتیں بھی جاری رہی تھیں۔ زرفشاں اس سے ملنے کے لیے کبھی کبھی فخری ہاؤس بھی آجایا کرتی تھی۔ کیونکہ ان لوگوں کا تعلق ماڈرن سوسائٹی سے تھا اس لیے کوکب نے جمیل کو یہ بات بتا بھی دی تھی کہ وہ زرفشاں سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے کیونکہ زرفشاں بھی اس سے محبت کرتی ہے۔

کوکب کو اس بات کا بھی بڑا قلق ہوا تھا کہ زرفشاں کے سلسلے میں اس کے بھائی کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس کے چھوٹے بھائی کی ہونے والی بیوی تھی، وہ زرفشاں کو ایسی نظروں سے دیکھا کرتا جسے "گندی نظر" کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

کوکب چاہتا تھا کہ وہ زرفشاں کو فخری ہاؤس آنے سے روک دے۔ جس دن اس نے یہ فیصلہ کیا، اسی دن بات بہت بڑھ گئی۔ شام کا وقت تھا اور زرفشاں فخری ہاؤس آئی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی ملاقاتیں ہمیشہ ڈرائنگ روم تک محدود رہتی تھیں۔ کوکب، زرفشاں کو وہاں چھوڑ کر کچھ لینے اپنے بیڈ روم میں گیا۔ جب وہ لوٹا تو جمیل بھی ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور شاید اس وقت کچھ نشے میں بھی تھا۔

وہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کوکب نے لکھا تھا۔ "میں نے اپنے کانوں سے وہ بے ہودہ جملہ سنا جو بھائی صاحب نے زرفشاں سے کہا تھا۔ وہ جملہ اتنا گھٹیا تھا کہ یہاں اسے لکھتے ہوئے بھی مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے لیکن وہ جملہ سن کر میں خود غصے سے چیخ پڑا تھا۔ "آپ بہت گھٹیا انسان ہیں بھائی صاحب!""

خود زرفشاں بھی اس وقت غصے سے لال بھبوکا ہو گئی تھی۔ اس موقع پر بات اتنی بڑھی کہ کوکب نے اپنے بھائی کو نہ صرف فخری ہاؤس سے بلکہ بزنس سے بھی علیحدگی کا فیصلہ سنا دیا اور اسی وقت زرفشاں کو لے کر فخری ہاؤس سے نکل گیا۔

رات اس نے ایک ہوٹل میں گزاری۔ دوسرے دن فخری ہاؤس جا کر اس نے اپنا تمام ضروری سامان سمیٹا اور لے جا کر اپنے دوست سجاد کے گھر میں رکھوا دیا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر، "بٹوارا" قانونی طور پر ہو گیا۔ جمیل اس علیحدگی سے بہت خوش تھا کیونکہ فیکٹری میں کوکب کی آمد و رفت اسے پسند نہیں تھی۔ اس کے دل میں چور جو تھا کہ کسی وجہ سے اس کا راز اس کے بھائی پر منکشف

نہ ہو جائے، جبکہ وہ ہو چکا تھا۔

جو کثیر رقم کوکب کے حصے میں آئی، وہ اس نے فوری طور پر تو ایک بینک میں جمع کرا دی اور یہ فیصلہ اس نے کچھ دن بعد تک کے لیے ملتوی کر دیا کہ وہ اس رقم سے کیا کرے گا۔ اس کے ذہن میں بس اتنا خیال تھا کہ رقم وہ کسی ایسی جگہ ''انویسٹ'' کرے گا کہ اسے خود کچھ نہ کرنا پڑے۔ کاروباری الجھنوں سے وہ خود کو دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن اس نے ایک معمولی سا اپارٹمنٹ خرید لیا جو اسے پسند نہیں تھا۔ وہ اس نے یہ سوچ کر خریدا کہ بعد میں اپنی خواہش کے مطابق اپارٹمنٹ لے لے گا.... لیکن بھائی پر اگر کسی وجہ سے ظاہر کرنا پڑا تو وہ اپنا قیام پہلے سے خرید کردہ اپارٹمنٹ میں بتائے گا۔ وہ اب خود کو جمیل فخری سے بالکل الگ تھلگ کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا ایک اکاؤنٹ سجاد کے بینک میں بھی کھول لیا۔ اسی بینک کا ایک لاکر بھی خرید لیا۔ اس نے اپنے بھائی اور حشمت کے خلاف جو ثبوت حاصل کیے تھے، وہ بھی اس نے ایک براؤن لفافے میں رکھ کر اس میں محفوظ کر دیے۔

چند دن بعد اس نے اپنی پسند کا اپارٹمنٹ ''ساویری'' میں خرید کر اس کے ڈرائنگ روم اور ایک بیڈ روم کو ڈیکوریٹ کروا دیا۔ دوسرے کمرے کو وہ بیڈ روم کے بجائے اپنا اسٹوڈیو بنانا چاہتا تھا۔ وہاں اس سے متعلقہ سامان رکھوا دیا۔ وہ اسے بعد میں اطمینان سے ''سیٹ'' کرنا چاہتا تھا۔ فوری طور پر تو اسے خود کو ہر اعتبار سے مطمئن کرنے کے بعد اپنے بھائی کے بارے میں سوچنا تھا۔

زرفشاں کی جو تصویر اس نے اپنے بیڈ روم میں لگائی تھی، وہ اس نے فخری ہاؤس ہی میں مکمل کر لی تھی۔ دوسرے دن وہ فخری ہاؤس سے اپنا سامان لایا تھا، اس میں وہ تصویر بھی تھی جو اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی خواب گاہ میں لگا دی تھی۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد اس نے یکسوئی سے اپنے بھائی کے بارے میں سوچا۔ شاید اختلافات کے باوجود اپنے بھائی کے لیے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ جمیل فخری کو قانون کے شکنجے میں جانے سے بچا لے۔ اس کی ایک صورت یہ ممکن تھی کہ وہ جعلی دواؤں کی اسمگلنگ کا کام بند کر دیتا۔

یہ بات اس نے زرفشاں سے بھی چھپائی تھی کہ اس کا بھائی ایک مجرم بن چکا ہے۔

فخری ہاؤس سے علیحدگی کے دسویں دن وہ اپنے بھائی کے دفتر پہنچ گیا جو شہر ہی میں تھا جبکہ دواساز فیکٹری شہر کے نواح میں بنائی گئی تھی۔

جمیل فخری اسے دیکھ کر چونک گیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اب کوکب اس سے کبھی نہیں ملے گا۔ بہرحال وہ کوکب سے طاہر ورلیکن سرد مہری سے ملا۔

کوکب کو اس کی توقع بھی تھی۔ اس نے اس کی پروا نہیں کی اور اپنے بھائی سے کہا کہ حشمت کا طرز زندگی اس کے خیال کے مطابق کچھ مشکوک سا ہے لہٰذا اس کے بھائی کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ حشمت سے اپنے تعلقات ختم کر لے۔

جمیل فخری نے حسبِ معمول اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیں۔ کوکب مایوس لوٹا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے بھائی کو اس مجرمانہ روش سے نکالنا چاہتا تھا۔

چند دن بعد اس نے فون پر بھی اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کو وہ سب کچھ بتا دے جو اس نے جعلی دواؤں کی اسمگلنگ کے سلسلے میں معلوم کیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس ملاقات کی حد تک وہ اپنے بھائی کے سامنے وہ ثبوت پیش نہیں کرے گا جو اس نے حاصل کیے تھے۔

یہ فیصلہ کرتے ہوئے کوکب کو یہ خیال بھی آیا کہ اس کا یہ اقدام اس کے لیے مخدوش بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اب بھی اپنے بھائی سے کچھ ہمدردی رکھتا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ بڑے بھائی کے دل میں چھوٹے بھائی کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی۔ سگا بھائی ہونے کے باوجود اس کا خون سفید ہو چکا تھا۔

اس فیصلہ کن ملاقات کے لیے جانے سے پہلے اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اپنی ڈائری اور ساویری اپارٹمنٹ کی چابی بھی سجاد کے بینک کے لاکر میں رکھ دے گا۔

کوکب نے سوچا تھا کہ اگر اس کا بھائی اس کے معاملے میں سو فیصد پتھر دل ثابت ہوا اور اس کے خلاف کوئی خطرناک قدم اٹھا بیٹھے تو پھر وہ بھی قانون کے شکنجے سے نہ بچ سکے۔ اس نے اس سلسلے میں زرفشاں کے والد ریٹائرڈ ایس پی سلمان علی کے نام ایک خط لکھا۔ اس میں اپنے بھائی کے بارے میں مختصراً لکھ دیا کہ وہ جرائم کی راہ پر چل نکلا ہے جس کے ثبوت فلاں بینک کے فلاں نمبر کے لاکر میں محفوظ ہیں۔

یہ خط لے کر کوکب اپنے کالج کے ایک پروفیسر نواز بیگ سے ملا۔ وہ پروفیسر کوکب کے لیے ایک استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شفیق بزرگ بھی تھے۔ آرٹ سے ان کو گہرا شغف تھا۔ اس بارے میں ان کی معلومات بھی بہت

وسیع تھیں۔ کوکب اسی سلسلے میں ان سے کبھی کبھی ملتا رہتا تھا اور وہ اس سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔

ڈائری میں ان سے کوکب کی ملاقات اس طرح درج تھی۔

''میں نے ان کو وہ لفافہ دیا جس میں زرفشاں کے والد کے نام میرا ایک خط تھا۔ میں نے ان سے کہا۔''یوں سمجھیے کہ یہ میں آپ کے پاس بہ طور امانت رکھوا رہا ہوں۔ کچھ لوگ ایک معاملے میں میرے پیچھے لگ گئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ مجھے کوئی ایسا نقصان پہنچا دیں جو ناقابلِ تلافی ہو اور قانون بھی اس سے بے خبر رہ جائے۔''

میری اتنی ہی باتیں سن کر پروفیسر صاحب کچھ مضطرب نظر آنے لگے تھے لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھی۔''میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی نقصان پہنچے تو نقصان پہنچانے والے بھی سزا سے نہ بچ سکیں۔ میں نے اس خط میں ایس پی سلمان علی کو ان لوگوں کے نام سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب میں کل شام آپ فون کروں گا اور روزانہ شام کو کرتا رہوں گا۔ اس طرح آپ میری خیریت سے آگاہ ہوتے رہیں گے۔ اگر کسی شام میرا فون نہ ملے تو آپ کسی بھی معتبر ذریعے سے یہ خط فوری طور پر ایس پی سلمان علی کو پہنچوا دیجیے گا۔''

پروفیسر نواز بیگ نے بے چینی سے پوچھا۔''تم کس خطرناک معاملے میں پڑ رہے ہو بیٹے؟''

میں نے ہنس کر انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی اور کہا۔''وہ کوئی بہت زیادہ خطرناک معاملہ نہیں ہے لیکن میں بس احتیاط کے طور پر یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔''

پروفیسر صاحب مجھ پر بہت شفقت فرماتے ہیں، مجھ سے محبت کرتے ہیں اس لیے انہوں نے بہت چاہا کہ میں انہیں سارے حقائق سے آگاہ کر دوں اور خود کو کسی خطرے میں نہ ڈالوں لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ میں خود کو کسی بہت بڑے خطرے میں نہیں ڈال رہا ہوں۔

مختصر یہ کہ میں انہیں لفافہ دے کر چلا آیا۔ وہ ایک نہایت شریف، دیانت دار اور مخلص انسان ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خود میرا خط پڑھنے کے لیے لفافہ نہیں کھولیں گے۔ اگر میں کسی مصیبت میں پھنس گیا اور انہیں فون نہ کر سکا تو وہ ہر صورت میں میرا خط زرفشاں کے والد کو پہنچا دیں گے۔

ابھی میں انہی کے پاس سے گھر آیا ہوں۔ ڈائری اور اپارٹمنٹ کی چابی کل صبح لاکر میں رکھنے کے بعد میں بھائی صاحب سے ملنے جاؤں گا۔ خدا کرے کہ میرے پاس ثبوت کی موجودگی سے ڈر کر بھائی صاحب اس غیر قانونی کام سے اپنی جان چھڑا لیں۔''

یہاں ڈائری کے اندراجات ختم ہو گئے تھے۔ کوکب بے تابی کے ساتھ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ بعد ازاں اسے ڈائری میں کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا اور اپنے بھائی سے اس کی وہ ملاقات اس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا فون نہ ملنے کے باعث پروفیسر نواز بیگ نے اس کا خط ایس پی سلمان علی کو کیوں نہیں پہنچایا تھا؟ اگر انہوں نے پہنچایا ہوتا تو سلمان علی کے وسیع تعلقات کے باعث محکمۂ پولیس حرکت میں آ چکا ہوتا۔ حشمت ابڑو اور جمیل فخری گرفتار کیے جا چکے ہوتے۔ وہ ہنگامہ خیز خبر اخبارات میں ضرور آتی جس کا علم سجاد کو بھی یقیناً ہوتا لیکن اس سے گفتگو میں ظاہر ہو گیا تھا کہ ایسی کوئی بات اس کے علم میں نہیں آئی تھی۔

وہ پروفیسر کو صرف ایک دن نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ دن تک فون نہیں کر سکا تھا۔ گاؤں میں اس نے ایک ماہ سے زیادہ دن گزارے تھے۔ اس دوران میں تو پولیس کو اس کے لاکر تک رسائی حاصل کر لینا چاہیے تھی لیکن اسے اپنی چیزیں لاکر میں محفوظ ملی تھیں۔

کوکب ڈائری بند کرتا ہوا بستر سے اٹھا۔ اس نے جلدی سے وہ پھر کھولی۔ اس نے وہ اوراق نکالے جن پر لوگوں کے ٹیلی فون یا موبائل نمبر لکھے ہوئے تھے۔ ان نمبروں میں پروفیسر نواز بیگ کے دونوں نمبر موجود تھے۔ ٹیلی فون نمبر بھی اور موبائل نمبر بھی...

کوکب نے اپنے موبائل پر، پروفیسر نواز بیگ کے موبائل نمبر ملائے۔ اسے معلوم ہوا کہ پروفیسر کا موبائل بند تھا۔ اس کے بعد اس نے ٹیلی فون نمبر ملایا۔ دو گھنٹیوں کے بعد ہی دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

''ہیلو!'' ایک مردانہ آواز سنائی دی جو پروفیسر نواز بیگ کے بڑے لڑکے عادل کی تھی۔

آواز پہچانتے ہی کوکب چونکا اور اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ آواز پہچاننے کے بعد اسے یکایک احساس ہوا تھا کہ شاید ڈائری پڑھنے ہی کے باعث اس کی یادداشت بحال ہو چکی تھی۔ غالباً اسے سب کچھ یاد آ چکا تھا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے عادل کی آواز پھر سنائی دی۔

''جی۔'' خوشی کی وجہ سے کوکب کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔''میں پروفیسر نواز بیگ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

دوسری طرف سے کچھ رک کر کہا گیا۔ ''شاید میں آپ کی آواز پہچان رہا ہوں۔ آپ کوکب صاحب ہیں نا؟''

''جی ہاں، جی ہاں۔'' کوکب نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے بھی آپ کی آواز پہچان لی ہے۔ آپ عادل ہیں غالباً۔''

''جی ہاں۔'' عادل نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''غالباً میرے پاس آپ کے لیے کوئی اچھی اطلاع نہیں ہے۔ آپ کو یہ جان کر ضرور قلق ہوگا کہ ڈیڈی کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''کیا؟'' کوکب چیخ سا پڑا۔ ''کب؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''مجھے وہ شام یاد ہے جب آپ ڈیڈی سے ملنے آئے تھے۔ دوسرے دن چار بجے ڈیڈی کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ نے انہیں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔''

کوکب نے ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی دبالی۔ اس سے فوری طور پر کچھ بولا نہیں جا سکا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''عادل!'' کوکب کی آواز بھرا گئی۔ ''میں آپ سے بعد میں کسی وقت بات کروں گا۔ ابھی تو اس اطلاع نے مجھے کسی قابل ہی نہیں چھوڑا ہے۔'' پھر اس نے عادل کی کوئی بات سنے بغیر ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

یہ حقیقت تھی کہ کوکب کو اچھا خاصا صدمہ ہوا تھا۔ اسے پروفیسر نواز بیگ سے خاصی انسیت تھی۔

اس افسوس ناک اطلاع سے یہ معما بہر حال حل ہو گیا کہ اس کا خط ایس پی سلمان علی تک کیوں نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ لفافہ اب تک شاید پروفیسر نواز بیگ کی میز کی کسی دراز میں ملتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ انہوں نے زیادہ احتیاط سے کہیں رکھا ہو۔

''میری یادداشت واپس آ چکی ہے۔'' کوکب بڑبڑایا۔

وہ کچھ ایسی ہی صورتِ حال میں تھا کہ پروفیسر نواز بیگ کی موت کا صدمہ اس پر زیادہ دیر تک اثر انداز نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی یادداشت پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کچھ ضروری کام کرنے میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ اسے قتل کرانے کی کوشش اس کے بھائی ہی نے کی ہو گی۔ اس احساس کے بعد اب اسے اپنے بھائی سے کوئی ہمدردی نہیں رہی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اس معاملے کو پولیس تک پہنچانے میں تاخیر سے کام نہ لے۔ وہ معاملہ ایسا تھا کہ کوکب خود بھی خاصے وقت تک اس معاملے میں الجھا رہتا جبکہ یادداشت واپس آ جانے کے بعد وہ اب زرفشاں سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے موبائل پر زرفشاں کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔ ''ہیلو!'' وہ زرفشاں ہی کی آواز تھی۔

کوکب بولا تو اس کی آواز میں لرزش تھی۔ ''کیسی ہو زرفش!'' اسے یہ بھی یاد آ چکا تھا کہ وہ زرفشاں کو صرف ''زرفش'' کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔

''کوکب!'' زرفشاں کی آواز ایسی تھی جیسے اس نے اپنی چیخ روکنے کی کوشش کی ہو۔ ''کہاں تھے تم کوکب؟ تم نے تو مجھے آدھا کر دیا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ تم کہیں جانے سے پہلے مجھے...''

کوکب نے اس کی بات کاٹی۔ ''فون پر زیادہ باتیں نہ کرو۔ فوراً آ کر مجھ سے ملو۔''

''کہاں؟'' زرفشاں نے بے تابی سے پوچھا۔

''میرے اپارٹمنٹ میں۔'' کوکب نے کہا۔ ''اسے یہ بھی یاد آ چکا تھا کہ زرفشاں اس سے ملنے اس اپارٹمنٹ میں بھی آیا کرتی تھی۔

''وہیں ہو تم؟''

''ہاں، ہاں جب ہی تو کہہ رہا ہوں۔''

''میں اُڑ کر آتی ہوں۔'' زرفشاں جذباتی ہو گئی تھی۔

''اور ہاں!'' کوکب جلدی سے بولا۔ ''ابھی کسی سے ذکر مت کرنا کہ میں آ گیا ہوں۔''

''ڈیڈی سے بھی نہیں؟ وہ تو...''

''باتیں نہیں، بس تم آ جاؤ۔'' کوکب نے پھر اس کی بات کاٹی۔ ''کوئی وجہ ہے کہ میں ایک آدھ دن کے لیے... یا شاید صرف آج کے لیے رازداری سے کام لینا چاہتا ہوں۔''

''اچھا اچھا۔'' زرفشاں نے جلدی سے کہا۔ ''میں ابھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میں آ رہی ہوں۔'' اور پھر اس نے کوکب کی کوئی اور بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

کوکب کے ہونٹوں پر خوشی کی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب زرفشاں کو سب کچھ بتانے کے بعد اس کے مشورے کے مطابق اس کے والد سے رابطہ کرے یا خود ہی پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ جائے۔

وہ کمرے سے نکلا۔ اب وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے اس گھر کے چپے چپے سے واقف ہو۔ وہ کچن میں پہنچا۔ اسے یاد تھا کہ ریفریجریٹر میں کھانے پینے کی بہت سی اشیا

موجود ہوں گی۔

اس نے فریج کھولا۔ اس میں رکھی ہوئی چیزیں اسے ذرا بھی اجنبی نہیں لگیں۔ اس نے پانی کی بوتل نکال کر اس سے دو گھونٹ لیے۔ پھر ایک کپ بورڈ سے اس نے دو پلیٹیں نکال لیں۔ ان پلیٹوں میں اس نے اپنا پسندیدہ حبشی حلوہ اور کچھ ڈرائی فروٹ نکال کر رکھے۔ پھر وہ پلیٹیں ہاتھ میں لیے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

نذیرو جو ایک صوفے پر لیٹ گیا تھا، جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

”لو یہ کھاؤ۔“ کوکب نے ایک پلیٹ اسے دی اور دوسری پلیٹ خود سنبھالے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”یہ سب اس گھر ہی میں تھا سائیں؟“ نذیرو نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں، تم کچھ کھانا تو شروع کرو۔“

نذیرو نے پلیٹ ایک طرف رکھ کر اس میں سے بادام اٹھائے اور کوکب سے بولا۔ ”آپ یہیں رہتے تھے؟“

”ہاں۔“

”آپ بڑے آدمی ہیں سائیں!“ نذیرو ڈرائنگ روم کی آرائش سے مرعوب تھا۔

کوکب دھیرے سے ہنس دیا۔

نذیرو بڑبڑایا۔ ”ڈکھین پٹھیان سُک۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ کوکب خوش تھا۔

”سندھی کی مثل ہے سائیں! دکھ کے بعد سکھ ہوتا ہے۔“

”ہوں۔“ کوکب مسکراتا رہا۔ وہ حبشی حلوہ کھا رہا تھا۔ اس کی ذہنی رو اس وقت زرفشاں کی طرف تھی۔

”آپ کو سب کچھ یاد آگیا ہے سائیں؟“ نذیرو نے پوچھا۔

”ہاں نذیرو! مجھے سب کچھ یاد آگیا ہے۔“

”اب آپ گاؤں تو چلیں گے نا سائیں؟ وہاں حکیم سائیں کو، ماروی کو، سبھی کو آپ کا انتظار ہوگا۔“

”ہاں نذیرو! میں ان لوگوں کو بھولا نہیں ہوں۔“

”میں گاؤں چلا جاؤں سائیں؟ بابو سے بات نہیں ہو رہی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”گھبراؤ نہیں۔ وہاں سب ٹھیک ہی ہوگا۔ آج اور رک جاؤ۔ شاید مجھے تمہاری ضرورت پڑے۔ تم کل چلے جانا۔“

”اچھا سائیں۔“

کوکب اٹھ کر کچن سے دو گلاس اور فریج سے پانی کی ایک بوتل نکال لایا۔

کچھ دیر بعد جب کال بیل بجی تو کوکب بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ آنے والا کون تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے زرفشاں تھی۔ وہ تیزی سے اندر آئی اور بے تحاشا کوکب سے لپٹ گئی۔

”کہاں چلے گئے تھے تم؟“ زرفشاں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

نذیرو غور سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آہستگی سے اٹھا، دروازے کے قریب گیا اور اسے بند کر دیا۔ زرفشاں اندر آئی تھی تو کوکب کو دروازہ بند کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور ان دونوں کی حالت دیکھ کر گاؤں کے سادہ لوح نذیرو نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ اس وقت دروازہ بند ہونا چاہیے۔

کوکب اور زرفشاں، دونوں ہی شدید جذباتی ہو گئے تھے۔ گلوں، شکووں اور محبت کی باتوں میں کوکب کو بھی نذیرو کا خیال نہیں رہا تھا۔ زرفشاں اس سے واقف ہی نہیں تھی کہ وہاں کوئی اور ہوگا۔

نذیرو سمٹا سمٹایا ایک طرف بیٹھا ہوا تھا اور اب اس کی کوشش تھی کہ اس کی نظریں ان دونوں پر نہ پڑیں۔ ان دونوں کی گرم جوشی ایسی ہی تھی کہ کوکب اسی وقت چونکا جب اتفاقاً اس کی نظر نذیرو پر پڑی۔

☆☆☆

جمیل فخری اپنے بنگلے سے نکل کر تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے، موبائل فون اپنے کان سے لگائے ماؤتھ پیس میں کسی سے جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ ”تم تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر فوراً ساویری اپارٹمنٹ پہنچو اور میرا انتظار کرو۔ میں بیس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”اوکے باس!“

جمیل فخری نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس وقت وہ اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے بڑی عجلت میں انجن اسٹارٹ کیا۔ اس کی کار بنگلے کے احاطے سے نکل کر سڑک پر پہنچی ہی تھی کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جمیل فخری نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے موبائل اٹھایا جو اس نے برابر کی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔ اس نے اسکرین پر حشمت ابڑو کا نام دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس نے کال ریسیو کی اور کہا۔

”خوش رہو سائیں۔“

”پتا چل گیا اس کا؟“ دوسری طرف سے بے چینی سے پوچھا گیا۔

"ہاں سائیں۔" جمیل فخری نے کہا۔ "اب دو بج چکے ہیں۔ میں تو مایوس ہو گیا تھا۔ میں سمجھا تھا تمھیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے کہ وہ پسنجر ٹرین سے کراچی پہنچے گا۔ وہ نہ کینٹ اسٹیشن پر اترا تھا، نہ سٹی اسٹیشن پر۔ غالباً وہ پہلے ہی کسی جگہ اتر گیا تھا۔"

"اب اس کا پتا کیسے چلا؟" حشمت ابڑو نے پوچھا۔

"آسان نہیں تھا اس کا پتا لگانا۔ میرے پاس اتنے آدمی تو ہیں نہیں کہ میں انھیں شہر کے چپے چپے پر پھیلا دیتا۔ مجھے امید یہ تھی کہ اس نے گاؤں میں اگر یادداشت کھونے کا ڈھونگ رچایا تھا تو کراچی آ کر زرفشاں سے ضرور ملے گا۔ زرفشاں کے بارے میں تمھیں بتایا تھا نا؟"

"ہاں ہاں، آگے بولو۔" حشمت ابڑو نے بے تابی سے کہا۔

جمیل فخری نے جواب دیا۔ "میں نے دو آدمیوں کو زرفشاں کی نگرانی پر لگا دیا تھا لیکن اتنے گھنٹے گزر جانے کے بعد مجھے مایوسی ہونے لگی تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ یا تو تمھیں غلط اطلاع ملی ہے یا اگر وہ کراچی آیا ہے تو واقعی اس کی یادداشت گم ہے ورنہ وہ زرفشاں سے ضرور ملتا۔"

"تم اصل بات نہیں بتا رہے ہو۔" حشمت ابڑو نے جھنجلا کر کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ مجھے ابھی ابھی زرفشاں کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ ساویری اپارٹمنٹ پہنچی ہے اور بہت خوش نظر آ رہی ہے۔ کوکب کے غائب ہونے کے بعد سے اسے اتنا خوش بھی نہیں دیکھا گیا۔ میں اسے دیکھتا تو رہا ہوں نا، پسند تو وہ مجھے بھی ہے۔"

"تم پھر بہک گئے۔" حشمت جیسے کھسیا کر بولا۔

"ہاں۔" جمیل نے کہا۔ "یہ اطلاع ملنے پر میرے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال آیا تھا کہ غالباً موبائل پر کوکب ہی نے اسے وہاں بلایا ہوگا۔ اطلاع دینے والے کی دوسری بات سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ میرے ایک آدمی نے رواروی کے انداز میں وہاں کے چوکیدار سے پوچھا تھا کہ آرٹسٹ کوکب فخری یہیں رہتا ہے نا؟ اور چوکیدار نے ہاں میں جواب دیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کوکب وہاں کب سے رہتا ہے۔"

"جب وہ تم سے الگ ہوا تھا، اس وقت تو تم نے مجھے کسی اور جگہ کے بارے میں بتایا تھا۔"

"دھوکا دیا تھا اس نے مجھے۔ اس نے پہلے جو فلیٹ خریدا تھا، اس کا پتا اس نے مجھے بے خبری میں رکھنے کے لیے بتایا ہوگا۔ دراصل وہ ساویری اپارٹمنٹ میں ہی رہتا ہے۔ میں اس وقت تیزی سے اسی طرف جا رہا ہوں۔ میرے آدمی بھی وہاں پہنچ رہے ہیں۔"

"کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی مجھے یہ سوچنے کی مہلت ہی کہاں ملی ہے؟ اطلاع ملتے ہی ہدایت دیتے ہوئے میں اپنی کار میں آ بیٹھا تھا پھر فوراً ہی تمھارا فون آ گیا۔"

"اس مرتبہ کوئی کچا کھیل مت کھیل جانا۔ اور ہاں، کیا تمھارے آدمیوں نے اس کے اپارٹمنٹ کا نمبر بھی معلوم کر لیا ہے؟"

"یہی تو خوشی کی بات ہے کہ ہر مشکل آسان ہوتی نظر آ رہی ہے۔" جمیل نے جواب دیا۔ "زرفشاں کی خوشی کا یہ عالم تھا جیسے اسے اپنی بھی سدھ بدھ نہ رہی ہو۔ وہ کسی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ میرا ایک آدمی بھی اس کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا ہے کہ زرفشاں کس اپارٹمنٹ میں گئی ہے۔"

"لیکن کوکب اتنی دیر تک کہاں غائب رہا؟ تمھارے کہنے کے مطابق تو اسے فوری طور پر زرفشاں سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔"

"یہ اندازہ لگانا میرے لیے ممکن نہیں کہ اس نے اتنی دیر کیوں کی اور اتنی دیر تک کہاں رہا، لیکن یہ بات طے ہے کہ اس نے ابھی تک پولیس سے رابطہ نہیں کیا ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس اب تک میری جان کو لاگو ہو چکی ہوتی۔ اچھا اب میں بند کر رہا ہوں۔ اس سڑک پر ٹریفک زیادہ ہے۔ مناسب نہیں ہوگا کہ میں اسٹیئرنگ ایک ہاتھ سے سنبھالے رہوں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن جیسے ہی موقع ملے، مجھے پھر فون کرنا۔ مجھے بتانا کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو۔" حشمت نے اتنا کہہ کر خود ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

جمیل نے موبائل برابر کی سیٹ پر ڈال کر دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"اب کی دفعہ نہیں بچ سکو گے تم۔" وہ بڑبڑایا۔

پچھلی بار اس سے غلطی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے آدمیوں پر ہی بھروسا کر لیا تھا۔ کوکب نے جب اس کے دفتر میں آ کر اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے خلاف سارے ثبوت بھی حاصل کر چکا ہے اور اب اس آخری وارننگ کے بعد پولیس سے رابطہ کرے گا۔

جمیل کو بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ کوکب اس قسم کے

ثبوت حاصل کرسکے گا جن کے بارے میں اس نے بتایا تھا لیکن جمیل کے لیے یہ بات بھی خطرے کی تھی کہ کوکب پولیس کے پاس چلا جاتا۔ اس کی ''زبانی رپورٹ'' بھی پولیس کو متحرک کرسکتی تھی جس کے بعد خطرات اس کے سر پر منڈلانے لگتے۔

جمیل فخری کو دولت کی اتنی ہی ہوس تھی کہ وہ اس میں رخنہ ڈالنے والے کسی شخص کو بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا، اپنے سگے بھائی کو بھی نہیں!

دفتری کام کرنے والوں میں تین افراد ایسے بھی تھے جو جمیل فخری کے مجرمانہ کاموں میں بھی اس کا آلۂ کار بنتے تھے۔ جمیل فخری نے انہی سے کام لیا۔ کوکب کو تو اس نے بٹھا کر محبت سے باتیں کرنا شروع کردی تھیں اور اسے سمجھانے لگا تھا کہ وہ حشمت ابڑو کے جال میں پھنس کر اس کام پر مجبور ہوا ہے۔

اس گفتگو کے دوران میں اس نے اپنے اور کوکب کے لیے چائے منگوائی تھی۔ انٹرکام پر اس نے اپنے ایک کارندے کو خفیہ الفاظ میں کچھ ہدایت بھی کردی تھی۔ اسی ہدایت کے بموجب کوکب کی چائے میں کوئی ایسا سفوف ڈال دیا گیا تھا جو کوکب کی بے ہوشی کا سبب بنا تھا۔

بے ہوشی کے بعد اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیر بھی باندھ دیے گئے تھے۔ اسے ایک بڑے چرمی تھیلے میں ڈال کر ساحل پر موجود مانجو کے ٹریلر پر پہنچا دیا گیا تھا۔ مانجو سے جمیل نے موبائل پر بات کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ کوکب کو ٹریلر میں کسی جگہ چھپائے رکھے اور مچھلیوں کے شکار کے بہانے جب ٹریلر کھلے سمندر میں لے جائے تو کہیں دور نکل جانے کے بعد کوکب کو ہلاک کرکے اس کی لاش سمندر میں پھینک دے۔

فوری طور پر جمیل فخری نے ایک کام یہ بھی کروایا تھا کہ بے ہوش کوکب کی تلاشی لے کر اس کی جیبیں بالکل خالی کروادی تھیں۔ شناختی کارڈ تو بڑی بات ہوتی، اس کی جیب میں رومال تک نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ کلائی سے گھڑی بھی اتارلی گئی تھی۔ اسے بس اس چابی کا علم نہیں تھا جو کوکب نے اپنے جوتے میں چھپالی تھی۔ اس کی جیب سے صرف ایک چابی نکلی تھی جو اس کے پہلے سے خرید کردہ فلیٹ کی تھی۔ بعد میں جب جمیل کو حشمت سے اطلاع ملی تھی کہ کوکب زندہ ہے اور اس کے گاؤں میں موجود ہے تو اس اطلاع نے جمیل کے پیروں تلے سے زمین سرکادی تھی لیکن اب وہ محسوس کررہا تھا کہ زمین پھر اس کے پیروں کے نیچے آگئی ہے۔

ٹریفک کی زیادتی کی وجہ سے وہ بیس منٹ سے کچھ زیادہ وقت میں ساویری اپارٹمنٹ پہنچ سکا۔ اس نے کار ایک کنارے روکی ہی تھی کہ ایک آدمی کسی طرف سے آیا اور کار کا دروازہ کھول کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''یس باس!'' اس کا نام جو کچھ بھی ہو، اسے ''شیبا'' کہا جاتا تھا۔

''کتنے آدمی ہیں تمہارے ساتھ؟''

''چار ہیں۔'' شیبا نے جواب دیا۔ اس نے چاروں کے نام بھی بتائے۔

جمیل راستے بھر سوچتا ہوا آیا تھا کہ اب کیا کرنا ہوگا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اس کے آدمی ساویری اپارٹمنٹس کے پاس رہیں اور جب بھی کوکب باہر نکلے، اسے سرِراہ گولیوں سے چھلنی کرکے فرار ہوجائیں، لیکن پھر اس نے یہ خیال رد کردیا تھا۔ اب وہ کوکب کو اپنے سامنے لاش کی شکل میں دیکھنے کے بعد ہی مطمئن ہوتا۔

''اپارٹمنٹ کا نمبر بتاؤ۔'' اس نے شیبا سے پوچھا۔

شیبا نے نمبر بتایا۔

جمیل نے پوچھا۔ ''چوکیدار کہاں ہے؟''

''پھاٹک میں داخل ہوتے ہی کسی جگہ دکھائی دے جائے گا۔''

''میرے ساتھ چلو۔ وہ جہاں نظر آئے، مجھے اشارے سے بتا دینا۔ اس کے بعد تم رک جانا۔ میں چوکیدار کو ریوالور کی نال پر اپنے ساتھ اوپر لے جاؤں گا۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد میں ...... موبائل فون پر تم سے رابطہ کروں گا۔ وہاں جو سچویشن بنے گی، اس کے مطابق میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم وہاں کتنے آدمیوں کے ساتھ آؤ۔ یہاں گولی چلائی جائے گی تو ہنگامہ ہوجائے گا۔ اپارٹمنٹ میں کوئی چھری ضرور مل جائے گی۔ تم اسی سے کوکب کو میرے سامنے ذبح کروگے اور اس سندھی نوجوان کو بھی جو اس کے ساتھ آیا ہے۔''

''سندھی نوجوان؟'' شیبا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔'' جمیل کا لہجہ خشک ہوگیا۔ ''زیادہ سوالات نہ کرو۔ صرف سنو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک سندھی نوجوان کو ہونا چاہیے۔''

جمیل کو یہ اطلاع بھی حشمت ہی سے ملی تھی کہ گاؤں کا ایک نوجوان بھی کوکب کے ساتھ روانہ ہوا ہے جس کا نام نذیرو ہے۔

پھر شیبا نے کوئی سوال نہیں کیا، کچھ نہیں کہا۔ جمیل فخری

کے ساتھ کار سے اترا اور اس کے ساتھ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا۔

''باس!'' شیبا آہستہ سے بولا۔ ''یہاں ایک نہیں، تین چوکیدار ہیں لیکن وہ ساتھ ساتھ نہیں رہتے۔ مختلف حصوں میں گشت کرتے رہتے ہیں مگر ان میں سے ایک نہ ایک پھاٹک کے قریب ضرور گشت لگاتا ہے۔''

''تین ہوں یا دس۔'' جمیل نے کہا۔ ''مجھے صرف ایک چوکیدار سے کام لینا ہے۔''

شیبا چپ ہو گیا۔

جب وہ دونوں پھاٹک میں داخل ہوئے تو دو خواتین اور ان کے ساتھ چند بچے بھی اندر جا رہے تھے۔ ایک آدمی باہر آ رہا تھا۔ جمیل نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ ایک عام سی بات تھی۔ اپارٹمنٹس میں لوگوں کی آمد و رفت لگی ہی رہتی ہے اور کسی وقت کوئی بھی آتا جاتا نظر نہیں آتا۔

''وہ ہے باس!'' شیبا نے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ اب تمہیں میرے ساتھ رہنے کی ضرورت نہیں۔'' جمیل فخری نے کہا اور چہل قدمی کرنے کے سے انداز میں چوکیدار کی طرف بڑھا۔

چوکیدار نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''چوکیدار ہو تم یہاں کے؟'' جمیل نے اس کے قریب جا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی صاب!''

''کوکب صاحب اسی عمارت میں رہتے ہیں نا؟''

''جی صاب!''

''مجھے ان کے اپارٹمنٹ تک پہنچا دو گے؟''

''معافی چاہتا ہوں صاب! مجھے تو ادھر ہی چوکیداری کرنا ہے۔ آپ لفٹ سے اوپر چلے جاؤ۔'' چوکیدار نے اپارٹمنٹ کا نمبر بھی بتایا۔

''اچھا۔'' جمیل مسکراتا ہوا ذرا سا آگے بڑھا اور جیسے ہی چوکیدار کی پشت اس کی طرف ہوئی، وہ چپک جانے کی حد تک اس کے قریب ہو گیا۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا بڑی سختی سے چوکیدار کی کمر سے لگا دیا۔

''یہ پستول ہے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ پستول کس طرح کام کرتا ہے۔''

چوکیدار کا چہرہ فق پڑ گیا۔

''اپنا چہرہ ٹھیک کرو۔'' جمیل نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اس طرح نظر آؤ جیسے تمہارے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔''

چوکیدار کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی، یہ وہی بتا سکتا تھا مگر اس نے جمیل کے حکم کی تعمیل اپنے لیے ناگزیر سمجھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو اس طرح پھیلایا جیسے مسکرا رہا ہو۔

''اس حد تک بھی ٹھیک ہے۔'' جمیل نے کہا۔ ''اب تم مجھے کوکب کے اپارٹمنٹ تک لے چلو۔'' اس نے اپنے انگوٹھے کا دباؤ بڑھایا تو چوکیدار قدم بڑھانے لگا۔

''جمیل کی عادت تھی کہ وہ اپنے پاس کبھی ہتھیار نہیں رکھتا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اپنے ہاتھوں سے کسی کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ وہ کوئی ہتھیار اپنے پاس اس لیے نہیں رکھتا تھا کہ انسان کسی وقت غصے میں بے قابو ہو جاتا ہے۔

نیلے سوٹ میں ملبوس ایک شخص تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان سے آگے نکلا اور لفٹ میں گھس گیا۔

''رک جاؤ۔'' جمیل نے چوکیدار سے کہا۔

لفٹ میں سوار ہونے والے نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے مہذب لہجے میں کہا۔ ''آئیے، آپ بھی آجائیے! لفٹ کسی ایک آدمی کے لیے تو نہیں ہوتی۔''

جمیل چاہتا تھا کہ لفٹ میں ان دونوں کے ساتھ کوئی نہ ہو لیکن اب وہ مجبور ہو گیا۔ نیلے سوٹ والے کی پیشکش مسترد کرنا اس کے خیال میں خود کو مشکوک کرنے کے مترادف ہوتا۔ اسے چوکیدار کے ساتھ آگے بڑھنا پڑا۔ وہ دونوں لفٹ میں سوار ہو گئے تو نیلے سوٹ والے نے وہ بٹن دبا دیا جس منزل پر اسے جانا تھا پھر اس نے جمیل فخری سے پوچھا۔ ''آپ لوگوں کے لیے کون سا بٹن دباؤں؟''

لفٹ حرکت میں آ چکی تھی۔

''ہمیں بھی اسی منزل پر جانا ہے۔'' جمیل نے مسکرا کر کہا۔ اس نے نیلے سوٹ والے کو بٹن دباتے دیکھ لیا تھا۔

''آج کل کوکب صاحب کی مصروفیت کیا ہے؟'' جمیل نے چوکیدار سے پوچھا۔ وہ نیلے سوٹ والے سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مالوم نہیں صاب!''

جمیل نے کوکب کے بارے میں پے در پے کئی سوال کر ڈالے۔ اتنی دیر میں لفٹ رک گئی۔ نیلے سوٹ والا فوراً باہر نکل گیا۔ اس کے بعد جمیل چوکیدار کے ساتھ باہر آیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''تم کال بیل کا بٹن دباؤ گے۔ جب اندر سے سوال کیا جائے تو تم اپنے بارے میں بتا دینا۔

کوکب کو معلوم ہی ہوگا کہ تم یہاں کے چوکیدار ہو۔ تم اس سے کہنا کہ نیچے ایک خاتون آئی تھیں جو کوکب کے لیے تمہیں ایک لفافہ دے گئی ہیں اور تم وہی لفافہ دینے آئے ہو۔"

چوکیدار نے اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا جو شاید خوف سے خشک ہوگئے تھے۔

ایک اپارٹمنٹ کے سامنے چوکیدار رکا۔ جمیل فخری کے اشارے پر اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر سے فوراً آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں صاب! چوکیدار۔" چوکیدار نے کہا اور وہ سب کچھ دہرا دیا جس کی ہدایت اسے جمیل سے ملی تھی۔

"اچھا!" جواب ملا اور پھر قدموں کی آہٹ دروازے کی طرف آنے لگی۔

نیلے سوٹ والا آگے نکل گیا تھا جو اچانک مڑ کر آنے لگا۔ جمیل یکایک چوکنا ہوگیا۔

جمیل سے نظریں ملتے ہی نیلے سوٹ والے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا موبائل نیچے گاڑی ہی میں بھول آیا ہوں۔"

اسی وقت دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا کوکب ہی تھا۔ جمیل نے چوکیدار کو تیزی سے آگے دھکیلا۔ اس کے پیچھے وہ خود بھی اندر داخل ہوتا مگر وہ اس طرح داخل نہیں ہو سکا جس طرح چاہتا تھا۔ نیلے سوٹ والا اس وقت بالکل قریب آگیا تھا۔ اس نے جھپٹ کر جمیل کا ہاتھ اس کے کوٹ سے باہر نکالتے ہوئے اوپر کی طرف اٹھا دیا۔

اگر جمیل کے ہاتھ میں پستول یا ریوالور ہوتا تو اس وقت غیر ارادی طور پر ٹریگر دبا بیٹھتا لیکن ہاتھ اوپر ہو جانے کے باعث گولی چھت کی طرف جاتی لیکن اس کے پاس نہ پستول تھا نہ ریوالور۔

جمیل کو سنبھلنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ نیلے سوٹ والے نے اسے بڑی طاقت کے ساتھ اندر دھکیل دیا تھا۔ جمیل فخری لڑکھڑایا مگر فرش پر گرنے سے بچ گیا۔

چوکیدار پہلے ہی اندر جا چکا تھا۔

نیلے سوٹ والے نے تیزی سے اندر داخل ہو کر بائیں پیر کی حرکت سے دروازہ بند کر دیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کی نال جمیل کی طرف تھی۔

یہ سب کچھ جیسے چشم زدن میں ہوا تھا۔

"سر!" نیلے سوٹ والے نے کسی سے کہا۔ "یہ غیر مسلح ہے۔ میں نے موبائل پر آپ کو اطلاع دی تھی کہ وہ چوکیدار کی کمر سے ریوالور لگائے اسے اوپر لا رہا ہے لیکن مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ یہ چوکیدار کی کمر سے غالباً اپنا انگوٹھا لگائے ہوئے تھا۔"

نیلے سوٹ والے نے یہ سب کچھ جس سے کہا تھا، اسے جمیل نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

زرفشاں کا باپ ریٹائرڈ ایس پی سلمان علی بڑے سکون سے صوفے پر بیٹھا جمیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زرفشاں ہونٹ بھینچے اس کے برابر میں بیٹھی جمیل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک اور صوفے پر بیٹھا ہوا اندیرو ہکا بکا سا نظر آرہا تھا۔

کوکب جس نے دروازہ کھولا تھا، آہستہ آہستہ اس صوفے کی طرف بڑھنے لگا جس پر سلمان علی اور زرفشاں بیٹھے ہوئے تھے۔

جمیل نے تیزی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

"نہیں جمیل!" سلمان علی نے سکون سے کہا۔ "دلاور کا نشانہ بہت سچا ہے۔ اگر تم نے کسی طرح بھی بھاگنے کی یا کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو یہ تمہاری دونوں ٹانگیں تو زخمی کر ہی دے گا۔"

دلاور نیلے سوٹ والے کا نام تھا۔

سلمان علی نے اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "جی ہاں، میں ہی بول رہا ہوں عارف جمال صاحب! بس اب آپ مجرم کو ہتھکڑیاں لگانے کے لیے اپنے گارڈ بھیج دیں۔ آپ کے محکمے کے ایک ریٹائرڈ ایس پی اور ایک معطل انسپکٹر نے آپ کے محکمے کا ایک بڑا کام نمٹا دیا ہے۔"

دوسری طرف سے جو کچھ بھی کہا گیا ہو، سلمان علی نے اس کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ہنس کر رابطہ منقطع کر دیا۔

"جمیل فخری!" وہ موبائل صوفے پر ایک طرف رکھ کر بولے۔ "تم سمجھ رہے ہو گے کہ تمہاری کہانی چٹ پٹ ختم ہوگئی لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت دنوں سے محنت کی جا رہی تھی۔ جب تم اور کوکب ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے، تب بھی میری بیٹی نے مجھے اس کا سبب بتا دیا تھا لیکن جب کوکب غائب ہوا تو یہ ازحد پریشان ہوگئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ بقول تمہارے، کوکب بیرون ملک ہرگز نہیں گیا ہے بلکہ شاید اسے تمہاری طرف سے کوئی خطرہ تھا جس کی وجہ سے کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ دراصل تم سے علیحدگی کے بعد کوکب بہت الجھا الجھا سا رہنے لگا تھا۔ اپنی الجھن کی وجہ اس نے میری بیٹی کو بھی نہیں بتائی تھی۔ بس ایک مرتبہ شاید بے خیالی میں وہ ایک جملہ کہہ گیا

تھا۔ کیوں کوکب؟"

"جی ہاں۔" کوکب نے آہستہ سے کہا۔ "میرے منہ سے یہ جملہ نکل گیا تھا کہ مجھے کچھ خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔ پھر زرفشاں کے استفسار پر میں نے بات دوسری طرف گھما دی تھی۔ شاید میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے زرفشاں خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔"

"اس شخص کی وجہ سے؟" سلمان علی نے جمیل کی طرف اشارہ کیا۔

"جی۔"

"لیکن مجھے اس پر یقین نہیں آیا تھا۔" زرفشاں بول پڑی۔ "میں بڑے یقین سے سمجھی تھی کہ تم خود اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو۔ جب تم اچانک غائب ہو گئے تو میں نے یہ بات بھی ڈیڈی کو بتا دی تھی۔ میں نے تو یہ بھی چاہا تھا کہ ایف آئی آر کٹوا دی جائے لیکن ڈیڈی نے مجھے روک دیا تھا۔"

"ہاں۔" سلمان علی نے کہا۔ پھر جمیل کی طرف دیکھا۔ "مجھے شبہ ہوا تھا کہ کوکب کو کسی وجہ سے خطرہ شاید تم سے ہوگا۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ ایف آئی آر کٹوا کے تمہیں چوکنا کر دینے کے بجائے اس معاملے کی چھان بین کروائی جائے۔ میں نے اس سلسلے میں دلاور کو فون کر کے اپنے گھر بلایا۔ ابھی میں نے ڈی آئی جی صاحب سے دلاور کا ذکر کرتے ہوئے معطل انسپکٹر کے الفاظ استعمال کیے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ ایک غلط الزام کی وجہ سے دلاور کی معطلی قطعی مناسب نہیں تھی۔ بہرحال، میں نے اسے بلایا۔ اسے تمہارے اور کوکب کے بارے میں سب کچھ بتایا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اس معاملے کی چھان بین کرے۔ میں دلاور کی صلاحیتوں سے واقف تھا اور اس شریف آدمی کے دل میں میرے لیے بہت عزت تھی لہٰذا یہ تیار ہو گیا۔"

جمیل لمبی لمبی سانسیں لیتے اور کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ کبھی کبھی کن انکھیوں سے دلاور کی طرف بھی دیکھ لیتا جس کے ریوالور کی نال اب بھی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور اس کی نظریں بھی جمیل فخری سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو رہی تھیں۔

سلمان علی نے سامنے رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر اس سے دو گھونٹ لیے، پھر دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "دلاور نے تمہاری نگرانی شروع کر دی۔ ایک ہفتے کی نگرانی کے باعث اس کی نظر میں دو تین ایسے آدمی آئے جو تمہارے دفتر میں کام کرتے تھے۔ دلاور کیونکہ پولیس میں رہ چکا ہے اس لیے اسے معلوم تھا کہ ان آدمیوں کا ماضی کا ریکارڈ کچھ مشتبہ رہا تھا۔ میں یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے بتاؤں کہ اس نے کس طرح ان لوگوں پر بھی نظر رکھی اور ان کی وجہ سے تمہاری دوا ساز فیکٹری تک پہنچ گیا۔ اس نے وہاں بھی کچھ محنت کی تو اسے معلوم ہوا کہ فیکٹری کا ایک حصہ فیکٹری کے دوسرے لوگوں کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ یہ بات اسے خاصی معنی خیز لگی۔ یہ حشمت ابڑو کو بھی تمہارے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ اس کے لیے یہ بات خاصی معنی خیز ثابت ہوئی کہ تم ایک مرتبہ حشمت ابڑو کو بھی فیکٹری کے اس حصے کا معائنہ کرانے لے گئے تھے۔ دلاور نے حشمت ابڑو کے بارے میں بھی چھان بین کی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کس گاؤں کا وڈیرا تھا۔ دلاور نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں جا کر وہاں کے لوگوں سے بھی حشمت ابڑو کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ مجھے اپنی کارکردگی کی رپورٹ برابر دیتا رہتا تھا۔ یہ مجھے بتا کر حشمت ابڑو کے گاؤں گیا اور...." سلمان علی نے مسکرا کر کوکب کی طرف دیکھا۔ "اس نے تمہیں وہاں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں نے اسے تمہاری تصویر دکھا دی تھی۔ اس نے تمہیں دیکھا تو مجھے فوراً اس کی اطلاع دی۔ اطلاع دینے سے پہلے اس نے چھان بین کر لی تھی کہ تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو۔"

"اور مجھ سے آپ نے یہ بات چھپائی!" زرفشاں نے اپنے باپ پر محبت آمیز خفگی کا اظہار کیا۔

سلمان علی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں تمہیں یہ صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا تھا کہ کوکب اپنی یادداشت کھو چکا ہے، لیکن یہ ضرور سوچا تھا کہ تمہیں کبھی نہ کبھی حقیقت سے آگاہ تو کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے مجھے کسی مناسب وقت کا انتظار تھا۔"

پھر سلمان علی نے جمیل کی طرف دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ "وہاں دلاور کی ملاقات پولیس چوکی کے انچارج اے ایس آئی سے ہوئی۔ وہ دلاور کے ساتھ کچھ عرصے کام کر چکا تھا۔ دلاور نے اس سے حشمت کے معاملے میں کام لینا چاہا تو وہ گھبرا گیا۔ حشمت کے خلاف کچھ کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی لیکن دلاور کے اصرار پر وہ یہ کام کرنے کے لیے اس وعدے پر تیار ہوا کہ اس کا نام کبھی سامنے نہ آئے۔ اب میں وہ بات اس لیے زبان پر لا رہا ہوں کہ اب وہ حشمت کے انتقام کا نشانہ نہیں بن سکے گا۔" سلمان علی نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ پولیس اس وقت اس کی حویلی پر دھاوا بول چکی ہوگی۔"

اس بات پر جمیل فخری ذرا سا چونکا اور مضطرب ہو کر

پہلو بدلنے لگا۔ شاید اسے خیال ہو کہ حشمت ابڑو اپنے تعلقات استعمال کر کے اسے اور خود کو بچالے گا۔

”ہاں تو۔“ سلمان علی نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”پولیس کے گارڈ آنے سے پہلے میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں اور درحقیقت تمہارے بہانے سے یہ سب کچھ میں زرفشاں اور کوکب کو بتا رہا ہوں۔ اس اے ایس آئی نے خاصا کام کیا۔ اس کی وجہ سے کوکب کے سر کے زخم کی بابت بھی پتا چلا۔ یہاں سے مجھے شبہ پیدا ہونے لگا کہ غالباً کسی وجہ سے تم ہی نے کوکب کو ہلاک کروانے کی کوشش کی ہوگی۔ خیر! چار پانچ دن قبل دلاور گاؤں کے معاملات اے ایس آئی پر چھوڑ کر واپس آگیا۔ اس پر فیکٹری کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی دھن سوار تھی۔ اس نے یہ خطرناک کام کر ہی ڈالا۔ اسے پرسوں رات معلوم ہوگیا کہ فیکٹری کے اس حصے میں جعلی ادویات تیار کی جارہی ہیں۔ اس نے مجھے رپورٹ کی۔ شاید اس وقت آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی لیکن اتنی اہم بات بتانے کے لیے اس نے مجھے جگانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ پھر اسی وقت اس کے پاس گاؤں سے اے ایس آئی کی کال آگئی۔ اس نے دلاور کو بتایا کہ کوکب اور اس گاؤں کا ایک نوجوان نذیرو ایکسپریس ٹرین سے کراچی روانہ ہوچکے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جعلی دواؤں کی بات فی الحال ڈی آئی جی صاحب کو نہ بتاؤں اور کوکب کا انتظار کروں، لیکن تم غائب ہی ہوگئے۔“ آخری فقرہ سلمان علی نے کوکب سے کہا۔

”جی۔“ کوکب نے جواب دیا۔ ”میں اور نذیرو لانڈھی اسٹیشن پر اتر گئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا تھا کہ کراچی اسٹیشن پر میں کسی خطرے میں پڑ سکتا ہوں۔“

”احساس بالکل درست تھا تمہارا۔“ سلمان علی نے کہا۔ ”تمہارے اس سفید خون والے بھائی کے پالتو کتے تمہیں دونوں اسٹیشنوں پر ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ بہرحال تمہارے اس طرح غائب ہوجانے کی وجہ سے میں خاصا پریشان ہوا۔ کل شام کو میں نے ڈی آئی جی صاحب سے ملاقات کی۔ دن گزر جانے کے بعد میں نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا تھا۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ جعلی دوائیں بنانے والی وہ فیکٹری دو ایک دن بھی زیادہ کام کرسکے۔

”ان کو میں نے تمہارے معاملات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔“ سلمان علی کوکب سے مخاطب ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر جمیل کی طرف دیکھا۔ ”میرے اس انکشاف کے بعد وہ بھی اپنے محکمے کو حرکت میں لے آئے۔ یہ ان کے اپنے ذرائع ہیں جن سے انہوں نے میری باتوں کی تصدیق کی۔ آج اسی وقت پولیس تم پر ہاتھ ڈالنے والی تھی۔ محکمے کے کچھ لوگوں کو گاؤں بھی بھیج دیا گیا ہے۔ تاکہ وہ حشمت ابڑو کو پکڑیں۔ تمہاری گرفتاری میں تھوڑی سی تاخیر اس لیے کی گئی تھی کہ تمہیں بھی اسی وقت پکڑا جائے جب حشمت ابڑو کے ہتھکڑیاں لگائی جارہی ہوں۔“

کہیں دور سے پولیس موبائل کی مدھم سی آواز سنائی دی۔

”لو!“ سلمان علی نے جمیل سے کہا۔ ”وہ لوگ آرہے ہیں جو تمہیں اس جگہ پہنچا دیں گے جہاں تم کو ہونا چاہیے۔ خیر، اب مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ آج کوکب نے یہاں سے زرفشاں کو فون کیا اور اسے یہاں بلایا۔ اس نے زرفشاں کو تاکید کر دی تھی کہ وہ اس کے بارے میں ابھی مجھے بھی کچھ نہ بتائے لیکن ہوا یہ کہ جب زرفشاں یہاں کے لیے روانہ ہوئی تو اس نے کسی طرح اندازہ لگا لیا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے۔“

اس وقت یہ سن کر جمیل فخری کو اپنے آدمی شیبا پر ضرور غصہ آیا ہوگا جس نے کہا تھا کہ زرفشاں کی خوشی حد سے اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔

”اس وقت زرفشاں نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا۔ اپنے تعاقب سے آگاہ کیا اور مجھے کوکب کے بارے میں بھی بتا دیا۔ دراصل اسے خیال ہوا تھا کہ اس کی نگرانی غالباً اسی لیے ہے کہ اس کے ذریعے سے کچھ لوگ کوکب تک پہنچنا چاہتے ہیں۔“

”میرا خیال درست ثابت ہوا نا ڈیڈی۔“ زرفشاں بول پڑی۔

”ہاں۔“ سلمان علی نے کہا۔ ”اس کے بعد میں نے فوراً دلاور سے رابطہ قائم کیا۔ اسے فوراً ساویری اپارٹمنٹ پہنچنے کی ہدایت کی اور میں خود بھی یہاں کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں اس عمارت میں پہلے بھی آچکا ہوں۔ کسی سے ملنا تھا مجھے۔ اسی لیے مجھے معلوم تھا کہ اس عمارت میں داخلے کے لیے پیچھے بھی ایک راستہ ہے۔ میں اسی راستے سے یہاں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سامنے کی جانب تمہارے لوگ ہوں گے جو مجھے ضرور پہچانتے ہوں گے۔ ہاں، میں ایک بات بتانا بھول گیا۔ ٹریفک میں ایک جگہ بری طرح پھنس جانے کی وجہ سے میں یہاں اگرچہ کچھ دیر سے پہنچا تھا لیکن یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ بروقت پہنچ گیا تھا۔ زرفشاں یہاں مجھ سے پچیس منٹ پہلے پہنچ گئی تھی۔ کوکب نے اسے وہ ساری تصاویر اور آڈیو کیسٹ دکھا دیے تھے جو تمہارے

خلاف اچھا خاصا ثبوت ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کو عدالت میں چیلنج تو کیا جا سکتا ہے لیکن آج رات تمہاری جعلی دواؤں کی فیکٹری پر چھاپا مارنے کے تمام انتظامات بھی مکمل ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد یہ تصویریں اور آڈیو کیسٹ اہمیت اختیار کر جائیں گے۔ میں جب یہاں پہنچا تو مجھے بھی وہ ساری چیزیں دکھادی گئیں۔''

کوکب نے اپنے بھائی جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ نے میری ان باتوں کو غلط سمجھا تھا۔ آپ کے خیال کے مطابق مجھے اس قسم کے ثبوت کسی طور حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔''

جمیل کچھ نہیں بولا۔ اب تک اس نے خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی۔ صورت حال نے اس کے دماغ کو ایسا جھٹکا پہنچایا تھا کہ وہ گونگا بن کر رہ گیا تھا۔

پولیس موبائل کے سائرن کی آواز سے محسوس کیا جا سکتا تھا کہ اب وہ ساویری اپارٹمنٹس کے احاطے میں پہنچ چکی ہے۔

تھوڑی دیر بعد وزنی جوتوں کی دھمک اپارٹمنٹ کی طرف آرہی تھی۔

''میں نے بڑے صحیح وقت پر اپنی بات مکمل کی ہے۔'' سلمان علی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے مجھے اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی ہوا ہے۔''

کال بیل کی آواز ہونے سے پہلے ہی کوکب نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور پولیس والے اندر گھستے چلے آئے۔

پھر ان لوگوں کا دن کا خاصا حصہ بے حد مصروفیت میں گزرا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر انہیں بھی جانا پڑا تھا جہاں ان کے بیان ریکارڈ کیے گئے۔ بیان دینے والوں میں صرف کوکب ہی نہیں تھا، سلمان علی، دلاور، زرفشاں، اپارٹمنٹ کا چوکیدار، حتیٰ کہ نذیرو بھی تھا۔

اس دن کی شام فرصت اور بظاہر سکون کی تھی۔ بظاہر اس لیے کہ کوکب اندرونی طور پر بے چین تھا۔ اسے خود کو یہ یقین دلانے میں دشواری پیش آرہی تھی کہ اس نے جمیل کو پولیس کے شکنجے میں دے کر اچھا کام کیا تھا۔ اس کے دل نے ایک بار پھر کروٹ لی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے لیے کچھ درد محسوس کر رہا تھا۔

زرفشاں نے اسے سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ ''اگر تم یہ کام نہ کرتے، تو بھی ہونا یہی تھا۔ دلاور نے جو معلومات جمع کی تھیں، وہ رنگ تو لاتیں۔''

''خیر چھوڑو یہ ذکر۔'' کوکب نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''یہ بتاؤ کہ اب ہماری شادی کب ہو رہی ہے۔''

زرفشاں تھوڑی سی جھینپ گئی کیونکہ نذیرو اس وقت بھی قریب ہی موجود تھا اور اس نے کوکب کی بات سن کر نظریں جھکالی تھیں۔

''ممی نیروبی سے آگئی ہیں۔'' زرفشاں نے تھوڑا سا گھما کر جواب دیا۔ ''ڈیڈی سے ان کی صلح ہو گئی ہے۔''

''کب؟'' کوکب نے خوش ہو کر پوچھا۔

''ابھی کوئی بیس دن پہلے۔''

''واہ! پھر تو نیک کام میں اب بالکل دیر نہیں ہونا چاہیے۔''

زرفشاں نے نذیرو پر ایک نظر ڈال کر کوکب کو آنکھیں دکھائیں تو اس نے نذیرو کے سامنے اس موضوع پر مزید باتیں کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

لیکن رات کو جب زرفشاں اپنے گھر پر تھی، کوکب موبائل فون پر اس سے ایک گھنٹے تک باتیں کرتا رہا۔ اس وقت زرفشاں نے اسے ایک خبر سنائی جو اس کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔

زرفشاں کی ماں اور سلمان علی دس دن بعد عمرہ کرنے جا رہے تھے اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ عمرے پر جانے سے پہلے ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔

''اب میں بہت تھک گئی ہوں کوکب!'' زرفشاں نے کہا۔ ''اب مجھے سونے دو۔ ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا کہ میں ٹھیک سے سو نہیں سکی۔''

''اچھا کل گیارہ بجے تک آجاؤ۔''

''گیارہ بجے کوئی خاص بات ہے؟''

''دراصل نذیرو اپنے باپ سے بات نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان رہا ہے۔ یہاں وہ دیکھ چکا ہے کہ سب معاملات ٹھیک ہو گئے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے مجھ سے گاؤں جانے کی اجازت طلب کی تھی۔ کل دوپہر کو دو بجے یہاں سے ایک پسنجر ٹرین جاتی ہے۔ نذیرو کو اس میں سوار کرانا ہے۔ تم بھی ساتھ رہنا۔''

''ٹرین دو بجے جاتی ہے تو گیارہ بجے کیوں؟''

''میں نذیرو کو شاپنگ کرانا چاہتا ہوں۔ حکیم صاحب صاحب اور ماروی کو بھی کچھ تحائف بھجواؤں گا۔''

''تم نے مجھے ان لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا۔''

''مہلت ہی نہیں ملی۔ کل بتاؤں گا۔''

یہ گفتگو ختم کرنے کے بعد بھی کوکب خاصی دیر تک

جاگتا اور مختلف النوع خیالات میں ڈوبا رہا۔

دوسرے دن زرفشاں گیارہ بجے سے کچھ پہلے ہی آگئی۔ کوکب اسی وقت تیار ہوا تھا لیکن نذیرو آدھے گھنٹے پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔ وہ گاؤں جانے کے خیال سے بے حد خوش تھا۔

وہ تینوں بازار گئے۔ وہاں سے کوکب نے حکیم صاحب کے لیے کئی اچھے ملبوسات کے علاوہ ماروی کے لیے کچھ تحائف بھی خریدے۔ ان کے علاوہ نذیرو اور اس کے باپ کے لیے بھی چھ چھ شلوار سوٹ خریدے گئے۔ اس سارے سامان کے لیے ایک سوٹ کیس بھی خریدنا پڑا۔

جب کوکب اور زرفشاں نے نذیرو کو ٹرین میں بٹھا دیا تو وہ آب دیدہ ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ بہت اچھے ہیں سائیں!'' پھر جلدی سے اس نے پوچھا۔ ''آپ گاؤں کب آئیں گے؟''

''ہماری شادی ہونے والی ہے نا! بس اس کے بعد آئیں گے، اور ہاں! تم بھی گاؤں جا کر ماروی سے شادی کر لینا۔''

نذیرو کا چہرہ شرم سے رنگ بدلنے لگا۔

کوکب نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ماروی تمہیں بہت چھیڑتی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ تم اسے بہت پسند کرتے ہو۔ میں حکیم صاحب سے بھی تمہاری سفارش کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اور ماروی میری بات نہیں ٹالیں گے۔''

نذیرو نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ جب ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا تو کوکب اور زرفشاں وہاں سے لوٹے۔

''حکیم صاحب میرے محسن ہیں زرفشاں! اور ایک اعتبار سے ماروی بھی میری محسن تھی۔ اس نے میرا بہت خیال رکھا تھا۔''

کوکب ان لوگوں کے بارے میں خاصی دیر تک بولتا رہا لیکن اس کی زبان پر یہ بات نہیں آسکی کہ ماروی اسے پسند بھی کرنے لگی تھی۔ کوکب کا خیال تھا کہ وہ ماروی کی وقتی جذباتی لہر تھی جو گزر جائے گی۔

آٹھ دن بعد ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اس کے دو دن بعد زرفشاں کے والدین عمرے پر چلے گئے۔ کوکب چاہتا تھا کہ اس کے بعد وہ زرفشاں کے ساتھ گاؤں جا کر اپنے محسنوں سے ملے گا لیکن زرفشاں نے ہنی مون کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ کوکب سے چوری چوری اس نے کاغان جانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ کوکب کو اس کے پروگرام کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا پڑا۔

کاغان سے ان کی واپسی ایک ماہ بعد ہوئی۔ وہ دونوں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نذیرو ان کے اپارٹمنٹ کے پھاٹک پر اداس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کوکب کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''کیا ہوا نذیرو؟'' کوکب نے بوکھلا کر پوچھا۔

''اسے اپارٹمنٹ میں تو لے چلیے۔'' زرفشاں بولی۔

وہ دونوں اسے اپارٹمنٹ میں لے گئے۔ ایک چوکیدار نے انہیں بتایا تھا کہ نذیرو آٹھ دن سے وہاں آرہا تھا۔ وہ صبح سے شام تک ان کا انتظار کر کے شام کو کہیں چلا جاتا تھا۔

نذیرو نے انہیں جو واقعات سنائے، وہ اتنے دردناک تھے کہ صرف کوکب ہی نہیں، زرفشاں بھی سکتے میں رہ گئی۔

نذیرو نے بتایا تھا کہ نورا جب کوکب کو کراچی جانے والی ٹرین میں روانہ کر کے گاؤں کی طرف لوٹا تھا تو حشمت ابڑو کے آدمیوں کی نظر میں آگیا تھا۔ اسے اتنی رات گئے اسٹیشن سے آتے دیکھ کر وہ لوگ شک میں پڑ گئے۔ انہوں نے نورا سے پوچھ گچھ کی تو وہ گھبرا گیا۔ اس کی گھبراہٹ سے ان لوگوں کا شک اور بڑھا۔ وہ اسے حویلی لے گیا۔ وہاں اس پر تشدد کیا گیا تو اس نے ساری بات بتا دی۔ اس ''جرم'' کے پاداش میں گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

لوگوں نے حکیم صاحب، نورا کے باپ اور نذیرو کے باپ کی لاشیں ادھر اُدھر پڑی دیکھیں۔ سب کو یقین تھا کہ یہ کام حشمت ابڑو کے آدمیوں نے کیا ہوگا لیکن ان میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔

ماروی کو غائب کر دیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ وہ حشمت ابڑو کی حویلی میں لے جائی گئی ہوگی۔

نذیرو جب گاؤں پہنچا تھا تو اسے یہ سب اطلاعات ملی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ایک دن پہلے پولیس حشمت ابڑو اور اس کے آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گئی تھی لیکن جیرا ان کے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ ماروی بھی حویلی میں نہیں تھی۔ گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ اسے جیرا زبردستی اپنے ساتھ کہیں لے گیا ہوگا۔

نذیرو غم زدگی اور پریشانی کے عالم میں دوسرے گاؤں چلا گیا تھا جہاں اس کی خالہ رہتی تھی۔ نذیرو نے کچھ دن وہاں گزارے لیکن پھر اس کا دل وہاں بھی نہیں لگا اور وہ کراچی آگیا۔

''اب میں باقی زندگی آپ ہی کی خدمت میں گزاروں گا سائیں۔'' نذیرو نے روتے ہوئے کہا۔ ''حکیم سائیں مرحوم نے مجھے یہی ہدایت کی تھی۔''

کوکب نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور دل سوز آواز میں بولا۔ ''نہیں نذیرو! تم میرے پاس خدمت گزار کی حیثیت سے نہیں، میرے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے رہو گے۔''

کوکب کو حکیم سائیں کے مارے جانے کا قلق تو ہوا ہی تھا لیکن ماروی کا یہ انجام اس کے لیے بڑا اذیت ناک تھا۔ وہ تصور کرسکتا تھا کہ ان بھیڑیوں نے اس معصوم لڑکی کا کیا حشر کیا ہوگا۔

سلمان علی جب عمرے کی سعادت حاصل کر کے واپس لوٹے تو کوکب نے ان کو یہ ساری باتیں بتائیں۔

''مجھے معلوم ہے بیٹے!'' سلمان علی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ ''جب وہاں کے ایس ایس آئی نے دلاور کو تمہاری کراچی روانگی کی اطلاع دی تھی تو یہ سب کچھ بھی اس کے علم میں تھا جو اس نے دلاور کو بتا دیا تھا۔ میں بس ماروی کے معاملے میں بے خبر ہوں۔''

''اسے تلاش کروائیے ڈیڈی!'' کوکب نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''وہ ہمیں ملنا چاہیے ڈیڈی! وہ ہمیں ملنا چاہیے۔''

سلمان علی نے اداسی سے کہا۔ ''میں دلاور کو اس کام پر لگاتا ہوں۔''

سلمان علی نے جو کچھ کہا تھا، اس پر عمل بھی کیا لیکن پندرہ بیس دن گزر جانے کے بعد بھی ماروی یا جیرا کا پتا نہیں لگ سکا۔

ایک شام کوکب اور زرفشاں کہیں سے اپنے گھر لوٹ رہے تھے تو ایک جگہ ٹریفک جام ہوگیا۔ ان کی کار اس میں پھنس گئی۔ توقع نہیں تھی کہ وہ وہاں سے ڈھائی تین گھنٹے سے پہلے نکل سکتے۔

زرفشاں نے اپنے گھر فون کر کے شوفر کو بتایا کہ انہوں نے اپنی کار کہاں کھڑی کی ہے، اور یہ کہ وہ وہاں آکر کسی طرح کار لے جائے۔

اس کے بعد زرفشاں اور کوکب پیدل چل پڑے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی چھوٹی موٹی گلی میں کوئی رکشا بھی مل گیا تو وہ اسی میں اپنے گھر چلے جائیں گے۔

وہ رکشے کی تلاش میں بھٹک ہی رہے تھے کہ ایک جانب ہونے والے شور نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔

''پاگل ہے، پاگل ہے۔'' کی صدائیں سنائی دیں۔

پھر کوکب اور زرفشاں نے دیکھا کہ ایک لڑکی انہی کی طرف دوڑی چلی آرہی تھی۔ اس کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹے ہوئے اور بے حد میلے تھے۔ یہی حالت بالوں کی تھی۔ چکٹ اور بکھرے ہوئے۔ چہرے پر بھی میل کی اتنی تہیں تھیں کہ اس کے نقوش اس میں دب گئے تھے لیکن کوکب نے اسے پہچان لیا۔

''ماروی!'' اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس کی آواز سن کر ماروی بھی چونکی اور تیزی سے ان کی طرف آئی۔ اس نے کوکب کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے جانتے ہو تو میرے ستھو سائیں کو بھی جانتے ہو گے۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے۔ اس کی یادداشت کھو گئی ہے۔''

کوکب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''میں ہی تو ہوں ستھوں سائیں، ماروی!''

''جھوٹا۔'' ماروی نے قہقہہ لگایا اور تیزی سے ایک جانب دوڑتی چلی گئی۔ اب وہ اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔

''ماروی!'' کوکب چیختا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔

کوکب کے پیچھے زرفشاں بھی لپکی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ دونوں ماروی کے قریب پہنچتے، وہ ایک تیز رفتار رکشے سے ٹکرا کر گری۔ اس کے سر سے خون ابل پڑا۔

''ماروی!'' کوکب نے لپک کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

ماروی کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے کوکب کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں اور پھر اس کا منہ اس طرح کھلا جیسے وہ مسکرائی ہو۔

''ستھو سائیں!'' اس کے منہ سے نکلا۔ اس کی دھندلی ہوتی ہوئی آنکھیں ظاہر کر رہی تھیں کہ اب اس نے کوکب کو پہچان لیا تھا۔

کوکب کی یادداشت سر کی چوٹ کے باعث گئی تھی اور ماروی کی یادداشت سر پر چوٹ کھانے کے بعد واپس آئی تھی لیکن اس وقت جب اس کی زندگی کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہچکی لی اور اس کا سر کوکب کی گود میں ڈھلک گیا۔

اردگرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا لیکن کوکب کے ہوش و حواس گم ہو چکے تھے۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو ماروی کے خون سے بھرے ہوئے چہرے پر ٹپک رہے تھے۔

یہ صبح صادق کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے برف کے گالوں کو اڑا کر فٹ پاتھ کے کنارے ڈھیر کر رہے تھے۔ قصبے کی مرکزی شاہراہ پر سناٹا طاری تھا۔ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

البتہ ایک شخص آل نائٹ لنچ روم کے داخلی دروازے کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ یہ قصبے کا واحد ریسٹورنٹ تھا جو رات بھر کھلا رہتا تھا۔ اس وقت صبح کے پانچ بج

چوروں اور پولیس والوں کی چلبلی... نخریلی اور نٹ کھٹ سی آنکھ مچولی کا قصہ...

بعض شہر... قصبے اور علاقے وہاں کے مکینوں کی پہچان اور فخر کرنے کا مؤجب بن جاتے ہیں... حساس طبیعت اور ماحول دوست افراد اپنے علاقے کے بارے میں کوئی بھی منفی بات سننے کے روادار نہیں ہوتے... ایک پُرسکون... خوب صورت سے چھوٹے قصبے کی کہانی... جہاں ایک اجنبی آیا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر بیٹھا...

قیام گاہ

سلیم انور

رہے تھے۔

ریسٹورنٹ کے باہر کھڑا ہوا وہ شخص مارٹی تھا۔ اس نے جیب میں سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں دبائی اور پھر ماچس ٹٹولنے لگا۔ ماچس میں صرف ایک تیلی باقی رہ گئی تھی۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور خالی ماچس بے پروائی سے برف پر اچھال دی۔

''وہ شخص اپنا ناشتا کرنے میں خاصا وقت لے رہا ہے۔'' مارٹی کھڑکی کے شیشے سے اندر ریسٹورنٹ کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''اگر میں زیادہ دیر تک یہاں کھڑا رہا تو وہ سمجھ جائے گا کہ میں اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

پھر مارٹی نے مزید انتظار کیے بغیر ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اس گنجے سے موٹے آدمی پر کوئی توجہ نہیں دی جو کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا توس اور اُبلے ہوئے انڈوں کے ناشتے میں مصروف تھا۔ مارٹی کے اندر آنے پر اس موٹے آدمی نے اخبار پر سے نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

مارٹی نے کاؤنٹر پر پہنچ کر اپنی پسندیدہ سگریٹ طلب کی۔

''باہر بہت سردی ہے نا؟'' کاؤنٹر مین نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ شب منفی تین درجۂ حرارت تھا۔ اخبار میں لکھا ہے کہ موسم مزید بدتر ہو جائے گا۔''

''ہاں، باہر ٹھیک ٹھاک سردی ہے۔'' مارٹی نے سگریٹ کا پیکٹ تھامتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ فالتو ماچس بھی دے دو۔ سردی میں ان کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور یہ میرے پاس ہمیشہ ختم ہو جاتی ہیں۔''

''کیوں نہیں۔'' کاؤنٹر مین نے تین عدد پیپر ماچس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

مارٹی نے تینوں ماچس بے پروائی سے اپنے اوورکوٹ کی سائڈ کی جیب میں ڈال دیں۔

پھر چند لمحے ریسٹورنٹ میں ٹھہرنے کے بعد وہ دوبارہ باہر سڑک پر نکل آیا۔ موٹے آدمی نے اپنا ناشتا ختم کر لیا تھا اور اب بل کی ادائی کر رہا تھا۔ پھر وہ بھی باہر سڑک پر آ گیا۔ اس کا بھاری اوورکوٹ اس کے بھاری بھرکم جسم پر سختی سے لپٹا ہوا تھا۔

ابھی وہ شخص چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک مارٹی تیزی سے اس کے پاس پہنچا اور بولا۔ ''کیا تمہارا نام گریسن ہے؟''

وہ شخص قدرے ٹپٹا سا گیا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، میں ایڈم ولٹن ہوں۔''

مارٹی نے یہ سن کر قہقہہ لگایا جیسے کہ ایڈم ولٹن نے اسے کوئی اچھا سا لطیفہ سنایا ہو۔ اس نے موٹے ایڈم کی پشت پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مارا اور مسکرانے لگا۔

''چلتے رہو۔'' مارٹی نے سخت لہجے میں کہا۔ البتہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور طاری تھی۔ ''میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں موجود ریوالور سے تمہیں زد میں لیا ہوا ہے اس لیے کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔''

''کیوں، میں......'' ایڈم ولٹن کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ ساتھ ہی اس نے ایک اچٹتی نگاہ پہلو کی طرف ڈالی۔

مارٹی نے اپنا آدھا ہاتھ جیب سے باہر نکالتے ہوئے اسے اپنے نیلے اسٹیل کے ریوالور کی جھلک دکھا دی۔ اتنے میں کوئی شے اڑ کر برف پر گری لیکن ان دونوں میں سے کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی۔

ایڈم خوف سے کپکپا رہا تھا لیکن اس نے مارٹی کے حکم کی تعمیل ہی میں عافیت جانی۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ مارٹی اس کے ساتھ ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔

کارنر پر پہنچ کر وہ ایک بغلی گلی میں گھوم گئے۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' ایڈم نے ہمت سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''چہل قدمی کے لیے۔'' مارٹی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ایک نئے قصبے میں اپنی جیبی موٹے نوٹوں کی گڈی کی جھلک دکھانا تمہاری کھلی حماقت تھی۔ میں نے گڈی اس وقت دیکھی جب تم سگار خرید رہے تھے۔''

اب وہ دو عمارتوں کے درمیان ایک پتلی سے گلی میں داخل ہو گئے تھے۔ مارٹی نے گلی میں دونوں اطراف کا جائزہ لیا۔ گلی سنسان تھی۔ اس نے جھپٹ کر موٹے آدمی کے کوٹ کے کالر کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا گلی کے اندر لے گیا۔

ایڈم نے بے بسی سے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش رائگاں رہی۔ مارٹی نے اپنے آٹومیٹک ریوالور کے بھاری دستے سے ایڈم کی کھوپڑی پر ضرب لگا دی۔

ولٹن لڑکھڑا گیا۔ تب مارٹی نے اس کے چہرے پر

ایک کاری وار کیا۔ ایڈم کے چہرے پر سے خون بہنے لگا اور پھر وہ برف پر ڈھیر ہوگیا۔

مارٹی نے جھک کر ایڈم کے ساکت جسم کا جائزہ لینا چاہا تو اس کی سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکل کر نیچے گر پڑا۔ اس نے تیزی سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ پھر جلدی جلدی ایڈم کی تلاشی لینے لگا۔

اسے نوٹوں کی گڈی تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی۔

دس منٹ بعد مارٹی اسی آل نائٹ ریسٹورنٹ میں لوٹ آیا۔ اس نے اپنے لیے کافی کا آرڈر دیا۔

''میرا خیال تھا کہ میں اس موٹے آدمی کو جانتا ہوں جو کچھ دیر پہلے یہاں ناشتا کر رہا تھا۔'' اس نے کاؤنٹر مین سے کہا۔ ''لیکن میں غلطی پر تھا۔ وہ بالکل پٹیز برگ کے میرے شناسا بل پرکنس کی طرح لگ رہا تھا لیکن وہ کوئی اور تھا۔''

''ہاں، بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔'' کاؤنٹر مین نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میری بھی بارہا ایسے لوگوں سے مڈبھیڑ ہو چکی ہے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ میرے شناسا ہیں۔ کیا تمہارا یہاں قیام کرنے کا ارادہ ہے؟''

''صرف رات بھر۔'' مارٹی نے جواب دیا۔ ''میں ایسے دیہاتی ٹائپ کے قصبوں میں زیادہ وقت گزارنا پسند نہیں کرتا۔''

''ارے سنو، یہ قصبہ اتنا برا نہیں ہے۔'' کاؤنٹر مین نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

پھر اس کی نگاہ دروازے کی جانب اٹھ گئی جس سے ایک باوردی پٹرول مین اندر داخل ہو رہا تھا۔ مارٹی نے کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر اس نو وارد کو دیکھا۔

''مارننگ جم۔'' پٹرول مین نے کاؤنٹر مین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''باہر خاصی ٹھنڈ ہے۔''

''مارننگ ٹام۔'' کاؤنٹر مین نے دانت نکال دیے۔

''تمہارا انعامی سلسلہ ابھی جاری ہے؟'' پٹرول مین نے پوچھا۔

''بالکل۔'' جم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس ہفتے جس شخص کا درست نمبر ہوگا اسے چاندی کی ایش ٹرے انعام میں ملے گی۔''

''گزشتہ ایک گھنٹے کے دوران یہاں تمہارے پاس

کتنے گاہک آچکے ہیں؟'' پیٹرول مین ٹام بریڈی نے پوچھا۔

''صرف دو۔'' کاؤنٹر مین جم نے جواب دیا۔

''ایک موٹا آدمی اور ایک یہ شخص۔'' اس نے سر کی جنبش سے مارٹی کی جانب اشارہ کیا۔

''انھوں نے سگار اسٹینڈ سے کسی چیز کی خریداری کی تھی؟'' ٹام بریڈی نے سوال کیا۔

''اس موٹے آدمی نے تو کوئی خریداری نہیں کی تھی، البتہ اس جنٹلمین نے سگریٹ کا ایک پیکٹ لیا تھا۔'' جم نے بتایا۔

مارٹی نے اپنا کافی کا کپ نیچے رکھ دیا اور کاؤنٹر کے مقابل رکھے ہوئے اسٹول پر سے نیچے اتر آیا۔ اسے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے خطرے کی... بو آرہی تھی۔

''تم پوچھنا کیا چاہ رہے ہو؟'' مارٹی نے پیٹرول مین سے کہا۔ ''کیا کوئی وجہ ہے کہ میں یہاں ایک سگریٹ کا پیکٹ بھی نہیں خرید سکتا؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' پیٹرول مین بریڈی نے کہا۔ ہم تو صرف جم کے لاٹری نمبر کے بارے میں باتیں کررہے ہیں۔ تم بھی جیت کے حق دار بن سکتے ہو، مسٹر۔''

''لاٹری نمبر؟'' مارٹی نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں بھی لاٹری جیت سکتا ہوں۔ طریقۂ کار کیا ہے؟''

''میں دن بھر میں خریداری کرنے والوں کو ماچسیں دیتا ہوں۔'' ریسٹورنٹ کے مالک جم نے بتایا۔ ''ہر ماچس کی ایک جانب اس ریسٹورنٹ کا اشتہار چھپا ہوا ہے اور دوسری جانب ایک نمبر ہے۔ ہر سنیچر کی شب ہم ہفتے بھر میں فروخت ہونے والی ماچسوں کے نمبر ایک ہیٹ میں ڈال دیتے ہیں اور لکی نمبر کا ڈرا کرتے ہیں۔ لکی نمبر انعام کا حق دار قرار پاتا ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' پیٹرول مین ٹام بریڈی نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''آج صبح تم نے کون سے نمبروں والی ماچسیں فروخت کی ہیں، جم؟''

ریسٹورنٹ کے مالک نے اس بڑے سے بکس پر نظر ڈالی جس میں ماچس کے پیکٹ سجے ہوئے تھے۔

''گزشتہ شب تک 311 نمبر تک کی ماچسیں فروخت ہو چکی تھیں اور اس جنٹلمین نے آج صبح تین ماچسیں لی تھیں۔ سو اس کے پاس 312 سے 314 نمبر والی ماچسیں ہیں۔''

''یہ ان میں سے ایک ہے نا؟'' پیٹرول مین ٹام بریڈی نے جم کی جانب ایک ماچس بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اس پر 313 نمبر چھپا ہوا ہے۔''

''ہاں، یہ انہی میں سے ایک ہے۔''

''میں بس یہی جاننا چاہتا تھا۔'' پیٹرول مین نے کہا اور مارٹی کی جانب گھوم گیا۔ ''تم خود کو ڈکیتی اور قتل کے الزام میں زیرِ حراست سمجھو، دوست۔'' اس کا لہجہ اب سخت ہوگیا تھا۔ ''جب تم نے اس تنگ گلی میں اس موٹے آدمی کے سر پر ضرب لگائی تھی تو تمہاری ماچسوں میں سے ایک وہاں گر گئی تھی۔ یہ وہی ماچس ہے...... نمبر 313! تب میں نے سوچا کہ یہ واردات جس شخص نے بھی کی ہے وہ جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے شاید جم کے ریسٹورنٹ میں موجود ہو کیونکہ اس قصبے میں اتنی صبح سویرے اور کوئی جگہ پبلک کے لیے کھلی ہوئی نہیں ہوتی۔''

یہ سنتے ہی مارٹی کے حلق سے ایک غراہٹ سی بلند ہوئی اور اس نے اپنا ریوالور نکالنا چاہا لیکن اس وقت تک ریسٹورنٹ کا مالک دبے پاؤں اس کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک بوتل ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی۔ اس سے قبل کہ مارٹی اپنا ریوالور نکالنے میں کامیاب ہوتا، جم نے بوتل سے مارٹی کی کھوپڑی بجادی۔

مارٹی لڑھک کر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

''مجھے یہ شخص ویسے بھی اچھا نہیں لگا تھا۔'' ریسٹورنٹ کے مالک جم نے پیٹرول مین ٹام بریڈی سے کہا۔ ''اس نے کہا تھا کہ اسے ہمارا یہ قصبہ اچھا نہیں لگا اور وہ یہاں قیام کرنا پسند نہیں کرے گا۔''

''لیکن ہوش میں آنے کے بعد اس کی یہ رائے بدل جائے گی کیونکہ اسے ایک لمبے عرصے تک یہاں جیل کی سلاخوں کے پیچھے قیام کرنا پڑے گا۔'' پیٹرول مین ٹام بریڈی نے کہا اور ساتھ ہی بے سُدھ پڑے مارٹی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی۔

پھر وہ دونوں مارٹی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔

سازش

تنویر ریاض

سازشی ذہن جب کسی سازش کا تانا بانا بنتے ہیں تو وہ صرف ... دوسروں کے نقصان پر گہری نظر رکھتے ہیں... فلمی ماحول میں ان گنت عناصر کسی نہ کسی گھناؤنی سازش میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ ایک متنازعہ فلم کی شوٹنگ جس میں دیکھتے ہی دیکھتے حقیقی مناظر شامل ہوتے چلے گئے...

شوبز کی جگمگاتی دنیا کی ایک خونی جھلک

میں جب دفتر میں داخل ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت کون فون کرسکتا ہے۔ میں نے ریسیور اٹھا کر خالص پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

''فیرل ڈیٹکٹیو ایجنسی۔ میں آرچی بول رہا ہوں۔ مسٹر فیرل اس وقت موجود نہیں ہیں۔''

''جھوٹ بولنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کم از کم اپنی آواز ہی بدل لیتے مگر میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔'' میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ کارل گوبر تھا۔

گوبرا سٹوڈیوز کا مالک۔ وہ عموماً گفتگو کا آغاز کسی ہلکے پھلکے جملے سے کیا کرتا تھا لیکن اس وقت اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی جھلک رہی تھی۔

''خیریت تو ہے مسٹر گوبر، آج صبح صبح میری یاد کیسے آ گئی؟''

''ایک بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے اسی لیے تمہیں فون کیا ہے۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

''مثلاً؟''

''کوئی شخص گوریلا آف دی گیس بیگز کے سیٹ پر تخریبی کارروائی کر رہا ہے۔''

میں جانتا تھا کہ یہ گوبرا سٹوڈیوز کی بہت بڑی فلم ہے اور اس سے مالکان کو کافی امیدیں وابستہ تھیں پھر بھی میں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے کہا۔ ''کیا تم اس فلم میں گوریلا کا کردار ادا کر رہے ہو؟''

''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔'' وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بہت پریشان ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اپنے طور پر اس معاملے کی چھان بین کرو۔''

''مجھے ابھی تک گیرٹ والے معاملے کی بھی ادائیگی نہیں ہوئی ہے۔''

گیرٹ سسٹرز اعضا کی نمائش کے ساتھ ساتھ گلوکاری بھی کیا کرتی تھیں اور بڑی تیزی سے شہرت کی جانب بڑھ رہی تھیں کہ اچانک ہی ان میں سے ایک نے کسی ملاح کے ساتھ فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے صرف ملاح کے بجائے جہاز پر موجود تمام عملے کی دل بستگی کا ذریعہ بننا ہوگا جو شدت سے اپنی محبوباؤں کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ گیرٹ سسٹر کی گمشدگی نے ایک تہلکہ مچا دیا اور تمام اخباری نمائندے و فوٹو گرافرز اس کی کھوج میں لگ گئے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب گوبر نے مجھے اسے تلاش کرنے کی ذمے داری سونپی۔

میرے گاہکوں میں عام طور پر بھٹکی ہوئی گھریلو عورتیں اور آوارہ مزاج مرد ہوتے ہیں۔ جو مجھے اپنی بیویوں یا شوہروں کی جاسوسی کرنے اور ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا معقول معاوضہ ادا کرتے ہیں لیکن گوبر میرا مستقل گاہک ہے۔ کوئی کام ہو یا نہیں وہ مجھے ہر ماہ ایک معمولی سی رقم بطور وظیفہ دیتا ہے گویا ایک طرح سے میں اس کا ملازم ہوں۔ اس لیے وقت پڑنے پر سارے کام چھوڑ کر اس کی خدمت میں لگ جاتا ہوں اور میرے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کی فلم میں کام کرنے والے اداکاروں کو ہر طرح کی مشکلات اور میڈیا کے حملوں سے بچاؤں۔ جب تک مجھے ماہانہ معاوضہ مل رہا ہے اس کے کام بخوشی کرتا رہوں گا۔ میں نے سوزی گیرٹ کو ہالی ووڈ بلے وارڈ کے عقب میں ایک ہوٹل سے تلاش کیا اور اس سے پہلے کہ اخباری رپورٹرز اور پاپارازی فوٹوگرافرز اس تک پہنچتے میں اسے واپس گھر لے آیا۔ اس کی بہنوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اسے بھاگنے کا موقع نہیں دیں گی کم از کم جب تک کہ ان کی اگلی فلم ریلیز نہ ہو جائے اور وہ اسٹوڈیو کے لیے کچھ پیسے کما سکیں، اس طرح یہ مشن کامیابی سے مکمل ہوا۔ مجھے توقع تھی کہ گوبر مجھے اس خدمت کا معقول معاوضہ دے گا لیکن وہ ہونٹوں پر قفل لگائے بیٹھا رہا لہٰذا اس کا فون سننے کے بعد موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جب تک مجھے پہلے کام کا معاوضہ نہیں دو گے، میں نہیں آؤں گا۔''

''تمہیں ہر مہینے معقول تنخواہ ملتی ہے۔'' وہ غراتے ہوئے بولا۔

''وہ حقیر رقم میرے لیے مونگ پھلی کے دانے کے برابر ہے اور یہ محض مجھے تمہارے کام کے لیے تیار رہنے کے عوض ادا کی جاتی ہے۔ تمہیں اصل کام کا الگ سے معاوضہ دینا چاہیے۔ جانتے ہو کہ اگر اس لڑکی کو واپس لے کر نہ آتا تو تمہارا لاکھوں ڈالر کا نقصان ہو جاتا اور تمہیں نئے سرے سے فلم کی شوٹنگ کرنا پڑتی۔''

میری دلیل کارگر ثابت ہوئی، وہ نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''تم یہاں آؤ گے تو رقم مل جائے گی۔ میں ابھی سیکریٹری سے کہہ کر تمہارا چیک بنواتا ہوں۔''

''ایسی بات ہے تو میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تمہارے پاس آ رہا ہوں۔''

مسٹر گوبر، اصلیت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں نقالی موجودہ دور میں کمائی کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی کامیاب ترین فلموں میں سے ایک ایل لوبو سیریز بھی جس میں ایک نمود پسند نوجوان زمین دار ڈون جارج کورٹیز، رات کو بھیس بدل کر مظلوم کسانوں اور کھیت کے مزدوروں کا محافظ بن کر رات کو نکلتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اندھیرے کا حصہ بنانے کے لیے ہمیشہ سیاہ لباس پہنتا تھا اور اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا چابک ہوتا گو کہ اس کی تلوار چاندی کی تھی لیکن اس کا دستہ بھی سیاہ رنگ کا تھا۔ اس کے پاس فیرو نام کا کتا تھا جو مظلوم طبقہ کو انصاف فراہم

جدید شب عروسی!

کرنے کے مشن میں اس کی مدد کیا کرتا۔

اس فلمی آئیڈیے کی کامیابی نے گیرٹ سسٹرز کو بہت متاثر کیا جبکہ اس سے پہلے یونیورسل کی فلموں میں اینڈریو سسٹرز بہت کامیاب تھیں۔ مسٹر گوبر کا خیال تھا کہ گیرٹ سسٹرز بھی مستقبل میں اسی پائے کی اسٹارز ثابت ہوسکتی تھیں اس لیے وہ ان بہنوں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ گو کہ میں گوبر کے اس خیال سے متفق نہیں تھا لیکن کسی نے بھی کبھی مجھ سے ان معاملات میں رائے لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کی زیرِ تکمیل فلم گوریلا آف دی گیس بیگز بھی چربہ تھی اور مارکیٹ میں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ ایک سال کے اندر کنگ کانگ دوبارہ ریلیز ہونے والی ہے۔ گوبر نے اس پرانی کہانی کے حقوق خرید لیے تھے اور اس کا خیال تھا کہ اس کہانی پر مبنی ایک کم بجٹ کی فلم بنائے تو اس پر دولت کی بارش ہوسکتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ فلم میں اوبرائن اور ہیری ہوسن جیسے باصلاحیت اداکاروں کو کاسٹ نہ کیا جائے کیونکہ وہ منہ مانگا معاوضہ طلب کرتے اور نہ ہی وہ اس شخص کی ضرورت محسوس کررہا تھا جس نے رے گوریگن سے گوریلے کی کھال خریدی تھی۔ گوبر کا نظریہ تھا کہ تیز اور سستا کام کیا جائے۔

گوبر اسٹوڈیو کے گیٹ پر محافظ نے مجھے روک لیا حالانکہ وہ مجھے جانتا تھا لیکن شاید اسے باتیں کرنے کے لیے کسی شخص کی تلاش تھی کیونکہ بڑے فلم اسٹارز تو رکے بغیر ہی اپنی گاڑی اندر لے جاتے تھے لہٰذا اس نے مجھ پر ہی اکتفا کرنا کافی سمجھا۔ اس کا نام ہیری تھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں ہالی ووڈ ڈیلکنیو کا ایک شمارہ پکڑا ہوا تھا۔ غالباً وہ وقت گزارنے کے لیے اپنے پاس اس طرح کی کوئی نہ کوئی چیز رکھا کرتا تھا۔ اس نے کار کی کھڑکی میں سر ڈالتے ہوئے کہا۔

”خیریت تو ہے، تمہاری آمد سے لگ رہا ہے کہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔“

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میری گوبر سے بات نہیں ہوئی ہے۔“

”تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں؟“ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”یہاں آنے کے لیے مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”مجھے اس کے باتونی پن سے جھنجلاہٹ ہورہی تھی کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے وہ چیک لہرا رہا تھا جو چند منٹوں بعد مجھے ملنے والا تھا۔

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ اس نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اپنا خیال رکھنا۔“

میں نے اپنی گاڑی اس عمارت کے باہر کھڑی کی جس میں گوبر کا دفتر تھا۔ وہاں پہلے سے دو سیاہ رنگ کی بیوک کاریں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک گوبر اور دوسری اس کی سیکریٹری کی تھی جس کا مطلب تھا کہ اسے معقول تنخواہ ملتی ہوگی۔

سیکریٹری کو پہلی نظر میں دیکھتے ہی اس کی مالی حیثیت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ وہ چھ فٹ قامت کی سنہرے بالوں والی پرکشش عورت تھی۔ اس نے اس وقت سیاہ رنگ کا جالی دار لباس پہن رکھا تھا۔ جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا اس نے مجھے چیک پکڑا دیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

”مسٹر گوبر نے کہا ہے کہ تمہیں فوراً اندر بھیج دیا جائے۔“

میں نے کچھ کہے بغیر وہ چیک کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور بغلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ گوبر مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”کہاں رہ گئے تھے، میں کب سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔“

”یہ تم اپنے گارڈ سے پوچھو جسے آتے جاتے لوگوں

سے باتیں کرنے کا شوق ہے۔''

''اچھا، اچھا، بیٹھ جاؤ۔'' وہ شاید مزید وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''قصہ کیا ہے؟'' میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک مشکل آن پڑی ہے۔'' وہ اپنے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتے ہو کہ ہماری گوریلا فلم ایک مہنگا منصوبہ ہے اور میں اسے جلد از جلد مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی تاخیر یا حادثہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔''

''کیا کسی شخص کو کوئی نقصان پہنچا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے لیے کوئی بھی اہم نہیں ہے۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ اس کا مطلب فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ گوبر کا فلسفہ یہ تھا کہ ہر شخص کا متبادل مل سکتا ہے لیکن اس کے لیے کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا مشکل تھا جس کے پاس گوریلا کی کھال ہو کیونکہ وہ کبھی بھی اس کے لیے بھاری قیمت نہیں دے سکتا تھا۔

''اب تک چھوٹے موٹے واقعات ہو رہے ہیں۔'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مثلاً کافی میں جلاب آور دوا ملانا۔ روشنیوں کو نقصان پہنچانا اور بجلی کے تار کاٹنا۔ ان سے نمٹنا مشکل نہیں لیکن یہ سب باتیں پریشان کن ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ بری صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔''

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟''

''اس طرح کی چیزیں ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔'' وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ ''کوئی ایسا شخص ہے جو نہیں چاہتا کہ ہم یہ فلم بنائیں۔''

''ایسا کون ہے جسے اس فلم کی وجہ سے پریشانی ہو سکتی ہے؟''

''یہ میں کیسے جان سکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ کنگ کانگ بنانے والی کمپنی یہ سمجھ رہی ہو کہ ہم ان کی فلم کاری میک بنا رہے ہیں یا کوئی اور شخص جو ہمیں پسند نہ کرتا ہو۔''

جی میں آیا کہہ دوں کہ اسے تو آدھا بلکہ شاید تین چوتھائی ہالی ووڈ پسند نہیں کرتا لیکن مجھ میں ایسا کہنے کی ہمت نہیں تھی لہٰذا مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''سیٹ کا چکر لگاؤ اور اس وقت تک وہاں رہو جب تک یہ حرکتیں ختم نہیں ہو جاتیں۔''

''اس فلم میں کون کام کر رہا ہے؟''

''وانس جیکسن اور وانڈا اولوکس۔''

میں نے ایک دفعہ جیکسن کو ایک سستے سے ہوٹل میں پکڑا تھا جہاں وہ ایک اسسٹنٹ مین کول راجرز کی بیوی کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ اس غریب کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اس کی بیوی کیا گل کھلا رہی ہے جب تک وہ خود اسے نہ بتاتی۔ میں نے گوبر سے پوچھا۔

''کیا راجرز بھی اس فلم میں کام کر رہا ہے؟''

گوبر نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''ہاں، وہ اس فلم میں گوریلا کے ساتھ کچھ خطرناک مناظر شوٹ کروائے گا۔ تمہارے خیال میں کیا وہ کوئی مسئلہ پیدا کر سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کئی وجوہ کی بنا پر جیکسن کو نقصان پہنچا سکتا ہے جس کا مطلب فلم کو تباہ کرنا ہے پھر یہاں وانڈا اولوکس بھی ہے۔''

وانڈا نے ایک بڑی فلم کمپنی آر کے او سے اپنا سفر شروع کیا لیکن جلد ہی اس کا معاہدہ ختم ہو گیا کیونکہ وہ کمپنی کے دو ہدایت کاروں کے ساتھ رنگ لیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی تھی اور یہ کارنامہ ان کی بیویوں نے انجام دیا۔ شاید مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا۔ میں آر کے او کے لیے کام نہیں کرتا تھا لیکن ان ہدایت کاروں کی بیویوں نے سارا کچا چٹھا کھول دیا۔ اس کے بعد وانڈا نے آزادانہ حیثیت میں کچھ فلمیں کیں لیکن وہ ناکام رہیں۔ اب وہ گوبر کے ساتھ کام کر رہی تھی۔

''وہ کیوں ہمارے لیے مسئلہ پیدا کرے گی؟'' گوبر نے پوچھا۔

''اگر اس سازش کے پیچھے آر کے او ہے تو وہ اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ وانڈا کو یہ لالچ ہو گا کہ شاید اس کے عوض وہ سابقہ کمپنی سے نیا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائے، ویسے تمہاری فلم کا ہدایت کار کون ہے؟''

''لارنس ٹیلی۔''

اس کا نام سنتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پوری سنجیدگی کے ساتھ کام کرتے ہیں اور سیٹ پر یا شوٹنگ کے بعد کسی غیر اخلاقی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتے۔

''تمہاری نظر میں کوئی اور ایسا شخص ہے جو مسئلہ بن

سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

گوبر اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تھک چکا تھا۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم سارا دن یہاں بیٹھ کر امکانات پر باتیں کرتے رہیں گے۔ سیٹ پر جاؤ اور تمام معاملات کا جائزہ لو۔ میں تمہیں باتیں کرنے کے نہیں بلکہ کام کرنے کے پیسے دیتا ہوں۔''

جس اسٹوڈیو میں فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا وہ مسٹر گوبر کے دفتر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ویسے بھی میں عموماً پیدل چلنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس طرح بہت کچھ دیکھنے اور سننے کو مل جاتا ہے۔ اس وقت بھی میں نے بہت کچھ دیکھا۔ ان میں سب سے اہم شخصیت مقبول ترین اداکارہ ایڈیلیڈ گلاس کی تھی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ اس کے لیے اسے الزام نہیں دوں گا کیونکہ چند ماہ قبل میں اسے اپنے پول بوائے کے ساتھ اسپرنگ فیلڈ میں دیکھ چکا تھا۔

میں عام دروازے سے اسٹوڈیو میں چلا گیا۔ یہ ایک وسیع وعریض جگہ تھی جس کا رقبہ ہوائی جہاز کے ہینگر کے برابر تھا اور یہاں عموماً مہنگی فلموں کی عکس بندی ہوا کرتی تھی۔ اس وقت وہاں کسی فلم کی شوٹنگ نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں سیدھا اندر چلا گیا اور یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ اسے دیکھ کر خاصا متاثر ہوا۔ وہاں مجھے خاصی گہماگہمی دکھائی دی۔ لائٹس لگائی جا رہی تھیں اور الیکٹریشنز تاروں کا معائنہ کر رہے تھے۔ اسی طرح ساؤنڈ کریو بھی مائیک لگانے میں مصروف تھا۔

مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ زپلین نامی ایک بڑا سا ہوائی جہاز تھا۔ میں نے زپلین کے چھوٹے غبارہ نما جہاز نہیں دیکھے تھے لیکن لگتا تھا کہ گوبر اسٹوڈیو نے اس پر خاصا پیسا خرچ کیا ہے۔ اس کے اڑنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ اس مقصد کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ یہ محض ایک ماڈل تھا جو فرش سے دو فٹ اوپر ایک کشتی کے ساتھ تاروں کے ذریعے لٹکا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی چند لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے، ان میں سے ایک وانس جیکسن تھا۔ جس نے فر کے کالر والا چمڑے کا لباس پہن رکھا تھا جو عموماً ہوابازی کے دوران استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نے ہاتھ میں چمڑے کی ایک ٹوپی پکڑی ہوئی تھی اور اسے وہ ضرورت کے وقت ہی پہنتا ورنہ اس کے سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے بال خراب ہو جاتے۔

اس کے برابر میں کول راجرز بھی ایسے ہی لباس میں ملبوس اور اسی طرح کی ٹوپی ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دونوں کسی ایسے سین کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جس میں راجرز کو جیکسن کی جگہ لے کر خطرناک کمالات دکھانا ہیں۔ راجرز کے برابر میں ایک شخص گوریلے کی کھال پہنے کھڑا تھا اور اس نے گوریلے کا سر اپنے بازو میں دبا رکھا تھا۔ اس کے اپنے بال میری طرح نرم اور چکنے تھے۔ مجھے وہ شخص فوراً ہی پسند آ گیا۔ میں نے ادھر ادھر نظریں گھما کر وانڈا ولوکس کو دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ شاید اس سین میں اس کا کام نہیں تھا اور وہ اپنے ڈریسنگ روم میں آرام کر رہی ہوگی۔

چند منٹ بعد یہ گروپ منتشر ہو گیا اور میں گوریلا کی کرسی کی جانب بڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کرسی پر بیٹھتا میں نے اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ میں یہاں ان واقعات کا جائزہ لینے آیا ہوں جو سیٹ پر پیش آ رہے ہیں۔ اس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولا کہ اسے مجھ سے مل کر خوشی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بڑی سی بھدی اور کھردری ہتھیلی میری جانب بڑھائی اور میں نے اس کا انگوٹھا پکڑ کر مصافحہ کیا۔

''میرا نام فن ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مارک فن۔'' اس نے اپنا بالوں سے بھرا ہوا بازو ہوا میں لہرا کر سیٹ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''کیا یہ سب بہت شاندار نہیں ہے؟''

''یہ تمہارا پہلا بڑا کام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل پہلا...... میں نے ساری زندگی اسی کا خواب دیکھا تھا۔ اس وقت سے جب میں نے گوریلے کی کھال پر کام شروع کیا۔''

''تم نے اپنی کھال خود تیار کی ہے؟''

''ایسا کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ چیزیں درختوں پر نہیں اگتیں لیکن جب کوئی شخص خواب دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے کوشش بھی کرنا پڑتی ہے۔''

''کوئی شخص تمہیں ایسا کرنے سے روکنا چاہ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ پچھلے دنوں کچھ مشکلات پیش آئی ہیں۔ کسی نے میری کافی میں جلاب آور دوا ملا دی اور مجھے سارا دن باتھ روم کے چکر لگانا پڑے۔ تم جانتے ہو کہ اس کھال کو پہن کر دوڑنے میں کتنی مشکل ہوتی ہے۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کون ایسی حرکت کر سکتا

ہے؟"

فن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسا کوئی سراغ نہیں ملا۔ سب لوگ اچھے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اسی دوران والس جیکسن ٹہلتا ہوا منہ میں سگریٹ دبائے وہاں آگیا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں چمڑے کی ٹوپی نظر نہیں آئی۔

"میرا خیال ہے کہ تم یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو فیرل۔" اس نے اداکاروں کے مخصوص لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ہمیں گناہوں سے بچانا چاہتے ہو؟"

"میں سراغ رساں ہوں کوئی مبلغ نہیں۔" میں نے طنزاً کہا۔ "اب تم نے بات چھیڑ دی ہے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے کچھ معصوم عورتوں کو گناہ کی دلدل میں گرنے سے ضرور بچایا ہے۔ ویسے تمہارے اور کول راجرز کے تعلقات اب کیسے ہیں؟"

اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور بولا۔ "تم بہت کمینے انسان ہو۔"

"میں یہاں صرف اپنا کام کرنے آیا ہوں۔ سنا ہے کہ سیٹ پر کچھ گڑبڑ چل رہی ہے۔"

اس نے سگریٹ کا ایک زوردار کش لگایا اور اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "تم نے ٹھیک ہی سنا ہے، کوئی ہے جو ہمیں کام کرنے سے روکنا چاہ رہا ہے۔"

"کچھ اندازہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟"

"نہیں، کون ہے جو گوبر کی فلم کو بند کروانا چاہے گا۔ ممکن ہے کہ کوئی کچھ نہ کر رہا ہو، ممکن ہے کہ یہ ہماری بدقسمتی ہو۔"

"کافی میں جلاب آور دوا ملانا بدقسمتی ہے۔" میں نے طنزاً کہا۔

جیکسن کا چہرہ گھوم گیا اور بولا۔ "نہیں، واقعی وہ بہت خوف ناک منظر تھا۔"

"مجھے اس کا یقین ہے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟"

"نہیں اور بہتر ہوگا کہ تم مجھے کسی معاملے میں شامل نہ کرو۔ یہ میرے کیریئر کی ایک بڑی فلم ہوسکتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کچھ غلط ہو۔"

اس کا کیریئر تقریباً پانچ برسوں پر محیط تھا لیکن اسے ہمیشہ یہ امید رہی کہ کوئی بھی بڑی کامیاب فلم اس کے بے جان کیریئر کو دوبارہ زندہ کرسکتی ہے۔ گوبر کی فلمیں آمدنی کے لحاظ سے کامیاب رہتی تھیں اور ان میں سے کوئی بھی فلم بڑا بزنس کرسکتی تھی۔ ممکن ہے کہ یہی وہ فلم ہو جس کی عظیم الشان کامیابی کا خواب گوبر اور اس کا یونٹ دیکھ رہا تھا پھر کون اس کا مخالف ہوسکتا ہے۔ یقیناً جیکسن پر تو شک نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی عملے کا کوئی فرد اس میں شامل ہوسکتا ہے تاوقتیکہ کسی کے پاس ہارنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔

"کافی کون بناتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

جیکسن نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا اور نہ ہی اسے اس کی پروا تھی۔ وہ صرف اپنے ہم پلہ لوگوں سے بات کرنا پسند کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے فن سے بھی ایک لفظ نہیں کہا جو گوریلا کی کھال پہنے ہوئے اس سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔

"میں جا رہا ہوں۔" جیکسن نے کہا۔ "معاملے کو پیچیدہ مت بناؤ فیرل۔ یہ فلم مجھے ایک بار پھر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا سکتی ہے۔"

وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اور میں فن سے اس سین کے بارے میں باتیں کرنے لگا جس کی وہ تیاری کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا۔

"یہ اس فلم کا سب سے بڑا سین ہے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا منظر ہے جب مشرقی یورپ کے لوگوں نے اپنے جہاز لے جانے کے لیے گوریلوں کی تغیر پذیر شکل تخلیق کی تھی۔ جیکسن ایک جاسوس ہے اور اس کی ذمے داری ہے کہ جہاز کو فضا میں بلند نہ ہونے دے۔ میں اسے روکنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جہاز فضا میں بلند ہونے ہی والا ہے اور میں پیچھے رہ جاتا ہوں۔ چنانچہ میں اس میں سوار ہونے کے لیے دوڑ لگاتا ہوں اور جیسے ہی جہاز سطح زمین سے اٹھنا شروع ہوتا ہے دوسرے گوریلے میرے لیے رسی کی سیڑھی لٹکا دیتے ہیں۔ میں اس پر چڑھنا شروع کرتا ہوں اور جیکسن میرے پیچھے آتا ہے۔ ہم دونوں کے درمیان فضا میں زبردست لڑائی ہوتی ہے۔"

فن جوش میں آکر رقص کے انداز میں ٹہل رہا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ایک زبردست سین ہوگا۔ میں رسی کی سیڑھی کے ذریعے جہاز پر چڑھوں گا اور وہ مجھے روکنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے پاس واحد ہتھیار ایک چھوٹا سا پانا (رینچ) ہے۔ ہماری لڑائی کے دوران جہاز آسمان کی طرف اٹھتا رہے گا۔"

میں نے جہاز کی طرف دیکھا۔ اسٹوڈیو کی چھت کو ایک ترپال سے ڈھک دیا گیا تھا اور اس پر ایسا رنگ کیا گیا کہ وہ آسمان نظر آئے۔ جہاز کے ساتھ ہی ایک بڑا ساختہ

تھا جس پر اس طرح کی عمارتوں کی تصاویر بنائی گئی تھیں کہ وہ کسی فوجی اڈے کی عکاسی کر رہی تھیں۔ فلم میں یہ سب کچھ حقیقی نظر آتا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ سین بہت موثر ہوگا اور اس کے ذریعے جیکسن کو بہت زیادہ توجہ مل سکتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہ اس سین میں نہیں ہوگا۔

''کیا جہاز میں اور بھی گوریلے ہوں گے؟''

''نہیں، تماشائی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ جہاز میں کون ہے۔ انہیں صرف میں ہی نظر آؤں گا۔ جیکسن لڑائی میں گرنے لگتا ہے لیکن پھر اچانک ہی وہ اپنے طور پر جہاز کو نیچے لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

''کیا واقعی؟ وہ ایسا کس طرح کر سکے گا؟''

''تیروں کی مدد سے۔'' فن نے کہا۔ ''اسے ایک کمان مہیا کی جائے گی.....''

''یقیناً وہ جیکسن نہیں ہوگا جس کے ساتھ تم لڑو گے؟''

''نہیں، اس کی جگہ اسٹنٹ مین کول راجرز آجائے گا۔''

میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ جیکسن کبھی بھی اس طرح کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ البتہ زمین پر ہی اس کے کچھ شاٹس لے لیے جائیں گے تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ سیڑھی پر بھی وہی ہے لیکن چمڑے کے سوٹ اور ٹوپی میں ملبوس راجرز بہ آسانی اس کی جگہ لے لے گا کیونکہ اس کا کوئی کلوز اپ نہیں لیا جائے گا تاہم بعد میں سیڑھی پر جیکسن کے کچھ کلوز اپ لے لیے جائیں گے اور فلم کی تدوین کے دوران انہیں اس منظر کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔

جب میں یہ سب باتیں سوچ رہا تھا تو مجھے کافی اور اسنیکس کی طلب محسوس ہوئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے ایک میز کے پیچھے موٹے شیشوں کا چشمہ لگائے ایک شخص نظر آ گیا۔ اس نے خانساماں والا ایپرن پہن رکھا تھا۔

''یہ شخص کون ہے؟'' میں نے فن سے پوچھا۔

''اس کا نام رک کولن ہے اور یہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔''

''مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔''

''میں رک کو برسوں سے جانتا ہوں۔ ہم اچھے دوست رہ چکے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی گوریلا کی کھال پہن کر کسی فلم میں کام کرے گا لیکن میں نے اسے شکست دے دی۔ اسی لیے وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اس کے لیے میں اسے الزام نہیں دوں گا اگر

ڈارلنگ! ناراض کیوں ہو رہے ہو، انشورنس ہے تو اس سے فائدہ بھی اٹھانا چاہیے

اس کی جگہ میں ہوتا تو ایسا ہی محسوس کرتا۔ تم اسے رقابت کہہ سکتے ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے بازو پھیلا دیے جس سے اس کی گھنی چھاتی نمایاں ہو گئی اور بولا۔ ''میری طرف دیکھو، کیا تمہیں حسد کا کوئی نشان نظر آ رہا ہے۔''

''نہیں۔''

''اس کے باوجود میں نے رک کے لیے اس سیٹ پر ملازمت کا انتظام کیا۔'' وہ چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''میں اپنے پرانے دوست کے لیے یہی کچھ کر سکتا تھا۔''

''حالانکہ وہ تم سے حسد کرتا ہے۔''

''ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو جو تمہیں تنگ کرتے ہیں۔'' فن نے کہا۔ ''یہ بائبل میں لکھا ہوا ہے، تم خود دیکھ سکتے ہو۔''

''میں اس کے لیے تمہارے جذبات یاد رکھوں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''تمہارے قیمتی وقت کا شکریہ۔ میں تمہارے دوست رک کولن سے کچھ باتیں کروں۔''

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' فن نے کہا۔ ''بظاہر اسے اپنے پرانے دوست سے باتیں کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم شوٹنگ دیکھو گے؟''

"کیوں نہیں، میں ایسا موقع ضائع نہیں کرسکتا۔"

جب میں نے کولن سے اپنا تعارف کروایا تو وہ بالکل بھی متاثر نہیں ہوا اور بولا۔ "میں نے تم جیسے لوگوں کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ تم بھی یہاں تاک جھانک کرنے آتے ہو۔"

میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کردیا اور بولا۔ "تم یہاں کافی بناتے ہو۔"

وہ دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "بہتر ہوگا کہ تم مجھے کوئی الزام نہ دو۔ میں نے کافی میں کچھ نہیں ملایا بلکہ خود بھی وہ کافی پی تھی اور دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی باتھ روم کے چکر لگانا پڑے۔ تم کسی سے بھی یہ بات پوچھ سکتے ہو۔"

"میں نے سنا ہے کہ تم فن کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔"

"وہ ہر ایک سے یہی کہتا ہے کہ میں اس گھٹیا کھال کی وجہ سے اس سے حسد کرتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھ سے حسد کرتا ہے۔"

میں نے اس کے ایپرن کی طرف دیکھا جس پر دھبے پڑے ہوئے تھے پھر اس کے گھنے بالوں والے سر پر نظر ڈالی اور بولا۔ "کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے بال بہت خوب صورت ہیں۔"

"یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے لیکن اس کی پریشانی کا اصل سبب یہ ہے کہ میں اس کے مقابلے میں زیادہ مشہور ہونے والا ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں ایک مصنف ہوں۔"

"کیا ہالی ووڈ ڈیٹکٹیو تم نے لکھی ہے؟" میں نے طنزاً کہا۔

"نہیں، میں نے ابھی اپنی کتاب شائع نہیں کروائی لیکن بہت جلد ایسا کرنے والا ہوں۔ میں گوریلوں سے متعلق ایک کتاب پر کام کررہا ہوں۔ جس میں ان تمام گوریلوں کا ذکر ہوگا جو فلموں، کتابوں اور تاریخ میں ملتے ہیں۔ اس کتاب کے شائع ہوجانے کے بعد میں راتوں رات مشہور ہوجاؤں گا۔"

میں نے سوچا کہ بغیر دم کے بندروں کے بارے میں کون اس کتاب کو پڑھنا پسند کرے گا۔ اس لیے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا تمہاری کسی ناشر سے بات ہوئی ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا تو میں نے پوچھا۔ "تمہارا کوئی ایجنٹ ہے؟"

"فی الحال نہیں لیکن بہت جلد میں ایک ایجنٹ تلاش کرلوں گا۔ فن اور ساری دنیا دیکھے گی۔ فن نے تو اپنے آپ کو گوریلے کی کھال میں چھپا رکھا ہے لیکن میری تصویر کتاب کے بیک ٹائٹل پر شائع ہوگی اور ساری دنیا میرے نام سے واقف ہوجائے گی۔"

میں نے تصور میں دیکھا کہ اگر اس نے کوئی تصویر شائع کروائی تو وہ کیسی ہوگی۔ اس نے ٹوئیڈ کی جیکٹ پہن رکھی ہوگی جس کی کہنیوں پر پیوند لگے ہوں گے اور منہ میں پائپ ہوگا۔ اگر ایسی کوئی کتاب بھی شائع ہوئی جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا، شاید وہ بھی جانتا تھا کہ اس کی نوبت کبھی نہیں آئے گی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ اسی لیے فن اور اس کی گوریلا کھال سے حسد کرتا تھا۔

"کافی کے بارے میں کیا خیال ہے۔" اس نے کہا۔ "اس کے بعد تم زیادہ مستعدی سے اپنا کام کرسکو گے۔"

میں نے اسے بتایا کہ فی الحال میرا کافی پینے کا موڈ نہیں۔ میں یہ بالکل نہیں سوچ رہا کہ اس میں کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ میں نے لارنس ٹیلی کو ایک کیمرا مین سے باتیں کرتے دیکھا ہے اور میں اس سے اس سین کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں اس کی جانب چل دیا۔

"ہیلو اولڈ بوائے۔" اس نے مجھے دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔ "کیا تم ہمارے مسائل حل کرنے کے لیے یہاں آئے ہو؟"

"میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کون یہ مسئلہ پیدا کررہا ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"ٹیلی کا تعلق فورٹ ورتھ ٹیکساس سے تھا لیکن نہ جانے اس کے دماغ میں یہ بات کیسے سماگئی کہ وہ ہالی ووڈ میں بہتر کام کرسکتا ہے۔ مجھے احساس تھا کہ کافی والے واقعے سے وہ متاثر نہیں ہوا ہوگا کیونکہ وہ ہمیشہ چائے پیتا تھا۔ میں اس کے پس منظر سے ناواقف تھا اور نہ ہی کسی ایسی بات کے بارے میں جانتا تھا جس کی وجہ سے وہ گوبر کو تباہ کرسکتا ہو۔

"فلم کی شوٹنگ کیسی جارہی ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اس سے قطع نظر کہ تمہیں کافی والے واقعے کی وجہ سے پریشانی کا سامنا ہے۔"

وہ میرے قریب جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی لیکن کیا تم اس احساس کے بارے میں جانتے ہو جب سب کچھ آپ کے حق میں بہتر ہو رہا ہو۔“

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”اگر تم اس فلم میں کام کر رہے ہوتے تو آسانی سے میری بات سمجھ جاتے۔ یہ گوبر کی زندگی کی سب سے بڑی فلم ہے۔ اس سے اسٹوڈیو کو زبردست مالی فائدہ ہوگا اور غربت کے بادل چھٹ جائیں گے۔ وانس جیکسن کا شمار گیبل اور گرانٹ جیسے اداکاروں میں ہونے لگے گا اور میں بھی ایک بڑا ہدایت کار بن جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے کوئی ایوارڈ بھی مل جائے۔“

یہ کہہ کر اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کر ڈالی۔ اسے اپنے کہے ہوئے ہر لفظ پر یقین تھا اور میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ اس کا کہا ہوا صحیح ہوسکتا ہے۔ اس فلم میں بہت زیادہ تفریحی عنصر تھا۔ ایکشن، رومانس اور ایک ایسی کہانی جو ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی۔

”لہٰذا تم دیکھ سکتے ہو اولڈ بوائے۔“ وہ اپنی پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں ان چیزوں کو روکنا ہوگا۔ اب تک تو چھوٹے چھوٹے مسئلے پیش آئے۔ وہ ہمارے لیے کچھ اہم نہیں تھے البتہ ہمارا کچھ وقت ضرور ضائع ہوا لیکن ہم اس پر قابو پاسکتے ہیں۔ اگر کوئی سنگین حادثہ پیش آگیا تو ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ تمہیں اس کے لیے بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔“

گوبر مجھے اس طرح کی ذمے داری کے لیے معقول معاوضہ نہیں دیتا تھا تاہم میں نے کہا۔ ”مجھ سے جو ہوسکا وہ کروں گا۔“

ٹیلی نے میرے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”یہی اسپرٹ ہونی چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم تم پر بھروسا کرسکتے ہیں۔ کیا تم شوٹنگ دیکھنا چاہو گے۔ اگلا سین فلم کے لیے بہت ہی اہم ہے۔“

”میں نے بھی یہی سنا ہے اس لیے شوٹنگ ضرور دیکھوں گا۔“

”ٹھیک ہے، اب مجھے واپس جا کر انتظامات کا جائزہ لینا چاہیے۔“

شوٹنگ کی تیاری میں مزید تیس چالیس منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں اسٹوڈیو کی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے ایک سائبان کے نیچے کھڑا ہوا حالات پر غور کرتا رہا۔ کسی نے پروڈکشن کی رفتار کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید وہ چاہتا ہو کہ کوئی فرد فلم چھوڑ کر چلا جائے لیکن اس کی یہ سرگرمیاں فلم کی شوٹنگ روکنے کے لیے کافی نہیں تھیں۔ فلم میں کام کرنے والے ہر شخص پر واضح تھا کہ اس کی کامیابی کے روشن امکانات ہیں پھر وہ کون ہوسکتا ہے جو ان حرکتوں کے ذریعے فلم کو روکنا چاہتا ہو۔

کون ایک ایسا شخص تھا جو فلم کو ناکام دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ ایسی صورت میں اس کا کوئی نقصان نہ ہوتا۔ وانڈا ولوکس کبھی نہیں چاہے گی کہ یہ فلم ناکام ہو جائے کیونکہ اس کی کامیابی سے اس کے کیریئر پر اچھا اثر پڑے گا۔ گو کہ اس فلم میں اس کا زیادہ کام نہیں تھا لیکن اس کے کامیاب ہونے کی صورت میں وہ کوئی اچھا رول حاصل کرسکتی تھی۔ اب رہ گیا ٹیلی، وہ فلم کو کیوں تباہ کرنا چاہے گا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس فلم پر ہالی ووڈ کا سب سے بڑا ایوارڈ حاصل کرسکتا ہے۔ جیکسن بھی یقینی طور پر چاہے گا کہ یہ فلم کامیاب ہو البتہ کول راجرز کے دل میں جیکسن کے لیے بہت زیادہ مخالف جذبات تھے۔

میں نے مشتبہ افراد کی ایک فہرست تیار کرلی تھی جن میں راجرز کا نام سرفہرست تھا لیکن فوری طور پر ان میں سے کسی ایک کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ ممکن ہے کہ مشکل پیدا کرنے والا کوئی ایسا شخص ہو جس کے بارے میں، میں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ حالات اس کمپنی کے حق میں سازگار نظر نہیں آ رہے تھے اور اگر کوئی بڑی مصیبت پیش آجاتی تو گوبر مجھے کبھی معاف نہ کرتا۔

کسی نے خاموش رہنے کا اعلان کیا تو عملہ اس جگہ سے لوگوں کو ہٹانے میں مصروف ہوگیا۔ ٹیلی نے ’ایکشن‘ کا نعرہ لگایا اور فن نے اس مخصوص جگہ کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ ٹھیک طرح سے نہیں دوڑ رہا تھا لیکن گوریلا کی کھال پہن کر کوئی شخص ریس نہیں جیت سکتا۔ اس نے رک کر پیچھے کی جانب دیکھا اور پھر جہاز کی طرف دوڑنا شروع کر دیا جو کہ اوپر کی جانب اٹھنا شروع ہوگیا تھا اور یہ عمل تاروں کے ذریعے انجام دیا جا رہا تھا جو کہ فائنل پرنٹ میں نظر نہیں آتے۔

جہاز تقریباً بارہ فٹ اوپر اٹھ چکا تھا جب فن اس کے قریب پہنچا اور اس نے سوار ہونے کے لیے چھلانگ لگائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اصلی بندر اس سے اچھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔ وہ جہاز تک نہیں پہنچ سکا لہٰذا اس نے ایک زوردار چیخ لگائی۔ چند سیکنڈ بعد جہاز کی کھڑکی سے رسی

کی ایک سیڑھی نیچے لٹکادی گئی جسے دیکھتے ہی فن میں حیرت انگیز طور پر پھرتی آگئی۔ اس نے سیڑھی کا ایک ڈنڈا پکڑا اور اس پر چڑھنا شروع کردیا۔ عین اسی وقت راجرز اس سین میں نمودار ہوا۔ اس نے ایک ہاتھ میں پانا پکڑا ہوا تھا اور تیزی سے بھاگتا ہوا اس جانب آرہا تھا۔ فن نے اسے دیکھا اور ایک بار پھر اس کے حلق سے خوف ناک چیخ نکلی۔

جہاز آہستہ آہستہ بلند ہورہا تھا لیکن راجرز بروقت اس تک پہنچ گیا اور اس نے عین فن کے پیروں کے نیچے سیڑھی پکڑلی۔ اس بار فن کے حلق سے ایک مختلف قسم کی چیخ برآمد ہوئی جس سے غصہ اور تکلیف کا اظہار ہورہا تھا۔ یہ چیخ خالص اور حقیقی تھی اور اس وقت مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ فن اتنا اچھا ایکٹر نہیں تھا کہ وہ اتنی حقیقی چیخ مارسکتا لہٰذا میں فوراً ہی حرکت میں آگیا اور میں نے آہستہ آہستہ جہاز کی طرف بڑھنا شروع کردیا پھر میری حرکت میں تیزی آگئی اور میں نے جہاز کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ عملے کے دو لوگوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں دونوں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جب میں ٹیلی کے پاس سے گزرا تو میں نے اس کے چہرے پر حیرت کی پرچھائیں دیکھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے فالج ہوگیا ہو پھر میں نے اسے چیختے ہوئے سنا کہ کیمرا بند نہ کیا جائے۔ اس طرح گویا میرے فلمی کیریئر کا آغاز ہورہا تھا۔

اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ اگر فلم کی آدھی شوٹنگ ہوجائے تو آپ کسی ایکٹر کے زخمی یا مرجانے کی صورت میں اسے تبدیل نہیں کرسکتے خاص طور پر اسٹارز کو لیکن یہاں ایک مختلف صورت حال تھی۔ اگر کول راجرز اس فلم کی شوٹنگ روکنا اور جیکسن کے اسٹار بننے کے موقع کو ضائع کرنا چاہتا تو اس سے جیکسن کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ راجرز کو تسلی اس وقت ہوتی جب جیکسن زندہ سلامت رہتا اور ہمیشہ یہ سوچتا کہ وہ کامیابی کے کتنا قریب آگیا تھا اور اب اسے دوبارہ ایسا موقع نہیں مل سکتا۔

راجرز اسے بہ آسانی ایک حادثے کی شکل دے سکتا تھا۔ کسی خطرناک اسٹنٹ میں کچھ بھی ہوسکتا ہے اور بعض اوقات ایسے واقعات رونما ہوچکے ہیں۔ میں کم از کم ایسے دو پرانے اسٹنٹ مین کو جانتا تھا جو شوٹنگ کے دوران ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے جبکہ فن ایسے معاملات میں ناتجربہ کار تھا۔ راجرز اس سلسلے میں اپنی بے گناہی کا دعویٰ کرسکتا تھا اور کون تھا جو اس کی بات پر یقین نہ کرتا۔

جب میں سیڑھی کے قریب پہنچا تو فن ایک بار پھر زور سے کراہا۔ اس کا بایاں بازو سیڑھی کے ڈنڈے میں پھنسا ہوا تھا اور راجرز اس کے پاؤں پر پانے سے مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ اسکرپٹ میں لکھا ہوا تھا۔ فن نے ایک پاؤں سے راجرز کے دائیں ہاتھ پر ضرب لگائی جس میں اس نے پانا پکڑا ہوا تھا۔ راجرز نے فن کے جسم کے اوپری حصے کو پکڑلیا اور اسے روکنے کی کوشش کی۔ جواب میں فن نے ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ نوچنے کی کوشش کی۔

اس دوران میں سیڑھی تک پہنچ چکا تھا اور اس کا نچلا پایہ بالکل میرے اوپر تھا۔ میں نے چھلانگ لگا کر سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کی۔ میں فن کی طرح پھرتیلا تو نہیں تھا پھر بھی سیڑھی پر چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے سیڑھی کا ڈنڈا مضبوطی سے پکڑا اور دائیں ہاتھ سے راجرز کی کہنی پکڑلی لیکن اس نے میرے ماتھے پر لات ماری اور میں سیڑھی سے لٹک گیا۔

راجرز نے پانا جیب میں رکھا اور اوپر چڑھنے لگا۔ اس نے فن کی کھال پکڑ رکھی تھی۔ فن نے اسے دھکیلنے کی کوشش کی، جواب میں راجرز نے اس کے منہ پر ضرب لگائی اور اس کے کندھے تک پہنچ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو اوپر لے جانے کی کوشش کی۔ مجھے ایسے کاموں میں مہارت نہیں تھی لیکن میں دو سیڑھیاں چڑھنے میں کامیاب ہوگیا پھر میں نے چلانا شروع کردیا۔

''جہاز کو روکو، جہاز کو روکو۔''

ٹیلی نے یقیناً میری آواز سنی ہوگی لیکن جب ڈائریکٹر کو ایسی فوٹیج مل رہی ہو جسے وہ کہیں استعمال کرسکے تو وہ ایسی چیزوں کو نہیں روکے گا اور ٹیلی تو کسی قیمت پر ایسا نہیں کرتا۔ جہاز مسلسل اوپر کی طرف جارہا تھا اور میں یہ سوچ کر حیران ہورہا تھا کہ یہ لوگ اسکرپٹ میں میرے لیے گنجائش کیسے نکالیں گے۔ مجھے شک تھا کہ شاید ہی میں یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ رہوں۔

میں نے اوپر کی جانب دیکھا۔ راجرز نے کسی حد تک فن کو قابو کرلیا تھا پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی جو پانے کے بجائے ایک چاقو تھا۔ وہ نیچے کی جانب جھکا اور اس نے رسیاں کاٹنا شروع کردیں۔ ہم اتنی اونچائی پر تھے کہ گرنے کی صورت میں ہم سب کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ سوائے راجرز کے کیونکہ وہ جن رسیوں کو کاٹ رہا تھا وہ اس سیڑھی سے نیچے تھیں جس پر وہ کھڑا ہوا تھا لہٰذا وہ بچ کر جہاز میں جاسکتا تھا تاکہ دوسرے گوریلوں کو روک

سکے۔

"اس کا پاؤں پکڑو۔" میں نے چلا کر فن سے کہا۔

جیسے ہی رسی علیحدہ ہوئی فن نے راجرز پر گرفت مضبوط کر لی۔ میں نے جھٹکا محسوس کیا لیکن سیڑھی سے لٹکا رہا۔ فن اور راجرز نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہم سیٹ کے فرش کے اوپر فضا میں معلق تھے۔ میں نے نیچے جھانک کر نہیں دیکھا کہ ہم کتنی بلندی پر تھے۔ اس کے باوجود ٹیلی نے جہاز کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا جو مسلسل اوپر کی جانب اٹھ رہا تھا۔

میں حیران تھا کہ راجرز کتنی دیر تک لٹکا رہ سکتا ہے۔ فن اور میں چھوٹی جسامت کے نہیں تھے اس کے علاوہ فن نے بھاری بھرکم کھال پہن رکھی تھی۔ راجرز بمشکل بیس سیکنڈ تک لٹکا رہا۔ اس کے بعد ہم سب نیچے کی جانب آ رہے تھے۔ فن کی وجہ سے ہماری بچت ہوگئی۔ اس نے راجرز کو آخر وقت تک نہیں چھوڑا اور جیسے ہی ہم نیچے گرنے لگے۔ اس نے راجرز کو پھینک دیا۔ اس طرح وہ سب سے پہلے فرش پر گرا، اس کے بعد فن بھی اس پر جا گرا۔ اور پھر میں بھی ان دونوں پر گر گیا۔ میرا سر فن کے سر سے ٹکرایا اور تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"اوہ میرے خدا، فیرل تم تو میرے لیے مر چکے تھے۔" گوبر نے کہا۔

میں نے سوچا کہ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ میں تقریباً مر چکا تھا۔ شاید اس میں کچھ مبالغہ ہو لیکن میرے سر پر بہت بری چوٹ آئی تھی اور جس کی وجہ سے شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ مجھے کئی جگہ چوٹیں آئی تھیں لیکن میں حرکت کر سکتا تھا۔

جبکہ راجرز کمر میں چوٹ لگ جانے کی وجہ سے کافی عرصہ حرکت کرنے کے قابل نہ رہا۔ فن اس کے مقابلے میں نسبتاً بہتر حالت میں تھا۔ اس کی صرف ایک ٹانگ ٹوٹی تھی اور مسٹر گوبر کے لیے یہی سب سے زیادہ پریشانی کی بات تھی۔ فلم میں تاخیر کی وجہ سے اسے بہت زیادہ مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا۔

ہم جیکسن کے ڈریسنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب اسپتال کا عملہ فن اور راجرز کو لے گیا تو گوبر کو مجھ پر رعب جھاڑنے کا موقع مل گیا۔ وہاں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ گوبر چاہتا تھا کہ اکیلے میں مجھ پر چیخے چلائے۔

"میں نے فن کو بچا لیا۔" میں نے اپنی صفائی میں کہا۔ "اگر ایسا نہ کرتا تو شاید فن کی کمر یا گردن ٹوٹ جاتی۔

تم بے فکر رہو، مچھر تمہارے پیروں پر زیادہ نہیں کاٹیں گے

غلطی ٹیلی کی ہے اگر وہ جہاز کو روک دیتا تو ہم سب بچ جاتے۔"

"شاید نہیں۔" گوبر نے کہا۔ "اس کے بجائے اسے بہت اچھی فوٹیج مل گئی۔ وہ یہ سب تو استعمال نہیں کر سکتا لیکن اس کے کچھ حصوں کی بدولت اسے ایوارڈ مل سکتا ہے۔"

"اسے مزید پھیلا دو، اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح فلم مکمل کر سکتے ہو۔"

"ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ فن بہت زیادہ پریشان ہے کہ وہ فلم مکمل نہیں کروا سکتا کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ کوئی اور شخص اس کی کھال نہیں پہن سکتا اور نہ ہی اس کے علاوہ اس شہر میں کسی اور کے پاس ایسی کھال ہے۔"

"ایک شخص ہے جس نے ربے کورگین سے کھال خریدی تھی۔"

"وہ یہاں موجود نہیں ہے اور اس کے پاس جو کھال ہے وہ بھی فن کی کھال سے مختلف ہے۔" گوبر اس وقت بالکل بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ ماضی میں وہ ایسی باتوں کے لیے کبھی پریشان نہیں ہوتا تھا۔

"ہم اب بھی اس فلم کو بچا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیسے؟ مجھے بتاؤ؟" گوبر مضطرب ہوتے ہوئے بولا۔

''اس کے لیے میں علیحدہ سے بونس لوں گا۔''

اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا کہ اسے میرا مطالبہ منظور ہے۔

''کیوں نہ ہم ایک کپ کافی پی لیں۔'' میں نے کہا۔

جب میں نے کولن کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا تو وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''فن کبھی مجھے اپنی کھال نہیں پہننے دے گا۔ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔''

''اس نے ہی تمہیں یہ ملازمت دلوائی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اسے تمہاری حالت پر افسوس ہوتا ہو۔''

''اپنی کتاب لکھنے کے بعد میں اس سے زیادہ مشہور ہو جاؤں گا۔''

''تم اب بھی یہ کتاب لکھ سکتے ہو۔ یہ سوچ کر کہ سلور اسکرین پر گوریلے کی کھال میں تم تھے۔''

''اب اس میں میرے لیے کیا باقی بچا ہے۔ زیادہ ترسین تو فن نے مکمل کروا دیے ہیں۔''

خدا تمہیں سمجھے کولن۔'' مسٹر گوبر نے کہا۔ 'تم اس فلم کو مکمل کرواؤ گے اور فن تمہیں اس کی اجازت دے گا۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''اچھا......اگر تم کہتے ہو......''

تھوڑی سی مزید گفتگو کے بعد وہ دونوں مجھے وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ انہیں فن سے بات کرنا تھی اور اسے اس پر راضی کرنا تھا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح فلم کو بچانا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ بھی ہیرو بن جاتا اور اخبارات کے تبصروں میں اس کا ذکر نمایاں انداز میں کیا جاتا اور یہ ذمے داری گوبر کے اشتہاری ایجنٹوں کی تھی کہ وہ اس موقع سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔

گوبر نے کولن کے کندھوں کے گرد اپنا بازو رکھا ہوا تھا۔ کولن نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا۔ تب مجھے شک ہونے لگا کہ اس تمام واقعے کے پیچھے اس کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ شروع میں ہونے والے ابتدائی واقعات بہ آسانی اسی کے کھاتے میں ڈالے جاسکتے تھے۔ اس نے کمالِ ہوشیاری سے کافی میں دست آور دوا ملائی اور چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کے سامنے اسے پی گیا۔ کوئی بھی شخص نہیں سوچ سکتا کہ وہ بھی یہ کافی پی سکتا ہے۔

اس کے باوجود فلم کی شوٹنگ جاری رہی تو اس نے دوسری کوششیں کرنا شروع کر دیں۔ شاید کبھی جیکسن نے اس کے سامنے شیخی بگھارتے ہوئے راجرز کی بیوی کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ کافی بنانے والے لڑکے کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنے سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اگر کولن کو اس تعلق کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا تو وہ راجرز کو بھی یہ بات بتا سکتا تھا۔ اس کے بعد اسے راجرز کو اکسانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ بس اس نے موقع کی مناسبت سے چند لفظ استعمال کیے ہوں گے۔ راجرز پہلے ہی بہت پریشان تھا اور کولن کی زبانی اپنی بیوی کی بے وفائی کا تذکرہ سننے کے بعد وہ سمندر میں کودنے کے لیے تیار ہوگیا۔

کولن دوبارہ گوبر کی طرف متوجہ ہوا اور دونوں سر جوڑ کر باتیں کرنے لگے۔ ممکن ہے کہ وہ تنخواہ کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔ میں گوبر کو اچھی طرح جانتا تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس نے اسے معمولی تنخواہ پر راضی کرلیا ہوگا۔ بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔

میرے خیال میں اس بات کی اہمیت نہیں تھی کہ سازش کا تانا بانا راجرز یا کولن میں سے کس نے تیار کیا تھا۔ بہرحال میرے اندازے کے مطابق کولن ہی اس کا ماسٹر مائنڈ تھا۔ سازش کی ابتدا اسی نے کی کیونکہ وہ فن کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جب اس کا کافی والا حربہ ناکام ہوگیا تو اس نے راجرز کو اکسایا کہ جیکسن کا کیریئر برباد کرنے کا اس سے اچھا موقع نہیں آسکتا اگر میں مداخلت نہ کرتا تو راجرز اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ فن ناتجربہ کاری کے سبب بلندی سے گر کر اپنی ہڈی پسلی تڑوا بیٹھا اور یہ فلم وہیں رک جاتی۔ اس طرح جیکسن سمیت بہت سے لوگوں کے خواب چکنا چور ہوجاتے۔

لیکن میری مداخلت کے باعث یہ سازش ناکام ہوگئی۔ راجرز کا کھیل ختم ہوگیا اور فلم دوبارہ بننا شروع ہوگئی۔ اب میرا وہاں رکنا بے کار تھا لہٰذا میں اپنے دفتر کی طرف چل پڑا۔ گوبر کی سیکریٹری کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس سے اسپرین کی دو گولیاں مانگ لوں کیونکہ شدید ذہنی مشقت اور سر پر لگنے والی چوٹ کے سبب میں بری طرح لڑکھڑا رہا تھا لیکن اس کا نخوت زدہ چہرہ دیکھ کر میری ہمت نہیں ہوئی۔ اب مجھے اس رقم کے چیک کا انتظار ہے جو گوبر نے اس خدمت کے عوض دینے کا وعدہ کیا تھا۔ شاید اس کے لیے مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑے جب گوبر کو مجھ سے کوئی دوسرا کام لینے کی ضرورت پیش آجائے۔

نکتہ گر

مختار آزاد

سوچوں کی گہرائی ناپنے کے لیے سوچ کے سمندر میں اترنا پڑتا ہے... وہ سوچوں کا بادشاہ تھا... سوچنا اور پھر سوچتے ہی رہ جانا... اس کا کمالِ فن تھا۔ کہانی کیا ہوتی ہے... اس کی بُنت کاری اور فنکاری کے جملہ لوازمات سے بھرپور ایک شاہکار فن پارہ... کہانی نویسی کے فن میں یکتائی کا دعویٰ کرنے والے مہاکلاکاروں کے لیے ایک نادر نسخہ...

سوچ کے گھوڑے پر سوار اپنے مطلوبہ ہدف کی جانب گامزن سوار کی پیش قدمی...
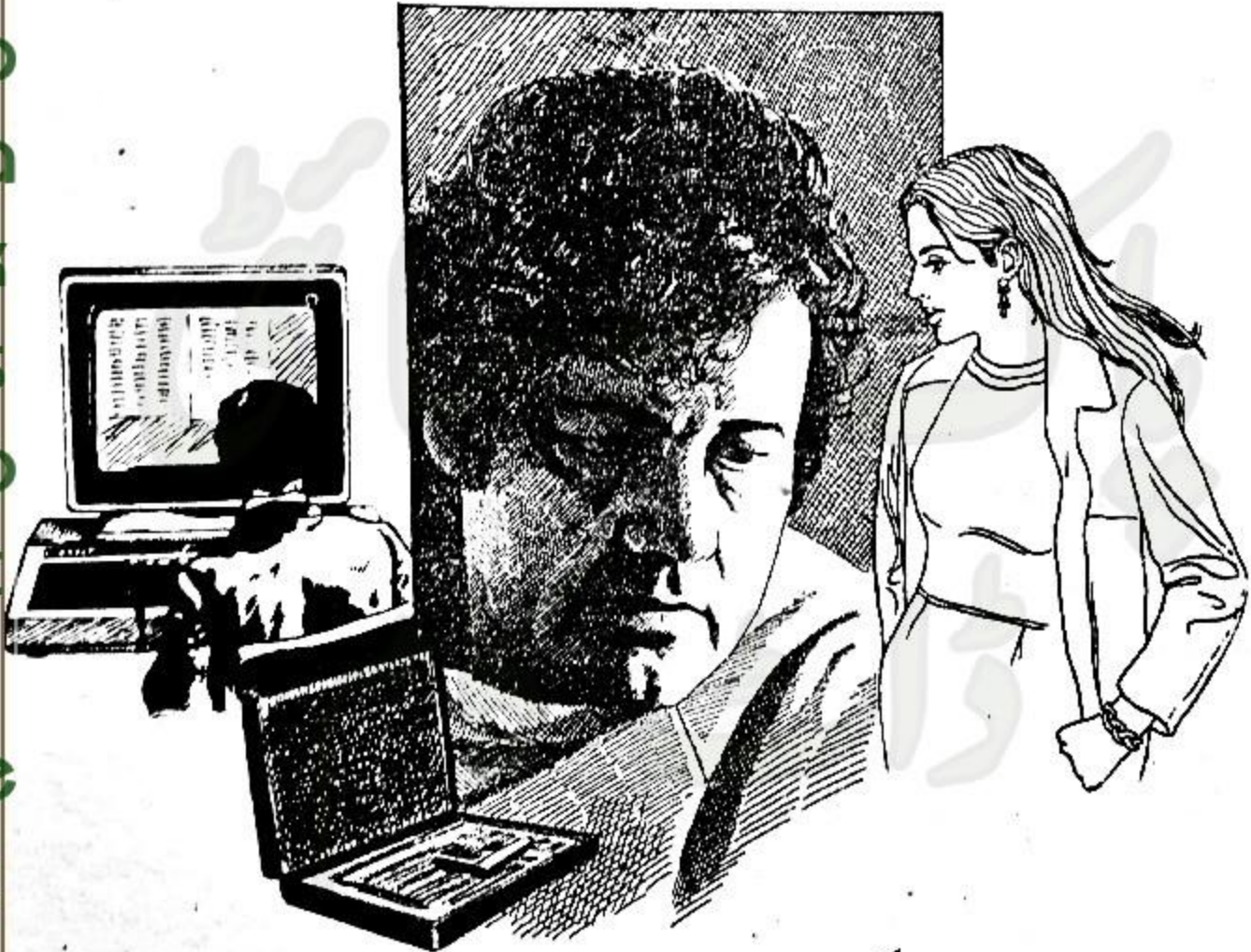
کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگلے ماہ کا کرایہ ادا کرنے کی صورت کیا نکل سکتی ہے، اسی دوران وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں رکھی اور اس پر گہری نظر ڈالی۔ میں اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ویسے بھی اس وقت کسی کے آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ دفتر کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ اس کے بعد ویک اینڈ شروع ہوجاتا۔

میں نے لمحہ بھر میں بھانپ لیا کہ اسے خوبصورت تو

ہرگز نہیں کہا جاسکتا البتہ اس کا حلیہ دلچسپ، کچھ کچھ مضحکہ خیز اور شاید اسی بنا پر قابلِ توجہ ضرور تھا۔ لمبے اور کھلے بال پلاٹینم رنگت کے تھے جو اس کے دونوں شانوں پر بکھرے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اصلی ہوں گے ہوسکتا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ اس نے سر پر ہیٹ اوڑھا ہوا تھا، جس پر مرغِ زرّیں کا ایک پنکھ بھی اٹکالیا تھا۔ ہیٹ کے ساتھ جالی دار فیشنی نقاب چہرے کو چھپائے ہوئے تھا حالانکہ اس کا پورا چہرہ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گلے میں بڑے بڑے مختلف رنگوں کے موتیوں کی کئی مالائیں لٹک رہی تھیں۔ شانوں پر چھوٹی سی تکونی سیاہ شال تھی۔ وہ بل کھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ لمحہ بھر رک کر مجھے دیکھا، سامنے رکھی کرسی کھینچی اور لہراتی ہوئی، ادائے ناز سے، ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ ویسے تو اس کا یوں بنا کہے بیٹھ جانا آداب کے خلاف تھا لیکن اس وقت مجھے کرایہ ادا کرنے کے سوا کسی اور بات کی چنداں فکر نہ تھی لیکن اس کی آمد کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی لاحق ہوگئی کہ ویک اینڈ شروع ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے اور ایسے میں کوئی نیا کام ہاتھ میں لینے کا مطلب اسے بھی داؤ پر لگانا پڑتا جو مجھے ہرگز منظور نہ ہوتا۔

''تو تم ہو مسٹر سلیڈ؟ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے لمحہ بھر میرے چہرے کو بغور دیکھا اور پھر بڑی ادا سے کھنک دار آواز میں پوچھا۔ اس کا لہجہ مخمور تھا، لگتا تھا گزشتہ شب کی چڑھی دخترِ انگور کا جادو اب تک اس کے سر سے اُترا نہیں۔

''بالکل بجا فرمایا۔'' میں نے گردن اس کی طرف جھکاتے ہوئے کہا۔ ''پرائیویٹ سراغ رساں... ملاقات کا وقت پیر سے جمعہ، صبح نو سے شام پانچ بجے۔'' اتنا کہہ کر گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے بالکل درست پہچانا، میں ہی سلیڈ ہوں، فرمایئے، کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی۔''

''وجہ ہوگی تو آئی ہوں اور ظاہر ہے یہاں ویک اینڈ پر آنے والے کسی ایمرجنسی میں ہوں گے۔''

''بالکل ٹھیک... میں خود ویک اینڈ کا پروگرام بنا رہا تھا۔''

''اوہ...!'' اس نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''میں تو صرف پروگرام بنا رہا تھا لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کے لیے تیاری بھی کرچکیں۔''

یہ سن کر وہ بڑے دلفریب انداز سے مسکرائی اور پھر معنی خیز انداز میں کہنے لگی۔ ''تو تمہیں ایسا لگتا ہے۔''

''شاید...'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''ویسے تم ویک اینڈ پر کیا کرتے ہو؟''

''وہی جو ہمیشہ کرتا ہوں۔ ہوٹل، ڈانس پارٹی، شاندار ڈنر، دوستوں سے ملاقاتیں اور کبھی کبھی کوکین بھی...''

''یہ کوکین والی بات بری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دستی بیگ کھول کر سگریٹ ہولڈر نکالا جو کم و بیش ایک فٹ کا تو ہوگا۔ اس کے سرے پر سگریٹ جمایا۔ اسے شاید اجازت طلب کرنے کی عادت نہ تھی یا کمرے میں سگریٹ کے پھیلے دھوئیں کو محسوس کرکے اس نے اجازت کی ضرورت نہ سمجھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ایش ٹرے میں رکھا سگریٹ اٹھائی اور گہرا کش لے کر دھوئیں دار فضا کو اور ذرا سا دھواں دار کردیا۔ اس نے سگریٹ ہولڈر کو لبوں سے لگاتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں نے ازراہِ تہذیب آگے بڑھ کر اس کی سگریٹ سلگائی۔ اس کے گہرے کش کے بعد کمرے کے دھوئیں میں مزید اضافہ ہوچکا تھا۔ ویسے جس ادا سے اس نے سگریٹ ہولڈر میں لگایا، میں سمجھ گیا وہ چاہتی ہے کہ میں ہی آگے بڑھ کر اسے سلگاؤں۔ یہ یورپ کی فیشنی عورتوں کا انداز خاص تھا۔ ویسے وہ مجھے چہرے مہرے سے جرمن لگ رہی تھی۔

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ وہ جمعے کا دن تھا۔ میں اس بار ذرا مختلف انداز سے ویک اینڈ منانا چاہتا تھا۔ گزشتہ مہینوں سے درپیش مالی مشکلات اور بے کاری نے مجھے خوامخواہ تھکا دیا تھا۔ لگتا تھا ذہن بھی کام نہ ہونے کے باعث سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں ایک طرف رکھ کر آرام کرنے جاچکا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ طائرانہ نظروں سے دفتر کا جائزہ لیتی کش پہ کش لیے جارہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بے وقت آمد کا مطلب ہے بے وقت کی پریشانی لیکن اس کی خاموشی خود مجھے پریشان کیے جارہی تھی۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ 'سلیڈ پرائیویٹ سراغ رساں سروس' کے دفتر میں اس کی آمد کا مقصد کیا ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی اور دن ہوتا تو میں اس پر ہرگز نہ سوچتا لیکن یہ ہفتے کا آخری دن تھا۔ ابھی مجھے یہ فیصلہ بھی کرنا تھا کہ شہر کے کس مضافاتی حصے میں، کہاں پُرسکون ویک اینڈ گزارا جاسکتا تھا۔

یہاں تک لکھنے کے بعد میں رکا۔ کافی دیر تک کی بورڈ پر بنار کے انگلیاں چلانے سے بازوؤں میں کھنچاؤ آنے لگا تھا۔ میں نے پرنٹر کو کمانڈ دی اور اب تک جو لکھا تھا، اس کا پرنٹ نکال کر نظریں دوڑانے لگا۔ یہ میرے نئے ناول

کا آغاز کا تھا جس کی کہانی چالیس کی دہائی کے پس منظر میں تھی۔ دو باتیں میرے ذہن میں کھٹک رہی تھیں: اس عورت کی مسکراہٹ کس طرح کی بیان کروں اور کیا سگریٹ ہولڈر کی لمبائی ٹھیک لکھی تھی یا اسے کچھ کم کر کے، بناوٹ پر مزید روشنی ڈالی جائے۔

میں نے دو چار فقرے درست کیے، تھوڑی سی کاٹ چھانٹ کی اور کاغذ ایک طرف رکھا۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے کمپیوٹر کے دور میں لکھنا شروع کیا ورنہ جتنی کاٹ چھانٹ کرتا ہوں اگر ٹائپ رائٹر پر لکھنے کا زمانہ ہوتا تو شاید میرے لیے اتنا زیادہ لکھنا ممکن نہ ہوتا لیکن اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ میرے بارے میں پبلشرز کی رائے ہے کہ زود نویس ہوں اور کمپیوٹر نے میرے لکھنے کی رفتار کو مزید بڑھا دیا ہے۔ ویسے یہ غلط بھی نہیں۔ اس سے اشاعت میں جتنی تیزی آئی ہے، اس سے، کم از کم میرے لیے تو کمائی کے راستے زیادہ آسان ہوئے ہیں۔ اسی لیے میں لکھتے ہوئے کمپیوٹر کی فراہم کردہ تکنیکی سہولیات سے بھرپور استفادہ کرتا ہوں اور لکھنے کے بعد بہ آسانی کاٹ چھانٹ کرتا رہتا ہوں۔ شاید اسی لیے میں کہانی کی جزئیات پر بھرپور توجہ دیتا ہوں۔ میری کہانیوں میں جزئیات نگاری اور فقروں کی ساخت بہت مضبوط ہوتی ہے۔ ویسے بھی میں لکھنے سے پہلے تحقیق اور کیفیات کو محسوس کرنے کے لیے مشاہدے پر کافی وقت خرچ کر دیتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ اگر ایک بار مکالمہ لکھ دیا تو وہ ویسا ہی رہے۔ نظرثانی کرتے ہوئے بعض اوقات بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔

میری کہانیوں کی بنت مضبوط پلاٹ پر ہوتی ہے اور یہاں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں کہانی لکھتے ہوئے کئی ناولوں کو اپنے ذہن میں گھماتا پھراتا رہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہی میری کامیابی کی دلیل ہو۔ اس وقت بھی چالیس اور پچاس کی دہائیوں میں لکھے گئے 'سہانا سپنا'، 'الوداع' اور 'میرے پیارے' جیسے دوسرے درجے کے مقبول ترین ناولوں کے بہت سارے مناظر زور وشور سے دماغ میں کلبلا رہے تھے، جن میں سے کچھ کو تو میں اپنے الفاظ کا پیراہن پہنا کر اپنا بھی چکا تھا۔ وہ مناظر اب اُن ناولوں سے نکل کر میری کہانی کی ملکیت بن چکے تھے۔

میرے پرستار چاہے اس سے متفق نہ ہوں لیکن میرا ایسا خیال ہے کہ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی کے لکھنے والے جذبات سے عاری اور حقیقت کے برخلاف کچھ عجیب سی تصوراتی کہانیاں تخلیق کرتے رہے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی تخلیقات سے لمبا مال کمایا۔ اس دور کے کچھ لکھنے والے تو اتنے دولت مند ہوئے کہ مرنے کے بعد آج بھی ان کا پیسا بینکوں میں منافع پر منافع دیے جا رہا ہے۔ صرف لفظوں کی کاریگری اور سوداگری کے ذریعے انہوں نے پُرآسائش زندگی بسر کی تھی۔

ویسے میں بھی زود نویس مصنف ہوں۔ ڈھائی سو صفحات کا ایک ناول صرف ایک مہینے میں لکھ سکتا ہوں۔ ایک ہفتہ نظرثانی کے لیے درکار ہوتا ہے، اس کے بعد پیپر بیک اور کم قیمت ناول قارئین کے ہاتھوں میں۔ سچ کہوں تو اس طرح کے عامیانہ ناول، معاف کیجیے یہ نقادوں کی آرا ہے، لکھ لکھ کر میں کئی برسوں سے بڑے سکون سے خوش حال زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ویسے میری مالی خوش حالی کا راز یہ ہے کہ میرے لکھے بہت سارے ناول دوسروں کے نام سے چھپ کر انہیں ناول نگاروں کی قطار میں کھڑا کر چکے ہیں۔ یہ وہ دولت مند ہیں جو ایک پیراگراف تو چھوڑیے، ڈھنگ سے ایک فقرہ تک نہیں لکھ سکتے مگر میرے ناولوں نے انہیں پیرس، لندن اور جرمنی تک کے دوسرے درجے کے ادبی حلقوں میں متعارف کرا دیا اور اب وہ اس خریدی گئی شہرت سے، خواتین پرستاروں کے جمگھٹ میں بیٹھ کر، مجھے دی گئی دولت اور بدلے میں لی گئی شہرت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ادبی دانشوری جھاڑتے ہیں۔

غربت زدہ بچپن اور فاقہ مست جوانی نے مجھے دولت کی اہمیت بہت پہلے بڑی اچھی طرح سمجھا دی تھی۔ مجھے درجہ اول کا ناول نگار بننے کا جنون تھا۔ میں اپنے ناولوں کی بنیاد پر عالمی ادب میں مقام حاصل کرنے کا خواہاں تھا لیکن بھوک بری بلا ہے۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا سودا روٹی سے کیا۔ ادب کی تاریخ میں زندہ رہنے سے زیادہ حال کی دنیا میں انسانوں کے بیچ زندہ رہنا زیادہ اہم ہے۔ میرے اس فیصلے سے مالی آسودگی تو بہت حاصل ہوئی لیکن اندر کے ادیب کی تشنگی برقرار تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اسے بھوک نہیں لگتی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بھی میرا ہمنوا ہوتا۔

خیر! بات کر رہا تھا ناولوں کی منظر نگاری کی۔ میری کہانیوں میں پُرتعیش ماحول بنیاد ہے۔ میں الفاظ سے ایسی منظر کشی کرتا ہوں کہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پڑھنے والا قاری بھی خود کو رُوسائے پیرس کے درمیان محسوس کرتا ہے۔ شاید یہ

سب کچھ لکھنے کا نفسیاتی پہلو یہ بھی ہو کہ اس طرح میں اپنے اندر کی گھٹن اور غربت زدہ فاقہ مست جوانی کی اُن محرومیوں کو باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہوں، جن کا مداوا اب شاید ممکن نہیں۔

بات جو بھی ہو، ماضی کے برعکس اب میری زندگی مالی لحاظ سے خوش حال ہے، لہٰذا میری طرح میرے کردار بھی خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں اور میری طرح ان کا حلقہ احباب بھی بہترین اور مہذب لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اب میرے اسی ناول کو لے لیں۔

سلیڈ کا حسب نسب بہت اعلیٰ تھا۔ وہ عظیم ڈیوک فلپ مارلو کا شکستہ حال پڑپوتا ہے لیکن نوابی شان اس کے خون میں رچی بسی ہے۔ اسے گھر کا کرایہ دینا ہے لیکن اس کے باوجود جھے کو ممکنہ کلائنٹ دیکھ کر وہ سوچتا ہے کہ کہیں یہ عورت اس کا ویک اینڈ غارت نہ کردے۔ اسے اپنی خالی جیب سے زیادہ ویک اینڈ کو سیر و تفریح میں گزارنے کی روایت زیادہ پیاری ہے۔

میرے کردار وہی ہیں، جن سے میرا عملی زندگی میں واسطہ پڑا۔ کرداروں کو سوچتے سوچتے، سچ کہوں تو میں حقیقی زندگی میں بھی، دنیا کو انہی کی نظر سے دیکھنے لگا ہوں۔ میری زندگی نے بہت سے طوفان دیکھے، بڑے بڑے نشیب و فراز میری راہ میں آئے اور تمام تر کرداروں ... نے دراصل انہی واقعات سے جنم لیا ہے۔ حد یہ ہے کہ فلپ مارلو میری زندگی پر اس حد تک غالب آچکا کہ اب اس سے چھٹکارا شاید ممکن نہیں۔ جب بھی لکھتے لکھتے کہیں اٹک جاتا ہوں یا حقیقی زندگی میں کوئی مشکل پیش آجائے تو سوچتا ہوں کہ اگر فلپ مارلو کو ایسی صورت حال درپیش ہوتی تو وہ کیا کرتا۔ اگرچہ یہ میرا تخلیق کردہ کردار ہے لیکن حقیقی زندگی میں یہ میرا ایک ہمدرد بوڑھا دوست تھا۔ اسٹاک مارکیٹ کا وہ بروکر کبھی بہت دولت مند تھا لیکن زمانے کے سرد و گرم نے اسے سڑک پر پہنچا دیا تھا۔ میری بھی اس سے ایک سڑک کنارے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتوں نے ہمیشہ مجھے سوچنے سمجھنے کی طاقت بخشی۔ وہ دوست تو دنیا سے چلا گیا لیکن اس کی شخصیت کو میں نے فلپ مارلو کے کردار میں ڈھال دیا۔ جب کبھی کسی مشکل کا سامنا ہوتا ہے، میں اپنے کردار کے سامنے مسئلہ بیان کرتا ہوں اور پھر اس کے انداز میں سوچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سچ کہوں تو اکثر اس کی طرح سوچنے سے مجھے اپنی پریشانی کا حل مل جاتا ہے۔

فلپ تو ایک طرف، اس سے فرار ممکن ہی نہیں لیکن میرے دوسرے کردار، خواہ اچھے ہوں یا برے، کسی طور بھی کم اہمیت کے حامل نہیں۔ جب سے میں نے ناول نگاری اور کہانیوں کو اپنی روزی روٹی کا بنیادی ذریعہ بنایا ہے، تب سے میرے کردار میرے حواس پر آہستہ آہستہ اس قدر سوار ہو چکے ہیں کہ اب تو کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ وہ سب میرے اندر منڈلی جمائے بیٹھے ہیں۔ جب کوئی کردار چاہتا ہے، اچھل کر نکلتا ہے اور میرے وجود پر قابض ہو کر اپنا حکم چلانے لگتا ہے اور پھر میں، میں نہیں رہتا، وہ ہو جاتا ہوں۔

میں نے نئے ناول 'زہریلی عورت' کا پہلا صفحہ لکھ لیا تھا لیکن اس پر غور کرتے کرتے سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہونے لگا۔ میں نے کاغذ ایک طرف رکھا اور کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں لیکن دماغ بدستور چل رہا تھا۔ میں 'زہریلی عورت' پر غور کر رہا تھا۔ نئے ناول کو لکھنا تو شروع کر دیا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ اسے لکھنے پر اندر سے خوش نہ تھا۔ اب تک میں اپنے اس کردار کا نام تک منتخب نہیں کر سکا جسے اس میں کلائنٹ کا کردار ادا کرنا تھا۔ یہ ایک اور مسئلہ تھا۔ مجھے ہمیشہ اس طرح کے مسائل درپیش رہتے ہیں۔ میں اب تک لکھے گئے بعض فقروں سے بھی مطمئن نہ تھا۔ انہیں از سرِ نو لکھنے پر سوچ بچار کر رہا تھا۔ میں نئے ناول میں کی گئی منظر کشی کا موسم بھی اب تک طے نہیں کر پایا تھا۔ بتاتا چلوں کہ ہر ناول لکھتے وقت میری کوشش یہی رہتی تھی کہ کہیں بھی ایسا ابہام نہ پیدا ہو جس سے قاری کے ذہن میں الجھنیں جنم لیں۔ میرا خیال ہے کہ مطالعہ کرتے وقت قاری کو پانی کے بہاؤ کی طرح بنا کسی رکاوٹ، اپنی رفتار سے آگے بڑھتے رہنے کا پورا حق حاصل ہے اور یہ حق اسے دیتا ہے ناول نگار، ناول لکھتے وقت۔

میری کوشش رہتی تھی کہ منظر، مکالمے اور سچویشن اس طرح بیان ہوں کہ قاری تسلسل سے آگے بڑھے۔ مجھے اس طرح کے ادیبوں سے چڑ ہے جو صورت حال کو اس طرح پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ قاری دن بھر میں بمشکل ایک صفحہ پڑھ پاتا ہے اور ہر فقرے پر وہ یوں اٹکتا ہے جیسے کانٹوں سے دامن چھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔ یہ اور بات کہ میرا خیال ہے میں ایک عظیم ادیب ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کوئی مشہور ادیب نہیں اور نہ ہی شاہکار ادب پارے تخلیق کرتا ہوں مگر پھر بھی لکھتے ہوئے کئی بار خود سے یہ پوچھتا رہتا ہوں کہ کہانی میں کہیں کوئی الجھاؤ تو نہیں

آ رہا، کوئی پیچیدگی تو جنم نہیں لے رہی لیکن میرے نئے ناول کے کردار سلیڈ کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ اس کا تو کام ہی خطرات سے اُلجھنا اور نمٹنا تھا۔ ویسے بھی وہ سابق پولیس افسر تھا۔ اس کردار کی بس ایک ہی بری عادت تھی۔ وہ عیش و آرام کا دلدادہ اور پیتے رہنے کا شوقین تھا چاہے وہ سگریٹ ہو یا پھر بوتل۔

لیکن اس وقت میری توجہ اس پر نہیں بلکہ ناول کی قاتل حسینہ اور ہیروئن ایمی پر تھی، جسے مجھے ایمی کے نام سے آگے لے کر چلنا تھا۔ یہ کردار بھی حقیقی زندگی سے متعلق ہی تھا۔ ایمی کا کردار میں نے ایلے جانسن سے اخذ کیا تھا۔ وہ میرے دشمن اور ظاہری دوست، مسٹر پبلشر کی پرائیویٹ سیکریٹری تھی۔ وہ ایک بار اس کے پاس اپنے ناول کا مسودہ لے کر آئی اور پھر اس کی ملازمت اختیار کر بیٹھی تھی۔ وہ اس کے ہر کچے چٹھے سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایمی میری ایک اچھی دوست بھی تھی اور ایک اچھی انسان بھی۔ اگر میں نے کبھی شادی کے متعلق سوچا تو پھر جس سے کروں گا، وہ ایمی ہی ہوگی۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی لیکن مسٹر پبلشر سے ڈرتی ہے۔ دراصل وہ نہیں چاہتا کہ ایمی کسی کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے، خاص طور پر میری طرف۔ اگرچہ وہ خود اس سے نالاں تھی مگر بے روزگاری کے خوف سے اس کے ہر حکم پر بنا چون چرا اس کی تعمیل کرتی رہتی ہے۔

خیر! اس وقت وہ میرے مسٹری ناول کی ایک ایسی ہیروئن ہے جسے نشے کی لت ہے۔ اس کا تعلق مالدار خاندان سے ہے۔ گھر والے اسے ویسٹ گیٹ کے بحالی مرکز میں داخل کراتے ہیں تاکہ نشے کی لت چھڑوائی جاسکے۔ یہاں ایمی بہت جلد مسٹر ڈینیل بیکر کے نزدیک ہوجاتی ہے جو دراصل اس مرکز کا مالک ہے۔ ایمی اس پر یہ ثابت کردیتی ہے کہ اس کی حالت سنبھل چکی اور اب وہ انسانی خدمت کے نام پر یہاں داخل لوگوں کی دیکھ بھال کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح وہ بحالی مرکز کی مریض سے نرس بن جاتی ہے اور اونچی ہیل سے کھٹ کھٹ کرتی دن بھر اِدھر سے اُدھر پھرتی رہتی ہے۔ اس دوران وہ ڈینیل کے ایسے راز بھی جان لیتی ہے، جن سے اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ مرکز کی آڑ میں اس کا اصل دھندا کیا ہے۔ اونچی ہیل کی کھٹ کھٹ، ناول میں اس نرس کی پہچان بنتی جارہی تھی۔

میں نے ناول کے تعارفی صفحات کے جو نوٹس تیار کیے تھے، انہیں پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ فقرہ نگاہوں کے سامنے تھا۔ 'سائمن میں نے تمہارے لیے ایک نوکری دیکھی ہے اگر تم کرسکو تو۔' میں نے فقرے کو دو تین بار پڑھا۔ میرا خیال تھا کہ سائمن کا کردار زیادہ بڑا کردار نہیں، اس کی گفتگو تو کسی بھی طرح چل سکتی ہے۔ قاری کے نزدیک اس کے مکالموں کی اہمیت ویسے بھی زیادہ نہیں ہوگی لیکن فوراً خیال آیا کہ ممکن ہے میں غلط سوچ رہا ہوں۔ سائمن کا کردار میں نے اوائل جوانی میں اپنی بے روزگار زندگی سے اخذ کیا ہے۔

اُف... آخری فقرہ خاصا بے تکا لگا۔ 'میں بوڑھے ریمنڈ کو اُس روز پھر وہاں لانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں اس کے قتل کی منصوبہ بندی تھی۔' بہرحال، یہیں سے میری توجہ کا محور بدل کر دوسرے منظر کی طرف ہوگیا۔

وہ تیسرے درجے کی عامیانہ فلموں میں دکھائے گئے منظر جیسا تھا... محفلِ ناؤنوش، رقص، بے فکری، ہلڑبازی، بس یوں سمجھ لو جیسے کسی گھٹیا سے کلب کا منظر ہو۔ اس کے ساتھ ہی امیر لوگوں کے کلب کا ماحول بھی ذہن میں متوازی گھوم رہا تھا۔ بے تحاشا دولت سے بھرے بڑے بڑے بریف کیس، قیمتی شراب، خوشبوؤں کے بھبکے، قیمتی سگار کے اٹھتے دھوئیں کی خوشگوار مہک، جوا اور داؤ پر لگی بھاری رقمیں، جہاں موجود تھا ڈینیل بیکر، ویسٹ گیٹ کا بحالیٔ مرکز اور اس سے منسلک نرسنگ ہوم کا حریص مالک۔

ڈینیل کا کردار دراصل میرے پبلشر کی شخصیت تھی۔ وہ بہت خبیث انسان تھا۔ میرے ناولوں کو مجھ ہی سے اونے پونے داموں پر خرید کر دوسروں کے نام سے شائع کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا۔ میرے ناولوں کے سارے گاہک دراصل وہ دولت مند تھے جنہیں سب کچھ کرنے کے بعد بطور ادیب معاشرے میں مقام بنانے کا شوق چرایا تھا۔

میں ڈینیل کے کردار میں اسی پبلشر کی پوری شخصیت عیاں کرنا چاہتا تھا۔ بحالی مرکز میں آنے والے مریض بھاری جیبوں کے مالک تھے جنہیں ہلکا کرنے کے لیے اس نے پورا بندوبست کر رکھا تھا مگر وہ بہت کنجوس تھا۔ اس نے بہت تھوڑی تنخواہ پر ملازم بھرتی کیے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو دولت اس تک پہنچے وہ کسی صورت وہاں سے نکل سکے مگر ملازمین کی تنخواہ مجبوری تھی اور وہ یہ کڑوا گھونٹ بہت مشکل سے بھرتا تھا مگر کم اُجرت کے ذریعے وہ پھر بھی رقم بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ ملازمین کی چھٹی کے پیسے کاٹتے ہوئے اسے بہت خوشی ملتی تھی۔

ناول میں اس کردار کو ایمی کے حوالے سے بیان کرنا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ ڈینیل آسانی سے پریشان ہوجانے والا شخص نہیں۔ وہ ہر شے کی قیمت بل میں شامل کردیتا تھا لیکن کوشش ہوتی تھی کہ سہولت دینے کے نام پر اس سے کچھ مانگا نہ جائے۔ ایک دو بار جب ایمی نے بحالی مرکز میں آنے والے مریضوں کو دی جانے والی سہولتوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہا تو پہلے اس نے سنی ان سنی کردی لیکن جب ایمی کا اصرار بڑھنے لگا تو ایک دن یہ سن کر اس نے پہلے تو اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور پھر بنا جواب دیے آگے بڑھ گیا۔ اس کے لیے شاید یہ معمول کی شکایت ہوگی۔ اسے یقین تھا کہ اس رویے کو دیکھ کر وہ آئندہ کچھ کہنے سے گریز کرے گی۔ یہی وہ نکتہ تھا، جہاں سے ایمی اس کی مخالف ہوگئی۔

اصل بات یہ ہے کہ حقیقی زندگی میں ایک دو بار ایمی ...... نے اپنے پبلشر باس سے کہا تھا کہ وہ غیر معروف مصنفین سے ناول خرید کر دوسروں کو فروخت کرنے کا سلسلہ ترک کرکے، نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کرے۔ ان کے ناول انہی کے نام سے شائع کرے اور مناسب رائلٹی بھی ادا کرے۔ یہ مشورہ اسے پسند نہیں آیا۔ بس! یہی بات اب میں بحالی مرکز کی آڑ لے کر بیان کرنے جارہا تھا۔

آگے کے کرداروں میں ریمنڈ تھا، ایک بہادر پولیس افسر جو انتہائی درجے کا ذہین بھی تھا۔ آگے چل کر اسے بھی کہانی میں شامل ہونا تھا۔ یہ کردار بھی حقیقی زندگی سے متعلق تھا اور اتفاق سے میرا پڑوسی بھی۔ اسی وجہ سے اس کی شخصیت کو گہرائی سے سمجھنے کا موقع ملا۔ ایک اور کردار، کرائے کا قاتل مارک تھا۔ میں اسے بھی جانتا تھا۔ اگر کبھی کسی سے انتقام لینے کا موقع آیا تو شاید میں اس کی خدمات حاصل کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یہ کام بہت عمدگی سے کرے گا۔ لڑکپن میں ایک بار چوری کے الزام میں ایک سال جیل بھگتی تھی، وہیں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ رہائی کے بعد بھی ہم اچھے دوستوں کی طرح رابطے میں رہے۔ اب بھی کبھی کبھار ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ ایک اور بات! میرے اور ایمی کے درمیان ایک مفاہمت طے پاچکی تھی۔ ہم دونوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ نوآموز اور نسبتاً نئے مصنفین کے ساتھ اس نے جو زیادتیاں بطور پبلشر کی ہیں، ان کی سزا ضرور دیں گے۔

بطور پبلشر اس نے زیادتیوں کی حد ہی پار نہیں کی تھی بلکہ ان کے کندھوں پر سوار ہوکر وہ دولت میں کھیلنے لگا تھا۔ وہ اُن میں سے تھا جو ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر دولت کے سہارے زندگی کو آسان بنانے کی سوچ رکھتے ہیں۔ میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ لگ بھگ گزشتہ بیس برسوں کے دوران وہ کہیں سے کہیں جا پہنچا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پبلشنگ کمپنی ایک آڑ ہے۔ اس پردے میں وہ کئی طرح کے دونمبری کام بھی کرتا ہوگا۔ اس کا حلقۂ احباب میرے شک کی تصدیق کرتا تھا۔

تخیل کے اعتبار سے وہ میرے لیے خاصا خشک دن تھا۔ دماغ بھرپور صلاحیت کے ساتھ آگے بڑھنے کے بجائے جگہ جگہ اٹک رہا تھا۔ الفاظ کے چناؤ اور استعمال میں میرا دماغ بہت چلتا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ جو بات کم الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہو، اس پر ضرورت سے زیادہ الفاظ ہرگز خرچ نہیں ہونے چاہئیں لیکن اس دن لگتا تھا کہ دماغ کے سوتے واقعی خشک پڑ گئے ہیں۔ اچانک ایک بار پھر ڈینیل میرے دماغ میں گھس گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس کو قتل کرادیا جائے تو یہی سب سے اچھا ہوگا۔

میں اب اپنے اس مسٹر پبلشر کو ڈینیل ہی کہوں گا۔ سوچنے لگا کہ اگر مارک کو کہوں تو وہ میرا یہ کام کردے گا اور شاید دوستی کے ناتے مجھ سے فیس بھی کم لے لیکن مجھے یہ خیال بہتر نہ لگا۔ اس سے رابطہ تبھی کیا جانا بہتر ہے، جب ڈینیل کو راہ سے ہٹانے کا کوئی اور راستہ نظر نہ آئے۔ اس دوران مجھے شدید تھکن محسوس ہونے لگی۔ لگتا تھا جیسے کندھوں میں کھنچاؤ ہونے لگا ہو۔ ویسے تو میں دن میں پینے سے گریز کرتا ہوں مگر وہ دن خاصا بور تھا۔ لگتا تھا جیسے دماغ سو رہا ہو۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھا اور گلاس بھرا۔ یہ دوپہر سے پہلے تک کا تیسرا گلاس تھا۔ میرے لیے یہ خلافِ معمول بات تھی۔

اسی دوران اچانک ذہن میں جھماکا ہوا۔ آج شام مجھے ایک پارٹی میں شرکت کرنی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا دعوت نامہ اٹھایا۔ یہ پارٹی ڈینیل نے شہر کے معززین کے اعزاز میں دی تھی۔ دراصل اب وہ کانگریس کے الیکشن میں حصہ لینے کا سوچ رہا تھا اور یہ پارٹی بھی اسی سلسلے کی ابتدا تھی۔ اس نے مجھے فون بھی کیا تھا اور نئے ناول کا مسودہ بھی ساتھ لانے کی ہدایت کی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ ایک گاہک ہے، اچھے دام مل جائیں گے۔ وہ رقم پارٹی میں ہی لے کر آرہا ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے، رقم بھی بڑی ملے گی۔

مجھے لگا اب وقت آچکا کہ ڈینیل کا کام تمام کردیا جائے۔ میں شدت سے اس کی زندگی کا باب ختم کرنے پر

غور کر رہا تھا۔ اس دوران مجھے سلیڈ کا خیال آ گیا۔ وہ ناول کا مرکزی کردار تھا۔ وہ جدت پسند تھا۔ اسے آلۂ قتل میں پستول کا استعمال سب سے بہتر لگتا تھا۔ سلیڈ اپنا پستول ہمیشہ بریف کیس میں رکھتا تھا، جسے وہ کسی معزز بزنس مین کی طرح ہاتھ میں تھامے کہیں بھی جا سکتا تھا۔ مجھے یہ آئیڈیا اچھا لگا۔ آلۂ قتل بریف کیس میں رکھا ہونا چاہیے۔

میرے پاس ایک بریف کیس تھا جس میں میرے شائع شدہ تازہ ترین ناول 'آدھی رات کا ایک منٹ' کے مسودے کی کاپی رکھی تھی۔ میرے پاس اعشاریہ تین آٹھ کا آٹومیٹک پستول بھی تھا۔ جو کچھ میں نے سوچا اس پر عمل درآمد کے لیے یہ دونوں چیزیں کارآمد تھیں۔ میں نے اس آئیڈیا کو اپنا لیا۔ یہ دونوں چیزیں نیچے تہ خانے میں رکھی تھیں۔ میں اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ میرا منصوبہ مکمل اور بے داغ تھا، بس! اس پر مرحلہ وار عمل کرنا باقی تھا۔

☆☆☆

مجھے اعتراف ہے کہ گھر سے نکلتے وقت تھوڑا سا پریشان ضرور تھا لیکن اس کے باوجود نئے آئیڈیے پر عمل کے لیے خود کو متفق کرنے کے بعد بڑی حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ اُس وقت میں خود کو مکمل طور پر تبدیل شدہ حالات میں پا رہا تھا۔ اپنے پچھلے ناول کے اہم کردار مارکیز کی طرح میں بھی اُس وقت نفیس لباس میں ملبوس تھا۔ بال عمدگی سے برش کیے ہوئے تھے۔ جوتے گرد سے پاک اور چم چم کر رہے تھے۔ ویسے میں اس وقت ڈینیل کے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جیسا سوچا ہے، ویسا ہی ہوگا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پارٹی کا وقت ہو چلا تھا۔

ایمی نے مجھے بتایا تھا کہ ڈینیل کی یہ پارٹی اُس کے سوچے سمجھے منصوبے کی ابتدا ہے۔ پیسے کی ہوس اب اسے طاقت ور بننے پر اُکسا رہی تھی۔ وہ کانگریس کی رکنیت کے لیے الیکشن لڑنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے مقامی دو نمبری ساتھیوں کے لیے بھی یہی اچھا ہوتا کہ کسی طرح وہ کانگریس میں پہنچ جائے۔ ایک دو نمبری ہی دوسرے دو نمبریوں کے مفادات کا دفاع زیادہ مناسب اور بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ اگر میں یعنی دو نمبر کا ادیب اپنا ووٹ اس کے پلڑے میں ڈال دوں تو اس سے اُس کا وزن بڑھ سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں زیر لب مسکرا دیا۔ مرنے کے بعد واقعی انسان کا وزن بڑھ جاتا ہے اور اب میں اس کا وزن بڑھانے ہی جا رہا تھا۔

ڈینیل کا گھر بہت شاندار تھا۔ وسیع و عریض رقبے پر بنا وہ ایک چھوٹا سا محل نما تھا۔ بڑے بڑے لان اور ان میں لگے چیری کے درخت، کئی گیراج اور ان میں کھڑی قیمتی گاڑیاں، سوئمنگ پول۔ گھر کی دو منزلہ سفید عمارت اور اس میں لگی بڑی بڑی کھڑکیاں، جن پر نظر پڑتے ہی ڈینیل کی بے تحاشا دولت کی ایک جھلک نظر آجاتی تھی۔ میں گیٹ پر پہنچا۔ اطلاعی گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد الیکٹرانک گیٹ کھلا۔ کار آگے بڑھائی۔ پورچ میں اترا اور سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہوا تو باوردی گھریلو ملازم نے بغلی کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ اس طرح کے کمرے مہمانوں کا سامان عارضی طور پر رکھنے کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔

میں نے بریف کیس ریک پر رکھ کر اوورکوٹ کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ ریک میں دو بریف کیس پہلے سے ہی رکھے تھے۔ میں نے ان پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور بے پروائی سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔

ڈینیل لمبوترے چہرے، نکیلی ناک، کسی سرجن کے نشتر کی طرح ابھرے گالوں کی ہڈیوں والا بے کشش انسان تھا لیکن اس کی دولت نے تمام تر بدصورتی پر پردے ڈال دیے تھے۔ اگرچہ میں خمار میں تھا لیکن پھر بھی اتنا ضرور سوچ سکتا تھا کہ اس نے شاندار پارٹی کا انتظام کیا ہوگا۔ ویسے بھی یہ پارٹی اسے سیاسی رہنما بنانے کی طرف پہلا قدم تھی۔

میں ہال میں داخل ہوا تو لمحہ بھر کے لیے دروازے میں رک کر منظر پر نظر ڈالی۔ پارٹی چل رہی تھی۔ سب مگن تھے۔ وہاں مقامی سیاستدانوں، کاروباری لوگوں اور دولت کے پجاریوں کا ہجوم تھا۔ جیسے ہی آگے بڑھا، میرے برابر سے گزرتے ویٹر نے سر جھکا کر مشروبات کی ٹرے پیش کردی۔ میں نے گلاس اٹھایا اور دو گھونٹ بھر کر مہمانوں کے درمیان سے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس طرف چلا جہاں ڈینیل ایک چھوٹے سے ہجوم میں گھرا کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ہال سے باہر نکلنے کا ایک دروازہ بھی تھا۔ مجھے اپنے منصوبے پر عمل کے لیے کسی ایسے مقام کی ضرورت تھی جہاں سے فوراً کھسکا جاسکے۔ ویسے ٹرے سے گلاس اٹھاتے وقت ہی میں نے منصوبے پر عمل درآمد کی ابتدا کردی تھی۔ یقین تھا کہ بس چند منٹ کی بات ہے، اس کے بعد مجھے موقع مل جائے گا۔

میں ڈینیل کو قتل کرنے جارہا تھا یا یوں کہیں کہ جہاں پارٹی ہورہی تھی، وہاں کچھ ہی دیر میں اُس کے قتل کے فوراً بعد افراتفری مچنے والی تھی۔ میں طے کرچکا تھا یہ شام اس کی زندگی کی آخری شام ہوگی۔ مجھے موقع کی تلاش تھی جو جلد ہی مجھے ملنے والا تھا۔ اس وقت میں پیشہ ور قاتل مارک کے ذہن سے سوچ رہا تھا۔ گلاس میں ملائی گئی دوا کو پینے والے پر تشنج کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ وہ زمین پر گر پڑتا۔ جس کے بعد مجھے یقین تھا کہ پارٹی میں افراتفری مچتی اور اس دوران موقع مل جاتا۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سائلنسر لگا جدید ساخت کا خودکار پستول اپنا کام کرنے کے لیے تیار تھا۔

ابھی میں خارجی دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک ہلکی سی چیخ کانوں سے ٹکرائی جسے سن کر میں پلٹا۔ ایک شخص ماربل کے فرش پر اوندھا گرا تھا۔ اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا تھا۔ اس کے منہ پر شدید کرب کے آثار تھے، وہ کچھ کہنے کی کوشش کررہا تھا مگر الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکل پارہے تھے۔

ڈینیل اور ایمی جلدی جلدی اس کے قریب پہنچے۔ ”کیا تم اپنے دونوں بازو اوپر اٹھا سکتے ہو؟“ ڈینیل نے اس سے پوچھا۔

فرش پر گرے شخص نے کوشش کی مگر وہ انہیں اوپر نہ اٹھا سکا۔

”کیا تم اپنا نام بتا سکتے ہو؟“ ڈینیل نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔

جواب میں وہ کچھ بڑبڑایا ضرور لیکن کیا کہا، یہ کوئی سمجھ نہ سکا۔

ایمی کا فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے سنا وہ کہہ رہی تھی ”ایمبولینس بلاؤ، ممکن ہے اسے دل یا مرگی کا دورہ پڑا ہو۔“

اس دوران کمرے میں بھی ہلچل مچ چکی تھی۔ اگرچہ لوگوں میں ایسی افراتفری نہیں تھی جس کی مجھے تلاش تھی لیکن اس کے باوجود وہاں موجود ہر شخص پریشان نظر آرہا تھا۔ سب ایک دوسرے سے سرگوشیاں کررہے تھے۔

”ہمیں اسے اٹھا کر کمرے میں لے جانا ہوگا۔“ ایمی سے یہ کہہ کر ڈینیل نے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ ”اس اچانک اُفتاد پر معذرت خواہ ہوں۔“

میں سوچ رہا تھا کہ ڈینیل نے میڈیسن میں ایم ایس سی کی ڈگری لی ہے اور ایسے وقت میں کہ جب ایک مریض سامنے ہو اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت پیش آچکی ہو، اسے کچھ کرنا چاہیے تھا لیکن وہ خود کو بہت ٹھنڈے مزاج کا

ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ مریض کی مدد کے بجائے اپنے مہمانوں سے معذرت کر کے خود کو مہذب ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یقیناً یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں خود کو کس قدر پُرسکون رکھ سکتا ہے۔ شاید اس خوبی کی بنا پر وہ خود کو کانگریس کا رکن نہیں بلکہ صدر امریکا بننے کا مستحق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دل تو چاہا کہ جھٹ سے پستول نکال کر گولی چلاؤں اور انہی لوگوں کے سامنے اسے موت کی نیند سلا دوں، جن کے بیچ کھڑا ہو کر وہ ہیرو بننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لاکھ چاہنے کے باوجود اپنی خواہش پر عمل نہ کر سکا۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسا کچھ ہو کہ میں پھنس جاؤں۔ مجھے صرف ڈینیل کو ہی اس کے انجام تک نہیں پہنچانا تھا، کچھ اور بھی اہم کام کرنے تھے، جس کے لیے ضروری تھا کہ اس وقت پولیس کی پہنچ سے دور رہوں۔

اگرچہ پارٹی میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آچکا تھا مگر میں خوش تھا۔ یقین تھا کہ بہت جلد مجھے اپنا کام ختم کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اب وہاں مزید ایک لمحہ رکنا فضول تھا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہال سے باہر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہال سے نکلتے ہی کمرے کی طرف گیا۔ کھونٹی پر لٹکا اوورکوٹ اتارا اور بریف کیس تھام کر اس طرح وہاں سے نکلا کہ کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔

پورچ سے ایمبولینس سائرن کی آواز آ رہی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو میڈیکل اسٹاف اسٹریچر لے کر سامنے سے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس شخص کو وہاں سے لے جایا گیا۔ میں ایک بڑے سے ستون کی آڑ لیے کھڑا تھا۔ جیسے ہی ایمبولینس آگے بڑھی، ڈینیل، ایمی کا ہاتھ تھام کر داخلی دروازے کی طرف پلٹا۔ موقع آ گیا تھا۔ مجھے وہاں لگے سیکیورٹی کیمروں کا علم تھا، لہٰذا اندھیرے کی آڑ لے کر گولی چلا دی۔ یقین تھا کہ جدید ساخت کے خودکار پستول سے نکلنے والی بے آواز گولی، سر کے پچھلے حصے میں گھس کر پیشانی کی ہڈی تک ضرور پہنچی ہوگی۔ میرا کام ہو چکا تھا۔ ڈینیل اپنے انجام کو پہنچا اور بنا ناول دیے، میرا ناول بک بھی گیا اور رقم بھی ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اب وہاں رکنا فضول تھا۔ ایمی زور زور سے چلا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہر طرف ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ میں بھی اسی افراتفری کی آڑ لے کر نکل گیا۔

اگرچہ مجھے پوسٹ آفس بھی جانا تھا۔ سوچا تھا کہ واپسی پر ہوتا آؤں گا لیکن یہ یاد نہ رہا کہ وہ کب تک کھلا رہتا ہے، لہٰذا وقت ضائع کرنے کے بجائے سیدھا گھر کا رخ کیا۔ راستے بھر پیش آنے والے تمام تر واقعات پر غور کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ منصوبے کا پہلا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا۔ اب ایک مرحلہ اور باقی تھا۔ اس کے بعد تین ماہ ریسرچ اور مشاہدے کے لیے، ڈیڑھ ماہ ناول لکھنے کے اور ایک ماہ اس کے چھپنے میں لگیں گے... مجھے یقین تھا کہ وہ وقت آ گیا جب میرا نام بھی عالمی شہرت یافتہ ادیبوں میں ہوگا۔ میں اپنے اس نئے ناول پر بھی سوچتا رہا، جسے چند مہینوں کے بعد لکھنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا جب لندن کی ادبی کانفرنس میں مجھے بکر پرائز سے نوازا جائے گا تو کیسا محسوس کروں گا۔ یہ سوچتے سوچتے میں کئی بار مسکرایا بھی تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی میرا ذہن نشے میں تھا لیکن پھر بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم نہیں ہوئی تھی، دماغ کام کر رہا تھا۔ ویسے میری جگہ، اگر میرا ہیرو سلیڈ ہوتا تو سوچنے سمجھنے کی بات ایک گلاس کے بعد ہی ترک کر چکا ہوتا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھرے گلاس اور حسین محبوبہ کے سامنے کچھ سوچنا کفرانِ نعمت کے مترادف ہوتا ہے۔

گھر پہنچ کر سیدھا اسٹڈی میں آیا۔ بریف کیس ایک طرف رکھ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب میری حالت کچھ سنبھلی تو اٹھا اور بریف کیس کھولا۔ گھر سے جاتے ہوئے جو بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا، اس میں پستول اور شائع شدہ ایک پرانے ناول کے مسودے کی کاپی تھی لیکن اس بریف کیس میں ان دونوں چیزوں کے بجائے نوٹوں کا ایک بڑا سا بنڈل تھا۔ واقعی میرے منصوبے کا پہلا مرحلہ کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے مارے خوشی کے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اپنی خوش نصیبی پر پیار آنے لگا تھا۔ یقین ہو گیا کہ اب اچھا وقت زیادہ دور نہیں۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کافی بنانے لگا۔ کچن میں کھڑے کھڑے ایک خیال آیا۔ اگرچہ یہ میرے طے شدہ منصوبے کا حصہ نہ تھا لیکن اس اچھوتے خیال نے منصوبے میں ترمیم پر اُکسایا۔ اگلے تین چار گھنٹوں تک میں اسی پر سوچتا رہا۔ اس دوران اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پانے کے لیے کئی کپ بلیک کافی بھی پی گیا تھا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میرا سارا نشہ ہرن ہوا اور دماغ پوری یکسوئی سے سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

آخر میں نے فیصلہ کر لیا۔ اپنا کمپیوٹر اور پرنٹر پیک کیا۔

سوٹ کیس نکال کر اس میں ضرورت کے کچھ کپڑے، چند مسودات اور چند سوڈالر علیحدہ کر کے، نوٹوں کا باقی بنڈل اس میں رکھا اور گھر کو تالا لگا کر سڑک پر آیا، ٹیکسی روکی اور ایئرپورٹ کی طرف چل دیا۔ میری منزل شمالی میں کینیڈا تھی۔

مجھے کینیڈا ہمیشہ سے ہی بہت پسند رہا ہے۔ اس کی فضاؤں میں سکون تھا اور یہی سکون مجھے درکار تھا لیکن ہمیشہ مالی حالت آڑے آتی رہی تھی لیکن اب کی بار ایسا نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایئرپورٹ پر کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میرے سامان میں ایسا کچھ نہ تھا جس کی وجہ سے امیگریشن عملہ روک کر کوئی سوال وجواب کرسکے۔

''آپ کس لیے کینیڈا جارہے ہیں؟''

ایئرپورٹ پر خوش شکل کسٹم افسر نے جب یہ سوال کیا تو میں نے لمحہ بھر کے لیے نظریں گھما کر اردگرد دیکھا۔ وہاں کوئی اور نہ تھا۔ میں نے اس خاتون کی جھیل جیسی گہری نیلی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میں ایک مصنف ہوں اور اپنے نئے ناول کے لیے کچھ تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر اس کے چہرے پر ہلکی سی خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ ''واہ... مرکزی خیال کیا ہے؟''

یہ سن کر مجھے محسوس ہوا کہ شاید وہ فکشن دلچسپی سے پڑھتی ہوگی، میں نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''ضرور بتاتا لیکن ابھی پلاٹ بدستور تبدیلیوں کی زد میں ہے۔''

''بہت خوب!'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ اس وقت اچانک میرے دماغ میں ایمی کا خیال آیا لیکن فی الوقت میں اس سے رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈینیل بھی اب تک میری سوچ کے منظرنامے میں تھا۔ میں چشمِ تصور سے یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی لاش مُردہ خانے منتقل کی جاچکی ہے، پولیس تفتیش میں مصروف ہے۔ ایمی اب تک پولیس کے سوالوں کے جوابات دے رہی ہے، آخر آخری لمحے میں وہی اُس کے ساتھ تھی۔ اس کا بیان قاتل تک پہنچنے میں پولیس کی بہت مدد کرسکتا تھا۔

سفر بہت پُرسکون تھا۔ دو دن ہوٹل میں گزارنے کے بعد، مانٹریال کے نواحی قصبے میں کرائے کے کاٹیج میں منتقل ہوگیا۔ مجھے یہاں کافی دن تک رکنا تھا۔ کب تک، یہ اس پر منحصر تھا کہ پولیس یا پھر پولیس افسر ریمنڈ کتنی ذہانت کا ثبوت دیتا ہے۔ جب تک پولیس مجھ تک پہنچے، تب تک میں پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے اُس ناول کی جزئیات اور منظر نگاری پر غور کرنا چاہتا تھا، جس کی تحقیق اور مشاہدے کے لیے مجھے ابھی ایک اور سفر کرنا تھا۔

ایمی میری بہت اچھی دوست تھی اور یوں شہر سے اچانک، بنا بتائے میری گمشدگی یقیناً اس کے لیے پریشانی کا باعث ہوگی مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ ڈینیل کے قتل کے بعد، وہ خود پریشان اور مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار ہوگی۔ اسی لیے چار دن تک اس سے کٹا رہا۔ آخر پانچویں دن مقامی لائبریری کے کمپیوٹر کے ذریعے اس سے آن لائن رابطہ کیا۔ چاہتا تو موبائل فون بھی استعمال کرسکتا لیکن مجھے اس پر زیادہ بھروسا نہ تھا۔ میرے لیے آن لائن رابطہ زیادہ مناسب اور شاید محفوظ بھی تھا۔

ایمی نے جو کچھ بتایا، وہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس اب تک قاتل کا تو کوئی سراغ نہیں لگاسکی لیکن گھر میں مہمانوں کے اوورکوٹ اور ہیٹ وغیرہ رکھنے والے کمرے سے انہیں ایک بریف کیس ملا ہے، جس میں ایک اعشاریہ تین آٹھ کا پستول اور ایک مسودہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس کو حیرت تھی کہ میرا مسودہ اور پستول وہاں کیسے پہنچا۔ البتہ ایک بات سے وہ بہت خوش تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پستول خالی تھا اور فرانزک ٹیسٹ کے مطابق ڈینیل کی موت کا سبب بننے والی گولی کسی جدید ساخت کے پستول سے چلائی گئی تھی۔ ویسے وہ بہت پریشان تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس نے مسودے پر میرا نام و پتا دیکھ کر مجھے مشتبہ ملزمان میں شامل کرلیا ہے اور میری گمشدگی کے باعث ان کا شک اور بھی بڑھ چکا۔ پولیس مجھے ہر جگہ پاگلوں کی طرح تلاش کرتی پھر رہی ہے۔

ایمی کی باتیں سن کر مجھے اطمینان محسوس ہوا۔ سب کچھ میرے منصوبے کے مطابق ہورہا تھا۔ یقین ہوگیا کہ اب قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہونے جارہی ہے۔ اب میں زیادہ عرصے تک دوسرے درجے کا گمنام ادیب نہیں رہوں گا بلکہ جلد شہرت یافتہ ادیب بننے والا ہوں۔

ایمی کا کہنا تھا کہ جس شام قتل ہوا، اس سہ پہر ڈینیل نے بینک سے بھاری رقم نکلوائی تھی، جسے اس نے ایک بریف کیس میں رکھ کر، اس کمرے میں رکھوادیا تھا جو مہمانوں کی ذاتی اشیا رکھنے کے لیے مخصوص تھا مگر واردات کے بعد وہ بریف کیس وہاں سے غائب تھا۔ ایمی کا کہنا تھا کہ اس بریف کیس کے بارے میں یا تو ڈینیل جانتا تھا یا وہ۔ پولیس کے سوالوں کی دردسری سے بچنے کے لیے اس نے نوٹوں والے بریف کیس کی گمشدگی کی بات پولیس کو بھی

نہیں بتائی تھی۔

جب میں نے اسے یہ بتایا کہ وہ بریف کیس میں نے اڑایا ہے تو وہ حیران رہ گئی اور جب اسے یہ بتایا کہ ڈینیل نے یہ رقم مجھے ہی دینی تھی ایک ناول کے بدلے تو اسے اور بھی حیرانی ہوئی۔ آخر میں نے اسے سب کچھ صاف صاف بتادیا، ماسوائے اس کے کہ اسے میں نے ہی قتل کیا تھا۔

میں نے ایمی سے کہا کہ ڈینیل نے ہی مجھے بریف کیس کی نشانی بتائی تھی اور کہا تھا کہ جاتے وقت مسودہ وہاں چھوڑ جاؤں اور رقم والا بریف کیس لے جاؤں تو وہ مطمئن ہونے کے بجائے اور پریشان ہوئی۔ اسے رقم کی بہت فکر ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس رقم کو ضائع کرنے کے بجائے اگر بچا کر رکھوں تو ہم دونوں ایک نئی زندگی کا بہتر آغاز کرسکتے ہیں۔ ڈینیل کی موت کے بعد شاید وہ بھی خود کو آزاد محسوس کر رہی ہوگی تبھی اسے شادی شدہ زندگی کا آغاز کرنے کی فکر تھی لیکن مجھے مشہور ادیب بننا تھا۔ مجھے رقم سے زیادہ اپنی کامیابی کی فکر تھی جس کے لیے میرے منصوبے کا کامیاب ہونا اہم تھا۔

''اسے کس نے قتل کیا، کس پر شبہ ہے پولیس کو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہرحال...'' ایمی نے ایک طویل وقفے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''یہ تو اب تک نہیں کہا جاسکتا کہ قاتل کون ہے لیکن بریف کیس سے ملنے والا پستول خالی تھا۔''

''اس کی گولیاں تو کبھی خریدی ہی نہیں تھیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''ویسے بھی وہ پستول کبھی استعمال ہی نہیں ہوا تھا۔''

''لیکن پستول کا خالی ہونا بھی تمہارے حق میں نہیں جاتا۔''

''ہوسکتا ہے۔'' میں مسکرایا۔

''ویسے میں نے پولیس کو بتایا ہے کہ تم ایک مصنف ہو اور اکثر اپنے مسودات پبلشرز کو دکھانے کے لیے ساتھ لے جاتے ہو۔ شاید اس روز بھی ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن وہاں جس طرح اچانک حالات بدلے، اس ہڑبونگ میں تم شاید اپنا بریف کیس لے جانا بھول گئے ہوگے۔'' ایمی کا لہجہ وضاحتی تھا۔

''پولیس کیا کہتی ہے؟'' میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

''تم مشکوک ہو اور اس کیس کی تفتیش کرنے والا پولیس افسر ریمنڈ تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔''

''تو پھر میں گرفتار ہونے والا ہوں۔''

''آج نہیں تو کل...''

''اوکے...'' یہ کہہ کر میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ہم دونوں کو آن لائن ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہوچکا تھا۔

''میرے خیال میں اب ہمیں آف لائن ہوجانا چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ایمی نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

''بہتر ہے، پھر ملیں گے...''

''کہاں... کینیڈا میں؟'' ایمی کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''نہیں، شاید سان فرانسسکو کی کسی جیل میں۔'' یہ کہہ کر میں نے کمپیوٹر بند کیا اور گھر لوٹ آیا۔

ایمی سے گفتگو کے دوسرے روز، شام کے سوا سات بج رہے تھے۔ باہر برف باری ہو رہی تھی۔ میں نے کافی بنائی اور لاؤنج میں آگیا۔ ابھی پہلا گھونٹ ہی بھرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے تین چار پولیس والے ہاتھ میں پستول لیے کھڑے تھے، شاید میری کہانی کو انجام تک پہنچانے کے لیے... میں نے گہری سانس لی اور بنا ایک لفظ کہے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے۔ ایمی سے بات کرنے کے بعد مجھے یقین تھا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے، پولیس بہت جلد لوکیشن کا پتا چلا کر مجھ تک پہنچ جائے گی اور ہوا بھی یہی۔

☆☆☆

کیلیفورنیا پولیس ڈپارٹمنٹ کی سرتوڑ کوشش کے باوجود مجھ پر قتل کا الزام تو ثابت نہ ہوسکا البتہ میری حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے جج کو میرے ذہنی توازن پر شک ضرور ہوا۔ آخر مجھے نفسیاتی معالجین کے روبرو پیش کیا گیا اور پھر سب کی متفقہ رائے سے مجھے ایک سال کے لیے پاگل خانے بھیج دیا گیا تاکہ سرکاری خرچ پر علاج ہوسکے۔

جس دن مجھے پاگل خانے بھیجا گیا، اسی دن میرا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ میں اپنا نیا ناول ذہنی مریضوں پر لکھنا چاہتا تھا، جزئیات نگاری اور منظر کشی میری کمزوری ہے اور اس کے لیے مشاہدے کی ضرورت تھی۔

مجھے یقین تھا کہ ایک سال نہیں تین چار ماہ میں ہی اپنا کام مکمل کرکے اس پاگل خانے سے نکل جاؤں گا اور بہت جلد میرا نیا ناول قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اس بار میرا ناول کسی اور کے نام سے نہیں بلکہ خود میرے نام سے ہی شائع ہوگا۔

قسط : 7

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں
ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

سب سے پہلے مجھے ہوش آیا تھا۔

ہوش میں آتے ہی مجھے سخت ٹیس کا احساس ہوا۔ اس کا مخرج میرا زخمی بازو تھا۔ درد کی یہ پُرزور لہر میرے دماغ اور حواسوں کو فوری بیدار کرنے میں معاون بھی ثابت ہوئی۔ مجھے پیش آئے حالات کا ادراک جلدی ہونے لگا۔ میں نے درد کی شدت کو محسوس کر کے بے اختیار اپنے مضروب بازو کو سہلانا چاہا تو پتا چلا کہ میرا تو پورا وجود ہی رسن بستہ تھا۔ میرے دونوں بازو ہی نہیں بلکہ دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے......... دونوں بازو پشت کی جانب موڑ کر کسی مضبوط رسی سے کس کر باندھے گئے تھے۔ زخمی بازو مڑنے کے باعث تکلیف کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا، اس قدر کہ بے اختیار میرے منہ سے کراہ خارج ہو گئی تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ میں دشمن کی قید میں تھا۔

میری پھٹی پھٹی آنکھوں کو کچھ روشنی کا احساس ہوا۔... جو نا معلوم سے روزنوں سے اندر پڑ رہی تھی، تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں کسی کمرے میں نہیں تھا۔ فرش پر ہونے والی مخصوص تڑتڑاہٹ اور گھرر.... ررر.... کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ میں کسی بند گاڑی یا وین میں تھا۔

سرِدست میں اپنے بندھے وجود کو ہلانے جلانے سے قاصر ہی رہا۔ تاہم گردن ذرا موڑ کر دیکھنے پر بے اختیار میرے حلق سے بھنچی بھنچی سانس خارج ہو گئی۔ میرے ساتھی بھی اسی حالت میں اِدھر اُدھر بکھرے بے سدھ پڑے تھے۔ گویا دشمن نے ہماری پوری ٹیم کو ہی یرغمال بنا لیا تھا۔

اول خیر بے ہوشی کی حالت میں میرے دائیں جانب پڑا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر شوکی اور بائیں جانب آسیہ تھی جبکہ شکیلہ میرے پیروں کی طرف بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مجھے شاید اپنے زخمی بازو سے اٹھنے والی درد کی لہر نے جلدی جاگنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

میں نے گویا اپنے وجود کو سرتاپا سماعت بنا لیا اور غور کرنے لگا۔ ہمیں کون سی گاڑی میں سوار کرایا گیا تھا۔ یہ ٹرک تھا یا وین...؟ جگہ کی تنگی سے مجھے وین کا ہی شبہ ہوا تھا۔ وین پرانی سی تھی، اس سبب اس کی دیواروں اور کونوں میں سوراخ ہونے کے باعث سورج کی کرنیں مقدور بھر اندر داخل ہو رہی تھیں اور کچھ میری آنکھیں بھی نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو... گئی تھیں۔ وین یا ٹرک کے یکساں ہچکولوں اور تیز رفتاری سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم کسی سپر ہائی وے جیسی شاہراہ پر گامزن تھے۔ شکر ہے کہ ہمارے چہروں یا منہ پر پٹیاں نہیں باندھی گئی تھیں۔

میں اول خیر کو آوازیں دینے لگا۔ اور ذرا گھستا ہوا اپنے بدن کو اس کے ساتھ مس کر کے ہلانے جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے مجھے کسی کی کراہ سنائی دی۔ میں نے تھوڑا سر اونچا کر کے پیروں کی جانب دیکھا۔ شکیلہ کسمسا رہی تھی۔ اسے ہوش آ گیا تھا اس کے بعد اول خیر اور پھر چند منٹوں بعد ہی سارے ساتھیوں کو ہوش آ چکا تھا۔ آسیہ اور شکیلہ زیادہ تشویش زدہ اور متوحش نظر آ رہی تھیں۔ کم و بیش یہی حال شوکی اور اول خیر کا تھا۔ شکیلہ نے گھبرا کر کہا۔

''ہم کہاں ہیں...؟ یہ کون لوگ ہیں...؟''

خود ہمارے پاس اس کے سوال کا جواب نہ تھا مگر اندازہ تھا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔ اول خیر بولا۔

''کاکا!... یہ بہت بُرا ہو گیا۔'' میں اسے کیا جواب دیتا۔ اچانک شوکی کی آواز اُبھری۔

''ہمیں دانتوں کے ذریعے ایک دوسرے کی رسیاں کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

میرے دماغ میں جھماکا ہوا۔ اس کی بات واقعی قابلِ غور تھی مگر دوسرے ہی لمحے بند گاڑی کے اندر ایک بدہیت ہنسی کی آواز ابھری پھر کوئی بولا۔ ''اس کا کوئی فائدہ نہیں، تمہارے دانت جھڑ جائیں گے مگر رسی پھر بھی نہیں کھلے گی۔''

اچانک ابھرنے والی اس آواز پر ہم سب دم بخود سے رہ گئے۔ آواز میرے لیے شناسا تھی، جسے پہچان کر میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ یہ جنگی خان کی آواز تھی۔ وہی ملعون جس نے عابدہ کو اغوا کرنے کا ناقابلِ معافی جرم کیا تھا اور رانگی چاڑہ کے اڈے پر میرے ہاتھوں ایک بھیانک موت مرنے سے بال بال بچ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش چاہی اور پھر مجھے اس دیوار کے اوپر چار بائی چھ انچ کا جالی دار رخنہ نظر آ گیا جس کے بارے میں میرا خیال تھا اس طرف ڈرائیونگ کیبن تھا اور یقیناً ہماری باتیں بھی وہاں سنی جا رہی تھیں۔

''یہ ممتاز خان کا آدمی ہے؟'' اول خیر نے سرگوشی کی۔

''ہاں۔'' میں نے ہولے سے تصدیق کی۔ ''یہ جنگی خان ہے۔ میرا اس کے ساتھ ٹاکرا ہو چکا ہے۔'' اول خیر کے چہرے کی تشویش گہری ہو گئی۔ ممتاز خان جیسے زخمی سانپ کی گرفت میں جانا گویا یقینی موت سے دوچار ہونے

کے مترادف تھا۔ مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ ہماری ساری محنت ساری عملی کشاکشی اپنی تمام تر احتیاط اور رازداری کے باوجود اکارت جا چکی تھی... یا تو ہم حد سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو کے دشمن سے غافل ہونے کی فاش غلطی کر بیٹھے تھے یا پھر دشمن نے ہم سے زیادہ ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کیا ہے۔

ہم سب دم بہ خود تھے۔ اندر سے تشویش زدہ بھی۔ یہ احساس ہی ہمارے لیے سخت اذیت کا باعث تھا کہ اب جو کچھ ہونے والا تھا وہ کسی بھی صورت میں ''خیر'' کے زمرے میں نہیں آتا ہے۔

انجانی منزل کی جانب سفر جاری تھا۔ جنگی خان کی آواز دوبارہ نہیں ابھری تھی۔ اندیشناک وسوسوں بھرے دلوں میں ''کیا ہونے والا ہے؟'' کی بڑی کریہہ صورت تصویر اس اذیت ناک وسوسے کی تھی جس میں خیر کی امید صفر تھی۔ مجھے زیادہ افسوس شکیلہ اور شوکی کی طرف سے ہونے لگا۔ وہ بے چارے، بہن بھائی تو خوامخواہ ہی میری وجہ سے لپیٹ میں آگئے تھے۔ دونوں اچھی بھلی پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ کاش! میں ادھر کا رخ ہی نہ کرتا... مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

''شہزاد خان! تم نے یقیناً مجھے پہچان لیا ہوگا... کہ تم سے مخاطب، میں کون ہوں؟''

چند سیکنڈوں کے خاموش دھڑکتے وقفے میں اچانک جنگی خان کی حقہ اٹھاتی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اپنے دیگر ساتھیوں کی یہاں موجودگی کے باعث میں نے اپنے ابال پر مصالحانہ ضبط کا پہرا بٹھایا اور بولا۔

''جنگی خان! تمہاری دشمنی صرف میرے ساتھ ہے۔ باقی لوگوں کو چھوڑ دو۔ میرا ان سے کوئی گہرا لگاؤ نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا یہ میرے ثانوی تعلقات کے باعث خوامخواہ ہی دشمنی کی بھینٹ چڑھ جائیں۔''

''ہا...'' جواباً جنگی خان کی استہزائیہ آواز ابھری۔ اس میں غیظ انتقام کی کاٹ محسوس ہوتی تھی۔ ''خوب جانتا ہوں تمہیں کہ ایک بار جو تمہاری دست یاری تلے آجائے... وہ شہزاد احمد خان کے لیے کس قدر اہمیت اختیار کر جاتا ہے... اب ہمارے پیاسے انتقام کی شروعات تمہارے انہی پیارے ساتھیوں سے ہی ہوگی۔'' اس کے ہولناک لہجے اور جان کاری نے مجھے اندر سے لمحے بھر کو لرزا کر رکھ دیا۔ یقیناً اسے اشرف نے ہی میری اس فطرت کے بارے میں بتایا ہوگا جسے میں نے رانگی چاڑہ میں جنگی خان کی آنکھوں کے سامنے واصل جہنم کیا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ عابدہ کے اغوا میں ملوث تھا۔

''رانگی چاڑہ میں تمہاری وحشیانہ مستعدی نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ ورنہ اشرف نے مجھے تمہارے متعلق جو بتایا تھا میں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔'' وہ بولے جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ، رویہ، بولنے کا انداز بتا رہا تھا وہ کوئی انتقامی بھڑاس اپنے دل سے نکال رہا ہے۔

''بھلا ایک اطفال گھر میں پرورش پانے والا... ہم جیسے کھلے میدانوں کے شیروں سے کس طرح ٹکرا سکتا ہے...؟''

اب میں اس رذیل کی ہرزہ سرائی کا منہ توڑ جواب دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

''جنگی خان! تم نے اپنے لیے کھلے میدان کے شیر کا لفظ غلط استعمال کیا ہے جبکہ تمہاری صحیح تعریف جس سے تم خود بھی اچھی طرح واقف ہو کہ تم شیر نہیں بلکہ کرائے کے ایک بزدل ٹٹو ہو... جس نے اپنا ضمیر اپنی انسانیت گروی رکھ دی ہے۔ شیر جیسا لفظ تو تمہیں میرے لیے استعمال کرنا چاہیے بزدل ٹٹو... جو تمہیں اس وقت بھی للکار رہا ہے۔ رہی بات یہ کہ تمہیں اس بات پر حیرت ہوئی کہ مجھ جیسے ایک عام آدمی جس نے اطفال گھر میں پرورش پائی، تم جیسے ''کھلے میدان کے شیر'' کو رانگی چاڑہ کے اڈے سے گیدڑ کی طرح بھاگنے پر کیسے مجبور کیا۔ اس کا جواب بڑا آسان ہے کہ جب ایک صلح جو اور امن پسند انسان پر جبر اور ناانصافی مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر اس کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے ایسی جرأت مندانہ صلاحیتیں ازخود پیدا ہونے لگتی ہیں، پھر جذبۂ شجاعت اور حالات اسے بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔''

میری آواز، میرے لب و لہجے کی گھن گرج بند ٹرک کے اندر ہی نہیں یقیناً ادھر بھی گونج رہی ہوگی جہاں جنگی خان بیٹھا سن رہا تھا۔

اول خیر کی آواز بلند ہوئی۔ ''او خیر... میرے کا کے شیر...!''

دوسری جانب جنگی خان کو چپ کھا گئی۔ کئی سیکنڈوں بلکہ منٹوں تک اس کی آواز نہ آئی تھی پھر جب بولا تو اس کی غراتی ہوئی آواز میں احساس ذلت کی بوکھلاہٹ عیاں تھی۔

''ساری اکڑفوں تمہاری ناک کے راستے نکل جائے گی... بس ایک تھوڑا انتظار...''

میں نے اپنے محبوس ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ میری جوابی کارروائی نے ان کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ جس کا

ثبوت ان کے چہروں پر عود کر آنے والی پُرجوش بشاشت سے ہوتا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے ان کے چہرے متوحش اور ستے ہوئے تھے جبکہ اول خیر کے بشرے پر جی دارانہ مسکراہٹ تھی۔

گاڑی چلنے کی مخصوص یکساں گھرر۔۔۔ررر۔۔۔ جاری تھی۔ کچھ لمحے اور بیت گئے تو ایک بار پھر غیر یقینی حالات سے تشویش دل و دماغ پر جاگزیں ہونے لگی۔ اول خیر کا چہرہ بھی اب سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔ اب ہمارے خاموش چہروں سے آنے والے وقت کے انتظار کے سوا کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔

محتاط اندازے کے مطابق نصف گھنٹے بعد گاڑی کی رفتار میں کمی آئی۔ اس کے بعد شاید موڑ کاٹا گیا تھا اور گاڑی نشیب کے کسی تنگ بل کھاتے کچے راستے پر اتر گئی تھی۔ رفتار نسبتاً ہلکی تھی البتہ گاڑی ہچکولے کھانے لگی تھی۔

نشیبی راستے کا یہ سفر بھی کم و بیش بیس پچیس منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔ یکلخت دھڑکتی خاموشی چھا گئی۔ انجن بند کر دیا گیا تھا۔ میرے دل نے تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا جو کچھ ہمارے بالخصوص میرے ساتھ ہونے والا تھا، وہ یقیناً اچھا نہیں ہوتا مگر مایوسی کا کفر کے زمرے میں آنا مجھے کسی ایسی سوچ سے مانع رکھے ہوئے تھا جس میں ذاتِ باری تعالیٰ کی مدد کی امید سے انحراف ہوتا ہو۔ زندگی اور موت صرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہے جو جسے چاہے محفوظ ٹھکانے میں موت کا ذائقہ چکھا دے اور جسے چاہے اپنی رحمانیت سے برستے شعلوں سے بچا لے۔

گاڑی کا پچھلا بھاری دروازہ خودکار انداز میں اوپر اٹھ گیا۔ لیٹے لیٹے ہم نے گردنیں اٹھا کر دیکھا۔ دھوپ کی تیز روشنی میں ہمیں کسی نواحی علاقے کا منظر نظر آیا اور تین افراد۔ ان میں ایک جنگی خان تھا باقی دو اس کے ساتھی، یقیناً یہی وہ تینوں ہوں گے جو ''ڈینگی مار'' ٹیم کا بہروپ بھر کر شوکت کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں عورت بھی تھی شاید اس سے کام لے کر فارغ کر دیا گیا تھا جو یقیناً ان کی ساتھی ہی ہو سکتی تھی۔

یہاں ان کے اور بھی ساتھی نمودار ہوئے جو چہروں مہروں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ ان کی تعداد چھ سات سے کم نہ تھی، بظاہر غیر مسلح نظر آ رہے تھے۔ یہ اوپر چڑھ آئے، بیدردی سے گھسیٹ گھسیٹ کر ہمیں کاندھوں پر لادا اور نیچے اتر گئے۔

میں جس کے کاندھے پر تھا، وہ میری طرح ہی مضبوط تن و توش کا مالک تھا۔ میرا بالائی جسم اس کی پشت کی طرف جھول رہا تھا۔ اسی لیے بمشکل گردن موڑ کر اطراف میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ مجھے مٹیالے رنگ کی عمارت نظر آئی جو کسی فارم ہاؤس سے مشابہ تھی۔ ہمیں ایک بڑے چوبی پھاٹک سے اندر لایا گیا اور پھر ایک طویل برآمدہ نما گوشے سے گزار کر ہال کمرے کے فرش پر گویا پٹخنے کے انداز میں پھینک دیا۔ ایسے میں مجھے آسیہ اور شکیلہ کی چیخ آمیز کراہیں سنائی دیں۔ ہال کی کھڑکیاں کھلی تھیں مگر لائٹ بھی آن تھی، فرنیچر کے نام پر دو تین چارپائیاں۔۔۔ اتنی ہی تعداد میں سرکنڈوں کے مونڈھے۔۔۔ دو چوبی بنچیں ایک بڑی سی میز کے علاوہ کچھ کھاد یا گندم وغیرہ کی بوریاں ایک طرف پڑی نظر آ رہی تھیں۔

آسیہ اور شکیلہ سرک کر میرے قریب ہونے لگیں۔ بے چاریاں میرے رسن بستہ ہونے کے باوجود مجھ سے جانے کون سی امید لگائے بیٹھی تھیں۔ تاہم انہیں میری قربت حوصلہ ضرور دے رہی تھی۔ وہ سب گماشتے جنگی خان سمیت ہمارے سروں پر ملک الموت بنے کھڑے گھور رہے تھے۔ پھر میں نے جنگی کو سیل فون پر بات کرتے دیکھا۔

''چودھری صاحب! مہمان حاضر ہیں۔ آگے کیا حکم ہے؟'' پھر اس نے کچھ سیکنڈ دوسری طرف کی گفتگو یا ہدایت سنی پھر ''جی بہتر'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد وہاں موجود اپنے گماشتوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ پانچ آدمی باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد جنگی خان اپنے دونوں ڈینگی ساتھیوں کے ہمراہ قریب دھری چارپائی پر جا بیٹھا۔

میں نے محسوس کیا وہ خبیث بار بار شکیلہ اور آسیہ کی طرف گھور رہا تھا۔ مگر اس کی پُرشیطنت نظریں شکیلہ کا زیادہ طواف کر رہی تھیں۔ جنگی خان کے دونوں ساتھی، آسیہ کو تاڑ رہے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر ان دونوں لڑکیوں کی طرف سے ہو رہی تھی۔

وہ تینوں خبیث ہم سے کچھ فاصلے پر چارپائی پر بیٹھے ہماری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں معنی خیز کھسر پھسر میں مصروف تھے، سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ کبھی کبھی ہلکا اوباشانہ قہقہہ بھی اگل دیتے۔

ادھر ان کی سگریٹ ختم ہوئی ادھر ایک آواز ابھری۔ یہ کسی بھاری بھرکم گاڑی کے رکنے کی آواز تھی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ کچھ سیکنڈ بعد ہال کمرے کے کھلے دروازے کے باہر بھاری قدموں کی چاپ ابھری۔

ہم فرش بوس تھے۔ ایک ساتھ اپنی گردنیں گھما کر

دیکھنے کی کوشش کی۔ چند مسلح کار پردازوں کی معیت میں ایک دراز قامت بھاری بھرکم گرانڈیل صورت آدمی اندر داخل ہوا۔ رنگ گورا چٹا تھا۔ قد دراز۔ چہرے پر کرخت مزاجی کے تاثرات تھے... اس نے بیش قیمت مکلف شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ مونچھیں گھنی تھیں۔ آنکھیں چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہونے کے باعث غضب کا کینہ پرور تاثر پیش کر رہی تھیں۔

یہ چودھری ممتاز خان تھا۔ اس سے پہلے میں نے صرف ایک بار اس کی دور سے جھلک دیکھی تھی۔ آج میں اسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک مغرور چودھری زادہ نظر آتا تھا۔

اس نے دوسروں پر صرف سرسری نگاہ ڈالی۔ مگر پھر میرے چہرے پر تو اس کی شعلہ برساتی نظریں کسی تیز خنجر کی طرح پیوست ہو کر رہ گئیں۔ اس کے ساتھی رک گئے۔ ممتاز خان آگے بڑھا۔ اس نے قریب آ کر اپنا جوتا میری گردن پر رکھ دیا۔ میرا چہرہ ہال کے فرش کی گرد چھونے لگا۔

"شہزی...! کاش میں تجھے کل کا چھوکرا سمجھ کر اتنی ڈھیل نہ دیتا مگر آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تجھے غیر اہم سمجھ کر میں نے اپنی زندگی کی بڑی بھیانک غلطی کی تھی۔"

اس کی شدید غیظ تلے پھٹی پھٹی آواز ازلی عناد اور آتشِ انتقام کی پیاس کا پتا دیتی تھی۔

"سوچا تو یہی تھا کہ تیرے قابو میں آتے ہی تیرا خاتمہ کر ڈالتا... مگر تجھ سے انتقام لینے کی آرزو اس قدر شدید تھی کہ موت تیرے لیے بہت چھوٹی سزا ہوتی... مگر دیر آید درست آید کے مصداق... تجھے تیرے قریبی ساتھیوں کے ساتھ یہاں دیکھ کر میرے انتقام کی آگ میرا دماغ پھاڑے ڈال رہی ہے۔ تڑپا دینے والی اذیت ناک موت تو تیرا مقدر ہے ہی... مگر..."

باعثِ غیظ ــــ وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ پھر اس نے جھک کر اپنی مٹھی سے میرے بال جکڑ لیے اور مجھے گھسیٹ کر قریب دھرے مونڈھے تک لے گیا۔ بالوں کے شدید کھنچاؤ کے باعث میری آنکھوں سے مارے اذیت کے پانی پھوٹ پڑا۔ وہ مونڈھے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا مگر میرے بال چھوڑ دیے۔ میرا چہرہ ایک بار پھر زمین بوس تھا۔ پھر مجھے اس کی غراتی آواز سنائی دی۔

"جنگی! ادھر آ... اس کتے کا سر اٹھا کر میرے چہرے کے قریب لا... میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بتاؤں گا... میں کون ہوں... میں اسے ایک لرزہ خیز حقیقت بھی بتانا چاہتا ہوں۔"

میرا دل دھڑکا... نہ جانے یہ کون سی لرزہ خیز حقیقت مجھے بتانا چاہتا تھا۔ بلاشبہ اس وقت اس کی حالت باؤلے کتے جیسی ہو رہی تھی۔ جنگی نے فوراً حرکت کی۔ ایک ہاتھ سے میرا کاندھا دبوچا دوسرے ہاتھ سے میرے سر کے بال جکڑ لیے۔ پھر مجھے اٹھا کر میرا چہرہ ممتاز خان کے چہرے کے قریب کر دیا۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ اس کا چہرہ مجھے آتشِ غیظ سے سلگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

"شہزی...! میں تجھے بڑے ہولناک منظر دکھانے کے لیے زندہ رکھوں گا۔ اب ایک لرزہ خیز حقیقت سن... تو مجھے کیا سمجھتا ہے؟ صرف چودھری ممتاز... نہیں، تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ اور میری جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں... تو کیا سمجھتا ہے تو نے اپنی معشوقہ عابدہ کو امریکا بھیج کر اسے میرے عتاب سے محفوظ کر دیا ہے؟"

عابدہ کا ذکر کرنے کے بعد وہ چند ثانیوں کے لیے یوں خاموش ہو گیا جیسے میرے سامنے عابدہ کا اس خطرناک انداز میں ذکر کرنے کے بعد وہ اس کا متوقع ردِعمل، پُرتشویش تاثرات کی صورت میں میری آنکھوں اور میرے چہرے سے محسوس کر کے حظ اٹھانا چاہتا ہو... واقعی ہوا بھی ایسا ہی تھا۔ عابدہ کے اس انداز میں ذکر پر میرا چہرہ بھبک کر انگارہ سا بن گیا۔ میرے پورے وجود میں بے کلی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا غیظ کی شدت سے ممتاز خان کی باچھیں جھاگ دار ہو رہی تھیں۔

"بہت نقصان کیا ہے تو نے میرا... شہزی! تیری وجہ سے میرا اکلوتا جوان بیٹا مارا گیا۔ میرے اہم آدمیوں کو تو نے بیدردی سے ختم کر ڈالا نہیں، نہیں... شہزی... میں تجھے موت کی سزا نہیں دوں گا مگر تیری زندگی کو سزا بنا دوں گا تیرے لیے..."

وہ غیظ و غضب کے عالم میں اپنے ہونٹ، دانت اور ہاتھوں کی مٹھیاں ایک ساتھ ہی بھینچے جا رہا تھا۔

"چودھری صاحب... ذرا ہولے... آپ کی طبیعت..." جنگی خان نے ممتاز کی پاگل جنونیوں جیسی ہوتی کیفیات کو دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا تھا۔ اسی وقت ایک آدمی کانچ کے گلاس میں پانی لے آیا۔ جنگی خان نے مجھے اسی طرح دبوچے ہوئے دوبارہ فرش پر میرے ساتھیوں کے قریب ڈال دیا۔ میرا ذہن عابدہ کے حوالے سے الجھ گیا تھا۔ جس انداز میں اس نے عابدہ کا ذکر کیا، اس سے مجھے

واقعی تشویش میں تو مبتلا کر دیا تھا مگر دل نہیں مانا کہ یہ پاگل، جنونی بیل، عابدہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ شاید مجھے یعنی اپنے دشمن دیرینہ کو اتنے قریب دیکھ کر یہ مارے طیش میں ہذیان بکنے پر مجبور تھا۔

ممتاز خان نے ایک ہی سانس میں پانی پیا اور گلاس کسی کو تھمانے کی زحمت گوارا کیے بغیر ایک طرف اچھال دیا۔ ہال میں کانچ ٹوٹنے اور بکھرنے کی آواز ابھری تھی۔ وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔ اس کی زہر بھری نظریں ہنوز مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس دھکا دھکی اور اٹھا پٹخ کے باعث مجھے اپنے بازو کا زخم بھی کھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے اٹھنے والی درد کی ٹیسوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''اب میں اس کو بھی نہیں چھوڑوں گا... اس نے میرے دشمن کو دودھ پلا کر میرے مقابل کھڑا کیا۔ ہم نے اب تک اس کتیا کو اس کے حال پر چھوڑے رکھا تھا، مگر یہ ہماری غلطی تھی... ہمیں اس دن ہی اس مردود کتے... لئیق شاہ سمیت اسے بھی...''

اس کا غضب ناک جنون ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ نجانے وہ کیسی بات اپنے منہ سے نکالنے والا تھا کہ جنگی خان نے اچانک جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور ممتاز خان بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔

وہ شاید اپنی بہن... یعنی بیگم صاحبہ سے متعلق کچھ بول رہا تھا اور لئیق شاہ کا ذکر تو میں نے بھی بیگم صاحبہ کے منہ سے محض اتفاقاً ہی ایک بار سن لیا تھا۔ جانے اس سے ماضی میں کون سا تعلق تھا ان کا... تاہم ممتاز خان اب اپنی بہن کا بھی جانی دشمن ہونے لگا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ میں ہی تھا۔

وہ موڑھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جنگی خان سے کچھ بولا تھا جس پر اس نے ہولے سے مؤدبانہ انداز میں جھکتے ہوئے جواب میں نجانے کیا ممتاز خان سے کہا تھا کہ وہ ایک بار پھر بھڑک اٹھا۔ اور ایک بار پھر میری طرف طیش بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''نہیں... ابھی اسی وقت یہ سب کرنا ہوگا... جنگی...! اس کے چہرے کا اطمینان... میرا خون کھولا رہا ہے... میں اسے جلد از جلد سزا کی بھٹی میں بھسم ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش! میں اسے زمین پر رینگنے والا کیڑا نہ سمجھتا... تو آج میں اتنے بڑے نقصانات سے دوچار نہ ہوتا۔ اب یہ حقیر کیڑا ہماری ناک میں گھس کر بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے... نہیں جنگی نہیں... ابھی اور اسی وقت... حساب دینا ہوگا اس نے... تاخیر مجھے قبول نہیں... سمجھے تم...؟'' اس نے آخر میں جنگی کو گھورا تو اس نے فوراً فدویانہ انداز میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد یہ سب لوگ ایک ایک کر کے ممتاز خان کے پیچھے ہال کمرے سے نکلتے چلے گئے

ہال کمرے میں یکلخت سناٹا طاری ہو گیا۔ ہم میں کوئی سینے کے بل اور کوئی پشت کے بل فرش پر تھا۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔ پہلی بار میں نے اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہوتے محسوس کیا۔ یہ اس کے انتہا درجے کی تشویش میں مبتلا ہونے کی دلیل تھی۔ مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر بولا۔ ''کاکے... یہ تجھ پر بہت گندی خار کھائے بیٹھا ہے... پتا نہیں اب یہ تیرے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟''

اسے میری فکر ستانے لگی تھی جبکہ مجھے خود سے زیادہ اپنے ساتھیوں بالخصوص آسیہ اور شکیلہ کی طرف سے تشویش لاحق تھی۔ میں نے کہا۔ ''اول خیر! زندگی اور موت ہمارے رب کے ہاتھ میں ہے۔ اس جیسے باؤلے کتے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ہمیں یہاں سے فوری طور پر فرار ہونے کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ یہ تم پر بہت بری طرح ادھار کھائے بیٹھا ہے... اور سب سے پہلے اس کے غضب ناک انتقام کا ہم ہی نشانہ بنیں گے'' شوکی نے کہا۔ اس کی آواز میں خوف کا ارتعاش تھا۔ اسے یقیناً زیادہ فکر اپنی بہن شکیلہ کی ہو رہی تھی۔

''ان بدبختوں نے ہمیں ہلنے جلنے تک سے قاصر کر رکھا ہے۔ ہم کس طرح یہاں سے فرار کی کوشش کر سکتے ہیں؟'' آسیہ نے لب کشائی کی۔

شکیلہ نے کسی خوف یا فکر کا اظہار کیے بغیر ایک تجویز دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم تھوڑی سی کوشش کر کے دو دو افراد اپنی پشت ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر انگلیوں کی مدد سے ایک دوسرے کی رسیاں کھولنے کی کوشش کریں تو...''

''یہ ممکن نہیں...'' اول خیر اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''محض انگلیوں کی مدد سے اس قدر مضبوط بندھی ہوئی رسیوں کو کھولنا ناممکن ہوگا۔''

معاً میری نگاہ ہال کے کونے میں ایک چمکتی ہوئی شے پر پڑی۔ یکلخت میرا دل خوش آئند تصور سے دھڑکا۔ وہ کانچ کا ٹکڑا تھا۔

یہ یقیناً اس ٹوٹے ہوئے گلاس کا ٹکڑا تھا جو ممتاز خان

نے پانی پینے کے بعد غصے سے پھینکا تھا۔ میرے بازو میں درد ہونے کے باعث میں زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے اول خیر کو یہ بات بتائی، اس نے ایک لمحہ بھی دیر کیے بغیر کونے میں پڑے کانچ کے ٹکڑے کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔

''یہ کیا کرنا چاہ رہا ہے؟'' شوکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کے ساتھ ہولے سے بتا بھی دیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ مسرت و امید کی ہلکی سی کرن اس کے چہرے پر چمکی تھی۔

''اب ہم شکیلہ والے آئیڈیے پر کچھ آسانی سے عمل کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اس اثنا میں اول خیر نے بندھے ہونے کے باوجود غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا اور کانچ کا وہ ٹکڑا پشت کے رخ پر اپنی انگلیوں میں دبا کر دوبارہ ہمارے قریب کھسک آیا۔ اور پہلے میری رسیاں کاٹنے کا ارادہ کیا تو میں نے اسے پہلے شکیلہ اور آسیہ کی رسی کاٹنے کا کہا۔ میری اولین کوشش تھی کہ پہلے آسیہ اور شکیلہ کو یہاں سے فرار کروا دیا جاتا، مگر اول خیر نے ہی نہیں شوکی نے بھی میری بات سے اختلاف کیا۔

میں چپ ہو رہا۔ اول خیر نے اپنی پشت میری پشت سے ملا دی اور نجانے کس طرح اس نے وہ کانچ کا ٹکڑا اپنی انگلیوں میں پھنسا کر اس کی تیز دھار میرے ہاتھوں کی رسی پر آزمانی شروع کر دی۔ یہ آزادی حاصل کرنے کی ایک اندھی کوشش ست رو ضرور تھی مگر اس کا نتیجہ دیر سے سہی... یقینی ہو سکتا تھا بشرطیکہ کوئی ہال میں داخل نہ ہوتا۔

یہ چور کوشش جاری تھی۔ سب اول خیر کی اس کوشش کے کامیاب ہونے کی دل ہی دل میں دعا مانگنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ہماری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ہال میں ملعون جنگی خان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوا۔ اس مکار صورت آدمی کو میں نے چونکتے دیکھا۔ اندر آتے ہی اس کم بخت نے نظریں اٹھا کے سب سے پہلے میری طرف ہی دیکھا۔ اول خیر کو مجھ سے الگ ہونے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ یہ دیکھ کر جنگی خان یوں اچھلا تھا جیسے اسے بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔ وہ کسی شکرے کی طرح ہماری طرف لپکا اور جھک کر اول خیر کی بندھی ہوئی ٹانگوں کو دبوچ کر نہایت بیدردی سے ایک طرف گھسیٹ لیا... پھر اس کی نگاہ پشت پر پڑ گئی۔ میری دھڑکتی نظریں اس کی بھڑکتی ہوئی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر میں نے اسے جھکتے دیکھا۔ اب اس کے ہاتھ میں خون آلود وہ کانچ کا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ اس میں لگا ہوا خون یقیناً اول خیر کا ہی تھا۔ وہ کانچ کا ایک دھاری دار ٹکڑا تھا جس کا ہر سرا کند اور تیز تھا۔ میری رسی پر رگڑنے کی کوشش میں اول خیر کی انگلیاں لہولہان ہو گئی تھیں۔

جنگی خان خون آلود کانچ کے ٹکڑے کو دیکھتا رہا پھر ایک زہر خند نظر مجھ پر اور اول خیر پر ڈالی، اپنے قریب کھڑے ایک ساتھی کو موٹی سی گالی دی اور ٹکڑا اسے تھما دیا۔ پھر ایک زوردار لات زمین بوس پڑے اول خیر کے چہرے پر رسید کر دی۔ ایک تیز کراہ ہال میں گونج گئی۔ جنگی خان کی اس حرکت پر میرا دماغ پکنے لگا۔

''بزدل خان!... بندھے ہوئے آدمی پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ نر کا بچہ ہے تو اس کی رسیاں کھول کر مقابلے پر آ... مگر میں جانتا ہوں تیرے جیسے زنخوں کے بس کی بات نہیں یہ...''

میرے حقارت آمیز للکارنے پر اس نے وحشیانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے دانستہ اس کا نام بگاڑا تھا۔

''بہت گھمنڈ ہے تم لوگوں کو... بس تھوڑا سا انتظار اور کر لو... پھر دیکھنا تم پر کیسی قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں۔''

''ہمارا صرف ایک ہی قیامت پر ایمان ہے بزدل خان! جو اس خالقِ کائنات نے... رکھی ہے جس میں جزا و سزا کا حساب ہوگا۔ تمہارے جیسے شیطان جہنم میں دھکیلے جائیں گے۔'' اول خیر نے بھی میری تقلید کرتے ہوئے اسے بزدل خان کے لقب سے نوازا۔

جنگی خان کی آنکھوں میں قہرناک طیش کی سرخی ابھری۔ دانت پیس کر اس نے اول خیر کی گردن پر اپنا جوتا رکھ دیا اور اس پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تم اگر صرف میرا شکار ہوتے تو تم جیسے بڑبولوں کا وہ حشر کرتا کہ میرا نام بگاڑنے کا مطلب تمہاری سمجھ میں آ جاتا۔''

''استاد! ہمیں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا کام نمٹانا چاہیے۔'' اس کے ایک گماشتے نے اسے ٹوکا۔

جنگی خان پلٹ گیا پھر اپنے ساتھی سے تحکمانہ بولا۔ ''ساتھ کا کمرا تیار کرو... باقی سامان کدھر ہے؟''

''ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ مزید دو گماشتے اندر داخل ہوئے۔ ایک کے پاس وہی ہینڈ بیگ تھا جو آسیہ کی ملکیت تھی جس کے اندر ویڈیو کیمرا، لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ وغیرہ سے متعلق سامان موجود تھا۔ جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں بڑا سا لوہے کا زنگ آلود بکس تھا جو عموماً پلمبر یا مکینک

وغیرہ کے پاس ہوتا ہے۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پیٹ میں گانٹھیں سی پڑنے لگیں۔ اس سامان کا مقصد یقیناً ہم پر کوئی غیر انسانی اور انسانیت سوز حربے آزمانا تھا تو ہمارے پاس اب سوائے اللہ سے مدد مانگنے کے اور کیا چارہ باقی رہ جاتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یقیناً میری طرح اول خیر وغیرہ بھی ان چیزوں کو دیکھ کر تشویش زدہ ہو رہے ہوں گے۔ بلکہ میں نے تو کسی کی ہلکی سسکاری بھی سنی تھی۔ یہ شاید آسیہ کے حلق سے خوف کے باعث برآمد ہوئی تھی۔ مگر اصل کھٹک جو مجھے اور شاید آسیہ کے دل کو بھی بے چین کر گئی تھی، وہ اس کا چرمی ہینڈ بیگ تھا۔

یہ لوگ اس سے بھلا کیا کام لینا چاہتے تھے...؟ کیا مجھ سے کوئی جھوٹا بیان... یا کچھ اور...؟

دونوں گماشتے ہماری نظروں کے سامنے سے وہ سامان جھلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے، پھر جنگی خان نے دو مسلح افراد کو وہیں کمرے میں موجود رہنے کی تاکید کی پھر وہ اپنے دیگر ہرکاروں کے ساتھ ہال کمرے سے نکل گیا۔

پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ ہم ایک خطرناک اور جنونی دشمن کے قبضے میں تھے اور اسی کے رحم و کرم پر بھی۔ یہ احساس ہی بڑا جاں گسل تھا کہ آئندہ آنے والے لمحات ہمارے لیے بقول ممتاز خان اور جنگی خان کے کسی قیامت سے کم نہ تھے۔

انہی ہولناک ساعتوں میں کچھ وقت اور سرک گیا۔ دونوں مسلح گماشتے ایک چارپائی پر بیٹھ گئے تھے، وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی میں ہم آپس میں فرار سے متعلق یا اور کسی قسم کا تبادلہ خیال کرنے سے بھی قاصر تھے۔

وقت گویا کسی بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا۔ اچانک آسیہ رو پڑی۔ اول خیر نے اسے جھڑکا۔ ”اے لڑکی! کیا تجھے اللہ پر بھروسا نہیں؟ جو کچھ ہونا ہوتا ہے صرف اور صرف اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔“

میں نے بھی آسیہ کو تسلی دینا ضروری سمجھا۔ ”آسیہ! تم تو بہت حوصلے والی تھیں پھر یہ آنسو...؟“

شکیلہ اس کے مقابلے میں مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اس کی وجہ شاید کچھ اس کی فطرت تھی اور کچھ وہ کڑے حالات تھے جن سے وہ ماضی قریب میں گزر چکی تھی۔ اس نے بھی آسیہ کو تشفی دی۔ ”آسیہ بہن! اللہ پر بھروسا رکھو۔ ہم نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا ہے اگر کسی شیطان کے انتقام اور عتاب کا نشانہ بنانے کے لیے ہمیں یہاں لایا گیا ہے تو یہ حق و باطل کی جنگ کہلائے گی جس میں فتح بہرحال حق کی ہی ہوتی ہے۔“

ہمارے ان الفاظ نے آسیہ کے پست حوصلوں کو کچھ ڈھارس دی۔ وہ کچھ سنبھلتے ہوئے بولی۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتی۔ وہ برحق ہے۔ لل... لیکن میں اپنے عورت ہونے سے ڈرتی ہوں۔ اس کی پامالی... ایک عورت ذات کے لیے موت سے بھی بڑھ کر سزا ہے۔“

اس کے جواب پر ہم سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہمارے چہرے گنگ سے ہو گئے۔ پھر کوئی نہیں بولا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے دونوں گماشتے ہماری طرف دیکھ کے خبیثانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ پھر میں نے ایک دوسرے سے دھیمی آواز میں کہتے بھی سنا۔

”لگتا ہے سالی کو وقت سے پہلے معلوم پڑ گیا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“

ایک ہولناک خیال تلے مجھے بھی اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اسی طرح دن ڈھلنے لگا۔ بھوک کا احساس تو اتنا نہ تھا مگر پیاس کی شدت سے مجھے اپنا حلق سوکھتا محسوس ہوا۔ میں نے ان دونوں خبیثوں سے پانی پلانے کی بھی درخواست کی۔ جو انہوں نے سنی ان سنی کر ڈالی۔ اب میرا دھیان بار بار بیگم صاحبہ کی طرف جا رہا تھا کہ انہیں اب تک ہمارے کسی مصیبت میں گرفتار ہونے کا علم ہو چکا ہو گا۔ پھر ایڈووکیٹ خانم شاہ بھی تو تھیں۔ آسیہ کی بڑی بہن جن کی رہائش گاہ پر سب سے پہلے ہمارا لائیو پروگرام کرنے کا ارادہ تھا مگر پھر بعد میں حالات ایسے ہوئے کہ ہم نے شوکت کے ہاں یہ پروگرام کرنے کا منصوبہ بنایا اور آسیہ بھی اپنے مختصر ساز و سامان کے ساتھ وہاں آن پہنچی تھی۔ یقیناً اس کی بہن خانم شاہ نے سیل پر رابطہ کر کے خیریت وغیرہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہوگی اور یہی کچھ بیگم صاحبہ نے بھی کیا ہو گا مگر ہمارے سیل سے جواب نہ پا کر وہ لوگ یقیناً پریشان ہو گئے ہوں گے اور اپنے تئیں ہماری تلاش کی کوشش میں مصروف بھی ہوں گے۔ خانم شاہ کے مقابلے میں مجھے بیگم صاحبہ کی طرف سے جلد مدد پہنچنے کی کچھ امید تو تھی کیونکہ ہمارے اچانک غیاب سے بیگم صاحبہ کے ذہن میں فوری خدشہ یہی پیدا ہوا ہو گا کہ ہم یقیناً ممتاز خان کی قید میں جا چکے ہوں گے اور پھر بیگم صاحبہ کہاں چین سے بیٹھی ہوں گی؟ وہ ایک طرح سے میرے دشمن ممتاز خان کے گھر کی بھیدی

تھیں، انہیں سب معلوم ہوگا کہ ممتاز خان کے خفیہ ٹھکانے کہاں کہاں ہو سکتے تھے مگر... سوال یہ تھا کہ ان کی متوقع مدد کی امید کب تک بارآور ثابت ہو سکتی تھی؟ جبکہ ان حالات میں ممتاز خان نے بھی اپنی بہن یعنی بیگم صاحبہ کو سبق سکھانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ بھلا اس کے گمان میں یہ بات کیسے نہیں ہو سکتی تھی کہ ہماری مدد کے لیے اس کی بہن کا فوراً حرکت میں آنا یقینی امر تھا۔

اب تو سب کچھ تقدیر پر ہی منحصر تھا کہ مشیتِ ایزدی سے کیا ظہور میں آتا ہے کیا وقوع پذیر ہوتا ہے؟

☆☆☆

دن ڈھلتے ہی ہال کمرے کی کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں اور کچھ مزید لائٹس آن کر دی گئی تھیں۔ وقت گویا اب ہمارے دل کی دھڑکنوں کے مساوی دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔

باہر گاڑی رکنے کی آواز ابھری... دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ اس کے چند ثانیوں بعد ہال کمرے کے کھلے ہوئے دروازے پر بھاری قدموں کی متعدد آوازیں ابھریں۔ پھر ممتاز خان اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر غضب ناکی کے بجائے بشاشت دوڑ رہی تھی۔ جنگی خان بھی اس کے ہمراہ تھا۔ باقی چار پانچ مسلح کارپرداز... ایک نے پھرتی سے موڑھا اس کے بیٹھنے کے لیے قریب سرکا دیا۔ وہ اس پر براجمان ہو گیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگانے تک اس کی برماتی ہوئی نظریں مجھ پر پیوست رہیں۔ مجھے ان نظروں میں خونخواری اور آنے والے کڑے وقت کی وحشت ناکی محسوس ہوئی۔ ایک گہرا کش لے کر اس نے آسیہ کی طرف دیکھا اور کھرکھراتی ہوئی کاٹ دار آواز میں بولا۔

"مس لیڈی رپورٹر...! تمہیں بڑا شوق تھا میرے خلاف آن ایئر لائیو پروگرام چلانے کا... تمہارا یہ شوق اور یہ حسرت میں ضرور پوری کروں گا۔" رکتے ہوئے اس نے جنگی کو اشارہ کیا۔ وہ جیسے حکم کا منتظر تھا۔ چابی بھرے کھلونے کی طرح فوراً حرکت میں آیا اور آسیہ کے قریب پہنچ کر اس کے ہاتھوں پیروں کے جکڑ بند کھولے۔ میں لیٹے لیٹے سر اٹھا کر ممتاز خان سے مخاطب ہوا تو خود مجھے اپنی آواز اجنبیت کا شائبہ دیتی محسوس ہوئی۔ "ممتاز خان! تیرے ساتھ میری کوئی پرانی دشمنی نہیں تھی اور نہ اب ہے۔ یہ سب وقت کے دھارے اور محض اپنے دفاع کا نتیجہ تھی۔ اس دشمنی کو ادھر ہی ختم کر دے، اسے میری زندگی کا اولین مقصد نہ بنا..."

"بہت خوش فہمی ہے تجھے یہاں سے زندہ بچ نکلنے کی...؟" وہ دانت پیس کر غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"زندگی اور موت صرف اس قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے ممتاز خان!" میں نے جوش سے لرزتی آواز میں کہا۔ "وہ جسے چاہے عین موت کے منہ سے نکال کر زندگی کی شاہراہ پر گامزن کر دے اور جسے چاہے کرسی پر آرام سے بیٹھے انسان کو موت کے اندھیروں میں دھکیل دے۔"

"تو کیا سمجھتا ہے، میں تجھے چھوڑ دوں گا؟ جانتا ہے تو فرخ کون تھا؟ میرا اکلوتا بیٹا تھا وہ..." اپنے بیٹے کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں خون کی لالی اترنے لگی۔ "میرے سامنے یہ گھسا پٹا جملہ مت بولنا کہ وہ تمہارے ہاتھوں قتل نہیں ہوا تھا، اگر تم میری کوٹھی میں نقب نہیں لگاتے تو یہ سب نہ ہوتا..."

"تم نے عابدہ کو اپنے کتوں کے ذریعے اغوا کرانے کا ناقابلِ تلافی جرم کیا تھا۔ اس کے جواب میں، میں تیرے بیٹے کو محض اغوا کر کے تجھے بھی اس اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا تھا اس کے علاوہ کچھ اور مقاصد بھی تھے میرے، مگر میں کسی نہتے اور مجبور انسان کو جان سے مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"اس کا انتقام تم میرے ایک آدمی.... کو بیدردی سے قتل کر کے لے چکے تھے۔"

"میرا شکار... یہ مردود جنگی خان تھا۔ اس کی سرکردگی میں عابدہ کو اغوا کر کے اس کے اڈے رانگی چاڑہ پہنچایا گیا تھا۔"

اس اثنا میں جنگی خان، آسیہ کو دبوچ کر ممتاز خان کے سامنے لے آیا۔ وہ بری طرح سراسیمہ ہو رہی تھی۔ ممتاز خان کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی جبکہ جنگی خان کی آنکھوں میں شیطانیت ہلکورے لے رہی تھی۔

"مس لیڈی رپورٹر... ذرا تصور کرو جب تمہاری ایک شرمناک ویڈیو کلپ انٹرنیٹ کی سوشل ویب سائٹ پر چلے گی... دکانوں پر بکے گی۔ ایسی ریئل کلپ کی بڑی مانگ ہوتی ہے۔" ممتاز خان کے ان شیطانی جملوں نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ آسیہ بے چاری کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔ میں حلق کے بل چیخ کر بولا۔

"ممتاز خان...! ایک شریف اور معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا کر کے تو اللہ کے عذاب کو تو آواز دے ہی رہا ہے مگر... مگر میں دنیا کو تیرے لیے عبرت کا نمونہ بنا دوں گا۔ ایسا مت کر..."

"بہت مزہ آرہا ہے مجھے... شہزی! تیرا اس طرح میرے سامنے بے بسی سے داد فریاد کرنا..." وہ حظ اٹھاتے ہوئے انتہائی کمینگی سے مسکرا کر بولا۔

"یہ داد فریاد نہیں ہے... ممتاز خان! اسے چھوڑ دے۔" میں نے سلگتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اندر سامان تیار ہے؟" ممتاز خان نے دانستہ میری طرف سے دھیان ہٹاتے ہوئے جنگی خان سے پوچھا۔

"جی ہاں جناب! سب تیار ہے۔" جنگی خان نے جواب دیا۔ مجھے اس خبیث کتے کی آواز میں حیوانی تلذذ کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

"اوئے... خیال رہے تمہارے چہرے نہیں آنے چاہئیں سامنے... یہ ایک "گینگ ریپ" کلپ ہوگا، سمجھے تم... مگر اس لیڈی رپورٹر کا چہرہ واضح ہونا چاہیے... اور سب کچھ فری اسٹائل ہونا چاہیے... سمجھے تم لوگ؟"

ممتاز خان نے اسے ہدایت دی، جنگی خان کی چندھی چندھی آنکھوں میں بھیڑیے جیسی چمک عود کر آئی جیسے وہ شکار کو پھاڑ کھانے کے لیے بے صبرا ہوا جا رہا ہو۔ اس نے محض اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ پھر ممتاز خان نے میری طرف بھویں اچکا کر خار دلانے والے انداز میں مسکرا کر دیکھا اور پھر مخصوص اشارہ کر دیا۔

جنگی خان نے آسیہ کو کمرے کی طرف گھسیٹا۔ چار ساتھی اس کے پیچھے چلے۔ ان کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جدھر یہ شیطانی کھیل کھیلا جانے والا تھا۔ آسیہ چیخنے چلانے لگی، مجھے پکارنے لگی "م... مجھے بچالو شہزی... مجھے بچالو۔"

شدتِ غیظ و غضب سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ آنکھوں سے خون ابلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دل جیسے جلتی سلگتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا جیسے پھٹ جائے گا۔

"ممتاز خان...!" میری آواز پھٹ گئی۔

اول خیر نے لب کشائی کی۔ "ممتاز خان...! ایسا مت کر... ایک شریف لڑکی کے ساتھ۔ مت بھول کر تو بھی ایک جوان بیٹی کا باپ ہے۔ ارے ظالم... جو خود بیٹیوں والے ہوتے ہیں انہیں تو ہر لڑکی اپنی بیٹی ہی کے روپ میں نظر آتی ہے۔"

"ہا... ہا... ہا... مجھے بہت لطف آرہا ہے تمہاری فریاد میں... تمہاری منتیں سماجتیں سن کر... بولو اور بولو۔" ممتاز خان مکروہ لہجے میں بولا۔

جنگی خان اپنے چار شیطان ہرکاروں کے ساتھ چیختی چلاتی مدد کے لیے پکارتی بے بس آسیہ کو دبوچ کر گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

مجھ پر جنونیوں کی سی وحشت طاری ہونے لگی۔ میں نے اپنے جسم و جان کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں پیروں کی رسیوں کو توڑنے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دی۔ اس قدر کہ مجھے اپنے ہاتھوں کی کلائیاں چھلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ایسے میں زخمی بازو کا درد بھی پوری شدت سے جاگ اٹھا۔ مگر میرے دل و دماغ اور حواسوں پر وحشیانہ جنون طاری تھا۔ ایک آتش فشاں تھا کھولتا ہوا، سلگتا ہوا جو پھٹنے اور لاوا اگلنے کو بے چین ہو رہا تھا۔

"اول خیر...! اس مردود شیطان کو سمجھا... اسے بتا، یہ ایسا نہ کرے۔ یہ اندر اپنے شیطانوں کو اس پاک دامن معصوم عورت کے ساتھ ایسا ظلم کرنے سے روک دے۔" میری حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔

ممتاز خان سامنے موڑھے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا خبیثانہ انداز میں مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ممتاز خان! تو یقیناً ایک باپ کی اولاد نہیں ہو سکتا... ورنہ ایسی گری ہوئی غیر اخلاقی حرکت نہ کرتا جس سے انسانیت بھی لرز اٹھے۔ اب تو ذرا تصور کر... یہی سب تیری اپنی بیٹی نوشابہ کے ساتھ ہوتا... پھر تیری کیا حالت ہوتی؟ بول ممتاز خان...؟" اول خیر کا لب و لہجہ عجیب ہو گیا۔ وہ بھی یقیناً میری طرح ذہنی ہیجان میں مبتلا تھا پھر جیسے اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا۔

"ممتاز خان! اندر فریاد کرتی آسیہ نہیں... تیری بیٹی نوشابہ ہے۔ تصور کر... وہ تیری بیٹیوں جیسی ہے۔ روک لے اپنے خونخوار کتوں کو۔" وحشتِ جنوں میں اس کی آواز پھٹنے کے قریب ہو گئی۔

میرا اپنا دماغ الٹنے لگا تھا۔ میری بے چین جلتی سلگتی انگارہ نظریں بار بار اس شیطانی کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں شیر کی طرح غراتا ہوا اندر جا گھسوں اور ان شیطان بھیڑیوں کی بوٹی بوٹی دانتوں سے بھنبھوڑ ڈالوں۔

آسیہ بے چاری کے تو سان و گمان میں بھی یہ نہ ہوگا کہ اسے کھلاں والی میں میری ایک "غلط فہم" ویڈیو کلپ بنانے کا کتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اگرچہ بعد میں اسے احساس ہو گیا تھا کہ جو منظر اس نے کلپ بند کیا ہے وہ غلط تھا۔ تب سے اس نے اپنی اس غلطی کا ازالہ کرنے کا عزم کر

رکھا تھا اور اپنے منگیتر ریحان کے منع کرنے کے باوجود سچ کو ظاہر کرنے کی خاطر اس روز سے میرے مشن میں شامل ہو گئی تھی اور اس ویڈیو کلپ کی تردید میں دوسری ویڈیو تیار کرنا چاہتی تھی جس میں ممتاز خان کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو جاتا مگر افسوس... آج اسی پاداش میں وہ کن قیامت خیز لمحات سے گزر رہی تھی اس کا تصور ہی سوہان روح تھا۔

کڑا وقت اپنی تمام تر اذیتوں اور شدتوں کے ساتھ حاوی رہے تو ایک ایسی کیفیت بھی آتی ہے جسے لامحالہ بے حسی کا ہی نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ بے حسی درحقیقت بے بسی اور شدتِ درد کی انتہائی اور آخری منزل ہوتی ہے، مجھ پر بھی شاید ایسی ہی بے رحمانہ بے حسی طاری ہو گئی تھی۔

میں ہولے ہولے ہانپنے لگا تھا... بالکل اس طرح جیسے شیر شکار کا تعاقب کرنے اور ناکامی کے بعد ایک طرف بیٹھ کر ہولے ہولے ہانپتا ہے اور خود کو دوبارہ تیار کرتا ہے۔ اول خیر بھی خاموش تھا۔ شکیلہ کی سسکیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ شوکی گنگ پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔

صدیوں پر محیط ایک ایک پل کا اجتماع نصف گھنٹے تک محیط رہا۔ پھر دروازہ کھلا۔ ہماری نیم مردہ شرمسار نظریں اس بے رحم کمرے کے کھلے دروازے کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے جنگی خان اور اس کے چاروں شیطان گماشتے برآمد ہوئے۔ وہ سب منہ لٹکائے برآمد ہوئے تھے۔ ان کی نامرادی شکلیں دیکھ کر ایک لمحے کو اطمینان سے موڑھے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے ہوئے ممتاز خان کو بھی چونکا دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بھویں سکیڑ کر ان سے پوچھا۔ ”کیا ہوا جنگی...؟“

”جناب وہ مر گئی۔“ جنگی خان نے بے رحمی سے جواب دیا۔

ہال کمرے میں شکیلہ کی ماتمی آہ ابھری۔ وہ سسک کر رونے لگی۔ اول خیر نے شدتِ کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے گوشوں سے بے اختیار آنسوؤں کی لکیریں پھوٹ پڑیں۔ ایسے میں بدنصیب آسیہ ہی کے وہ الفاظ یاد آنے لگے جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے مجھ سے کہے تھے۔

”شہزی...! میں موت سے نہیں ڈرتی ہوں، وہ تو برحق ہے لیکن میں اپنے عورت ہونے سے ڈرتی ہوں۔ اس کی پامالی... ایک عورت ذات کے لیے موت سے بھی بڑھ کر سزا ہے۔“ آسیہ کے یہ الفاظ یاد کر کے میرا دل ہی نہیں پورا وجود ہی دکھ سے بھر گیا۔

میرے چشم تصور میں اس کے منگیتر ریحان کا چہرہ ابھرا... جس نے اپنے تئیں بہت کوشش چاہی تھی کہ آسیہ ان چکروں میں نہ پڑے۔ اس وجہ سے اس نے مجھے دھوکا بھی دینے کی کوشش کی تھی۔ درحقیقت میں خود بھی یہی چاہتا تھا اور بارہا آسیہ کو روکنے کی بھی کوشش کر چکا تھا۔ تاہم آسیہ نے جلد بازی کے جوش میں جو فاش غلطی کی تھی اس کے ازالے کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جواب میں تردیدی ویڈیو جاری کرے۔ وائے افسوس... تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

بہرحال اس اطلاع پر ممتاز خان کا چہرہ یکلخت تاریک پڑ گیا۔ وہ یک دم موڑھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کیسے مر گئی... وہ...؟“

جنگی خان سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا ممتاز خان کی ساری خوشی آسیہ کی موت کی خبر سن کر غارت ہو گئی تھی۔ اس نے مارے طیش کے ہونٹ بھینچ کر ایک زوردار تھپڑ جنگی خان کے چہرے پر جڑ دیا۔

”خبیثو... کیا پہلے کبھی عورت نہیں دیکھی؟ جو مر بھکوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ میں نے سمجھایا تھا تمہیں کہ صرف فلم بنانی ہے۔“

”ہا... ہا... ہا... شیطان خان... اس معصوم لڑکی نے اپنی جان دے کر تم سب درندوں کو مات دے ڈالی۔ اصل جیت اسے کہتے ہیں یہی بہادری ہے۔“ اول خیر نے ایک قہقہہ لگا کر کہا مگر میں نے اس کی آواز میں دکھ کی لہر بھی محسوس کی... مجھے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ ایک خوف ناک چپ... شوکی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ شکیلہ کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ہال کمرے میں کرب انگیزی اور سوگواری کی کیفیت طاری تھی۔ ایک ٹھہراؤ کا سا احساس ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آ کر گزر چکا ہو۔

”لعنت ہے تم پر... جیت کا سارا مزہ ہی کرکرا کر کے رکھ دیا۔“ ممتاز خان نے اول خیر کی بات پر توجہ دیے بغیر دانت پیس کر اپنے گماشتوں کو کوسا۔ ”اب میرا منہ کھڑے کیا تک رہے ہو۔ جاؤ، اس کی لاش کو ٹھکانے لگاؤ اور اس کی ہر نشانی ختم کر دو۔“

”اس نشانی کا کیا کرو گے ممتاز خان...! جو کسی زخمی سانپ کی طرح میری آنکھوں میں تمہاری مکروہ صورت کی تصویر بن کر ہمیشہ کے لیے چسپاں ہو چکی ہے۔“ میں نے ممتاز خان کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن موڑ کر میری طرف غیظ آلود نظروں سے دیکھا

پھر بولا۔

’’بہت زعم ہے تمہیں اپنے آپ پر حقیر کیڑے... تیری باری بھی آئے گی... مگر اس طرح کہ پہلے تو اپنے سارے ساتھیوں کی باریاں اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا۔‘‘

اس اثنا میں ہماری سوگوار آنکھوں نے ایک اور اذیت ناک منظر دیکھا جو ہمیں خون کے آنسو رلا گیا۔ کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ آسیہ جیسی نرم و نازک خوب صورت لڑکی کو ایسی حالت میں بھی دیکھیں گے۔

ممتاز خان کی ہدایت پر جنگی خان کمرے سے آسیہ کی لاش کاندھے پر اٹھائے برآمد ہوا تھا۔ آسیہ کا بے سدھ وجود ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کے مردہ جسم کو کسی میلی سی چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ آسیہ کا آخری دردناک دیدار بڑا کرب ناک تھا۔ ہال کمرا ایک بار پھر آہ و فغاں سے گونجنے لگا۔

میری آنکھوں کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ دماغ کی نسیں پھٹ رہی تھیں۔ رگوں میں دوڑتا لہو شعلِ لاوا گردش کررہا تھا۔ روح تک لیر لیر ہونے لگی تھی۔ مجھے ہر طرف غمناکی کے اندھیرے نظر آرہے تھے اور ان اندھیاروں میں مجھے سلگتا ہوا آتشیں گولا متحرک نظر آرہا تھا۔ کاش... کاش میں آزاد ہوتا تو اس صفتِ ابلیس ممتاز خان اور جنگی خان سمیت ان چاروں گماشتوں کا خون پی جاتا۔

ممتاز خان اٹھ کر باہر نکل گیا۔ دو آدمی چارپائی پر جا بیٹھے۔

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ وقت کو جیسے موت آگئی ہو وہ رکا ہوا محسوس ہونے لگا۔

’’ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ میری بہن...‘‘ معاشوکی کی لرزتی آواز ابھری۔

’’میں ایسا کوئی اذیت ناک منظر دیکھنے سے پہلے مر جانا بہتر سمجھوں گا۔‘‘ وہ بے حال سا ہونے لگا۔ ہم اسے کیا جواب دیتے۔ اب تو ہر تسلی طفل تسلی ہی محسوس ہوتی تھی۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ جس کی موت جس حالت میں لکھی ہوتی ہے اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔

قیامت جیسی قیامت گزر چکی تھی۔ ہم چاروں مغموم خاموشی کے زیرِ اثر تھے۔ میں خاموشی سے سوچ رہا تھا۔ آخر اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پایا جائے؟ کچھ نہ کچھ تو سوچنا تھا اور کرنا بھی تھا۔ ممتاز خان جیسے درندہ صفت شیطان اور منہ زور حیوان کو لگام دینا ضروری تھا۔ آسیہ کی موت کا دکھ اپنی جگہ تھا مگر آگے کی سوچنا ازبس ضروری بھی تھا۔

پتا نہیں اب یہ رذیل اور صفتِ ابلیس ممتاز خان کسے تختۂ مشق بنانے والا تھا۔ میں اس کی درندہ صفت سفاکی سے نہیں اس کے غیر اخلاقی اور انسانیت سوز حربوں سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ یہ بہت کمینی خصلت اور بدفطرت آدمی ثابت ہوا تھا بلکہ اسے تو انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین تھی۔

تھوڑی دیر اور گزری۔ باہر شاید رات کی تاریکی اترنے لگی تھی۔ وہ دونوں مسلح حواری چارپائی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور آپس میں کھسر پھسر کررہے تھے۔ ان کے بشروں پر اب سنجیدگی نظر آرہی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ ممتاز خان اور اس کے گماشتے ادھر ہی کہیں موجود تھے یا جا چکے تھے۔ اگرچہ مجھے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز تو آئی تھی۔ ممکن ہے ممتاز خان اس عمارت کے کسی آرام دہ کمرے میں موجود ہو، جبکہ اس کے ساتھی، آسیہ کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے جا چکے ہوں اور وہ ان کی واپسی کا منتظر ہو۔ گویا آج کی ساری رات بھی ہم پر کسی قیامت کی طرح مسلط کی جانے والی تھی۔

وقت ایک بار پھر گویا بھاری سل کی طرح گزرنے لگا۔ بڑے ہولناک لمحات میں ہم سانس لے رہے تھے کہ اچانک شکیلہ نے چارپائی پر بیٹھے دونوں حواریوں کو مخاطب کرکے بہ آوازِ بلند کہا۔

’’یہاں کوئی باتھ روم ہے؟‘‘ دونوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا، پھر آپس میں کھسر پھسر کی۔ پھر سر ہلا کے اس کی طرف سے لاتعلق ہو گئے۔ اب نجانے شکیلہ کو واقعی کوئی فطری حاجت ستا رہی تھی یا پھر وہ کوئی چالاکی کرنا چاہتی تھی، یہ وہی جانتی تھی۔ شکیلہ نے جب دیکھا کہ اس کی بات پر ان دونوں نے کوئی توجہ نہ دی تو چلا کر بولی۔

’’تم نے سنا نہیں، مجھے سخت پیشاب لگا ہے۔ کیا مجھ سے ڈرتے ہو... لعنت ہے تمہاری ہتھیار بند مردانگی پر... مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا اب، یہاں گندگی ہو جائے گی۔‘‘ شکیلہ نے انہیں اکسانے کے لیے عجیب حربہ استعمال کرنا چاہا۔ میں نے دیکھا شکیلہ کی بات پر ان دونوں کے بشروں پر غصے کی سرخی ابھری۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کھسر پھسر کی پھر ایک چارپائی سے اٹھا۔ میرا دل جانے کیوں یکبارگی زور سے دھڑکا۔ شکیلہ کا انداز واقعی بھڑکانے والا تھا اور کچھ خالی از علت بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آدمی اس کی طرف بڑھا۔ پھر قریب آکر اس کی نازک گردن پر اپنا بھاری بھرکم پاؤں رکھ کر اپنی رائفل کی نال اس کی گردن پہ چبھو دی اور غرایا۔

''کتیا...! اپنی زبان بند رکھ... ورنہ تیرا بھی اس لیڈی رپورٹر جیسا حشر کردوں گا۔''

''ذلیل... کتے... شرم نہیں آتی تجھے... لڑکی ذات سے ایسا سلوک کرتا ہے۔ اپنا ناپاک پاؤں ہٹا دے میری بہن کی گردن سے۔''

شوکی نے طیش میں آکر اسے للکارا۔ حواری کے چہرے پر پہلے قدرے چونکنے کے اور پھر پُرطیش تاثرات ابھرے۔ وہ شکیلہ سے ہٹ کر اس کی طرف بڑھا۔ اور شوکی کے وجود پر لاتوں کی بارش کردی۔ وہ کراہنے لگا۔ شکیلہ چیخنے لگی۔ میں گلا پھاڑ کر دہاڑا۔

''لعنتی نسل کے انسان... بندھے ہوؤں پر لاتیں چلا رہا ہے۔ یاد رکھنا ایک ایک سے حساب لوں گا۔ تم سب کو عبرت کا نمونہ بنا دوں گا۔''

یہ سن کر چارپائی پر بیٹھا ہوا اس کا دوسرا رائفل بردار ساتھی بھی خوفناک انداز میں غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ راہ میں اول خیر پڑا تھا۔ اس نے بندھے ہونے کے باوجود جانے کس طرح اپنا جسم موڑا تھا کہ قریب سے گزرتا ہوا وہ حواری اس کی ٹانگوں سے الجھتا ہوا بری طرح لڑکھڑا گیا اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ نتیجتاً وہ منہ کے بل ہمارے درمیان آن گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگری۔ میں اور اول خیر بیک وقت جکڑ بند ہونے کے باوجود حرکت کرنے کی ایک بے بس کوشش کرتے ہوئے اس پر جاپڑے۔ مگر وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور سب سے پہلے گری ہوئی اپنی رائفل پر قبضہ جمایا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی شکیلہ کو چھوڑ کر ہماری طرف لپکا۔ ہماری بے مراد کوشش کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ ہم شیطان کے چیلے کی شکیلہ کی طرف سے توجہ ہٹانے میں تو ضرور کامیاب ہوگئے تھے مگر خود زیرِعتاب آگئے۔ ان دونوں نے مجھے اور اول خیر کو رائفلوں کے کندوں اور لاتوں سے پیٹنا شروع کردیا۔ جب تھک گئے تو ایک طرف کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔

''اب تم لوگ اپنا منہ بند رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے دونوں چارپائی کی طرف بڑھ گئے۔ میرے اور اول خان کے ناک اور منہ سے خون جاری ہوگیا تھا۔ شوکی سے ہماری یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ وہ چلا کر بولا۔ ''ظالمو! ان کا خون بہہ رہا ہے... یہ مرگئے تو اپنے باپ ممتاز خان کو کیا جواب دو گے؟'' ان دونوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ہمارا خون بہہ بہہ کر ایک قدرتی عمل کے تحت جم کر خود ہی بہنا بند ہوگیا۔

اس دوران مجھے اول خیر کی ہلکی سرگوشی سنائی دی۔

''کاکا... ! مگر یہ خون ضائع نہیں گیا۔ اس بہانے میں تیرے قریب ہوگیا ہوں، میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے ہیں... تو اسی طرح پڑا رہ میری طرف اپنی پشت کیے۔''

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ پروانۂ آزادی کو ایک ذرا راہ کیا سجھائی دی کہ میرے اندر کا سویا درندہ بیدار ہونے لگا۔ اول خیر جانے کب سے اپنے دونوں ہاتھوں کی رسیوں پر زور آزمائی کر رہا تھا... نجانے وہ کیسے رسی کھول پایا تھا جبکہ ایک کوشش میں بھی اس طرح کی کرچکا تھا اور سوائے ہاتھوں پیروں کی کھال چھیلنے کے کچھ نہ کرسکا تھا۔

''تو ایک کام کر... کھانسنے کے بہانے اپنی پشت کو حرکت دے کر میرے ذرا اور قریب کرلے، ورنہ میرے بازوؤں کے پھیلاؤ اور بدلتی پوزیشن سے یہ دونوں مردود شک میں پڑجائیں گے۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور زور زور سے کھانسنے لگا۔ ساتھ ہی اپنی پشت اس کے مزید قریب کرلی۔ میں نے کھانسنے کی صورت میں ایک طرف گردن اٹھا کر خون بھی تھوک ڈالا۔ تاکہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے دونوں یہی سمجھیں کہ خون حلق میں پھنسنے نے مجھے کھانسنے پر مجبور کیا ہے۔

دونوں نے میری طرف دیکھا بھی تھا اور پھر دوبارہ اپنی طرف دھیان کرلیا تھا۔ ان کی چارپائی کا فاصلہ ہم سے تقریباً آٹھ نو فٹ کے فاصلے پر دیوار کے ساتھ اور دروازے کے قریب تھا۔ میں نے اپنی پشت پر بندھے ہاتھ کی رسیوں پر اول خیر کے زخمی ہاتھوں کی حرکت محسوس کی اور ایک لمحے کو لرز اٹھا۔ اول خیر کے ہاتھوں کا لمس مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے گوشت کے چھلے ہوئے لوتھڑے ہوں... میرے خدا! اس نے جانے کس اذیت کے ساتھ جان توڑ کوشش سے اپنے ہاتھ رسی کی گرفت سے آزاد کیے تھے۔ بہرحال وہ کوشش میں لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میرے ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ورنہ ہماری ساری محنت اکارت جاتی۔ ہاتھ آزاد ہونے کے باوجود ہم نے اپنے دونوں بازوؤں کی پوزیشن ویسے ہی رکھی تھی۔

میں نے ایک بار پھر کھانسنے کا عمل کیا اور اپنے جسم کو اس طرح بل دیا جیسے پسلیوں میں درد ہو رہا ہو۔ اس طرح لیٹے لیٹے میری پوزیشن بدلی۔ اب میری دونوں ٹانگیں اول

''او خیر... کاکے... میرا تو پورا وجود ہی زخمی ہو رہا ہے... یہ زخم میرے جوش اور طاقت کو ہوا دیتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''پر میں تیری آنکھوں میں شیر جیسی چمک اور چیتے جیسا جوش دیکھ رہا ہوں، خود کو سنبھالنا، زیادہ جوش بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گا۔''

''تو فکر نہ کر۔'' میں نے کہا اور باہر جھانکا۔

مختصر سے برآمدے کے باہر فارم کے احاطے میں رات کی سیاہی اتری ہوئی تھی۔ چھتوں کی دیواروں پر کچھ بلب نصب تھے جن کی روشنی میں مجھے سب نظر آ رہے تھے۔ مگر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ان میں نہ ممتاز خان تھا نہ ہی جنگی... البتہ وہ چاروں مردود حواری ضرور تھے جو جنگی کے ساتھ آسیہ کو اپنی بربریت کا نشانہ بنانے کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ وہ شاید بدنصیب آسیہ کی لاش ٹھکانے لگا آئے تھے۔ ایک جیپ کھڑی تھی وہ چاروں اسی میں سے اترے تھے اور وہیں احاطے میں کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے اول خیر سے کہا۔

''ابھی ان کے اندر آنے میں کچھ دیر محسوس ہوتی ہے... تم جلدی سے شوکی اور شکیلہ کو آزاد کر دو۔''

اول خیر نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میری ہدایت پر عمل کیا۔ جب تک وہ اپنے کام سے فارغ ہوا میرا دل یہ دیکھ کر یکبارگی زور سے دھڑکا کہ وہ سب ہلکی آواز میں قہقہے لگاتے ہوئے اسی ہال کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ ان کی تعداد اب چھ تھی وہ سب مسلح تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہال کمرے میں ان کی یقینی موت کا سامان کیا جا چکا تھا۔ بندھے ہوئے زخمی شیر آزاد ہو چکے تھے اور کسی کو بھی چیر پھاڑ ڈالنے کو کھلے پنجرے میں دندنا رہے تھے۔

☆☆☆

ممکنہ خون ریز مقابلے کے پیش نظر ہم نے شکیلہ اور شوکی کو اندر کمرے میں جانے کا کہا تھا مگر شوکی اپنی بہن کو کمرے میں چھوڑ کر دوبارہ ہمارے ساتھ آن ملا تھا۔ میں نے اور اول خیر نے تنبیہہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سنجیدگی سے فقط اتنا بولا۔

''آئندہ مجھے مقابلے کے میدان میں خود سے الگ کرنے کا کبھی مت کہنا ورنہ شوکی تم دونوں کی دوستی کو فراموش کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگائے گا۔''

شوکی کے لہجے اور آواز میں گزرے کڑے وقت کا سوز بھی تھا اور آنے والے فیصلہ کن محاذ میں ڈٹ جانے کا جوش بھی۔ اس کی آواز میں ایسی پرجوش تھرتھراہٹ تھی کہ خیر کی پشت کی سمت ہو گئیں۔ وہ ان کی رسی کھولنے میں مشغول ہو گیا۔

یہ سب کچھ چھپ چھپاتے اور نہایت رازداری سے انجام پذیر ہوا تھا۔ اب میں آزاد تھا۔ اول خیر کی کچھ ایسی صورتِ حال تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں کی رسی نہیں کھول سکتا تھا۔ یہ فریضہ میں ہی انجام دے سکتا تھا۔ وہ دونوں گاہے بگاہے ہماری طرف بھی نظر ڈال لیتے تھے۔ اگر ہم بغیر کھانسے اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کرتے تو ان دونوں کو شبہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس بار اول خیر کھانسا اور اپنے جسم کو بل دیا۔

اسی وقت ان دونوں نے ہماری طرف دیکھا تو اول خیر ہانپنے کے انداز میں دانستہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

''...مم... مجھے... ایک... گلاس پانی تو پلا دو... خون میرے حلق میں اتر رہا ہے۔''

''اپنے خون سے ہی پیاس بجھا لو... ہا... ہا...''

ان میں سے ایک نے زہر خند طنز سے کہا مگر ہمارا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اول خیر نے اپنی ٹانگیں اکڑوں انداز میں موڑ کر پشت کی طرف موڑ لی تھیں اور میرے پشت کی طرف بظاہر ''بندھے'' ہوئے ہاتھ اس کی ٹانگوں کے جکڑ بند کو چھونے لگے۔ میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اس دوران میں نے شوکی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا... شاید ہماری کارروائی کا اسے ''خوش کن'' شبہ ہو چلا تھا۔ جس وقت میں اول خیر کی رسی کھول چکا تھا ٹھیک اسی وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ ہم بری طرح ٹھٹکے، چارپائی پر بیٹھے وہ دونوں گماشتے چونک کر اٹھے۔ اپنی رائفلیں سنبھالیں اور دروازے کی طرف بڑھے۔

''او خیر... چل کاکا اللہ کا نام لے، آگے بڑھ یہی موقع ہے۔'' ان دونوں کے باہر نکلتے ہی اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھ سے کہا۔ اور پھر ہم دونوں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ شکیلہ تو متحیر رہ گئی۔ مسرت کے مارے اس کے حلق سے ہلکی سی سسکاری بھی برآمد ہوئی تھی۔

ان کی طرف توجہ دینے کا وقت نہ تھا۔ وہ لوگ کسی بھی وقت دوبارہ آ سکتے تھے۔ ہم دونوں لپک کر ہال کمرے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اس دوران میری نظریں اول خیر کے ہاتھوں پر پڑیں۔ وہ بری طرح چھلے ہوئے تھے۔ میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

''اول خیر! تیرے ہاتھ زخمی ہیں۔''

پھر مجھے یا اول خیر کو اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ ہم دونوں کی طرح وہ بھی ان ابلیس صفت رذیلوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اپنی بقا اور تحفظ کا جذبہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک عام انسان کو بھی بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔

میں نے دیکھا۔ وہ مختصر سے برآمدے میں آکر رک گئے تھے۔ اب ان کی باتوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ مذکورہ چاروں میں سے ایک نے دونوں پہرے دار ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جیدی! چودھری صاحب حویلی جا چکے ہیں۔ استاد جنگی خان بھی ان کے ساتھ ہے۔ ہم ایک نظر یرغمالیوں پر ڈال لیں پھر ڈیرے کی راہ لیں گے۔ ویسے سب ٹھیک تو ہے ناں... اندر؟'' جیدی نامی اس آدمی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''سب ٹھیک ہے جی... فکر دی لوڑ نہیں۔ بس ذرا وہ زنانی پیشاب کرنے کے لیے شور مچا رہی تھی، ویسے ان کا اب کرنا کیا ہے؟''

''اب ان لوگوں کا فیصلہ کل صبح ہی ہوگا۔''

''ہو جائے فیصلہ تو اچھا ہے۔ اس ڈیوٹی سے جان چھوٹے۔'' دوسرے نے پوچھا۔ ''ویسے کرنا کیا ہے ان کا؟'' میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پہلے شیطان نے سفاکی سے کہا۔

''چودھری صاحب نے انسپکٹر روشن کو فون کر دیا ہے۔ وہ صبح تڑکے پولیس کی بھاری نفری لے کر یہاں پہنچے گا۔ شہزی اور اس کے ساتھی اول خیر کو تو جعلی پولیس مقابلہ دکھا کر ختم کر دیا جائے گا جبکہ ان دونوں بھائی بہنوں (شوکی اور شکیلہ) کو ڈیرے پر لے جا کر گولی مار دی جائے گی۔''

ان کے عزائم سن کر میں لرز گیا۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کے بشروں کی طرف دیکھا... کسی بھی وقت ہمارا خون ریز ٹکراؤ ہونے والا تھا۔ دونوں مسلح پہرے دار ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتے ہوئے...... اندر داخل ہوئے ..... اور پھر یکلخت جیسے ان پر میں اور اول خیر قیامت بن کر ٹوٹ پڑے۔

خوفناک ٹکراؤ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ وہ چاروں خونی مسلح ہرکارے بھی اپنے دونوں پہرے دار ساتھیوں کے عقب میں اندر آ رہے تھے لہٰذا یہ سب بجلی کی سی پھرتی سے کرنے کا متقاضی تھا۔ اولین کوشش ان کے ہتھیاروں پر چشم زدن میں قبضہ جمانا تھا۔ رائفلیں چھین کر انہیں واپس دروازے کی طرف دھکیلا تو وہ چاروں ابلیس بری طرح ٹھٹک گئے۔ اور اس بری طرح بدکے کہ انہوں نے اپنی گنوں کا منہ کھول دیا۔ یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی بدحواسی کا شاخسانہ تھا کیونکہ ان کے بھی سان وگمان میں کب یہ تھا کہ اندر بندھے ہوئے بے بس پڑے یرغمالی ایسا اچانک ایکشن بھی لے سکتے تھے۔ نتیجتاً ان کی بدحواسی کا نشانہ ان کے اپنے ہی وہ دونوں نہتے پہرے دار بنے۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ میں ان دونوں کی کریہہ چیخیں بھی شامل تھیں۔ ان کے گرتے ہی میں اور اول خیر رائفلیں سیدھے کر کے لبلبی دبا چکے تھے۔ ہم دونوں کی گنوں نے بیک وقت آتشیں قہقہے اگلے... مگر تب تک وہ چاروں دائیں بائیں چھلانگیں مار چکے تھے۔ ہم نے بھی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دروازے سے باہر محتاط روی کے ساتھ جھانک کر دیکھا۔ ایک برسٹ فائر ہوا۔ میں پلٹا تو دوسرے ہی لمحے میں میری تھکتی ہوئی نظروں نے ہال کی سیدھ والی کھڑکی کے دھندلے شیشوں کے پٹ کے پار سایہ لہراتے دیکھا۔ باہر سے رائفل کے کندہ مار کر شیشہ ٹوٹنے کی آواز ابھرتے ہی میں اپنی رائفل کی نال اس طرف کر چکا تھا۔ میری انگلی ٹریگر پر متحرک ہوئی، گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پار مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے ابلیسی چیلے کو بری طرح چاٹ گئی۔ ایک اور چھناکے کی آواز ابھری۔ میں جنوں خیز انداز میں آواز کی سمت پلٹا۔ اس وقت اول خیر کی گن گرجی اور دوسرے ابلیسی چیلے کی کریہہ چیخ میرے جسم وجان کو سرشار کر گئی۔ گولیوں کی گھن گرج کے ساتھ ہی ایک دم سناٹا چھا گیا۔ بدنصیب مظلوم آسیہ کے دو مجرموں کو موت کے گھاٹ اتار کے میرے رگ وپے میں لہو کی گردش مثل پارا دوڑنے لگی۔ میں باقی دو ابلیسوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اپنی طرف کی مذکورہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کی طرف لپکا۔ یہاں سناٹا تھا۔ بیرونی احاطہ ویران تھا۔ باہر چھت کی پیشانی پر نصب بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں آتشی بگولا کی طرح پلٹا اور ہال کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ادھر اول خیر بے چارہ نجانے کس طرح اپنے زخمی ہاتھوں سے رائفل کو سنبھالے ہوئے تھا۔ مگر اس دوران شوکی نے بیدار مغزی کا مظاہرہ کیا اور نہایت ہوشیاری سے اول خیر کی طرف کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے جھک کر ایک مرے ہوئے ابلیسی چیلے کی گن اٹھا کے قبضے میں کر لی۔ دروازے کی طرف لپکتے ہوئے میں نے اس کی کامیاب مستعدی پر اسے انگوٹھا دکھا کر ہمت افزائی کی اور

باہر آگیا۔

اول خیر اور شوکی بھی لپک کر میرے عقب میں آ گئے تھے۔ باقی دونوں ابلیسی جانے کہاں غائب تھے۔

”کاکا! سامنے جیپ کھڑی ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے جلدی...“ اول خیر بولا۔ شاید میری طرح اس نے بھی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ باقی ماندہ دو چیلے یقیناً کہیں چھپے ممتاز خان یا جنگی خان کو تازہ صورتِ حال کی اطلاع دے رہے تھے۔

”جلد بازی نہیں کرنی اول خیر۔“ میں نے کہا۔ ”ان کے ذہن میں بھی یہی خدشہ ہوگا کہ ہم سب سے پہلے سامنے احاطے میں کھڑی جیپ کا رخ کریں گے۔ انہوں نے اسے نشانے پر رکھا ہوگا۔“

ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ اول خیر چلایا۔ ”گر جاؤ۔“

میں نے فوراً خود کو زمین پر گرا دیا، برسٹ فائر ہوا، شکر تھا کہ میں تو چھلنی ہونے سے بچ گیا تھا مگر اول خیر نے بھی کمال پھرتی سے اپنے سمیت ساتھ کھڑے شوکی کو بھی دبوچ کر اندر ہال کمرے میں گھسیٹ لیا تھا۔ اگرچہ میں اب بھی حملہ آور کے رحم و کرم پر تھا مگر اس سے قبل ہی اول خیر کی گن گرجی اور ایک بھیانک چیخ مجھے اپنے سیدھے ہاتھ کی دیوار سے سنائی دی اور میں لپک کر ہال کمرے کے دروازے کی طرف آگیا۔ دوسرے ہی لمحے ہم تینوں ایک بار پھر اندر تھے۔

”باقی ایک بچا ہے۔ ہمیں ان کھڑکیوں سے باہر نکل کر اسے تلاش کر کے جہنم رسید کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

دونوں نے صاد کیا پھر ہم تینوں محتاط روی کے ساتھ کھڑکیوں کی طرف بڑھے اور باہر کود گئے۔ میری طرف کھلے احاطے کا شمالی حصہ تھا یہاں دو ابلیسی چیلوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے نفرت خیز انداز میں ان پر تھوک دیا..... تین چیلے مارے جا چکے تھے، ایک زندہ بچا تھا۔ آسیہ پر ظلم کرنے کا انہیں ہم نے بہت جلد ہی موت کا انعام دے ڈالا تھا۔

میں نے سامنے دیکھا یہاں مدھم تاریکی تھی۔ کسی دوسرے کمرے کی دیوار بھی نظر آرہی تھی۔ جس کا جنوبی گوشہ نوفٹ تک باہر کو نکلا ہوا تھا، اس کے درمیان یقیناً کوئی گلی نما راہداری تھی، میں اس طرف بڑھا اور یک دم گلی میں آگیا۔ سامنے ایک اور شخص کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا اور بے اختیار ہم دونوں نے ہی ایک گہری سانس خارج کی تھی، وہ اول خیر تھا۔

”شوکی کدھر ہے...؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

”میں نے اسے واپس ہال میں بھیج دیا تھا۔ وہاں شکیلہ ہے۔ اس کی وہاں موجودگی ضروری ہے۔ ویسے بھی وہ باہر احاطے میں موجود جیپ پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے۔ تاکہ ہمارا آخری شکار فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔“ ابھی اس کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ ہمیں ایک برسٹ کی خوفناک تڑتڑاہٹ نے بری طرح چونکا دیا۔ یہ آواز ہال کی طرف سے ابھری تھی۔ یکلخت ہم دونوں کے بشروں پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ہم دوبارہ ہال کی طرف پلٹے۔ کھڑکی سے اندر جھانکا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ اندر گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ یا تو بلبوں کو دانستہ نشانہ بنایا گیا تھا یا پھر مین سوئچ آف کیا گیا تھا۔ مگر کس نے؟ اور کیوں...؟“ یہ سوالیہ نشان آنکڑے کی طرح میرے حلق میں اٹک گیا۔

”دشمن کا ایک ساتھی بچا تھا اور وہی ہمارے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس عمارت کے محل وقوع سے واقف تھا اور ہم نابلد... ہم صرف محدود حد تک حرکت پذیر ہونے کے بعد دوبارہ وہیں لوٹ آنے پر مجبور ہو جاتے۔ میں نے شوکی کو ہولے سے پکارا تو مجھے تیز تیز سانسوں کی بازگشت سنائی دی۔ پھر اچانک مدھم روشنی میں ایک چہرہ کھڑکی سے باہر جھول گیا، اسے دیکھ کر میں اور اول خیر دھک سے رہ گئے۔ وہ شکیلہ تھی۔ میں نے فوراً اسے سنبھالا اور باہر کھینچ لیا، وہ ٹھیک تھی۔

”شوکی کدھر گیا...؟ اور یہ برسٹ کس نے فائر کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ہانپنے کے انداز میں بولی۔ ”بھائی کو دشمن کی جھلک نظر آئی تھی... وہ ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا... بھائی سے رائفل نہیں چلائی جا سکی، اس نے چلا کر مجھے دوبارہ کمرے کی طرف بھاگنے کو کہا پھر اچانک لائٹ آف ہو گئی تھی ہال کی۔ برسٹ دشمن نے چلایا تھا مگر ہم بچ گئے پھر میں نے بھائی کی دوڑتے قدموں کے آواز سنی تھی، پتا نہیں وہ کدھر چلا گیا۔“

”وہ یقیناً دوسری کھڑکی سے کود کر دشمن کو دبوچنے گیا ہوگا کاکے... تم ادھر ہی ٹھہرو۔“ اول خیر نے یہ سن کر فوراً کہا اور تیزی سے ایک طرف کو رینگ گیا۔ شکیلہ میرے ساتھ تھی، میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اچانک ایک للکار سے مشابہ آواز ابھری۔

”تم تینوں جہاں کہیں بھی ہو۔ سامنے احاطے کی روشنی میں اکٹھے ہو جاؤ۔ تمہارا ساتھی شوکی میرے رحم و کرم

پر ہے اس وقت۔۔۔"

یہ آواز سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ یقیناً اس آخری ابلیس چیلے نے شوکی کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا۔ ممکن ہے اول خیر نے بھی اس کی آواز سن لی ہو۔ اب یہ اس کی صوابدید پر منحصر تھا کہ وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے یا پھر۔۔۔ اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔

"میں صرف پانچ تک گنتی گنوں گا۔ اس کے بعد تمہارے ساتھی کی لاش احاطے میں گرے گی۔" معاً اس کی غضب میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "تم تینوں بچ کر نہیں جا سکتے۔ میرے ساتھی کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں گنتی شروع کر رہا ہوں۔"

"ایک۔۔۔"

میں اس مردود کی بات پر لرز اٹھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ جنگی خان کو مطلع کر چکا تھا اور کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ خونی ہرکارہ فوراً حرکت میں آ چکا ہوگا اور کسی بھی وقت اپنے ساتھیوں کے مسلح ٹولے سمیت یہاں وارد ہونے والا تھا جبکہ ادھر یہ نئی مصیبت گلے آن پڑی تھی۔

"اب کیا ہوگا شہزی۔۔۔؟" شکیلہ نے مجھے خاموش پا کر متوحش لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ "حوصلہ رکھو۔۔۔"

"دو۔" اس کی گنتی جاری تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

"تین۔"

سوچنے کے لیے اب وقت بھی نہ رہا تھا۔ وہ بے دریغ شوکی کو گولی مار سکتا تھا۔ وہ یقیناً ہال کمرے کی چھت پر کہیں چھپا کھڑا تھا۔ اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ اول خیر اس کی آواز کے تعاقب میں اس کے سر پر جا پہنچے۔ شکیلہ کی سسکی ابھری۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اسے بھی پورا ادراک تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً دوڑتا ہوا احاطے میں آ گیا۔ یہاں فقط ایک ہی دو سو واٹ کا بلب روشن تھا، اس کا کنکشن شاید ڈائریکٹ باہر نصب پول سے کیا گیا تھا ورنہ اندر ہال کمرے کا شاید فیوز اڑ گیا تھا۔

میں نے چھت کی طرف دیکھا اور سناٹے میں آ گیا۔ مجھے کھلے روشن آسمان کی مدھم روشنی میں ہال کی چھت کی منڈیر پر شوکی اپنے دونوں ہاتھ اوپر کیے کھڑا نظر آیا۔ اس کے عقب میں آخری دشمن اپنی رائفل کی نال اس کی گدی سے لگائے ہوئے تھا۔ دونوں کے ہیولے صاف نظر آتے تھے۔ اس نے شاید مجھے اور شکیلہ کو دیکھ لیا تھا۔ چلا کر بولا۔

"رائفل پھینک دو۔ اور تم دونوں اپنے ہاتھ بلند کر لو۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی پھر غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔ "تمہارا ساتھی کدھر ہے۔ اب آخری گنتی رہ گئی ہے۔"

"وہ ہمیں نہیں معلوم کدھر ہے۔" میں نے جھوٹ بولا۔ لیکن مجھے تشویش بھی ہوئی۔ میرا جھوٹ اسے مزید غضب میں مبتلا کر سکتا تھا۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ اوپر سے ایک وجود لہراتے ہوئے نیچے آ رہا اور دھب سے ہمارے قریب قدموں میں گرا۔ میں بری طرح دہل گیا۔ شکیلہ کے حلق سے ہذیانی چیخ ابھری۔ دوسرے ہی لمحے شکیلہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے لاش کو دیکھا تو جسم و جاں تک میں سرشاری دوڑ گئی۔ بالآخر میرے بہادر جاں نثار ساتھی اول خیر نے آخری ابلیس چیلے کو بھی نشانہ بنا ہی ڈالا تھا۔

وہ اوپر سے چیخا۔ "کاکے۔۔۔! جیپ میں سوار ہو جاؤ۔ ہم نیچے آ رہے ہیں۔۔۔ جلدی۔"

شکیلہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہوئی۔ وہ اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اوپر دیکھ رہی تھی جہاں شوکی سلامت کھڑا تھا اور ہاتھ ہلا کر اول خیر کے ساتھ واپس پلٹ رہا تھا۔ بھائی کو سلامت پا کر وہ رونا بھول گئی تھی۔ اس کی طرح پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ کہیں بدقسمتی سے گرنے والا شوکی نہ ہو مگر اول خیر نے عین وقت پر اوپر پہنچ کر بازی پلٹ دی تھی۔

میں نے پھرتی سے رائفل اٹھائی، ہم جیپ کی طرف دوڑے۔۔۔ شکیلہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر سوار ہو گئی۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لی۔ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً گھما دی۔ رات کے دم بخود سناٹے میں جیپ کا انجن ہلکی غراہٹ کے ساتھ بیدار ہو گیا۔ ہیڈ لائٹس جل اٹھیں اس کی روشنی اس منحوس فارم ہاؤس کے مختصر برآمدے سے ہوتی ہوئی ہال کمرے کے کھلے دروازے سے اندر پڑ رہی تھی جہاں اب آسیبی سناٹے کا سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسیہ کو یاد کر کے ایکا ایکی میرا دل بھر آیا۔ میرا جی چاہا اس منحوس فارم ہاؤس کو آگ لگا دوں۔۔۔ مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اول خیر اور شوکی بھی دوڑتے ہوئے آ گئے اور فوراً جیپ میں سوار ہو گئے۔ اول خیر نے میرے برابر والی سیٹ سنبھال لی۔

"نکل چل کاکے۔۔۔ وقت کم ہے۔" وہ بولا اور میں نے جیپ کو گیئر ڈال کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا پھر یوٹرن لیا اور پھاٹک کے رخ پر جیپ کا رخ کرتے ہی ایکسلریٹر دبا

دیا۔ جیپ ہچکولے کھاتی بڑا سا چوبی پھاٹک کراس کر کے تاریک راستے پر ہولی۔ میں بتدریج رفتار بڑھاتا چلا گیا...

☆☆☆

فارم ہاؤس سے ابھی بمشکل ہمیں نکلے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ سامنے ایک گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ یکلخت میرا دل کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ میں نے فوراً اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کر دیں تو اول خیر کی سرسراتی آواز ابھری۔ ''کوئی فائدہ نہیں، لائٹس آن کر کے دائیں جانب گاڑی موڑ دو۔ کسی کھڈ میں نہ پھنس جائے ہماری گاڑی۔''

میں نے ایسا ہی کیا۔ ہیڈ لائٹس دوبارہ آن کر کے فوراً اسٹیئرنگ دائیں جانب کاٹا اور رفتار پھر بڑھا دی۔ جیپ زبردست ہچکولے کھانے لگی۔ اول خیر کی بات صحیح تھی یہاں مجھے بڑے کھڈ بھی نظر آئے تھے جیپ تاریکی کے باعث کسی گہرے کھڈ میں پھنس سکتی تھی۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی وحشیانہ تڑتڑاہٹ ابھری اور بغیر کسی وقفے کے تقریباً دس پندرہ سیکنڈ تک جاری رہی۔ اب یہ بات شک وشبے سے بالاتر ہوگئی تھی کہ جنگی خان اپنے مسلح ساتھیوں سمیت سامنے والی جیپ میں ہمارے تعاقب میں تھا۔ مرتے مرتے ابلیسی چیلوں نے ہمارے لیے یہ مشکل کھڑی کر دی تھی کہ انہوں نے ہم سے مقابلہ کرنے کے دوران جنگی خان وغیرہ کو ہمارے متعلق آگاہ کر دیا تھا۔ ہماری جیپ کے دائیں جانب موڑ کاٹتے ہی انہیں ہم پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا کہ اس جیپ میں یقیناً ان کے ساتھی نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ان کے شکار تھے جو فرار ہو رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ہم پر انہوں نے اپنی گنوں کے دہانے کھول دیے تھے۔

ہم سب جھک گئے تھے، یہ ہمارا غیر اختیاری ردِعمل تھا مگر میں نے اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جما رکھے تھے۔ میرے زخمی بازو کا درد جانے کہاں جا سویا تھا۔ اول خیر کو دیر بعد سہی مگر اب اس علاقے کا ادراک ہو چلا تھا۔ میں اس کی ہدایت پر جیپ دوڑا رہا تھا۔ گہرے ہچکولوں میں کمی آگئی تھی۔ اب ناپختہ مگر قدرے ہموار راستہ ہمارے سامنے تھا جس کے دائیں بائیں قدِآدم جھاڑیاں تھیں۔ دشمنوں کی گاڑی ہمارے تعاقب میں لگ چکی تھی۔ میں تاریکی میں بل کھاتے اس کچے راستے پر جیپ آندھی طوفان کی طرح اڑائے جا رہا تھا۔ سرِدست ہم دشمنوں کی نئی کھیپ سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ہمارا اسلحہ پہلی دشمن ٹیم سے مقابلہ کرنے کے بعد دوبارہ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

معاً ایک بار پھر ہمارے عقب میں فائرنگ ہوئی۔ اس بار دشمن کی چلائی ہوئی کچھ گولیوں سے جیپ کی باڈی میں پیوست ہونے کی سنسنی خیز ''زناٹ'' ابھری تھی۔ ٹائر برسٹ ہونے کا خطرہ شدید ہو گیا تو میں نے جیپ کو قدرے زگ زیگ انداز میں دوڑانا شروع کر دیا۔ اسی وقت اول خیر پھرتی سے اچھل کر جیپ کے پچھلے حصے کی طرف کود گیا۔ وہ یقیناً جوابی فائرنگ کرنا چاہتا تھا اور اب میرے خیال میں یہ ازبس ضروری بھی ہو گیا تھا۔

پوزیشن سنبھالتے ہی اول خیر نے پہلا برسٹ فائر کیا تھا اور ساتھ ہی مجھے ایک راستہ بھی سجھا دیا تھا کہ اس راستے پر ایک خشک نالے کی پلیا پار کرتے ہی یہ راستہ تین حصوں میں منقسم ہوتا تھا۔ مجھے اپنے الٹے ہاتھ والے راستے پر اسٹیئرنگ کاٹنا تھا۔ اس کے آگے راستہ نسبتاً کھلا اور سیدھا تھا جو مین روڈ سے گلے ملتا تھا۔ یہ کوئی چار پانچ کلومیٹر کا راستہ ہو سکتا تھا اور مین روڈ تک ٹاپوں ٹاپ تھا۔ یہ شبہ تھا کہ ہم شاید ممتاز خان کی آبائی جاگیر ''نئے پنڈ'' میں تھے۔

''کاکے پلیا پر چڑھتے ہوئے خیال رکھنا وہ راستہ تنگ ہوگا۔'' عقب سے دوسرا برسٹ فائر کرتے ہوئے اول خیر نے مجھے خبردار کیا۔

میری نظریں سامنے کچے راستے پر مرکوز تھیں۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے جلد ہی اس پلیا کی شکستہ منڈیریں دکھائی دے گئیں، جس کی اول خیر نے نشاندہی کر دی تھی۔ وہاں تک راستہ خاصا تنگ ہو گیا تھا۔ نسبتاً بلند بھی تھا۔ اس وقت میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ دشمن کی تعاقب میں آتی ہوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی منعکس ہو کے میری آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں میں دھک سے رہ گیا تھا۔ دشمن بتدریج قریب ہو رہے تھے۔ میں نے دانت پر دانت جما کر ایکسلریٹر پر یکدم دباؤ بڑھا دیا۔ پلیا قریب آگئی تھی۔ اس وقت عقب سے یک بیک ایک سے زائد گنیں گرجیں، اس بار ٹائروں کا نشانہ لیا گیا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے سماعت شکن دھماکا ہوا۔ ہماری جیپ یکدم یوں بیٹھنے لگی جیسے اس کے ٹائر ہی نیچے سے نکل گئے ہوں۔ تب تک میں پلیا پر جیپ چڑھا چکا تھا۔ عین وقت پر جیپ رکنے اور ایک طرف کو جھکنے لگی۔ میں نے ہینڈ بریک لگا دیے مگر بے سود، جیپ لڑکھڑائی اور خشک نالے کی طرف پھسلتی ہوئی جا گری۔ وہ نصف حد تک جھک گئی۔

''سب باہر نکلو جلدی۔ ورنہ دشمن ہمیں بھون کر رکھ

دیں گے۔'' اول خیر چیخا۔ ہم تیزی سے جیپ سے اترے۔ میں رائفل اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ نالے کے کراڑے پر تیز روشنی چمکی۔ اس روشنی میں مجھے آٹھ دس مسلح افراد دکھائی دیے۔ یہ کوئی اولڈ ماڈل لینڈ کروزر تھی۔ جس کی چھت اڑا کر اسے بھی شکاری جیپ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ہم تب تک پلیا کے اندر گھس گئے۔ اول خیر آگے تھا۔

''میرے پیچھے آتے رہو۔'' کہتا ہوا وہ دوڑا۔ ہم اس کے پیچھے تھے۔ رکنا بھیانک موت کو دعوت دینا تھا۔ اس کا احساس ہمیں تھا اور ہم سے زیادہ اول خیر کو نالا لانگ تھا۔ اس کے اندر کہیں کہیں کیچڑ بھی تھا۔ خودرو جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں۔ کچھ آوارہ کتے اور گیدڑ شور مچاتے ادھر ادھر دوڑتے دیکھے۔ ان میں ایک دو کتے خونخوار اور ضدی ثابت ہوئے مگر اول خیر نے اپنی رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما کر ان پر ضرب لگائی تو وہ کوں کوں کر کے ایک نالے کے کراڑے کی طرف بھاگ اٹھے۔ رات، سناٹا اور کیچڑ زدہ نالا... اس پر جھینگروں کی کراہت انگیز جھائیں جھائیں ماحول کو عجیب سا تاثر دے رہی تھیں۔ دفعتاً عقب سے گاڑی کے انجن کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔ نالے کے دائیں کراڑے پر دشمنوں کی جیپ ہمارے تعاقب میں آرہی تھی۔ اگر وہ ہمارے قریب پہنچ جاتے تو آسانی سے ہمیں اس نالے کے اندر ہی محدود کر کے گولیوں سے بھون دیتے۔

اول خیر ہم سے آگے تھا۔ وہ ایک جگہ رکا۔ اور بائیں کراڑے کی ڈھلان پر اگی خودرو جھاڑیوں کو پکڑ کر اس پر چڑھنے لگا۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

اب مجھے اول خیر کی چالاکی کا اندازہ ہوا۔ وہ اب دشمن کو مخمصے میں ڈالے ہوئے تھا کہ آیا وہ پلیا پار کر کے کراڑے پر سے ہی ہمارا تعاقب کرتے رہیں یا بائیں طرف سے۔ اب جبکہ ان کی گاڑی کی آواز دائیں کراڑے سے ابھرتی ہوئی سنی تو اس نے لامحالہ بائیں کراڑے کا رخ کیا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کی مدد سے ہاتھ تھامے، دائیں کراڑے پر آگئے۔

''خبردار... کھڑے مت ہونا، لیٹ جاؤ... سینے اور کہنیوں کے بل جتنی جلدی ہو سکے، کراڑے سے نیچے اتر جاؤ'' اول خیر نے ہدایت دی۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے عقب میں دوسرے کراڑے پر بھی نگاہ ڈالی۔ دشمن نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے جیپ روک لی تھی اور ان میں سے کئی مسلح ہرکاروں کو نالے میں اترتے دیکھا۔

''وہ جیپ سے اتر کر ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔'' میں نے اول خیر کو خبردار کر دیا۔

''آگے بڑھتے رہو۔ میرے پیچھے۔'' اول خیر کی آواز سنائی دی اور گرد و پیش کی گھور تاریکی اور اوپر کھلے روشن آسمان میں ہمارے صرف متحرک ہیولے نظر آرہے تھے۔ اول خیر آگے تھا اس کے بعد شکیلہ اور شوکی تھے، میں نے خود کو دانستہ پیچھے رکھا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ پیچھے مڑ کر تعاقب میں آتے ہوئے دشمنوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دوں... مگر یہ محض میری جنونی سوچ تھی۔ اس کا خاطر خواہ فائدہ ہونے کے بجائے نقصان ہو سکتا تھا۔ دشمنوں کو ہماری سمت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ اب کم از کم وہ جیپ کے ذریعے ہمارا تعاقب کرنے سے قاصر ہی تھے مگر یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی، کیونکہ کچھ دشمن پیدل ہمارے تعاقب میں آنے کے بعد باقی جیپ میں دوبارہ پلیا کی طرف پلٹ گئے تھے۔ وہ یقیناً پل پار کر کے دوسرے کراڑے پر آنا چاہتے تھے۔ ممکن تھا اس میں صرف ڈرائیور ہی ہوتا۔

ادھر جب تک ہم کراڑے کی ریتیلی اور بھر بھری مٹی والی ڈھلوان سے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے نشیب میں جا پہنچے اور یہاں سے ہم نے اٹھ کر سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں کچھ کھیتوں کے سلسلے تھے۔ ان کے اختتام پر چوڑی کاریز تھی۔ (دریا سے کھیتوں کو پانی پہنچانے والا کھالا) ان پر بھی خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔

مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ ہم اس طرح بھاگتے ہوئے دشمنوں سے بچ نکلیں گے مگر دوسرے ہی لمحے اول خیر کی آواز ابھری۔

''اس کاریز کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چت لیٹ جاؤ'' اس کی یہ تدبیر مجھے کارگر لگی۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔

ماحول اچانک یہ خودسا ہو گیا تھا۔ ہم کاریز کے اندر اس طرح پشت کے بل جا لیٹے تھے جیسے یہ ہماری اجتماعی کھلی قبر ہو۔ یہاں زہریلے کیڑوں، حشرات الارض اور سانپوں کا خطرہ بھی تھا مگر بہرحال یہ جان بچانے کے لیے عارضی طور پر سہی، یہ خطرہ ہمیں مول لینا تھا۔

ہر طرف اب ھُو کا عالم تھا۔ ہم جیسے چپ چاپ مگر دھڑکتے دلوں کے ساتھ گویا سانس تک روکے کاریز کے اندر لیٹے ہوئے تھے۔ اس کے کناروں پر اگی ہوئی لمبی

لمبی خودرو جھاڑیوں نے ہمیں ڈھانپ دیا تھا اور رہی سہی کسر رات کی گھور تاریکی نے پوری کر دی تھی۔ اول خیر کی اس چالاکی سے دشمن بھٹک سکتے تھے اور ہمارے اندھے تعاقب کی رو میں کافی آگے جا نکلتے۔

اچانک مجھے قریب ہی دھب دھب کرتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ دشمن دوڑتے ہوئے قریب آرہے تھے۔ میرا دل سینے میں بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ اپنی رائفل کو بھی اپنے دائیں پہلو میں لٹا رکھا تھا۔ قدموں کی آوازیں قریب آگئیں۔ میں نے گویا سانس تک روک لی۔ اب تو ان کی باتیں کرنے کی بھی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر عین ہمارے بالکل قریب آ کے بھاری قدموں کی دھپا دھپ تھم گئی۔ میں سن ہو کے رہ گیا۔ کیا انہیں اپنے قدموں کے قریب کاریز پر کسی قسم کا شبہ ہوا تھا؟ میرے اندر دھڑکتا شبہ بیدار ہوا۔ پھر ایسے میں ایک کریہہ شناسا آواز ابھری۔

”میں اور بشیرا ادھر ہی رکتے ہیں۔ پیچھے کھدو جیپ لا رہا ہے۔ تم لوگ آگے جاؤ۔“ یہ جنگی خان تھا۔

میرے پورے وجود میں سرشاری و غیظ جوش کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ میرا شکار جنگی اپنے کسی ایک ساتھی کے ساتھ ادھر رکنا چاہتا تھا۔ باقیوں نے اسے اثبات میں جواب دیا ہوگا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے مجھے دوبارہ متعدد قدموں کی دھپا دھپ سنائی دیں جو دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں۔ یقیناً اول خیر نے بھی جنگی کی آواز سن لی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں اس نئی حوصلہ افزا صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرنے سے قاصر تھے۔ مگر میں نے اپنی صوابدید پر ایک جارحانہ قدم اٹھانے کا سوچا۔ میری قوتِ فیصلہ اس وقت عروج پر تھی، میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے صرف تین سیکنڈوں کے اندر اندر فیصلہ کر لیا۔ پہلے سیکنڈ پر میں نے سوچا۔ جنگی خان یہاں صرف اپنے ایک ساتھی کے ساتھ موجود ہے۔ دوسرے سیکنڈ میں وہ اپنے زیادہ تر مسلح ساتھیوں کو ہمارے تعاقب میں آگے پیش قدمی کرنے کا حکم دے چکا تھا۔ تیسرے سیکنڈ میں... عقب میں اس کا صرف ایک کھدو نامی ساتھی جیپ لے کر کسی بھی وقت پہنچنے والا تھا۔

میں نے حرکت کی، سر اٹھا کر دیکھا۔ مجھ سے آگے سر کی طرف شکیلہ لیٹی تھی اور جنگی خان اپنے بشیرا نامی ساتھی کے ساتھ وہیں موجود تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا، جیپ کو ادھر سے ہی آنا تھا۔ میں نے کاریز سے سر تھوڑا باہر نکالا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس نظر آرہی تھیں کہ وہ ابھی کچھ دور تھی۔ میں نے کاریز کے اندر سے کسی خونخوار مگرمچھ کی طرح حرکت کی اور جنگی کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکے سے کھینچا۔ وہ منہ کے بل دھب سے گرا، اس کے ہاتھ میں پستول تھا، جو تاریکی میں کہیں گر کر غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھی بشیرے نے حرکت کی، میں اب کھڑا ہو چکا تھا، ایک زوردار گھونسا بشیرے کی ناک پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز نکلی وہ کئی قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔ ٹھیک اسی وقت میں نے کاریز سے ایک ہیولے کو پھرتی کے ساتھ اچھلتے دیکھا یہ اول خیر تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے والے بشیرے پر جھپٹا، میں جنگی خان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ تاریکی میں ”کرولنگ“ کے انداز میں اپنا پستول ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ کاریز کے اندر سے نجانے کون سی بلائیں نکل آئی ہیں۔ میں نے اس کی کمر پر زوردار لات رسید کر دی۔ اسی لمحے مجھے تاریک فضا میں لرزہ خیز کراہ سنائی دی۔ اول خیر نے شاید بشیرے کی گردن دبا دی تھی۔ ادھر جنگی میری لات کھا کر آگے کی طرف الٹ گیا۔ میں نے چلا کر اول خیر سے کہا۔

”اول خیر! اس کا ایک ساتھی سامنے سے آرہا ہے۔ جیپ لے کر، اسے قابو کر۔“ اول خیر، جنگی سے مقابلہ کرنے کے لیے میری مدد کو آنا چاہتا تھا۔ میری ہدایت پا کر وہ رائفل سنبھالے آگے بڑھا۔ اس اثنا میں شوکی اور شکیلہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں جنگی پر خونخوار درندے کی طرح جھپٹا۔ اس نے بھی فرار ہونے کی کوشش کیے بغیر مجھ پر دوبدو حملہ کیا۔ میری ٹھوڑی پر اس کا گھونسا پڑا جس کی تکلیف خبیث اور صفت ابلیس جنگی خان سے نبرد آزما ہونے کی آتش غضب میں بھسم ہو گئی۔ اس مردود سے نبرد آزمائی کے دوران بار بار آسیہ کا معصوم چہرہ میری نظروں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ اس کی چیخیں اس کی آہیں اور داد فریاد میری سسکتی سماعتوں میں گونجنے لگیں۔ گھونسا کھانے کے باوجود میں نے اپنے دائیں ہاتھ کے شکنجے میں اس کی گردن دبوچ لی اور ساتھ ہی اپنی سیدھی ٹانگ کی زوردار ضرب اس کے پیٹ پر رسید کر دی مگر گردن پھر بھی نہیں چھوڑی، اس طرح ٹانگ کی ضرب اس کے لیے ضرب شدید ثابت ہوئی۔ اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے وہ حیرت انگیز پھرتی سے سنبھلا تھا اور میری ہاتھ کی کلائی کو پکڑنا چاہا مگر مجھ پر تو جیسے اس وقت آتش جنوں سوار تھا، میں نے اس کے چہرے پر قدرے اچھل کر اپنے سر کی ٹکر رسید کر دی اور اس کی گردن دباتا چلا گیا۔ وہ دوہرے عذاب کا شکار تھا۔ میرے ایک ہی ہاتھ کے شکنجے

سے وہ اب تک اپنی گردن نہیں چھڑا پا رہا تھا اور خود مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سارے وجود کی طاقت سمٹ کر میرے سیدھے ہاتھ کے پنجے میں آگئی ہو۔ میری انگلیوں کے ناخن اس کی گردن کی کھال میں اتر کر گوشت تک کو چھونے لگے تھے... اس نے ایک پرانا داؤ کھیلا اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹا اور گرا... میں لامحالہ اس پر جھک گیا، اس نے پھرتی سے اچھل کر اپنی دونوں ٹانگیں میرے پیٹ اور سینے کے درمیان جما دیں۔ نتیجتاً میں اچھل کر اس سے دو تین فٹ پرے جا گرا۔ کھلے روشن آسمان تلے شوکی نے جب مجھے گرتا دیکھا تو خود بھی اس پر پل پڑا۔

اس وقت مجھے پٹاخہ چھوٹنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی شوکی کی کراہ بھی۔ میں فکرمند ہو گیا۔ جنگلی خان جیسا وحشی سانڈ اس کے بس کا نہ تھا۔ اس نے اپنے اوپر پڑے ہوئے شوکی کی کنپٹیوں کو اپنے دونوں ہتھوڑے جیسی ہتھیلیوں سے پیس ڈالا تھا۔ اس دیسی ساختہ داؤ میں کئی ثانیوں تک مدمقابل کا نہ صرف دماغ سُن ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ سماعتیں بھی بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے شوکی کا وجود اچھل کر پرے جا پڑا۔ اس میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ میں نے جنگلی خان کے بدمست ہیولے کو دیکھا۔ وہ غضب ناک غراہٹ کے ساتھ میری طرف لپکا۔ اسے کھانسی کا پھندا بھی پڑا ہوا تھا، وہ بار بار کھانس رہا تھا۔ ایسا شاید اس کا گلا دبوچنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ ہم دونوں پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ ٹھیک اسی وقت ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ہم پر پڑی۔ ہمارے ہیولے یک دم واضح ہو گئے۔ شاید اس خبیث کا ساتھی کھدو جیپ قریب لے آیا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے اب فکر نہ تھی۔ اسے سنبھالنے... بلکہ دبوچنے کے لیے اول خیر وہیں کہیں قریب ہی گھات لگائے بیٹھا تھا۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس میں مجھے جنگلی خان کا چہرہ بری طرح بگڑا ہوا نظر آیا۔ اس کی بیل جیسی موٹی گردن پر میرے ہاتھ کی انگلیوں نے سرخ خراشیں ڈال دی تھیں اور چہرے پر لگنے والی میرے سر کی ٹکر نے اس کی موٹی ناک پچکا کر خون آلود کر دی تھی۔ وہ میری طرف وحشی سانڈ کی طرح لپک رہا تھا۔ ہیڈ لائٹس روشن ہوتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے خون آلودہ چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے، میں اس کی وجہ جانتا تھا اس لیے ایک پل بھی ضائع کیے بغیر اس کی طرف لپکا... مکار فطرت جنگلی خان پر صورت حال کی نزاکت واضح ہو گئی تھی، دوسرے ہی لمحے اسے میدان چھوڑنا پڑا۔ وہ کسی جنگلی بلے کی طرح حرکت میں آیا اور میرے شکنجے میں آنے سے قبل ہی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اس کے پیچھے جانا بے سود تھا میں شوکی کی طرف لپکا۔ شکیلہ اسے سنبھال رہی تھی۔ اس دوران اول خیر نے ہمیں پکارا۔

''آجاؤ... جلدی... جیپ اب ہمارے قبضے میں ہے۔''

''شوکی! تم ٹھیک تو ہونا؟'' میں نے شوکی سے پوچھا۔ وہ بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا پھر اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہم تینوں جیپ کی طرف لپکے۔ اس بار سیٹ اول خیر نے سنبھالی ہوئی تھی۔ کھدو کا بے سدھ وجود مجھے اپنے قدموں میں پڑا نظر آیا۔ اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔

''وہ مردود... نکل بھاگا۔'' میں نے اول خیر کے برابر والی سیٹ سنبھالتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ شوکی اور شکیلہ بھی پیچھے سوار ہو گئے تھے۔

''میں نے دیکھ لیا تھا اس لیے تمہیں آواز دی تھی۔'' اول خیر نے گیئر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم اس کے تعاقب میں نہ چلے جاؤ۔'' اس نے جیپ ریورس کی۔

جیپ ریورس کر کے اس نے نشیب میں اتار دی۔ اگلے چند منٹوں بعد ہم پلیا سے آگے جانے والے مطلوبہ راستے پر گامزن تھے۔

رات کی گھور تاریکی میں جیپ اندھا دھند دوڑی جا رہی تھی۔ اول خیر کی انتہائی کوشش تھی کہ ہم جلد سے جلد ممتاز خان کی جاگیر سے نکل جائیں مگر میرے دل و دماغ پر بے چینی طاری تھی۔ میں ممتاز خان اور اس کے مقرب خاص کارپرداز... جنگلی خان سے آسیہ کی المناک موت کا بھیانک انتقام لینا چاہتا تھا۔ اول خیر نے شاید میرے خاموش چہرے کے سنگین تاثرات سے میرے اندر کے کھولتے ہوئے ابال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ''کاکے...! کیا سوچ رہا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے گومگو سے انداز میں جواب دیا۔ میری نظریں ونڈ اسکرین سے پار ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کچے راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ اول خیر نے جیپ کی رفتار بڑھا دی تھی، وہ بولا۔ ''کاکے...! ہم آسیہ بہن کا بدلہ لیں گے... ابھی ہمارا انتقام پورا نہیں ہوا۔''

اس کے چھیڑنے کی دیر تھی اور میرے پھٹ پڑنے کی۔ میں بے ساختہ بول اٹھا۔ ''اول خیر...! میری آنکھوں کے سامنے آسیہ کا چہرہ ابھی تک لہراتا ہے۔ جس

طرح اس غریب معصوم پر ان سفاک درندوں نے ظلم ڈھایا ہے۔ جی تو چاہتا ہے ممتاز خان کی حویلی سمیت پورے نئے پنڈ کو آگ کی بھٹی میں جھونک ڈالوں تب ہی میرے دل و دماغ کو چین نصیب ہوگا۔''

''کاکا... بلاشبہ آسیہ بہن جرأت مند اور بہادر عورت تھی، اس کا مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے۔'' وہ بھی مغموم لہجے میں بولا۔

''اگرچہ وہ اپنی غلطی کا جلد سے جلد ازالہ کرنے کی کوشش میں تھی... مگر شاید میری طرح تو نے ایک اور حقیقت بھی نوٹ کی ہوگی کاکے... وہ آخری حد تک صدقِ دل سے تیری مدد کرنے کے لیے کوشاں تھی، اور اس کی خاطر وہ اپنے منگیتر ریحان کی دوری کو بھی برداشت کیے ہوئے تھی۔'' اول خیر کی اس آخری بات نے مجھے ایک بار پھر آبدیدہ سا کر دیا اور میں نے سر جھکا دیا۔ عقب سے شوکی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''حوصلہ کرو شہزی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم سب مل کر ان دونوں رذیل قاتلوں سے آسیہ بہن پر کیے گئے ظلم کا بدلہ لیں گے۔'' شکیلہ نے بھی اس عزم کا اظہار کیا تو میں سر اٹھا کے بولا۔

''نہیں دوستو... میں تم دونوں کو اس آگ سے دور رکھنا چاہتا ہوں... یہ صرف میری جنگ ہے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد تم دونوں کو یہ شہر چھوڑنا ہوگا۔''

جیپ میں یکلخت خاموشی چھا گئی۔ اول خیر راستوں کا شناسا تھا۔ اول خیر نے جو پہلے راستہ بتایا تھا اس کے مطابق اب تک ہمیں مین روڈ پر آ جانا چاہیے تھا۔ میں نے پوچھا۔

''اول خیر! کیا تم نے واپسی کا راستہ تبدیل کر دیا ہے؟'' وہ میری بات سن کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، یہاں سے اس منحوس جاگیر ''نئے پنڈ'' کی حدود جلد ختم ہوتی ہے۔ ہم موضع بھل واں پہنچنے والے ہیں وہاں سے نیم پختہ راستہ اختیار کریں گے ہمارا اب مین روڈ پر آنا مناسب نہ ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ اب تک اس مردار ممتاز خان نے اپنے راتب خور... انسپکٹر روشن خان کو خبردار کر دیا ہو۔'' اول خیر کی بات معقول تھی۔ مجھے ممتاز خان کے ایک گماشتے کی بات یاد آ گئی تھی، جس کے مطابق ممتاز خان نے صبح تڑکے انسپکٹر روشن کو جعلی پولیس مقابلے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ اور اپنی جاگیر نئے پنڈ اسے سے بلایا تھا۔

اول خیر کے مطابق اب محض ایک آدھ کلومیٹر کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جب ذرا دیر بعد یہ فاصلہ بھی بہ خیر و عافیت کے طے ہوا اور اول خیر کے مطابق... اب ہم موضع بھل واں کے اس مذکورہ نیم پختہ راستے پر گامزن تھے۔

میں بار بار کفِ افسوس مل رہا تھا۔ آسیہ کے ساتھ شرمناک اور انسانیت سوز ظلم کرنے والے ان چاروں ابلیسی چیلوں کو جہنم واصل کرنے کے باوجود مجھے جنگی خان کے عین وقت پر اپنے شکنجے سے بچ کر نکل جانے کا بے حد رنج تھا۔ آسیہ کی ایک لاش کے بدلے، ممتاز خان کو کئی لاشوں کا تحفہ دیا تھا مگر میرے لیے یہ سب کافی نہ تھا۔

ہمارے پاس رابطے کے لیے کوئی سیل فون نہ تھا۔ وہ سب ہم سے چھین لیے گئے تھے۔ ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے تحت میں نے خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اول خیر سے پوچھا۔

''بیگم ولا کا رخ کرنے سے پہلے ہمیں بیگم صاحبہ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا... مگر...''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ جواباً بولا۔ ''اس وقت پولیس فورس کا سارا زور نئے پنڈ میں ہنگامی آمد پر ہو گا۔ ہاں... یہ ضروری ہے کہ ہمارا بھل واں سے ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد اس جیپ سے چھٹکارا پانا ضروری ہوگا۔''

میرا ارادہ ابھی اس جیپ کو چھوڑنے کا نہیں تھا۔ نیز میں چاہتا تھا کہ بیگم ولا کا رخ کرنے سے قبل ہم شوکی اور شکیلہ کے گھر کا رخ کرتے... وہاں سے ان کا ضروری سامان سمیٹنے میں ان کی مدد کرتا... اور پھر بیگم ولا پہنچ کر ان دونوں بہن بھائیوں کو بحفاظت ملتان سے لاہور روانہ کر دیتے مگر چودھری ممتاز خان کی بربریت اور ناپاک عزائم جاننے کے باعث میرا ارادہ تھا کہ شوکی اور شکیلہ یہ صوبہ ہی چھوڑ دیں... کراچی ان کے لیے محفوظ شہر ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنے خیال کا اظہار اول خیر کے علاوہ... شوکی اور شکیلہ سے بھی کر دیا تھا... شوکی کو یقیناً اب اپنی بہن کی فکر زیادہ تھی، مگر شکیلہ کے آثار کچھ اور ہی بتاتے تھے۔ اس کی یہ سب کرنے کی مرضی نظر نہیں آتی تھی مگر چپ تھی۔

یہ سفر خاصا طویل ثابت ہوا... ہمارے دائیں کھیتوں کھلیانوں کا سلسلہ تھا جو اب موقوف ہو کے بنجر اجاڑ میدان میں بدل گیا تھا اور کہیں کہیں کچے گھروں کی بے ترتیب قطاریں نظر آ رہی تھیں جہاں سے روشنی پھوٹتی دکھائی دیتی تھی۔ ہمیں وقت کا احساس نہ تھا مگر مشرقی سمت سے صبح کاذب کی شفق سی پھوٹتی دیکھ کر وقت کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔

ایک طویل ذہنی اور جسمانی مشقت کے بعد جب

ہمارے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑے تو غنودگی سی چھانے لگی اور تھکاوٹ اور کسلمندی کا بھی زیادہ احساس ہونے لگا۔

''ہم مین روڈ پر پہنچنے والے ہیں... اس جیپ کو چھوڑنا ہوگا اب۔'' اول خیر نے اعلان کیا تو میں نے اپنا ارادہ... گوش گزار کردیا اور بولا۔

''بیگم ولا پہنچنے کے بعد... یہ کام بیگم صاحبہ کے آدمی بھی نمٹا سکتے ہیں... اول خیر... ورنہ اگلی سواری کا انتظام کرنے میں خاصا وقت برباد ہو جائے گا۔'' اول خیر نے میری بات پر صاد کیا۔

مین روڈ پر آتے ہی ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔

اگلے ایک گھنٹے بعد جب صبح کاذب کی روشنی چہار اطراف پھیل چکی تھی، ہم شہر میں داخل ہوچکے تھے۔ یہاں ہمیں پولیس کا خطرہ تھا اور ممتاز خان کے ہرکاروں کا بھی... مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس کی جاگیر کے مقابلے میں یہاں اس کی شہر والی رہائش گاہ ''گرائیں نگر'' کے آدمی زیادہ فعال ہوں گے، یوں بھی اب خطروں سے کھیلنے کے سوا ہمارے پاس منزل تک پہنچنے کا کوئی چارہ تھا بھی نہیں۔

خدا کا شکر ہوا کہ... شوکی کے گھر تک... ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ شاید ہمارا بروقت اور تیزی کے ساتھ فعال ہونا تھا۔

''جتنی جلد ہو سکے... اپنا مختصر سا سامان سمیٹ لو... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔'' میں نے جیپ ایک جھٹکے سے دروازے کے سامنے روکتے ہوئے کہا۔

یہ متوسط طبقے کا علاقہ تھا۔ محلہ بھی مختصر سا تھا... اعلیٰ الصباح کا وقت تھا اس لیے سوائے دودھ والوں کی اکا دکا موٹر سائیکلیں ہی آتی جاتی دکھائی دی تھیں۔

مکان کا تالا توڑنا پڑا۔ دشمنوں نے ہم پر غلبہ پانے کے بعد ہمیں ہر شے سے محروم کردیا تھا۔ گھر کی چابیاں تک نکال لی تھیں۔

بہر حال... اندر داخل ہونے کے بعد شوکی اور شکیلہ اپنا مختصر سا سامان سمیٹنے لگے۔ میں نے دیکھا شکیلہ یہ کام بے دلی سے کر رہی تھی... میں بھی مقدور بھر ان کا کام نمٹا رہا تھا... ایک تنہا موقع پر شکیلہ مجھ سے بولی۔

''شہزا...! مجھے تمہاری طرف سے تشویش رہے گی... کاش! میں تمہارے قریب رہ سکتی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ بڑا عجیب اور معنی خیز محسوس ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

''شکیلہ! میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں بھی آسیہ کی طرح میرے خونی دشمنوں کی بربریت کا نشانہ بنو... یہ بات میرے لیے اپنے پیروں پر بیڑیاں ڈالنے کے مترادف ہوگی۔ پہلے ہی آسیہ کے بوجھ سے میرا دل و دماغ بھاری اور بوجھل ہو چکا ہے۔ میں مزید ایسے کسی اور بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔'' وہ میرا اشارہ سمجھ کر خاموش ہوگئی۔ تاہم تھوڑے توقف کے بعد بولی۔

''کیا ہمارا کراچی جانا ضروری ہے... ہم لاہور یا جنوبی پنجاب کی طرف نکل جاتے ہیں۔''

''کراچی بھی اس ملک کا حصہ ہے۔ زندگی رہی تو ہم دوبارہ اچھے دوستوں کی طرح ایک دن ضرور ملیں گے۔ شوکی پر مجھے بھروسا ہے۔ وہ کراچی میں بھی تمہارے ساتھ سکون سے گزربسر کرسکتا ہے۔''

''ہاں... وہاں ہمارے دور کے رشتے کی ایک خالہ رہتی ہیں... ہوسکتا ہے ہم وہیں کا رخ کریں۔''

''میں نے سنا ہے کراچی ایک مہربان شہر ہے۔ اس نے اپنے دامن میں نہ جانے کتنے لوگوں کو سمیٹ رکھا ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

اس سارے کام میں... نصف گھنٹا صرف ہوگیا۔ شوکی نے دو سوٹ کیس اور ایک بھاری سا بڑا بیگ تیار کرلیا تھا... ابھی دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اچانک ایک پرشور سی آواز سن کر ٹھٹک کے رک گئے۔ یہ کسی کار کے ٹائروں کی چرچراہٹ تھی۔ ہمارے چہروں پر یکلخت سناٹا طاری ہوگیا جبکہ میرا دل سائیں... سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا... مجھے پچھتاوا ہوا کہ... میں اپنی رائفل جیپ میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ میرے اعصاب یک دم تن گئے تھے۔

میں نے اشارے سے شوکی اور شکیلہ کو صحن میں ہی ٹھہرنے کا کہا اور خود پھرتی کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا... ابھی میں دروازے سے محض چند ہی قدموں کے فاصلے پر تھا کہ وہ دھڑ سے کھلا... میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اول خیر کو دیکھ کر میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ البتہ اس کے ہمراہ ایک اور شخص کو دیکھ کر میرے تنے ہوئے وجود میں طمانیت کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس شخص سے چاہے جتنے اختلاف سہی... مگر بہرحال اس کی حیثیت ہمارے ساتھی ہی جیسی تھی... یہ بیگم صاحبہ کے گروہ کا ''بڑا استاد'' کہلانے والا... کھیل دادا تھا۔ مگر یہ شوکی اور شکیلہ کے لیے اجنبی تھا اس لیے اسے دیکھ کر دونوں بہن بھائی پریشان ہوگئے... کھیل دادا نے ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی پھر مجھ سے بولا۔

"وقت کم ہے میرے پاس... آجاؤ جلدی۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ اول خیر میری جانب دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا.... پھر میں نے شوکی اور شکیلہ کو کمیل دادا کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا۔ اس دوران ہم باہر آگئے۔ جیپ کے سامنے ایک کار کھڑی تھی دو آدمی باہر چوکس کھڑے تھے اگرچہ خالی ہاتھ تھے مگر میں جانتا تھا وہ اندر سے مسلح تھے۔

"تم کار میں بیٹھو۔" کمیل نے مجھ سے کہا۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے آنکھ مار کر اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ میں کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر براجمان ہو گیا۔ پھر کمیل دادا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ کار اسٹارٹ تھی اس کے دونوں آدمی بھی عقبی نشستیں سنبھال چکے تھے، دوسرے ہی لمحے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

بیگم ولا پہنچنے تک... سارے راستے کمیل دادا نے مجھ سے کوئی بات نہ کی تھی۔ میرے پاس بھی اسے بتانے کے لیے لمبی اور دکھ بھری تفصیل تھی، اچھا ہی ہوا اس نے کچھ نہیں پوچھا۔ بیگم ولا... پہنچے تو... مجھے کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا۔ اس شاندار اور عظیم الشان کوٹھی کے دونوں اطراف مورچے قائم کر دیے گئے تھے۔ یہی نہیں، جس سمت کے راستے پر ہماری کار نے موڑ کاٹا تھا... وہاں ہرڈل راڈ نصب کی گئی تھی اور دو سیکیورٹی گارڈز چیکنگ کے بعد اس مذکورہ راستے پر آنے والی گاڑیوں کو چھوڑ رہے تھے البتہ ہماری کار اور کمیل دادا کو پہچان کر ہرڈل راڈ فوراً اوپر اٹھا دی گئی تھی۔ سامنے سفید رنگ کی عالیشان سفید کوٹھی تھی۔

بڑے سے آہنی گیٹ خودکار انداز میں دائیں بائیں .... کھل گئے اور دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔ پھر وسیع کارپورچ میں جا رکیں۔

ہم اترے۔ اول خیر نے کمیل دادا کے قریب آکر سنجیدگی سے اپنی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"یہ دشمن سے چھینی ہوئی گاڑی ہے... اسے فوراً یہاں سے ہٹانا ضروری ہے۔" میں نے دزدیدہ نظروں سے کمیل دادا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ اسی لہجے میں وہ اول خیر سے بولا۔

"تم اپنی زبان بند رکھو۔ تم کچھ بولنے کے مجاز نہیں ہو یہاں۔"

اول خیر نے بھی ترکی بہ ترکی اسی تلخی سے جواب دیا۔

"یہ میں احتیاط کے پیشِ نظر محض اطلاع دے رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا بعد میں دشمنوں کو کوئی گل کھلانے کا موقع ملے۔"

"تم نے مطلع کر دیا۔ اب اپنا منہ بند کرو۔" کمیل دادا نخوت سے بولا۔ اس اثنا میں چار مسلح افراد اندرونی عمارت سے برآمد ہوئے۔ کمیل دادا نے انہیں وہ جیپ ٹھکانے لگانے کا حکم دیا۔ دو افراد حرکت میں آگئے۔ باقی دو سے مخاطب ہو کر کمیل دادا نے اول خیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ کہا۔ "اسے لے جاؤ۔"

اول خیر کے ساتھ کمیل دادا کا جارحانہ انداز دیکھ کر میرا دماغ گرم ہونے لگا۔ چھتے والے معاملے کی وجہ سے اول خیر دب رہا تھا۔ تنظیمی اصول اور قواعد و ضوابط کے مطابق وہ تنظیم اور بیگم صاحبہ کا مجرم تھا، کمیل دادا کو بھی شاید اسی لیے اپنی ذاتی عناد کی بھڑاس نکالنے کا موقع ہاتھ لگا تھا۔ اسی سبب وہ گویا اول خیر کے ساتھ "ماورائے تنظیم" اہانت آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ وہ دونوں آدمی اول خیر کو اپنے ساتھ لے جانے لگے تو میں نے فوراً آگے بڑھ کر بہ آواز بلند انہیں پکارا۔

"ٹھہرو۔" وہ رک گئے۔ میں نے کمیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ابھی یہ میرے ساتھ ہے۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔ ہمیں بیگم صاحبہ سے ملنا ہے۔" میری بات پر کمیل دادا نے تیر برساتی ہوئی نظروں سے میری طرف گھورا۔

"زیادہ سر چڑھنے کی کوشش مت کرو تم... مت بھولو کہ اس وقت تم کہاں کھڑے ہو؟" پھر اس نے غصیلی نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھے۔ اول خیر نے میری طرف دیکھ کر انگلی کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ اس دوران ارشد بھی نمودار ہو گیا۔ کمیل دادا اس سے تحکمانہ بولا۔

"ان سب کو اندر روم نمبر فور میں بٹھاؤ۔" اشارہ ہماری طرف تھا۔ ہماری چپقلش نے بے چارے شوکی اور شکیلہ گھبرا سے گئے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ پھر ہم سب ارشد کے ساتھ ایک آرام دہ کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

شکر تھا کہ ارشد ہمارے ساتھ تھا ورنہ تو یہاں سب کا رویہ ہمارے ساتھ سرد ہی تھا۔ یقیناً اس میں کمیل دادا کے حکم کا دخل ہوگا۔ اس کا شوکی کے گھر میں اچانک نازل ہونا خالی از علت نہ تھا کیونکہ میں نے بیگم صاحبہ سے ہونے والی آخری گفتگو میں ان کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ ہم لوگ کہاں اور کس مقصد کے لیے شوکی کے گھر قیام کیے ہوئے تھے پھر ہماری اچانک گمشدگی یا غیاب پر ہوسکتا ہے بیگم صاحبہ نے کمیل دادا کے ہی ذمے یہ کام لگایا ہو کہ وہ اس گھر کی اس

وقت تک باقاعدہ نگرانی کرتا رہے جب تک کہ... اس کے بند دروازے کا تالا کھلا ہوا نہ دیکھ لیا جائے... بعد میں میرے اس قیاس کی تصدیق ارشد نے بھی کر دی تھی۔

یہ میرے لیے فخر کی بات تھی کہ ہمارے سلسلے میں بیگم صاحبہ نے اپنے کسی عام آدمی کے بجائے کبیل دادا کو محتاط کر رکھا تھا۔ مجھ سے کبیل دادا کے خار کھانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

ارشد سے گفتگو ہوئی، سب سے پہلے تو میں نے اس سے بیگم صاحبہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہا تو وہ بولا۔

''پہلے تم بتاؤ، اچانک کدھر غائب ہو گئے تھے...؟ بیگم صاحبہ تو ہلکان ہو رہی تھیں تمہاری فکر میں؟ اور یہ دونوں کون ہیں... کچھ دیکھے بھالے لگتے ہیں مگر یاد نہیں آرہا۔''

اوکاڑہ والی مہم میں ارشد... کی شکیلہ سے ملاقات تھی اور غائبانہ تعارف بھی تھا۔ میں نے پہلے شوکی اور شکیلہ کا تعارف کرایا تو ارشد کو یاد آگیا۔

اس کے بعد میں نے اسے اب تک کی ساری تفصیل بتادی۔ وہ سب سن کر دنگ رہ گیا۔ آسیہ کی موت کا اسے بھی دکھ تھا۔ پھر جب میں نے اس سے بیگم صاحبہ کے متعلق پوچھا تو وہ جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بولا۔ ''پہلے میں ذرا اس خردماغ آدمی کبیل دادا کو یہ تفصیل بتا آؤں... اس کا یہی حکم تھا پھر آرام سے آکر باتیں کرتا ہوں۔''

میں چونکا پھر کہا۔ ''خیریت تو ہے ناں... یہاں پر...؟''

''ابھی آکر بتاتا ہوں۔'' وہ پھر میرے سوال سے پہلوتہی کر گیا، میں الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ میرے سامنے والے صوفے پر شوکی اور شکیلہ اپنے چہروں پر سوالیہ نشان لیے بیٹھے میری جانب ہی تک رہے تھے۔ ارشد جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہمراہ ایک بوڑھی خادمہ بھی تھی۔ جو ایک ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر لے آئی۔ اس میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ وہ خاموشی سے ہمارے درمیان ٹرالی کھڑی کر کے چلی گئی۔ ارشد نے میری طرف دیکھا وہ میری بے چینی بھانپ کر بولا۔

''اسے اسپتال جانا تھا بیگم صاحبہ کو لینے... اسی لیے مجھے تاکید کی تھی کہ میں تم سے مختصراً احوال لے کر اسے بتا دوں۔''

میں چونکا۔ ''اسپتال...؟ کک کیا ہوا بیگم صاحبہ کو... وہ خیریت سے تو ہیں...؟'' میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

''شاید تمہیں نہیں معلوم۔'' اس نے ایک اہم اطلاع دینے کے انداز میں کہا۔ ساتھ ہی ایک گہری ہمکاری بھی اپنے سینے سے خارج کی اور آگے بولا۔ ''بیگم صاحبہ کے والد... چودھری الف خان کا انتقال ہو گیا ہے۔''

اس اطلاع پر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ''کب کیسے؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس نے شوکی اور مجھے ٹرالی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پہلے پانی پیا... پھر چند بسکٹ کھائے... اس کے بعد چائے لے کر دوبارہ صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ شوکی اور شکیلہ بھی ٹرالی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ابھی دو تین گھنٹے پہلے کی بات ہے، انہیں دل کا دورہ پڑا۔ انہیں آناً فاناً شہر کے ایک بڑے اسپتال میں لایا گیا مگر بدقسمتی سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور اسپتال میں ہی دم توڑ دیا۔''

''اطلاع کس نے دی تھی بیگم صاحبہ کو...؟'' میں نے کسی خیال کے تحت ارشد سے پوچھا۔ وہ جواباً اپنے لیے بھی چائے کا ایک کپ بناتے ہوئے بولا۔

''انہی کے ایک محافظ نے دی تھی۔ امکان یہی ہے کہ... ایسا اس نے یقیناً وڈے چودھری (الف خان) کے کہنے پر یہ اطلاع دی تھی سیل پر...''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ گویا جس وقت ہم موضع مجھلواں میں داخل ہوئے تھے، یہ اس سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ تھا یا پھر جس وقت ہم ان کے لاڈلے بیٹے ممتاز خان وغیرہ سے نبرد آزما تھے شاید یہی سبب تھا کہ ہم نئے پنڈ کی جاگیر سے بہ خیر و عافیت نکل آئے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر ارشد سے کہا۔

''فرخ والے واقعے کے بعد... بیگم صاحبہ کا اسپتال جانا ضروری تھا؟ میرا مطلب ہے وہاں ان کا بڑا بھائی ممتاز خان بھی...''

''میرا نہیں خیال وہ اس نازک موقع پر اپنی بہن کے ساتھ کوئی گل کھلانے کی کوشش کرے گا۔'' ارشد میری بات سمجھ کر بولا۔ ''ویسے بیگم صاحبہ کے ساتھ گارڈز ہیں۔ اب کبیل دادا بھی جا چکا ہے۔''

''بیگم صاحبہ کو ان حالات میں کبیل دادا کو ساتھ رکھنا چاہیے تھا مگر انہوں نے اسے ہماری تلاش میں مصروف رکھا۔'' میں گومگو سے انداز میں بولا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد آیا۔ ''ارشد! یار ذرا اول خیر کو پوچھ لو جا کر... اس بے چارے نے بھی کچھ کھایا پیا نہیں ہے... اب بیگم صاحبہ اس کے ساتھ کیا کرنے والی ہیں؟''

میری بات پر وہ ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''بے فکر رہو، اول خیر کو تم جیسے آدمی کی سفارش حاصل ہے۔ اسے ناشتا وغیرہ پہنچا دیا گیا ہے۔''

اس کے بعد وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ آرام کرو... مجھے ذرا سیکیورٹی کے معاملات کا جائزہ لینا ہے... ممتاز خان سے کچھ بھی بعید نہیں... اور ہاں... میرا ایک مشورہ ہے جب تک بیگم صاحبہ نہیں آجاتیں، اول خیر سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ کھیل دادا کا حکم ہے میں نہیں چاہتا کہ بلاوجہ یہاں تمہاری کسی آدمی کے ساتھ منہ ماری ہو۔''

میں نے ایک تلخ سی مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہماری حالت نہایت خستہ ہورہی تھی۔ ہم تینوں نے غسل وغیرہ کر کے نئے کپڑے زیب تن کر لیے تھے۔ بیگم ولا میں ہر وقت ہر قسم کی اشیا موجود رہتی تھیں۔ ایک دو گھنٹے مزید گزر گئے۔ بیگم صاحبہ نہیں لوٹی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں تھا۔ شوکی اور شکیلہ کو الگ کرا دیا گیا تھا آرام دہ ماحول کا اثر تھا کہ مجھے نیند آنے لگی اور میں بیڈ پر نیم دراز... سوچوں میں مستغرق رہتے رہتے جانے کب سو گیا۔

☆☆☆

کسی کے جھنجوڑنے پر میں بُری طرح ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ یہ ارشد تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''اٹھو... شہزی! اٹھو... نکل بھاگو...'' اس نے بوکھلا کر مجھ سے کہا۔

میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور نجانے کیا افتاد اچانک آن پڑی تھی جس کے باعث میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔

''کک... کیا ہوا...؟ خیر تو ہے...؟'' میں نے ارشد کے بدحواس اور پُرتشویش چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''شہزی! خیریت بالکل نہیں ہے، سب درہم برہم ہو چکا ہے بس... تم نکل چلو... آؤ میرے ساتھ... وقت بالکل نہیں؟'' اس نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف لپکا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔

''شوکی اور شکیلہ کدھر ہیں...؟ اور اول خیر؟'' میں نے اس کے پیچھے تقریباً دوڑنے کے انداز میں تیز تیز چلتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی ان کو چھوڑو... اپنی خیر مناؤ، انسپکٹر روشن خان بھوکے بھیڑیے کی طرح تم پر جھپٹنے کو بے تاب ہے۔'' وہ بولا۔ اور مجھے ایک بڑے ہال کمرے سے نکالتا ہوا... جیسے ہی پچھواڑے بنے وسیع لان کے ایک کھلے گوشے میں آیا تو اسی وقت کئی بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔ شاید پولیس اندر داخل ہو گئی تھی۔ سامنے ایک دروازہ تھا۔ ارشد اسی طرف دوڑا۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو ہم دونوں ہی بُری طرح ٹھٹک کر رک گئے۔ چار پانچ پولیس اہلکار رائفلیں تانے چوکس کھڑے نظر آئے۔

''اب تم کہیں بھی بھاگ کر نہیں جا سکتے... شہزی... اتم قانون کے گھیرے میں آچکے ہو۔''

اچانک عقب سے ایک خونخوار بھیڑیے سے مشابہ آواز ابھری۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور سناٹے میں آگیا۔

یہ راجپوت انسپکٹر روشن خان تھا۔ اس کے ہمراہ سات آٹھ مسلح پولیس اہلکار چوکس کھڑے تھے۔ ارشد کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ انسپکٹر روشن خان کے بدہیئت ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ چھلک رہا تھا۔

''تمہارا کھیل ختم ہو گیا شہزی!'' وہ ملعون گویا اپنی فتح اور میری بے بسی پر حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔

آدمی نیند سے بیدار ہوتے ہی حالات دگرگوں کی اس یلغار سے میرا دماغ مزید ماؤف سا ہونے لگا۔ مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کب تھا۔

''اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دو۔'' روشن خان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس کے بعد مجھے اور ارشد کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔

میری ستم کار تقدیر نے ایک بار پھر مجھے دشمنوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسا دیا تھا۔ ارشد کا چہرہ بُری طرح ستا ہوا تھا۔ خود میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب اچانک اور کیسے ہو گیا؟ بیگم ولا جیسی مضبوط قلعہ نما حویلی میں انسپکٹر روشن خان اتنی آسانی سے کس طرح دندناتا ہوا داخل ہو گیا تھا؟ بیگم صاحبہ کہاں تھیں؟ اول خیر کہاں گیا؟

''اس کے دوسرے ساتھی اول خیر کا کچھ پتا چلا؟'' ہمیں آہنی زیور پہنانے کے بعد روشن خان نے اپنے سپاہی سے دریافت کیا جس نے جواباً کہا۔

''نو سر! لگتا ہے... وہ وقت سے پہلے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... کہ وہ اپنے اس جگری یار کو خطرے میں ڈال کر بھاگ جائے۔'' روشن خان وحشیانہ انداز میں غرایا۔ اس کا خیال غلط نہ تھا مگر اس بات پر مجھے بھی حیرت تھی، اول خیر کہاں گیا...؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالوں کے جوابات مجھے صرف ارشد ہی دے سکتا تھا۔

"ایک عورت اور مرد ملے ہیں جناب... دونوں خود کو بہن بھائی کہتے ہیں۔" وہاں کھڑے ایک سپاہی نے مودبانہ کہا اور میری پیشانی پر امڈ آنے والی سلوٹوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ یقیناً شوکی اور شکیلہ کی بات کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا اس بات پر رذیل صفت روشن خان کے سیاہ رو چہرے پر کمینگی کی ایک معنی خیز چمک ابھری تھی۔ اس کے مکروہ چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی میری نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ... اسے یہاں شب خون مارنے کی ہدایت سے پہلے اچھی طرح "بریف" کیا گیا تھا۔

"لے چلو... انہیں بھی۔" روشن خان کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔

میں نے انسپکٹر روشن خان کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر... وہ دونوں قانون کے مجرم نہیں ہیں، انہیں چھوڑ دے۔" میرے جلتے سلگتے اور لاوا اگلتے لہجے پر روشن نے ایک جھٹکے سے اپنی موٹی گینڈے جیسی گردن موڑ کر میری طرف دیکھا پھر اسی طرح برماتی نظروں میں مجھے لیے ہوئے چند قدم چلتا ہوا میرے بالکل قریب آن کھڑا ہوا اور بولا۔

"تمہارا ہر وہ ساتھی جو تمہارے ساتھ ہے، وہ قانون کا بھی مجرم ہے... لے جاؤ اس کو۔"

کئی سپاہی چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آ گئے... اور ہمیں باہر کھڑی ایک پولیس موبائل میں سوار کرا دیا گیا۔ وہاں ایک سیاہ جیپ کے علاوہ مزید ایک اور پولیس موبائل بھی کھڑی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تینوں گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی روانہ ہو گئیں۔

صرف مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا اور وہاں ایک تنگ و تاریک اور ننگی اینٹوں والی بیرک میں ڈال دیا گیا۔

میں دل گرفتہ بیرک کے ایک کونے میں دیوار سے پشت لگائے بیٹھ گیا۔ نجانے میری تقدیر میں کیا لکھا تھا؟ سلجھنے کو جب راہ سجھائی دیتی تو عین وقت پر سب کچھ الجھ جایا کرتا تھا۔ گویا بنتے بنتے میری تقدیر اچانک بگڑ جاتی تھی، مجھے یوں لگتا جیسے میری درماندہ زندگی ایک دائرے کی قیدی بن کر رہ گئی ہے، میں جہاں سے چلتا پھر وہیں آ جاتا۔

میں اب ایک بار پھر روشن خان کے رحم و کرم پر تھا اور یہ بات کم باعثِ تشویش نہ تھی کہ وہ میری موت کا خواہاں تھا۔ وہ چودھری ممتاز کے "ٹاسک" کے مطابق مجھے کسی بھی وقت مروا سکتا تھا۔ اس کی قید میں جانے کا مطلب موت کا قیدی بننا تھا۔

مجھے اس کی ہرگز توقع نہ تھی کہ آخر یہ سب اچانک اور اتنی تیزی کے ساتھ ہوا کیوں کر تھا؟ بیگم ولا میں تو چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھیں چہ جائیکہ... انسپکٹر روشن خان اپنی پولیس پارٹی سمیت دھڑلے کے ساتھ دندناتا ہوا نہ صرف اندر داخل ہوا بلکہ ہمیں بھی گرفتار کر لایا۔ ضرور اس سلسلے میں پہلے سے اس کی راہ ہموار کی گئی ہوگی... اور راہ ہموار کرنے والا ممتاز خان کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ میں نے پیش آمدہ حالات کا باریک بینی سے تجزیہ کیا تو کئی سوالوں کے جوابات مجھے بنا پوچھے ملتے چلے گئے۔ چودھری الف خان کا اچانک انتقال، بیگم صاحبہ کا اسپتال باپ کی عیادت کو جانا۔ یقیناً ممتاز خان بھی وہاں گیا ہوگا۔ اب تک کے حالات کا ممتاز خان کو تو علم تھا مگر بیگم صاحبہ کو اس کا اندازہ تھا کہ نہیں، پھر ممتاز خان سے دوبدو ٹاکرے کے دوران میرے سامنے اس کا اپنی بہن (بیگم صاحبہ) کے خلاف خطرناک عزائم کا اظہار کرنا یہ ثابت کرتا تھا کہ ممتاز خان نے باپ کی فوتگی والے موقع کو بھی نہیں بخشا اور اس مردود نے بیگم صاحبہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش چاہی ہوگی، اپنے بیٹے کی ہلاکت کے بعد وہ دشمنی میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ انتقام لینے کے لیے کسی بھی موقع کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا ہوگا۔

اس کم صفت رذیل انسان ممتاز خان کے لیے یہ اندازہ لگانا کون سی مشکل بات تھی کہ... میں اس کے صفت ابلیس حواریوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد پناہ کے لیے کہاں کا رخ کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے... پھر یقیناً بیگم صاحبہ کے ساتھ کوئی گل کھلایا ہوگا اس کے بعد اپنے راتب خور روشن خان کو بیگم ولا پر ریڈ کرنے کا "سنہری موقع" سے آگاہ کر دیا ہو۔

میرے پاس اب سوائے انتظار کے اب کوئی کام نہ رہا تھا جو میں کر رہا تھا۔ اس دوران عابدہ کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل و دماغ سے محو نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے دور تھی، بہت دور... کوسوں دور... اور جو اتنی دور ہوتا ہے، وہ اتنا ہی قریب ہوتا ہے... راہِ محبت کی کٹھنائیوں کو سہنے والوں پر شاید ستم کار تقدیر کی یہ ایک عنایت ہوتی ہے کہ وہ محبوب کو عاشق سے دور کر کے بھی مزید قریب کر دیتی ہے کہ محبوب اپنے دیوانے کے حواسوں اور خیالات پر چھایا رہتا ہے۔

وقت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا البتہ بیرک کے باہر سنسان کوریڈور میں کچھ اندھیرا سا اُتر آتا دیکھ کر اندازہ ہوتا

تھا کہ سورج ڈھلنے والا ہے۔ بیرک میں میرے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔

رات ہوگئی۔ میری بیرک کے قریب اب تک کوئی پھٹکا نہیں تھا... مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میں اٹھ کر سلاخوں کی طرف آیا اور کوریڈور کی طرف منہ کر کے چلایا... میں نے پانی مانگنے کے لیے کسی کو پکارا تھا مگر کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ میرا خیال تھا وہ ملعون روشن خان تو ضرور... میری ''مزاج پرسی'' کو آئے گا مگر مجھے حیرت تھی، وہ مجھے ڈال کر نجانے کدھر غائب ہوگیا تھا۔

وہ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ اس طرح اونگھتے جاگتے اندیشوں بھری رات گویا آنکھوں میں ہی کٹ گئی۔ صبح کہیں جاکر ایک سنتری کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی... وہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں پانی کا گلاس اور چائے کا ایک بدرنگ سا کپ سلاخوں سے پار تھما کر لوٹ گیا۔

ایک گلاس پانی ناکافی تھا۔ میں غٹاغٹ چڑھا گیا پھر چائے پینے لگا جو خاصی بدمزہ تھی۔

آسیبی سے نظر آنے والے کوریڈور میں اب دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی، اچانک کسی کے بھاری قدموں کی آواز ابھری۔

آنے والا شاید تنہا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ وہ کوریڈور کے سیلن زدہ فرش پر دانستہ اپنے بھاری جوتوں کی دھمک پیدا کرتا ہوا بیرک کے سلاخ دار دروازے کے بالکل قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ یہ انسپکٹر روشن خان تھا۔ اس کے مکروہ سیاہ رو چہرے پر کمینگی اور خطرناکی کے بھرپور تاثرات مترشح تھے۔ میری جلتی سلگتی نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ میری شعلہ بار آنکھوں میں پریشان کن الجھن سی تیر گئی کہ جانے اس خبیث نے اب میرے خلاف کون سا تیر آزمایا تھا۔ نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اخبار پر پڑیں۔ جو میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھا۔ اخبار آج کا ہی تھا۔ پہلے ہی صفحے پر کل سہ پہر بیگم ولا پر پڑنے والے پولیس ریڈ کی خبر جلی حروف میں چھپی تھی۔

میں دھڑکتی نظروں سے خبر پڑھتا چلا گیا۔ جس کے مطابق پولیس نے بیگم ولا پر ریڈ کرنے کے بعد میرے چند خطرناک مجرموں ارشد، شوکی اور شکیلہ کو گرفتار کرلیا ہے جبکہ اصل مجرم... یعنی میں پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

یہ خبر چونکا دینے والی تھی ساتھ ہی اس میں مجھے انسپکٹر روشن خان کے نئے رینک کا بھی علم ہوا۔ میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا، وہ اب ترقی پاکر ڈی ایس پی کا رتبہ اختیار کرچکا تھا۔

اخبار اس نے میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا۔ مجھے جیسے ہوش آیا۔

''میری طاقت اور میرے اختیارات کا تجھے اندازہ ہو ہی گیا ہوگا... شہزی! میں ہر طرح سے تیری قبر کھودنے کی سکت رکھتا ہوں۔''

وہ بھیڑیئے کے انداز میں غرایا۔ ادھر میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں... گویا میرا ایک اندیشہ تو درست ہی نکلا تھا۔ یعنی میری گرفتاری کو راز میں رکھا گیا تھا بلکہ راز میں کیا... سرے سے ہی جھوٹ پر مبنی تھا کہ میں بیگم ولا سے پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ دشمنوں کا میرے خلاف بھیانک اور خطرناک عزائم کا صاف پتا چلتا تھا۔

''اب تیرے سامنے انسپکٹر نہیں ایک ڈی ایس پی... ایک نیا پولیس افسر... روشن خان کھڑا ہے... شہزاد احمد خان عرف شہزی۔'' اس کی بکواس جاری رہی۔

''اس جھوٹ اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا مقصد جان سکتا ہوں... ڈی ایس پی روشن خان؟'' میں نے حتی المقدور اپنے اندر کے آتش فشاں ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ مکروہ انداز میں ہنسا پھر بولا۔

''اس میں تیرا فائدہ بھی ہے... اور نقصان بھی۔''

''فائدہ...؟ اور تم...'' میں زہرخند لہجے میں بولا۔

''ہاں فائدہ... اس صورت میں کہ تجھے صرف یہ قبول کرنا ہوگا کہ... چودھری ممتاز خان کے اکلوتے بیٹے فرخ کا قتل تو نے کیا تھا۔'' وہ گھمائے پھرائے بغیر سیدھی بات کرتے ہوئے بولا اور میرے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی مگر اسے بھڑکانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

''اس میں میرے فائدے والی کون سی بات ہو گی؟''

''تیرے اس اقبال جرم کے بعد... تیرے ساتھیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور سزا کے سلسلے میں تجھ سے خاصی رعایت برتی جائے گی۔''

اس کی بات سن کر مجھے اس کی عقل پر حیرت ہوئی، کیا یہ مجھے اس قدر نادان سمجھتا تھا؟ کیا اسے ابھی تک شہزاد احمد شہزی... کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔

ہم دونوں کا تو کئی بار آمنا سامنا ہو چکا تھا، کئی بار میں نے اسے زک بھی پہنچائی تھی۔ اس کے ٹی ٹارچر سیل کو بے نقاب کیا تھا۔ مجھے اپنے ٹی ٹارچر سیل میں غیر انسانی تشدد کی انتہائی منزلوں تک پہنچا کر بھی آزما کے دیکھ چکا تھا کہ شہزی کس قدر آہنی اعصاب کا مالک تھا پھر کیوں...؟ یہ مجھے ایسا سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آجاؤں گا؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے میری بے بسی اور شکست خوردگی پر اپنے تئیں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میں اب خود کو بے آسرا اور بے سہارا سمجھوں۔ اگر یہ بات تھی تو یہ اس کی بھول تھی، ایک فاش غلطی تھی کیونکہ شہزاد احمد شہزی نے سوائے اللہ کے کسی بندے کا سہارا نہیں لیا نہ ہی آسرا کیا... اس لیے کہ میں اپنے اللہ کو ہی اپنے لیے کافی سمجھتا تھا... پردۂ غیب سے اب تک جو میری مدد آئی، وہ اس کے حکم سے آئی۔ مجھے خاموش پاکر روشن خان کو خوش فہمی ہوئی کہ شاید میں اس کی لغو بیانی پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔

وہ بھویں اچکا کر مکارانہ خباثت سے بولا۔ ''سوچ لو اچھی طرح..... ایسے حالات میں جبکہ تیری مدد کو آنے والے اور پشت پناہی کرنے والے سب کے سب خود بڑی مصیبتوں کا شکار ہو چکے ہیں... تیری مدد کو کون آسکتا ہے بھلا... ویسے بھی تیرے پاس ہماری بات ماننے کے لیے ایک آپشن بچا ہے... ورنہ تو تو میری قید میں تو ہے ہی... روشن خان کی قید میں ہونا... کوئی معمولی بات نہیں... پتھر بھی لرزنے لگتے ہیں خوف سے۔''

اس فرعون صفت پولیس افسر کی گفتگو میں انتہا درجے کی کمینگی اور سفاکی رچی بسی تھی۔

میں اس کی قید میں اور اس کے رحم وکرم پر ہونے کے باوجود سلاخوں کے پیچھے سے اسے للکار سکتا تھا، اسے بتا سکتا تھا کہ راتب خوری کے حرام نوالے ٹھونسنے والے اس جیسے راشی پولیس افسر کی رگوں میں دوڑنے والا خون... ہر قسم کے جذبے سے عاری ہو جاتا ہے۔ جذبۂ شجاعت اور جاں نثاری تو در کنار... ایسے بے لہو عناصر جو بظاہر قانون کی وردی میں خود کو طاقت اور بہادری کا نمونہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اندر سے کس قدر بزدل ہوتے ہیں میں اسے اور بھی بہت کچھ جتانا اور یاد دلانا چاہتا تھا کہ اس مردود نے مجھے کتنی ہی بار جھکانے کی کوشش کی مگر ہر بار میں اسے گزند پہنچا کر اس کی ناک کے نیچے سے نکل گیا۔ یہ فرعون صفت خارش زدہ کتے کی طرح اپنے ہی زخم چاٹتا رہ گیا لیکن میں خاموش رہا۔ میری خاموشی اسے بولتے رہنے پر مجبور کرتی اور جو باتیں میں نہیں جانتا تھا، وہ اس سے فوری طور پر آگاہ ہو رہا تھا کیونکہ وہ میرے دشمنوں سے درون خانہ ملا ہوا تھا اور دشمنوں کی کارستانی سے واقف بھی۔ وہ مجھے اس رو اروی کے زعم میں سب کچھ بتا سکتا تھا۔

''کیا بیگم صاحبہ کو بھی گرفتار کیا جا چکا ہے؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر بھانپتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جواباً وہ اپنی موٹی توند پر پتلون کی بیلٹ درست کرتے ہوئے اس کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

''اب اسے بھول جاؤ اور اپنی فکر کرو۔''

میں اس کی بات پر اندر سے لرز گیا۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا بیگم صاحبہ کے ساتھ... جس کی وجہ سے بدبخت اسے بھول جانے کو کہہ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ بیگم صاحبہ نے میری بہت مدد کی تھی، وہ میرے لیے ایک مہربان خاتون ثابت ہوتی رہی تھیں، اول خیر جیسا جاں نثار اور وفادار ساتھی اس کا بین ثبوت تھا۔ بلاشبہ بیگم صاحبہ کے مجھ پر احسانوں کی ایک طویل فہرست تھی۔

میں اس رذیل صفت افسر کی اپنی جانب بھانپتی ہوئی نظروں سے اپنی اندرونی کیفیات چھپاتے ہوئے بظاہر لاابالی پن سے بولا۔

''آفیسر! ان حالات میں ہر انسان کو اپنی ہی فکر ہوتی ہے مگر میں جاننا تو چاہوں گا کہ آخر تم جیسا پولیس آفیسر... ایڈووکیٹ خانم شاہ کے گیٹ کا احاطہ بھی آج تک پھلانگ نہ سکا، اس نے بھلا بیگم ولا کی دیوار کیسے پھاندلی...؟''

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے اندر کا زہریلا غبار لفظوں کی صورت اگل ہی پڑا۔ میری بات پر اس کے سیاہ رنگت پیشانی پر سلوٹیں ابھریں۔ مگر یہ میرے کاٹ دار لفظوں کا اثر تھا کہ وہ دانت پیستے ہوئے پھٹ پڑا۔

''خانم شاہ نے اگر اب درمیان میں آنے کی کوشش کی تو اسے بہت بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا... فی الحال... وہ ہمارے راستے کی دیوار نہیں ہے۔''

''بیگم صاحبہ کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے؟'' میں اپنے اندر کی تشویش ناک بے چینی سے بالآخر مجبور پوچھ بیٹھا۔

یکلخت اس کے مکار چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ چمکی۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا ناں... اب اسے بھول جاؤ... آج سارے دن کی مہلت دے رہا ہوں میں اچھی طرح سوچ لے۔'' وہ پلٹ کر جانے لگا مگر پھر رکا اور میری بیرک کے سلاخ دار دروازے کے قریب آکر بولا۔

''ویسے وقت کی قید نہیں کل صبح سے پہلے بھی تیرا فیصلہ اثبات

میں ہوتو بتا دینا... مگر کل صبح سے زیادہ تجھے مہلت نہیں دی جائے گی۔'' اس کا لہجہ سنسنی خیز ہو گیا۔

میں خود کو قانون کی حراست سے زیادہ کسی وحشی دشمن کے رحم و کرم پر محسوس کرنے لگا تھا ظاہر ہے روشن خان نے سرے سے میری گرفتاری کو عوام وخواص میں ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا مجھے دہشت زدہ کر کے اپنی مرضی کا بیان دلوانے کے بعد انہی گمنامی کی تاریکیوں میں ہلاک کرنے کا سفاکانہ فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ جھوٹے بیان کی خاطر ہی مجھے شاید اب تک زندہ رکھا گیا تھا۔ اس میں یقیناً... ممتاز خان کی کوئی بڑی اور اہم کمزوری چھپی ہوئی تھی جس کا مجھے علم نہ تھا...

مجھے اب صحیح معنوں میں اپنی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔

میں اس بار واقعی بہت برا پھنسا تھا شاید حالانکہ یہ میری فطرت نہیں تھی کہ میرے ساتھی بھی قید و بند میں ہوں اور میں صرف اپنی فکر میں گھلتا رہوں۔ مگر حالات کی نزاکت اور وقت کی نوعیت اس بار اور تھی۔ میری گرفتاری کو ظاہر نہیں کیا گیا تھا اور مفرور گردانا گیا تھا جبکہ ارشد، شوکی اور شکیلہ کا معاملہ اتنا زیادہ نازک یا خطرناک نہ تھا... نہ ہی ان کا جرم اتنا سنگین تھا پھر ان کی گرفتاری بھی ظاہر کی گئی تھی لیکن مجھے یقینی موت کا خطرہ تھا۔

فرعون صفت روشن خان اس کے لیے مجھ پر تشدد کے پہاڑ بھی توڑنے کا ارادہ کر چکا تھا... بس آج کا دن میری خیریت کا تھا کل سے یہ خیریت میرے لیے خواب بننے والی تھی۔ میں سوچتا بھی تو کیا...؟ اس قید خانے سے مفر کی اور کیا راہ ہو سکتی تھی؟ مجھے برائے نام کھانے پینے کو دیا گیا۔ دن پوری طرح چڑھ آیا تھا بیرک کے روزن نما تنگ روشن دان سے تیز دھوپ کی کرنیں اندر پڑ رہی تھیں پھر دھیرے دھیرے... ان کی سفیدی سنہری ہونے لگی اور پھر ملگجے اندھیرے میں بدل گئی۔

اب شام ڈھلنے والی تھی۔ گزرتے وقت کا احساس... رات پڑنے پر ہی ہو سکا اور میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔ کل سے مجھے مشقِ ستم بنایا جانا تھا، اس کے بعد میرا کیا حشر کیا جاتا۔ میں باقاعدہ قانون کی حراست میں ہوتا بھی تو مجھے اپنے تحفظ کا احساس اور اطمینان رہتا مگر یہاں تو اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ تھا۔

وقت بھاری سل کی طرح گزرنے لگا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا، سلاخ دار دروازے کے پار کوریڈور پر مجھے عجیب سی نامعلوم منحوسیت ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہاں سے مدھم روشنی آ رہی تھی۔

میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ میں خود کو سزائے موت کا قیدی تصور کرنے لگا جسے صبح تختۂ دار پر چڑھایا جانے والا تھا۔

اچانک... ایک آواز پر میں ٹھٹکا۔ یہ آواز کوریڈور کے سرے سے ابھری تھی۔ میں بری طرح چونک کر اٹھ کھڑا ہوا مجھے ایک دو افراد کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دیں۔ افراتفری کا یہ عالم خاموشی کے ساتھ نہایت قلیل عرصے میں تمام ہوا، پھر دوسرے ہی لمحے تین مسلح افراد کو میں نے دوڑتے ہوئے اپنی بیرک کے قریب آتا دیکھا تو میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔ یہ کون تھے؟ غیبی امداد... اپنے دوست... یا پھر دشمن کی کوئی چال... کئی سوالات تھے جو اب ان کا ایک ہی تھا یعنی... میری آزادی۔

مذکورہ تینوں افراد میں سے ایک حرکت میں آیا۔ مجھے ان سے خوف بھی محسوس ہوا، کیا خبر میری جان لینے کے درپے ہوں مگر ایسا نہیں ہوا۔ آنے والے کے ایک ہاتھ میں چابیوں کا گچھا دکھائی دیا۔ اس نے فوراً آہنی چوکھٹے کے اندر ہاتھ ڈال کر چابی لگائی اور سلاخ دار دروازہ کھول دیا۔

''جلدی نکلو! وقت کم ہے آؤ...'' اس نے کہا۔ وہ اجنبی تھا۔ میں الجھن آمیز پریشانی میں بیرک سے باہر آ گیا۔

ہم نے کوریڈور کو تقریباً دوڑتے ہوئے کراس کیا۔ وہاں دو کمرے کے باہر دو تین سنتری فرش پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔ ان جیسے دو مزید ساتھی ایک دوسری راہداری میں ہمارے منتظر تھے۔ ان تینوں نے مجھے ان کے حوالے کیا۔ ان سب کے چہروں پر نقاب تھے۔ وہ دونوں مجھے لیے دوسری راہداری سے جو نسبتاً مختصر تھی، اس کے سرے پر واقع ایک دروازے سے باہر آئے جہاں احاطے کی دیوار کافی قریب تھی اور ٹوٹی ہوئی بھی تھی۔ وہاں سے وہ مجھے لیے باہر آ گئے۔ جہاں مجھے ایک کار کھڑی نظر آئی۔

ایک نے مجھے کار کی طرف اشارہ کیا۔ ہم کار میں سوار ہوئے ہی تھے کہ اندر احاطے میں زبردست فائرنگ کی آواز ابھری اور ساتھ ہی تیز آواز میں سائرن گونج اٹھا۔

''اپنے دونوں نجات دہندہ کو میں نے بری طرح چونکتے دیکھا۔ تاہم وہ رکے نہیں اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ فائرنگ کے ساتھ ہی ایک سماعت شکن دھماکے کی بھی آواز سنائی دی۔

''خدا کرے وہ تینوں سلامت ہوں...'' میرے

ساتھ عقبی نشست پر بیٹھنے والے نے دعائیہ کلمات ادا کیے جو یقیناً ان تینوں افراد کے لیے تھے جو ان کے ساتھی تھے۔

کار آناً فاناً فراٹے بھرتی ہوئی پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے دور ہوتی چلی گئی۔

''کیا میں اپنے محسنوں کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے بالآخر اپنے دل کی بے تحاشا دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا تو کار ڈرائیو کرنے والے نے میرے ساتھ براجمان اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔

''تارڑ! اسے بتادو ہم کون ہیں؟''

تارڑ نامی ساتھی نے اپنے چہرے سے نقاب کھینچ لیا۔ یہی نہیں... اس کے دوسرے ساتھی نے بھی یہی کیا مگر دونوں کے چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ میں مزید الجھ گیا اور جواب کا منتظر تھا۔ پھر تارڑ نامی ساتھی نے میرا شانہ تھپتھپا کر دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔

''زبیر خان کو جانتے ہو گے...''

''اوہ۔'' میں بے اختیار چونک پڑا اور ایک گہری ہنکاری لے کر رہ گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ زبیر خان کو یہ کیسے پتا چلا کہ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر کی خفیہ بیرک میں قید کر کے رکھا گیا ہے جبکہ میری گرفتاری کو روشن خان نے راز میں رکھا تھا؟ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

''ناممکن۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ وہ دونوں چونکے پھر اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے شخص نے کہا۔

''واقعی یہ سب تمہارے لیے ناممکن ہی ہو گا... مگر بہت جلد یقین آجائے گا تمہیں جب تم اپنی کھلی آنکھوں سے زبیر صاحب کو دیکھو گے۔''

''کیا تم لوگ مجھے کھلاں والی لے جا رہے ہو؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''نہیں۔'' میرے ساتھ بیٹھے تارڑ نے کہا۔ دونوں پکی عمر کے مضبوط اور توانا مرد تھے۔ رنگت قدرے جھلسی ہوئی تھی اور چہرے مہرے سے ان کا شمار بھی شرفا میں نہیں کیا جا سکتا تھا جہاں تک میرا تجربہ تھا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہو سکی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے اسٹیئرنگ والے نے اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا تھا۔

''ہاں، کیا ہوا؟ نکل گئے تم؟'' پھر دوسری طرف چند سیکنڈوں کی جوابی گفتگو کے بعد بولا۔ ''بس ٹھیک ہے پھر وہیں پہنچوں ہم بھی ادھر ہی کے لیے نکل پڑے ہیں۔ خیال رہے، کالے کتے پیچھے نہ لگے ہوں... ورنہ مشکل آجائے گی... اگر ایسی بات ہو بھی تو انہیں چکما دینے کے بعد ہی نیلی کوٹھی پہنچنا ہو گا، سمجھ گئے؟''

''گڈ۔''

''سب ٹھیک ہے۔ مشن سو فیصد کامیاب ہے۔''

سفر خاموشی سے جاری رہا۔ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دل مسرور تھا اور مطمئن بھی۔ بلاشبہ زبیر خان کا یہ مجھ پر بڑا احسان تھا مگر جانے کیوں باوجود اس کے دل و دماغ ایک عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ... میرے لیے یہ سب بالکل اچانک ہی نہیں غیر متوقع بھی تھا۔ ویسے جب آخری بار زبیر خان سے میری ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی تو اس نے پہلے ہی مجھ سے دوستانہ عزائم کا اظہار کیا تھا، وہ مجھ سے کوئی خفیہ ڈیلنگ بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ڈیل کیا تھی؟ مجھے اس کا علم نہ تھا۔ نیز اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے اس سے ملنے کے لیے کھلاں والی تک کا سفر نہیں کرنے پڑے گا۔ اس کی ایک رہائش گاہ ملتان میں بھی ہے۔ وہاں کیا بات چیت ہو سکتی تھی مگر مستقل خطرے کی صورت اور طویل پناہ کے لیے میں بے دھڑک کھلاں والی اس کی جاگیر کا بھی رخ کر سکتا تھا۔

ایسے وقت میں جبکہ میرے ذاتی ہمدردوں کا کچھ اتا پتا نہ تھا... اور میرے دشمن نہ صرف ان پر بلکہ مجھ پر بھی حاوی ہونے لگے تھے ایسے میں... زبیر خان کا ساتھ میرے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

میں خاموشی سے کھڑکی سے باہر تاریکی میں گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ کار چکنی ویران سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ شہر کے قلب سے نکل کر جنوب مغرب کی سمت دور دور یہ روڈ نکلتی تھی۔ اس پر پندرہ بیس منٹ کا یہ سفر مزید جاری رہا۔ یہ کوئی نئی رہائشی اسکیم تھی جس کے اشتہارات میں ٹی وی اور اخبارات میں دیکھتا اور سنتا آیا تھا۔ آبادی سے الگ تھلگ یہ علاقہ خاصا پُرفضا اور پُرسکون نظر آتا تھا۔ شہر سے پانچ چھ کلو میٹر ہی دور تھا، وہ نیلی کوٹھی اسی طرف ہی تھی یہاں پہنچ کر مجھے لگا جیسے یہ کوئی نیا چھوٹا شہر ہو... دس مرلے کے بنگلوں سے لے کر ایک ایک، دو دو کنال پر کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی کوٹھی کے دیوہیکل آہنی گیٹ کے سامنے کار رک گئی۔ گارڈ کیبن سے ایک باوردی محافظ نمودار ہوا اس کے بعد دونوں آہنی پٹ خودکار انداز میں دائیں بائیں کھل گئے۔ کار رینگتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ دیدہ زیب پختہ روش پر چلتی ہوئی اندر کار پورٹیکو میں جارکی۔

دو السیشن کتے بھی چوکس انداز میں منڈلاتے دکھائی دیے۔ نیلی کوٹھی کے نام سے منسوب یہ کوٹھی کہیں سے بھی نیلی نظر نہیں آرہی تھی جانے کیوں اس کا نام نیلی کوٹھی رکھا گیا تھا؟

بہرحال... ہم اندر ایک بڑے کمرے میں آگئے۔ نشست گاہ کی طرز کے اس کمرے میں بہت آرام و تسکین کا احساس ہوا۔

''زبیر صاحب ادھر ہی تشریف رکھتے ہیں؟'' میں نے اپنے ساتھ آنے والے دو افراد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو پچھلے دس بارہ دنوں سے ادھر ہی ہیں۔'' ایک نے صوفے پر تھکے تھکے انداز میں براجمان ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کی وجہ تم ہی ہو۔'' دوسرے نے بھی قریب کا صوفہ سنبھالتے ہوئے کہا اور کسی کو آواز دی۔ مگر اس کی آواز بلند ہونے سے قبل ہی ایک بھاری بھرکم شخصیت کا حامل آدمی اندر داخل ہوا۔ جسے دیکھتے ہی وہ دونوں یک دم اپنی جگہ سے اچھلنے کے انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں نہایت مؤدبانہ انداز میں سرک کر صوفوں کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ میں بھی لامحالہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ زبیر خان تھا۔ عمر ساٹھ کے آس پاس نظر آتی تھی مگر صحت قابلِ رشک تھی۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ چہرے مہرے سے پکا کشمیری نظر آتا تھا۔ سر کے بال سفید تھے۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میرے ساتھ اس نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ اور مصافحہ کیا۔ پھر وہ میرے سیدھے ہاتھ والے صوفے پر براجمان ہوگیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیش قیمت سلیپنگ گاؤن میں تھا۔

''میں آپ کا بہت مشکور ہوں... جناب... بلاشبہ آپ نے مجھے بڑی مصیبت سے نکالا ہے۔'' میں نے اس سے گفتگو کی ابتدا میں ہی اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔

''میں نے تو تمہیں پہلے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ میری طرف کھلاں والی نکل آؤ، ادھر کوئی پرندہ بھی ہماری اجازت کے بغیر پر نہیں مار سکتا مگر تم... خیر... جانے دو... دیر آید درست آید۔'' وہ ہولے سے مسکرایا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کی ہلکی مسکراہٹ جانے کیوں مجھے اسرار بھری محسوس ہوئی۔

''مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔ ''لیکن بدقسمتی سے میں کچھ ایسے طوفانی حالات کا شکار رہا تھا کہ کہیں نکل جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

''ہوں۔'' اس نے گہری ہنکاری بھری۔ اس کی آواز میں عجیب سی کھرکھراہٹ تھی۔ پھر اس نے قریب کھڑے دو میں سے ایک کو مخاطب کر کے ٹھیٹ علاقائی پنجابی میں کچھ پوچھا۔ جو ظاہر ہے میں بھی سمجھتا تھا۔ اس نے باقی ساتھیوں کے بارے میں دریافت کیا جو مجھے چھڑانے کے لیے اس مشن پر روانہ ہوئے تھے۔ تارڑ نامی شخص نے نہایت مؤدبانہ انداز میں اسے ان کی خیریت سے آگاہ کیا کہ وہ بھی پہنچ چکے ہیں... پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''نوجوان! اب تم آرام کرو... کل ناشتے کے بعد تم سے تفصیلی بات چیت ہوگی۔''

یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اپنے مذکورہ دونوں آدمیوں کو میرے آرام وغیرہ کے سلسلے میں کچھ ہدایت دے کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس کمرے میں ہی ان دونوں یعنی تارڑ وغیرہ نے میرے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کردیا۔ اس کے بعد مجھے دوسرے کمرے میں لے آئے۔

اگلے دن غسل اور ناشتے وغیرہ کے بعد میں خود کو بالکل ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کرنے لگا۔ زبیر خان نے میرے ساتھ ہی ناشتا کیا تھا اور ناشتے کی میز پر اس کے علاوہ ایک حسین و جمیل جوان خاتون کو بھی وہاں موجود پاکر میرا یہ خیال غلط نکلا تھا کہ اس کوٹھی میں صرف زبیر خان ہی رہائش پذیر تھا، یہ اس کی عارضی رہائش گاہ سہی لیکن یہاں بھی بڑے ٹھاٹ نظر آرہے تھے۔

زبیر خان نے اس خاتون کا مجھ سے اپنی بیگم کے طور پر تعارف کروایا تو مجھے کچھ خاص حیرت نہ ہوئی۔ اس طرح کے بڑے زمینداروں کی ''اگلی'' بیویاں اسی طرح کی ہی ہوتی ہیں خود سے کم عمر، حسین اور طرح دار۔

اس کا نام نیلی خاتون تھا اور کوٹھی بھی یقیناً اس کی اس چہیتی بیگم کے نام سے منسوب کی گئی تھی۔ سو کوئی بعید نہ تھا کہ یہ کوٹھی بھی اس کے نام کردی گئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے ''نیلی'' کا سرسری سا جائزہ لیا۔ وہ عمر میں مجھ سے پانچ چھ سال بڑی ہوگی، البتہ زبیر خان سے آدھی عمر چھوٹی تھی۔ جسم بھرا بھرا تھا... رنگ گورا، دلکش خدوخال کی مالک مجموعی طور پر وہ حسین عورت تھی۔

اس کی موجودگی میں خود کو تھوڑا نروس سا محسوس کرنے لگا۔ ناشتا پُرتکلف تھا۔ ناشتے کے بعد چائے کا دور چلا۔ ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ زبیر خان ڈائننگ ٹیبل کے سرے والی کرسی پر براجمان تھا۔ جسے عرفِ عام میں گھر کے

سربراہ والی کرسی کہا جاتا ہے۔ اس کے سیدھے ہاتھ والی کرسی پر نیلی خاتون اور اس کے سامنے یعنی زبیر خان کے بائیں ہاتھ کی کرسی پر میں تھا۔ یوں نیلی خاتون اور میں آمنے سامنے تھے۔ میں نے بس ابتدا میں ایک بار ہی اس پر اور اس کے ''سراپا'' پر نظر ڈالی تھی، اس کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھنے سے احتراز ہی برتا تھا مگر مجھے احساس ہوتا رہا کہ وہ بار بار اپنی گہری آنکھوں کی گھنیری پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھتے رہنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

ناشتا ہوتا رہا۔ اس دوران ایک آدمی نے آکر زبیر خان کو جھک کر مؤدبانہ انداز میں کچھ کہا۔

''میں ابھی آیا۔'' کہہ کر وہ ٹیبل سے اٹھ کر اس آدمی کے ہمراہ ایک طرف چلا گیا۔ آدمی کے ہاتھ میں کارڈلیس تھا۔ جو اب زبیر خان... کے کان سے لگا ہوا تھا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک صوفے سے ٹک کر نہایت دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگا۔

میں پھر نروس سا ہونے لگا اور سر جھکائے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ سامنے والی کرسی پر بیٹھی نیلی خاتون میری طرف ہی تکے جا رہی ہے مگر میں نے اپنی نظریں نفیس قسم کے کپ پر ہی جمائے رکھی تھیں۔

معاً مجھے ٹیبل سے نیچے اپنے پیروں پر کسی اور کے پاؤں کا ایک ہلکے سے ''ٹھوکے'' کا احساس ہوا۔ بے اختیار میری چونکتی ہوئی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ میری طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، لمحہ بھر کو اس نے ترچھی نگاہیں کر کے اپنے شوہر زبیر خان کی طرف دیکھا جو کارڈلیس پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ نیلی خاتون کا اس طرح اپنے شوہر کی طرف معاً ترچھی نگاہ سے دیکھنا گویا مجھے یہ جتانا تھا کہ وہ اس سے چھپ کر یہ ''حرکت'' کر رہی ہے تب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میرے پورے وجود میں سنسنی خیز لہریں دوڑنے لگیں۔ میں نے دوبارہ اپنی نظریں چائے کے کپ پر جھکا لیں۔ ایک بار پھر مجھے نیچے اپنے پیروں پر اس کے پاؤں کا ''ٹھوکا'' لگا۔ میں نے اپنی ٹانگیں تھوڑا پیچھے کر لیں۔ مجھے یقین تھا اس کی یہ حرکت غیر دانستہ نہ تھی، مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں اس ''قبیل'' کا مرد نہیں تھا کہ ان ''چہلوں'' میں دلچسپی لیتا۔ لہٰذا میں نے اپنے چہرے پر فوراً گہری سی سنجیدگی طاری کر لی۔ اس دوران میں زبیر خان... واپس ناشتے کی میز پر لوٹ آیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کے ہم دونوں قریبی صوفوں پر آکر بیٹھ گئے۔ نیلی خاتون ٹیبل پر بیٹھی تھی، اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ وہ بہت ہولے ہولے چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی اور ہر دو تین گھونٹ بھرنے کے بعد ذرا گردن موڑ کر بظاہر سرسری انداز میں ہماری طرف دیکھ لیتی تھی۔ اس بار میں نے اس کے چہرے پر نہایت گہری سنجیدگی محسوس کی تھی۔ میں مقصد کی بات پر آنے کے لیے بے چین تھا۔ میری بے چینی بھانپ کر زبیر خان نے ایک نظر ناشتے کی میز پر بیٹھی اپنی بیگم پر ڈالی اور اس وقت تک ڈالے رکھی جب تک کہ نیلی کی اس سے نظریں چار نہ ہو گئیں، چار ہوتے ہی نیلی نے فوراً چائے کا کپ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

نیلی کے جاتے ہی میں نے خود کو پُرسکون سا محسوس کیا۔ زبیر خان نے ایک سگریٹ سلگائی۔ یہ پتلی تنکے جیسی لمبی سگریٹ تھی۔ جس کا دھواں خوشبودار تھا۔ اور گاڑھا بھی نہیں تھا ایک کش لگانے کے بعد وہ بولا۔

''شہزی! تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم اس بار بہت برے پھنسے تھے۔'' مجھے اس کا انداز احسان جتانے والا محسوس ہوا۔ جس نے مجھے تھوڑا پریشان بھی کر دیا۔ اس طرح احسان جتانے کا اشارہ دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کا بدلہ بھی اتارا جائے۔ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو۔

''ممتاز خان پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ چکا ہے۔ اپنے باپ الف خان کے حوالے سے وہ بڑا اثر و رسوخ بھی رکھتا ہے... حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی اس سے دامن بچانے ہی کی کوشش کرتے ہیں مگر تمہاری خاطر ہمیں اس سے دشمنی کا خطرہ مول ہی لینا پڑا۔''

ایک بار پھر اس کے اس انداز نے مجھے فکرمند کر دیا۔ میں نے بے اختیار کہا۔ ''شاید آپ کے علم میں نہیں کہ چودھری الف خان...''

''کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اس نے فوراً ہی میری بات درمیان سے اچک لی۔

''کیا ممتاز خان کو معلوم ہے کہ مجھے پولیس کی تحویل سے اس طرح چھڑانے کا سبب آپ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا پھر بولا۔ ''تم پولیس کی قید میں تھے ہی کب... شہزی؟ تمہیں تو ایک منصوبے کے تحت بڑی بھیانک پولیس گردی کا شکار بنایا جانے والا تھا۔ ویسے میرے آدمیوں نے یہ کارروائی بہت رازداری اور کامیابی

کے ساتھ نمٹائی ہے۔''

''میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس حقیقت کا کیسے علم ہوا کہ میں روشن خان کی قید میں ہوں۔ جبکہ میری گرفتاری کو بھی اس نے کسی مذموم مقاصد کی خاطر راز میں رکھا تھا۔''

''روشن خان... ممتاز خان کا بڑا پرانا ناؤٹ ہے۔'' وہ بولا۔ پتلا سرمئی رنگ کا سگریٹ اس کی موٹی موٹی انگلیوں میں تھرک رہا تھا۔ ''وہ اس کی شہ پر بڑے دھڑلے کے ساتھ پولیس گردی کرتا رہا ہے... خیر، تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ اخبار میں بیگم ولا پر پولیس ریڈ کی خبر پر میں چونک پڑا تھا۔ اس میں تمہارے ساتھیوں کی گرفتاری اور تمہارے پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے کی بھی خبر تھی۔ اس خبر نے مجھے بھی گمراہ کر دیا تھا۔ میں بھی یہی سمجھا تھا کہ تم واقعی فرار ہو گئے ہو... مجھے تمہاری فکر ستانے لگی۔ میں تو خود اتنے عرصے سے تم سے ملاقات کرنے کے انتظار میں تھا۔ پھر اس دوران ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔ اسپتال میں اپنے باپ کی عیادت اور انتقال کے بعد واپسی کے وقت اس کی بیٹی زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) پر نامعلوم مسلح افراد نے حملہ کر دیا۔'' وہ ذرا رکا... میرے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ میں ان کے بولنے کا بے چینی سے منتظر رہا۔ وہ آگے کہنا شروع ہوا۔

''اس کے بعد زہرہ بانو کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ کدھر غائب ہو گئی؟ کچھ پتا نہیں۔ اب تم بتاؤ تمہارے ساتھ کیا صورتِ حال ہے؟''

بیگم صاحبہ کے متعلق بات کھل نہ پائی۔ تاہم میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے انہیں اب تک کے سارے اعصاب شکن اور آسیہ کی دردناک موت سے متعلق ساری حقیقت بیان کر دی جسے سن کر زبیر خان کی آنکھیں پھیل گئیں، چہرے پر گہری گمبھیرتا چھا گئی۔

''مجھ میں تو اتنی بھی ہمت نہیں ہو پا رہی ہے کہ اس کی دردناک موت کی خبر... اس کی بڑی بہن ایڈووکیٹ خانم شاہ کو دے سکوں؟ مگر سوچتا ہوں... یہ کڑوا گھونٹ مجھے ہی پینا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ آسیہ کے ذکر پر میرے لہجے میں کبیدگی اتر آئی تھی۔

''اس کی اطلاع تو تمہیں دینا ہی پڑے گی کیونکہ تمہیں اب پہلے سے زیادہ خانم شاہ کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے جبکہ اب جو رول تمہارے حق میں آسیہ ادا کرنا چاہ رہی تھی وہ اب اس کی بڑی بہن خانم شاہ کرے گی۔'' زبیر خان کی بات قابلِ غور تھی۔ آسیہ کی موت کے بعد خانم شاہ ہی میری قانونی معاملات میں مدد کر سکتی تھی۔ وہ ایک ذرا توقف کے بعد آگے بولا۔

''خانم شاہ سے تمہارے سلسلے میں میری بھی بات ہوئی تھی اگرچہ مختصر سی سہی مگر وہ پُرامید تھی اپنی چھوٹی بہن آسیہ کے مشن پر...'' میرے دل و دماغ میں کافی دیر سے ایک سوال گردش کر رہا تھا۔ زبیر خان کی اس بات پر مجھے وہ سوال پوچھنے کا موقع مل گیا۔ میں نے پُرغور نظروں سے زبیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جناب! آپ نے بھی تو میرے سلسلے میں اپنا بیان بدل ڈالا تھا اس سے کتنا فرق پڑا؟''

یکلخت اس کے چہرے پر گمبھیرتا چھا گئی۔ نشست گاہ میں دم بخود سناٹا طاری ہو گیا۔ میرے اس سوال پر... اس کے چہرے پر ماضی قریب کے کچھ تلخ اور درد بھرے واقعات کے حوالے سے کئی سائے لہرا گئے۔ اس نے قدرے مضطربانہ انداز میں سگریٹ کے یکے بعد دیگرے دو تین کش لگائے پھر نفیس قسم کی سنگ مرمر کی ایش ٹرے میں اسے مسل ڈالا۔

''میں تو اسی وقت تمہارے سلسلے میں اپنا بیان بدل چکا تھا کہ... میرے بیٹے شفقت راجا کے قتل میں تمہارا ہاتھ نہیں اور اب آسیہ کی دردناک موت نے بھی ثابت کر ڈالا ہے کہ واقعی یہ حقیقت تھی جو ذرہ برابر شبہ تھا تمہارے بارے میں مجھے، وہ بھی دل سے نکل چکا میرا... کیونکہ اس ویڈیو کلپ کی تردید اور تلافی کرنے کی خاطر آسیہ اور تم نے کتنے پاپڑ بیلے تھے جبکہ ممتاز خان نے یاسین ملک کو بھی خرید لیا تھا اور اسے اس ویڈیو کلپ کی اپنے نجی ٹی وی چینل پر تردید چلانے یا دکھانے سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا۔ آسیہ کے منگیتر ریحان کے حوالے سے بھی ممتاز خان کی میرے ساتھ ہٹ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس وقت تک ریحان کو یرغمال بنائے رکھوں جب تک اس کا اصلی دشمن یعنی تمہارا صفایا نہیں ہو جاتا... مگر میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کے اصل قاتلوں کے سلسلے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لوں گا کیونکہ میں نے اپنے ذاتی ذرائع سے پتا لگوا لیا تھا کہ میرے بیٹے کے قتل میں بہرحال تم ملوث نہیں تھے۔'' وہ رکا۔

''اس کے بعد میری تم سے دشمنی کا جواز ختم ہو کر رہ جاتا ہے اس لیے میں نے نہ صرف ریحان کو چھوڑ دیا تھا بلکہ تمہاری مدد کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا اور فوراً تمہارے سلسلے

میں عوام وخواص میں اس بات کا اعتراف کرلیا کہ میرے بیٹے شفقت راجا کے قتل میں شہزاد احمد خان عرف شہزی نہیں بلکہ کوئی اور لوگ ملوث ہیں۔ میں نے قانونی طور پر بھی تمہیں بے گناہ قرار دلوادیا تھا۔ مگر یہ بات ممتاز خان کے مفادات کے خلاف جاتی تھی۔ وہ بپھر گیا مگر میں نے اس کی مطلق پروانہ کی... لہٰذا اب اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے، وہ خانم شاہ پوری کردے گی۔ رہی بات ممتاز خان کے بیٹے کے قتل کی جس کا الزام تمہاری اور تمہارے قریبی ساتھی اول خیر کے سر پر تھوپا جارہا ہے... اس سلسلے میں بھی تمہیں فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اس کی بیٹی نوشابہ نے یہ حقیقت تسلیم کرلی ہے کہ اس کا بھائی فرخ کا قتل اس کی غلطی سے پستول چل جانے سے ہوا ہے۔“

”مگر اس سلسلے میں ممتاز خان کا جواز بڑا ٹھوس ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”وہ اس کی وجہ بھی مجھے ہی سمجھتا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ... ہم فرخ کو محض اغوا کرنا چاہتے تھے، اسے مارنا نہیں۔“

”ہاں، باوجود تمہاری تاویل کے... قانونی طور پر بھی اس کی وجہ تم ہی گردانے جاؤ گے۔ میں اس سلسلے میں ٹیلی فون پر خانم شاہ سے بھی تبادلۂ خیال کرچکا ہوں۔ اب ہم منتظر تھے کہ کب آسیہ تمہارے سلسلے میں وہ لائیو پروگرام چلاتی ہے۔ جس کے بعد بہت سی قانونی پیچیدگیاں تمہارے حق میں آسان ہوتی چلی جاتیں مگر افسوس... ایسا نہ ہوسکا۔“

میں نے کہا۔ ”آسیہ کے بعد خانم شاہ ہمارے لیے اہم ہوسکتی ہے مگر اب وہ میری اس سلسلے میں کیا مدد کرسکتی ہیں؟“

”میں اس سلسلے میں بہت مختصر مگر جامع پروگرام ترتیب دے چکا ہوں۔“ زبیر خان جواباً پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ”میرا ایڈووکیٹ خانم شاہ کو یہاں بلانے کا ارادہ ہے۔ تم بھی فون پر ان سے بات کرلینا، تم سے بات کرکے وہ یقیناً مطمئن ہوجائیں گی۔ اور ادھر چلی آئیں گی پھر ہم سر جوڑ کر ایک لائحہ عمل طے کریں گے کہ تمہیں کس طرح اس قانونی چکروں سے آزاد کرایا جاسکتا ہے؟ مگر ابھی فون پر تم انہیں آسیہ کی موت کا کچھ نہیں بتاؤ گے۔“

”لیکن اسے اس کی بہن کی موت کا بتانا تو پڑے گا۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے زبیر خان کی طرف دیکھا۔

”جب وہ یہاں آئے گی تو اسے بتادیا جائے گا۔“

”مگر یہ دکھ بھری خبر اس کے لیے ذہنی شاک (صدمے) کا باعث بنے گی۔ میرا نہیں خیال اپنی بہن کی موت کی خبر سننے کے بعد وہ ہم سے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کرنے کے قابل ہو؟“

”تمہاری بات صحیح ہے۔“ زبیر خان نے صاد کیا۔ ”مگر وہ ایک قابل وکیل بھی ہے یقیناً مضبوط اعصاب کی مالک ہوگی۔ اپنی چھوٹی بہن کے اس بہیمانہ قتل کا انتقام وہ بھی ممتاز خان سے لینا چاہے گی۔ پہلی ملاقات میں نہ سہی... ایک دو روز بعد سہی... اب وہی کوئی مشورہ دے سکتی ہے۔“

بغیر وقت ضائع کیے زبیر خان نے اپنے سیل فون پر ایڈووکیٹ خانم شاہ سے رابطہ کیا پھر فون مجھے تھما دیا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب سی حالت ہورہی تھی، دکھ بھی ہورہا تھا، پورا یقین تھا مجھے خانم شاہ چھوٹتے ہی سب سے پہلے اپنی الم نصیب بہن آسیہ کے بارے میں ہی مجھ سے پوچھے گی اور ہوا بھی وہی۔ میری آواز سنتے ہی وہ مرتعش سے لہجے میں بولی۔

”شش... شہزی... ! تت... تم... ٹھیک تو ہو نا...؟ آسیہ خیریت سے ہے؟ تم لوگ سب اچانک کدھر غائب ہوگئے تھے پروگرام کا کیا بنا...؟“ اس کے منہ سے سوالوں کی بوچھار جاری تھی جس کا میں نے سرِدست ایک جواب دیا۔

میں فون پر آپ کو زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ بس اس قدر جان لیجیے کہ... اب ہمیں آپ کے مشورے اور مدد کی زیادہ ضرورت آن پڑی ہے۔ آپ نیلی کوٹھی آسکتی ہیں... زبیر صاحب کے ہاں...؟“

”ابھی آجاتی ہوں۔ فون دو انہیں۔“ دوسری طرف سے اس کی مضطربانہ آواز ابھری۔ میں بھی یہی چاہتا تھا دراصل زیادہ دیر تک میری ان سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ انہوں نے خود ہی میری مشکل آسان کردی۔ لہٰذا میں نے فوراً سیل دوبارہ زبیر خان کی طرف بڑھا دیا۔

دونوں میں مختصر سی بات ہوئی... جس کے مطابق خانم شاہ کو اس کی رہائش گاہ سے لانے کے لیے زبیر خان اپنے آدمی روانہ کرنا چاہتا تھا مگر خانم شاہ نے اسے ایسا کرنے سے منع کردیا۔ اب وہ خود ہی تنہا اپنی کار میں یہاں نیلی کوٹھی پہنچنے والی تھی... ہم دونوں اس کی آمد کے بے چینی سے منتظر تھے۔

مجھے سرد بابا سے بھی بات کرنا تھی۔ میں ان سے... عابدہ اور ان کی بہو عارفہ کی خیریت وغیرہ معلوم کرنا چاہتا

تھا۔ ظاہر ہے مجھے زیادہ بے چینی عابدہ کی خیریت معلوم کرنے کی ہو رہی تھی۔ یوں بھی سرمد بابا خود بھی میرے لیے فکرمند ہوں گے۔ زبیر خان سے میں نے اس کی درخواست کی۔ اس نے فوراً کارڈلیس منگوا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ سرمد بابا کے نمبر پنچ کیے۔ ان سے بات ہوئی۔ وہ واقعی میرے لیے فکرمند تھے۔ میں نے عارفہ اور بالخصوص عابدہ کے سلسلے میں ان سے خیریت پوچھی۔ خدا کا شکر تھا وہاں امریکا میں وہ دونوں خیریت سے تھیں۔ سرمد بابا نے میری تمام مصیبتیں اور پریشانیاں ختم ہونے اور میرے جلد سے جلد گھر پہنچنے کی ڈھیروں دعا دیں۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔ عابدہ کی خیریت معلوم کرنے کے بعد... میں اب خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا مگر میرا دل اس سے بات کرنے کے لیے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ البتہ سرمد بابا کا روزانہ ان سے ٹیلی فون پر رابطہ رہتا تھا۔ عارفہ کا اسٹیٹ کے جس اسپتال میں علاج ہو رہا تھا اس کا نمبر میرے پاس تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نمبر ملایا... وہ بڑی جا رہا تھا۔ عابدہ کے سیل فون پر جو اس نے وہاں جانے کے بعد حاصل کیا تھا اس نمبر کو عارفہ اور عابدہ دونوں ہی استعمال کرتی تھیں اس پر بھی ملایا دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ عابدہ سے بات کرنے، اس کی مترنم آواز سننے کے لیے میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیات ہونے لگیں۔ بالآخر دوسری جانب سے عابدہ ہی کی آواز ابھری۔

''ہیلو'' اس کی آواز امرت دھارا کی طرح میری سماعتوں میں اُتری جس نے مجھے سرتاپا سرشار و بےخود سا کر دیا۔ میں اپنی دلی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے گویا دل کی عمیق گہرائیوں سے بولا۔

''عابدہ... میں تمہارا شہزی... تم کیسی ہو؟''

''شش... شہزی...'' دوسری جانب سے عابدہ کی جذبات سے معمور لرزیدہ آواز ابھری۔ ''تم... کہاں ہو...؟ کیسے ہو... ٹھیک تو ہو نا؟'' اس کی آواز میں محبت کی سرشاری تھی اور فکر بھی۔

میں نے کہا۔ ''ہاں، عابدہ! میں ٹھیک ہوں تم تو ٹھیک ہونا...؟'' یہ سب کہتے ہوئے جیسے میں رفتہ رفتہ اپنے گردوپیش سے لاتعلق سا ہونے لگا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں شہزی مگر تمہارے بغیر بہت اُداس ہوں... میرا یہاں بالکل جی نہیں لگ رہا۔'' وہ بے اختیار روہانسی سی ہونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اپنے لہجے کو مضبوط بنایا۔

''عابدہ! تمہارے بنا میرا بھی یہی حال ہے مگر عابدہ! زندگی گزارنے کے لیے انسان کو کچھ کڑوے گھونٹ بھرنے ہی پڑتے ہیں حوصلہ رکھو... باقی تھوڑے دن ہی تو رہ گئے ہیں تمہارے امریکا سے واپسی میں...'' میں نے امید بندھائی۔ ''عارفہ باجی کا علاج تو ٹھیک ہو رہا ہے ناں؟''

''ہاں شہزی! ڈاکٹر پرامید ہیں۔ ایک ہفتے بعد ان کا آپریشن کر کے جگر تبدیل کر دیا جائے گا۔ پھر پندرہ روز کے بیڈ ریسٹ کے بعد... واپسی ہوگی... مگر...'' وہ اتنی خوشی کی بات بتاتے بتاتے جانے کیوں یک دم چپ سی ہوگئی۔ جس نے مجھے بےچین کر دیا۔

''مگر کیا عابدہ؟ آگے بولو ناں...؟ تمہیں وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں...؟''

''پتا نہیں کیوں شہزی! میرا دل عجیب سی نامعلوم بےچینی کا شکار رہنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہاں میرا دم گھٹ جائے گا۔ جی کرتا ہے میرے پر نکل آئیں اور... اور... میں اڑ کر پاکستان تمہارے پاس آجاؤں۔'' اس کے لہجے سے شدید بیتابی مترشح تھی۔ میں زیرِلب محبوبیت سے مسکرایا اور بولا۔

''عابدہ! یہی حال میرا بھی ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ تم جلد سے جلد پاکستان واپس لوٹ آؤ... میرے پاس... میرے بالکل قریب... میری آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ سرمد بابا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں بھی ان کے ہاں آؤں تو وہ مجھے اسکائپ پر تم سے بات کروائیں گے جس میں ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔''

''تمہارے مسئلے کا کیا ہوا شہزی؟ پچھلی بار تم نے مجھے بہت امید دلائی تھی کہ بہت جلد تم اپنے مسائل سے چھٹکارا پانے والے ہو؟'' وہ ایک دم بولی۔

میرے دل میں ایک مجبوری میں ٹیس ابھری، جسے لفظوں کی تہ میں دباتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! میں کوشش کر رہا ہوں، تم بھی دعا کرو۔ اچھا سنو... میں کسی اور کے فون پر ہوں... اتنی دور لمبی گفتگو کرنا مناسب نہیں... بہت جلد میں تم سے اسکائپ پر بات کروں گا... ٹھیک ہے نا... اپنا خیال کرنا۔''

پھر دوسری جانب سے عابدہ کا اثبات میں جواب سن کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

ایڈووکیٹ خانم شاہ ایک گھنٹے کے اندر ہی وہاں آن پہنچی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی بہن آسیہ کے بارے میں استفسار کیا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ آسیہ بھی میرے ساتھ ہوگی۔۔۔ زبیر خان بھی موجود تھا۔ میں خانم شاہ سے کچھ چھپانا جرم سمجھتا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے دھیرے دھیرے اب تک کے سارے پیش آمدہ واقعات سمیت اس کی بہن آسیہ کے بارے میں بتادیا۔ پہلے تو وہ یہ سُن کر ایک دم سکتے میں آگئی، وہ کئی ثانیوں تک یک ٹک غیر یقینی نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف تکتی رہی۔ زبیر خان نے یہ عقل مندی کی تھی کہ اپنی بیوی نیلی خاتون کو بھی وہاں بلالیا تھا اور خانم شاہ سے اس کی ملاقات بھی کروادی تھی۔

خانم شاہ ایک تیز اور غم زدہ سی سسکاری خارج کر کے رو پڑی۔۔۔ وہاں سنبھالنے کے لیے اسے نیلی خاتون موجود تھی۔ اس نے ہی روتی ہوئی خانم شاہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور ہولے ہولے اس کا کاندھا تھپک کر اسے تسلیاں دینے کی کوشش کرنے لگی۔ ماحول ایک دم افسردہ اور کچھ ماتمی سا ہو چلا تھا۔ بلاشبہ خانم شاہ ایک مضبوط اعصاب کی مالک تھی مگر اپنی بہن کی اس طرح کی ظالمانہ موت نے اسے واقعی اندر سے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا آبدیدہ چہرہ۔۔۔ جوشِ غیظ کی سرخی سے بھی تپتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ میں چودھری ممتاز خان کو اس ظلم کا مزہ چکھا سکوں کاش۔۔۔'' وہ رندھے ہوئے مگر جوش و غیظ کے جذبات سے لرزتے لہجے میں بولی۔ زبیر خان صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

''ہم سب مل کر ممتاز خان کو اچھی طرح سبق سکھا سکتے ہیں اور آپ سے رابطہ کرنے کا بھی ہمارا یہی مقصد تھا۔''

''آسیہ کی ڈیڈ باڈی کا کیا ہوا؟'' خانم شاہ اب دھیرے دھیرے اپنے آپ میں آنے لگی مگر آواز اس کی اب بھی غم کے بوجھ تلے مرتعش سی محسوس ہوتی تھی۔

''وہ انہوں نے کہیں ٹھکانے لگادی تھی۔'' میں نے جواب دیا اور آگے بولا۔ ''بعد میں ان کی قید سے آزاد ہوتے ہی میں نے اور میرے ساتھی اول خیر نے ان کے ساتھ ایک خوں ریز مقابلہ کیا تھا اور جن چاروں شیطانوں نے آسیہ کے ساتھ گینگ ریپ کیا تھا، انہیں ہم نے بعد میں جہنم رسید کردیا تھا۔ ممتاز خان کے اور بھی ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے لیکن پھر حالات کچھ ایسے خطرناک رخ اختیار کرنے لگے کہ ہمیں اپنی جانیں بچا کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔''

تھوڑی دیر تک ماحول پر خاموشی طاری رہی۔ اس دوران نیلی خاتون نے خانم شاہ کو پانی پلایا اور آنسو پونچھنے کے لیے اسے ٹشو پیپر دیتی رہی۔ زبیر خان کے چہرے پر پُرسوچ خاموشی طاری تھی پھر وہ خانم شاہ سے مخاطب ہو کے بولا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں آسیہ کی لاش بازیاب ہونے کی صورت میں ممتاز خان اور اس کے ایک اہم کارندے۔۔۔ جنگی خان کے خلاف کوئی قانونی گرفت مضبوط ہوسکتی ہے؟''

''یہ آپ کیسی بات کررہے ہیں زبیر صاحب؟'' خانم شاہ یک دم اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''آسیہ کی لاش کو بازیاب کرانا ازبس ضروری ہے۔ اس کا پوسٹ مارٹم کرانا ہوگا میں خود ممتاز خان کے خلاف ایف آئی آر کٹواؤں گی اور شہزاد احمد۔۔۔ اور اس کے ساتھیوں کی حیثیت چشم دید گواہوں کی سی ہوگی۔''

''اگر یہ بات ہے تو سب سے پہلے آپ کو شہزی کے سلسلے میں قانونی طور پر کچھ آسانیاں پیدا کرنا ہوں گی۔'' زبیر خان نے کہا تو میں بولا۔

''اگر آسیہ کی لاش برآمد کرنے میں ممتاز خان کے خلاف کیس مضبوط بن سکتا ہے تو یہ کام میں خود ممتاز خان کی جاگیر نئے پنڈ کا رخ کروں گا اور کسی طرح آسیہ کی لاش برآمد کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''تم اب یہ سب کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو شہزی۔۔۔'' خانم شاہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ اب اس کی آواز میں ذرا مضبوطی آنے لگی تھی۔ ''میرے پاس ایک آسان لائحہ عمل ہے۔ لاش کی برآمدگی کے سلسلے میں پولیس خود ہی میری مدد کرے گی۔ تمہارے دو ساتھی جو چشم دید گواہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔ یعنی شوکت حسین (شوکی) اور اس کی بہن شکیلہ۔۔۔ پہلے ہی پولیس کی حراست میں ہیں۔۔۔ لہٰذا۔۔۔'' وہ اتنا کہہ کر تھوڑا سانس لینے کو رکی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شہزی! تم کو بھی پہلے اپنی رضاکارانہ گرفتاری پیش کرنا ہوگی۔''

خانم شاہ کی بات سُن کر میں یک دم سناٹے میں آگیا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

تکمیل

منظر امام

روح کے اندر کے خزانے انسان کے چہرے پر حسن بن کر جھلکتے ہیں۔ دلوں میں محبت اور عقیدت پیدا کردیتے ہیں... ہر فرد کی روح اس کے چہرے... اس کی آنکھوں اور اس کے جسم کی ہر جنبش سے عیاں ہو جاتی ہے... ایک ایسے ہی سوہنے جنوں پسند رنگوں کی دنیا میں رہنے والے فنکار کی کتھا... اس کا کھنوس اس کی انگلیوں کی تھرک اور رنگوں کی آمیزش سے لمحوں میں ایک جیتی جاگتی تصویر میں بدل جاتا تھا... اصل حلیہ اور جذبات کے فطری عکس اس کی کمزوری تھے... ان کی کھوج و جستجو اسے ہر دم بھٹکائے رکھتی تھی۔

اپنی کوعیت کی ایک انوکھی اور یادگار تحریر... جس کے کردار آپ کے اردگرد ضرور سانس لیتے ہوئے نظر آئیں گے

وہ خاکی رنگ کے... کاغذ میں لپٹا ہوا ایک فریم تھا۔

انجم نہیں جانتی تھی کہ کوریئر سروس کے ذریعے آنے والا اس کے نام کا یہ پیکٹ کس نے بھیجا ہے اور اس فریم میں کیا ہے؟

وہ اس دن اپنے گھر میں اکیلی ہی تھی جب یہ گمنام تحفہ موصول ہوا۔

اس کے گھر والے کسی کے گھر تعزیت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ایک ملازمہ تھی، وہ بھی اس دن کام پر نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی جب کسی نے گھنٹی بجادی۔

اسے کمرے سے دروازے تک جاتے ہوئے بہت کوفت ہو رہی تھی۔ دروازے پر کوریئر سروس کا ایک نوجوان ایک پیکٹ لیے کھڑا تھا۔

''جی فرمائیں۔'' انجم نے حیرت سے پوچھا۔

''انجم حسین صاحبہ؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''جی ہاں، میں ہی ہوں۔''

''یہ لیں۔ اس فارم پر سائن کردیں۔'' اس نے وہ پیکٹ اور ایک فارم اس کی طرف بڑھایا۔

کوریئر والے کو فارغ کر کے وہ پیکٹ لیے اپنے کمرے آگئی۔ خدا جانے اس فریم میں کیا تھا۔ اس نے بے تابی سے ریپر کو پھاڑ کر الگ کردیا۔

جو کچھ اس کے سامنے تھا، وہ بہت ہی حیران کن تھا۔ وہ ایک قلمی تصویر تھی۔ کسی ماہر مصور کے فن کا شاہکار اور وہ تصویر اسی کی تھی۔ کسی نے انجم کو پینٹ کیا تھا۔

کیا خوب صورت پینٹنگ تھی! خود انجم محو ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ جیسے کسی ماہر فوٹو گرافر نے اپنے کیمرے سے اس کی تصویر کھینچی ہو۔

آدھ کھلی سی خواب ناک آنکھیں، گول چہرہ، ستواں ناک، دونوں گالوں پر نظر آنے والے ڈمپلز، شانوں تک جھکی ہوئی زلفیں۔ تصویر کیا تھی کسی نے خود اس کو فریم میں سجا کر رکھ دیا تھا۔ انجم خود بھی مصوری کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھی لیکن اتنا مکمل پورٹریٹ اس نے بہت کم دیکھا ہوگا۔

تصویر بنانے والے یا بھیجنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔

انجم الجھن میں پڑ گئی۔ اس کے جاننے والوں میں تو کوئی مصور بھی نہیں تھا پھر کس نے اس کا پورٹریٹ بنایا تھا اور کیوں؟

شام کو جب اس کے گھر والے آئے تو اس نے یہ گمنام تحفہ انہیں دکھایا۔ وہ سب بھی حیران رہ گئے۔

''کچھ بھی ہو آپا، کسی نے تمہارے حسن کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔'' اس کی چھوٹی بہن ستارہ نے کہا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے کہ کسی نے میرے حسن کو سراہنے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا کون ہوسکتا ہے؟''

''تم سوشل بھی تو ہو۔'' ستارہ نے کہا۔ ''تم جاب بھی کرتی ہو۔ اس کے بعد تمہارے دوستوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے۔ ذرا اپنے اردگرد نظر دوڑاؤ۔ شاید کوئی نظر آجائے۔''

انجم کی الجھن اس وقت اور بڑھ گئی جب کچھ دنوں کے بعد اسے ایک اور پارسل موصول ہوا۔

اس میں بھی اس کی تصویر تھی اور مصور نے کمال کر دکھایا تھا۔ اسے ایک چرواہن بنا کر پیش کیا تھا۔ جو کچھ بھیڑوں کو لیے ایک درخت کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر ویسا ہی لباس تھا جیسا عام طور پر چرواہنوں کے جسموں پر ہوتا ہے۔ بہت معمولی سا۔ میلا کچیلا۔ لیکن اس کی خوب صورتی اس لباس میں بھی نمایاں تھی اور وہ تصویر بھی کمال کی تھی۔

انجم اور اس کے گھر والے اس تصویر کو بھی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

''تصویر تو بہت کمال کی ہے۔'' انجم کے باپ نے تبصرہ کیا۔ ''لیکن یہ معاملہ بہت پُراسرار سا معلوم ہوتا

ہے۔''

''ہاں پاپا، مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے۔'' انجم نے کہا۔ ''نہ جانے کون ہے۔ کیا چاہتا ہے؟''

''وہ جو بھی ہو، ایسا لگتا ہے کہ اس کا کام صرف آپا کو پینٹ کرتے رہنا ہے۔''

''کیوں نا اس کی رپورٹ پولیس کو کر دی جائے؟'' بھائی جان نے مشورہ دیا۔

''بے وقوفی کی بات۔'' باپ نے کہا۔ ''ہم کیا رپورٹ کریں گے؟ رپورٹ تو کسی جرم کی ہوتی ہے لیکن یہاں تو ابھی کوئی جرم ہی نہیں ہوا۔''

''اس کے علاوہ خوامخواہ میری بدنامی ہو جائے گی۔'' انجم منہ بنا کر بولی۔ ''نہ جانے کون ہے؟''

''ایک بات تو ہے کہ اس کی بنائی ہوئی تصویریں نمائش میں رکھنے کے قابل ہیں۔'' ستارہ نے کہا۔

''ہاں، آرٹسٹ تو بہت زبردست ہے۔'' باپ نے بھی تبصرہ کیا۔

اس شام انجم نے اپنے منگیتر فیروز کو فون کر کے اسے ان تصویروں کے بارے میں بتایا۔

''انجم! تم ان دونوں پینٹنگز کو لے کر میرے پاس آجاؤ۔'' اس کے منگیتر نے کہا۔ ''بلکہ ایسا کرو، میں خود آرہا ہوں۔ گھر پر سب لوگ ہیں نا؟''

''ہاں ہاں سب ہیں۔'' انجم نے بتایا۔ ''لیکن بات

کیا ہے، تم کیوں اتنے بے چین ہو گئے؟“

”یہ میں آکر بتاؤں گا۔“ فیروز نے کہا۔

انجم اور فیروز کی ایک سال پہلے منگنی ہوئی تھی۔ دونوں نے کالج کا زمانہ ساتھ گزارہ تھا اور اب جیون بھی ایک ساتھ گزارنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

فیروز کشادہ ذہن رکھتا تھا اس لیے منگنی کے بعد انجم نے ایک بڑی فرم میں ملازمت شروع کر دی تھی۔ ان دونوں کا یہی خیال تھا کہ مہنگائی کے اس طوفان بدتمیزی میں گھر اسی وقت چل سکتا ہے جب جیون ساتھی معاش کے ساتھی بھی بن جائیں۔

شام کے وقت فیروز اُن کے گھر آ گیا۔ اس کے ساتھ الجھے بالوں والا ایک شخص تھا۔ فیروز نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ ”یہ رسام ہیں۔ بہت ...پرست اور بڑے مصور ہیں۔“

انجم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فیروز اس مصور کو ساتھ لے کر کیوں آیا ہے۔ بہرحال جب سب بیٹھ چکے تو فیروز نے بتایا۔ ”ہمارے یہ رسام صاحب تقریباً ہر پینٹر کے کام سے واقف ہیں۔ یہ ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیں گے کہ کس نے تصویریں بنائی ہیں۔“

اب بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ رسام، فیروز کے ساتھ کیوں آیا ہے۔

دونوں تصویریں سامنے لا کر رکھ دی گئیں۔ رسام بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بہت خوب صورت، پرفیکٹ کام ہے۔ رنگوں کا استعمال بہت خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔ خاص طور پر چہرے پر جس قسم کے جذبات اور تاثرات پینٹ کیے گئے ہیں، وہ کسی عام مصور کے بس کی بات نہیں ہے۔“

”اوہ، تو تم نے اندازہ لگا لیا ہے کہ یہ تصویریں کس نے پینٹ کی ہیں؟“ فیروز نے پوچھا۔

”نہیں، اس بات پر تو حیرت ہے کہ بالکل مختلف ورکس ہیں۔“ رسام نے بتایا۔ ”میں تقریباً ہر مشہور مصور کے کام کو جانتا ہوں لیکن یہ اسٹائل بالکل نیا ہے۔ اس مصور نے ہلکے ہلکے دائروں کی صورت میں پورا اسینار یو پینٹ کر دیا ہے۔ یہ ایک زبردست تخلیق ہے۔“

”معاملہ الجھ گیا ہے رسام صاحب۔“ انجم نے کہا۔ ”کون ہے جو ایسی تصویریں بنا بنا کر بھیج رہا ہے؟“

”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس نے یہ تصویریں بنائی ہیں اس نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آپ کے خدوخال کا جائزہ لیتا رہا ہے۔“

بات جہاں تھی وہیں رہی۔

انجم نے اپنے دفتر والوں کو بھی ان تصویروں کے بارے میں بتا دیا۔ وہ سب بھی حیران رہ گئے۔

”مصیبت تو یہ ہے سر کہ میں پولیس وغیرہ کے پاس جا کر اس کی شکایت بھی نہیں کر سکتی۔“ انجم نے اپنے باس سے کہا۔

”ظاہر ہے کس کی شکایت کرو گی، کیونکہ اس گمنام آرٹسٹ نے ابھی تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے تمھیں نقصان پہنچا ہو۔“

”ہم سب بھی یہی سوچ کر خاموش ہو گئے ہیں سر۔“

”ایک بات ذہن میں آ رہی ہے۔“ باس نے کہا۔ ”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی تصویر وغیرہ میں کوئی خفیہ تحریر بھی ہوتی ہے جو ذرا سا دھیان دینے پر سامنے آ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان تصویروں میں بھی ایسی کوئی بات ہو؟“

انجم اور اس کے باس کی گفتگو باس کے کمرے میں ہو رہی تھی۔ اس دوران میں دفتر کا چپراسی برکت ان دونوں کے لیے چائے لے کر آ گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جس کے ایک پیر میں ہلکا سا لنگ تھا۔ چلتے ہوئے اس کی پوزیشن بہت مضحکہ خیز سی ہو جاتی تھی۔

میز پر چائے کی ٹرے رکھ دینے کے باوجود وہ کھڑا رہا۔

”کیا بات ہے، کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ باس نے اس سے پوچھا۔

”صاحب جی! ابھی وہ منیجر صاحب بتا رہے تھے کہ انجم بی بی کے پاس دو تصویریں آئی ہیں لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ وہ تصویریں کس نے بھیجی ہیں۔“

”سر! میں نے منیجر صاحب سے بھی تذکرہ کیا تھا۔“ انجم نے بتایا۔

”تو پھر، تمھیں کیا کہنا ہے؟“ باس نے برکت سے پوچھا۔

”صاحب جی! اگر آپ اور بی بی کہیں تو میں پتا کروا سکتا ہوں۔“ برکت نے کہا۔

”تم کیسے معلوم کروا سکتے ہو؟“

”صاحب جی! وہ میرے ایک مرشد ہیں، پانی

والے۔ وہ وظیفہ پڑھ کر بتا سکتے ہیں۔'' برکت نے کہا۔ ''بڑی شان والے ہیں صاحب۔''

''کیا بکواس ہے۔'' باس بھڑک اٹھا۔ ''جاؤ یہاں سے۔''

''اچھا جی۔'' برکت کمرے سے نکل گیا۔

''سر! ایسا لگتا ہے ان لوگوں کی جہالت ہمیشہ اسی طرح رہے گی۔'' انجم نے کہا۔

''ہاں، بہرحال اب تم بھی کسی سے اس کا ذکر مت کرو۔ انتظار کرتی رہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ معاملہ حل ہو جائے۔''

انجم اس شام گھر آنے کے بجائے اپنی ایک دوست عارفہ کے پاس چلی گئی۔ عارفہ بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ اسکول اور کالج کا زمانہ دونوں کا ساتھ گزرا تھا۔

انجم نے فون کر کے گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ وہ عارفہ کے پاس جا رہی ہے۔

عارفہ نے بہت خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

''خیریت تو ہے۔ اتنے دنوں کے بعد کیسے یاد آ گئی؟''

''یار! میں ایک الجھن میں ہوں۔'' انجم نے بتایا۔

''آؤ کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔'' عارفہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔

اس کمرے میں ہر طرف پورٹریٹ بھرے ہوئے تھے اور وہ سب ایک ہی چہرے کے تھے اور وہ چہرہ انجم کا تھا۔

پنسل اسکیچ، کلر پینٹنگ، مختلف شیڈز، مختلف اسٹائل، ایک ہی جلوہ ہر طرف بکھرا ہوا، بہت سی تصویریں ادھوری تھیں۔ بہت سی مکمل حالت میں تھیں۔

انجم کو مختلف انداز سے دکھایا گیا تھا۔ کہیں ماڈل کے روپ میں، کہیں کچرا چننے والی، کہیں رقص کے انداز میں، کسی میں مغربی لباس، کہیں ساڑی باندھے ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس مصور کو صرف اس ایک چہرے سے عشق ہو۔ اور وہ اسے ہر روپ میں دیکھنا چاہتا ہو۔

ایک کونے میں ایک چارپائی اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ شاید تصویریں بنانے والا مصور اسی کمرے میں رہتا بھی تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا، ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو شاپرز تھے جن میں کھانا تھا۔ چارپائی کے پاس کچھ برتن رکھے ہوئے تھے۔ اس نے شاپرز میں موجود کھانا دو برتنوں میں نکالا اور ایک پلیٹ اٹھا کر ایک ادھوری تصویر کے پاس پہنچ گیا۔

وہ تصویر ابھی تکمیل کے مرحلے میں تھی۔ اس کا ابھی صرف چہرہ ہی مکمل ہوسکا تھا اور بنانے والے نے اس چہرے کو بنانے میں شاید اپنی پوری مہارت صرف کردی تھی۔

ادھ کھلے بھرے بھرے ہونٹ، نیم واخوابیدہ سی آنکھیں۔ ہر کام ادھورا نظر آتا ہے جہاں کا۔ ہر سمت تیری نیم نگاہی کا سماں ہے۔

''تم ناراض تو نہیں ہو؟'' اس شخص نے اس تصویر کو مخاطب کیا۔ ''دیکھو تو سہی، میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں اسی لیے آنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ تمہیں پینٹ کرنے کا شوق کتنا مہنگا ہے۔ یہ دیکھو۔'' اس نے پلیٹ ایک طرف رکھ کر ایک برش اٹھا لیا۔ ''یہ دیکھ رہی ہو۔ یہ خاص قسم کا برش ہے۔ اس سے آنکھوں کے تاثرات واضح کیے جاتے ہیں اور جانتی ہو یہ برش کتنے کا ہے، پندرہ سو کا۔''

بولتے بولتے رک کر اس نے کمرے کے چاروں طرف نگاہ کی پھر تصویر سے مخاطب ہوا۔ ''سن لیا تم نے۔ پورے پندرہ سو کا اور خود دیکھ لو۔ اس قسم کے کتنے برش ہیں۔ اندازہ لگالو کہ میرے کتنے پیسے خرچ ہوتے ہوں گے تم تو جانتی ہو کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ کہاں سے یہ سب پورا کروں؟ اس لیے دو دو نوکریاں کرتا ہوں۔ اب تو سمجھ گئیں نا کہ مجھے آنے میں کیوں دیر ہو جاتی ہے۔''

تصویر تو پھر تصویر ہوتی ہے۔

اس آدمی نے پھر کہا۔ ''تم مجھ سے بولتی کیوں نہیں؟ کیا تم یہ نہیں دیکھتیں کہ میں نے اپنا سارا ہنر تمہارے لیے وقف کر دیا ہے۔ جب برش اٹھاتا ہوں' تمہاری تصویر بنانے لگتا ہوں۔ تمہارے سوا کسی اور کو پینٹ ہی نہیں کرتا۔ کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟ خیر، چلو کوئی بات نہیں۔ دیکھتا ہوں کب تک ناراض رہتی ہو۔''

تصویروں کے پاس سے ہٹ کر اس نے اپنی پلیٹ اٹھائی اور کھانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

اس بار جو تصویر آئی، وہ پورا پورٹریٹ تھا۔

اس تصویر میں انجم کو خلائی لباس میں دکھایا گیا تھا۔

ایسا لباس جو خلاباز استعمال کرتے ہیں۔ فرق یہ تھا کہ اس میں چہرہ چھپا ہوا نہیں تھا اس لیے تصویر کا چہرہ پوری طرح

واضح تھا۔

اس بار گھر والے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

"صورت حال بہت خطرناک اور پُراسرار ہوتی جا رہی ہے۔" انجم کے باپ نے کہا۔

"اس شخص کا پتا چلانے کی ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔" انجم کے بھائی نے بتایا۔ "میں کوریئر والوں کے پاس جا کر معلوم کرتا ہوں کہ یہ تصویریں ان کے یہاں کون پوسٹ کرتا ہے۔"

"ہاں، اس طرح شاید معلوم ہو جائے۔"

"کوریئر سروس والے ایک فارم پُر کرواتے ہیں جس میں پوسٹ کرنے والے کا ایڈریس لکھا جاتا ہے۔"

"پھر تو یہ کام پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔" انجم کی ماں نے کہا۔

"ذہن میں نہیں آیا تھا۔ بہر حال اب میں جا رہا ہوں۔ دیکھوں تو سہی، کون ہے یہ موصوف۔"

کوریئر سروس والوں نے بتایا۔ "جی ہاں، یہ تصویریں ہمارے ہی یہاں سے بھیجی جاتی ہیں۔ ہمیں اس لیے یاد ہے کہ آج کل احتیاط کے طور پر ہم ہر پارسل کو کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔"

"تو پھر اس کا ایڈریس بھی ہوگا؟"

"جی ہاں ایڈریس بھی ہے لیکن ہماری یہ پالیسی نہیں ہوتی کہ ہم اپنے کسٹمر کا ایڈریس دوسروں کو بتائیں۔"

"دیکھیں میں یہ بتا چکا ہوں کہ یہ کیسا معاملہ ہے۔" اس کے بھائی نے کہا۔ "وہ شخص ہم گھر والوں کو پریشان کر رہا ہے۔ ہم پولیس میں رپورٹ کرنے سے پہلے اس کے بارے میں اطمینان کر لینا چاہتے ہیں۔"

"میں اپنے طور پر آپ کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہوں۔" کوریئر سروس کے نگراں نے کہا۔ "لیکن مجھے یہ کیسے معلوم ہو کہ جو تصویریں بھیجی جاتی ہیں وہ آپ کی سسٹر کی ہیں؟"

"آپ نے وہ تصویریں خود دیکھی، ہیں نا؟"

"جی ہاں کئی بار۔ اور وہ چہرہ تو میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا ہے۔"

"اوکے۔" انجم کے بھائی نے نگرانِ اعلیٰ سے کہا۔ "اگر وہ لڑکی آپ کے سامنے آ جائے تب تو یقین آ جائے گا نا؟"

"ہاں، میں اس وقت آپ کو ایڈریس دے دوں گا۔"

انجم کے بھائی نے فون کر کے انجم کو بلا لیا۔ انجم اپنے باپ کے ساتھ آدھ گھنٹے کے اندر ہی پہنچ گئی۔ اس کو دیکھتے ہی کوریئر سروس کے نگراں نے آواز لگائی۔ "جی ہاں، اب مجھے یقین آ گیا۔ آپ اس کا ایڈریس لے سکتے ہیں۔"

☆☆☆

وہ ایڈریس شہر کے ایک پوش علاقے کے ایک بہت بڑے مکان کا تھا۔

پہلے انجم کے باپ اور بھائی انجم کو چھوڑ کر آنا چاہتے تھے لیکن وہ ضد کر کے ان کے ساتھ ہو لی تھی۔ "نہیں بابا! میں بھی ساتھ چلوں گی، کیونکہ یہ میرا کیس ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں اس آدمی کو پہچان جاؤں۔"

مکان کے گیٹ پر کسی جمال اکرم نام کے آدمی کی تختی لگی تھی۔ گیٹ پر چوکیدار بھی موجود تھا۔ چونکہ یہ لوگ خود بھی ایک گاڑی میں وہاں تک آئے تھے اس لیے اس نے بہت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہمیں جمال اکرم صاحب سے ملنا ہے۔" انجم کے باپ نے بتایا۔

"جی صاحب، میں ابھی معلوم کر لیتا ہوں، آپ کا نام؟"

"وہ ہمیں نہیں جانتے۔ ان سے کہنا کہ کچھ مہمان آئے ہیں۔" انجم کے باپ نے کہا۔

چوکیدار نے انٹرکام پر کسی سے بات کی۔ پھر ریسیور رکھ کر اشارہ کیا۔ "آ جائیں جناب، میں آپ کو لیے چلتا ہوں۔"

وہ چوکیدار کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ یہ ایک شاندار ڈرائنگ روم تھا۔ وہ سب الجھے ہوئے تھے۔ چوکیدار ان لوگوں کو بٹھا کر اندر کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ایک باوقار سا ادھیڑ عمر آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ یہ تینوں اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

"جی فرمائیں۔" اس نے بہت خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"جناب! ہم آپ کے پاس ایک بہت الجھا ہوا مسئلہ لے کر آئے ہیں۔" انجم کے باپ نے کہا۔

"کیسا مسئلہ؟" اس نے پوچھا۔

"پہلے یہ دیکھ لیں۔" انجم کے بھائی نے دونوں پورٹریٹ اس کے سامنے رکھ دیے۔

"واہ۔" اس نے تعریف کی۔ "بہت خوب صورت، بہت پرفیکٹ۔" پھر اس نے چونک کر انجم کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ دونوں پورٹریٹ آپ ہی کے ہیں۔''

''جی ہاں، میرے ہی ہیں۔'' انجم نے کہا۔

''مجھے بتائیں، میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''یہ دونوں تصویریں آپ کے گھر کے ایڈریس سے بھیجی گئی ہیں۔'' انجم کے باپ نے بتایا۔ ''یہ ہمیں کوریئر سروس کے ذریعے موصول ہوئیں اور ایڈریس اس گھر کا ہے۔''

''کمال ہے، یہاں کون ہے تصویریں بنانے والا۔'' اس نے حیرت ظاہر کی اور اس کی حیرت مصنوعی بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا آپ کسی آرٹسٹ کو نہیں جانتے؟'' انجم کے بھائی نے پوچھا۔

''نہیں جناب، بالکل نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہے۔ اس گھر میں میرے علاوہ میری بیوی ہے اور کچھ ملازمین ہیں۔ ایک بیٹا ہے لیکن وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ کسی نے اس گھر کے ایڈریس کو غلط استعمال کیا ہے۔''

''یہ ایک اور الجھن ہوگئی ہے جناب۔''

''ابھی تک تو آپ کے لیے الجھن ہوگی لیکن اب میرے لیے بھی ہوگئی ہے۔'' جمال اکرم نے کہا۔ ''اگر آپ چاہیں تو میں اپنے ملازمین کو آپ کے سامنے کر دیتا ہوں۔ آپ ان سے معلوم کر کے دیکھ لیں۔''

''نہیں جناب رہنے دیں۔ اس پُراسرار شخص نے آپ کے مکان کا ایڈریس استعمال کیا ہے۔ اب کوریئر سروس والوں کے تعاون سے پتا چل سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ پھر کوئی نہ کوئی تصویر بھیجنے کے لیے کوریئر سروس جائے گا۔ اس دوران وہ لوگ ہمیں خاموشی سے فون کر کے بتا دیں۔ اور کسی بہانے اسے روک کر رکھیں۔ اس طرح شاید ہم اس کو پکڑنے میں کامیاب ہوسکیں۔''

''ہاں، یہی ہوسکتا ہے۔'' جمال اکرم نے پُرخیال انداز میں اپنی گردن ہلائی۔ ''اور دیکھیں، جو بھی پروگریس ہو مجھے ضرور بتائیں۔ اب تو خود مجھے بھی اس معاملے سے دلچسپی ہوگئی ہے۔''

☆☆☆

خوف سے زیادہ اُسے حیرت تھی۔

اس حیرت نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ اس کے پاس لفظ نہیں تھے۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی۔ گالیاں دینا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے پارہی تھی۔

اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ وہ چھٹی کے بعد گھر جانے کے لیے اپنے دفتر کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ آکر کھڑا ہوگیا۔

وہ اس کے دفتر کا لنگڑا چپراسی برکت تھا۔

''کیا بدتمیزی ہے برکت؟'' وہ غرائی۔ ''چپکے کیوں جارہے ہو؟''

''چپ چاپ چلتی رہو بی بی۔'' برکت کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ انجم کو اپنی کمر پر کسی چیز کا دباؤ محسوس ہوا۔ پھر برکت کی آواز آئی۔ ''یہ پستول ہے بی بی۔ چپ چاپ چلتی رہو اور کسی کو بھی اشارہ وغیرہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ آج میں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ حرکت کی ہے۔ مجھے اپنی پروا نہیں ہے لیکن تم جان سے جاؤ گی۔''

انجم کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔

کچھ لوگ سیڑھیوں سے اوپر جارہے تھے۔ کچھ نیچے آرہے تھے۔ سب کچھ نارمل تھا، ہمیشہ کی طرح لیکن انجم کے لیے نارمل نہیں تھا۔

بہت کچھ بدل گیا تھا۔

اس کے دفتر کا عام سا چپراسی پستول کی نال کے زور پر اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ انجم نے اس شخص کو کبھی دھیان کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا۔

اس نے برکت کی طرف دیکھا۔ پستول کی نال بدستور اس کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔ بہت عجیب اور وحشت ناک صورتِ حال تھی۔

ایک عام سا آدمی درجنوں لوگوں کے سامنے اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اس نے کیا بگاڑا تھا اس شخص کا۔ اس کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ وہ بہت سنجیدہ ہے اور اس کے ارادے خطرناک ہیں۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ نیچے آگئے۔ برکت بدستور اس کے ساتھ لگا ہوا چل رہا تھا۔ ''بی بی! وہ دیکھو۔'' اس نے ایک کالی پیلی ٹیکسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہیں اس میں بیٹھنا ہے۔ میں پھر خبردار کر رہا ہوں، کوئی ہوشیاری نہیں کرنا، ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''تو... تم مجھے کہاں لے جارہے ہو؟'' انجم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں تمہیں اپنی تکمیل کے لیے لے جارہا ہوں۔''

برکت نے بتایا۔
انجم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس قسم کا جملہ کوئی عام آدمی تو نہیں بول سکتا تھا۔
کالی پیلی ٹیکسی قریب آ گئی تھی۔ اس کا ڈرائیور ایک جوان العمر شخص تھا۔ اس نے کچھ پوچھے بغیر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹیکسی والا برکت کو جانتا تھا۔
"بیٹھ جاؤ۔" برکت نے انجم سے کہا۔
"دیکھو۔" انجم نے کچھ کہنا چاہا۔
"بیٹھو۔" اس بار برکت کے لہجے میں غراہٹ تھی۔
"وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ جلدی کرو۔"
انجم ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ برکت اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اس کا چھپا ہوا پستول بھی باہر نکل آیا تھا۔ شاید اس نے انجم کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ مذاق نہیں کر رہا۔
ٹیکسی کسی انجانے راستے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ یہ شہر کے وہ علاقے تھے جن کی طرف سے انجم کا کبھی گزر نہیں ہوتا تھا۔
وہ گھر سے نکلتی اور دفتر آ جاتی۔ پھر دفتر سے گھر چلی جاتی۔ جانے پہچانے راستے تھے اس کے لیکن یہ راستہ جانا پہچانا نہیں تھا۔
برکت نے ٹیکسی والے کو منزل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اب ٹیکسی ایسے علاقے میں داخل ہو گئی جہاں چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ٹیکسی کچے راستوں سے گزرتی ہوئی ایک میدان میں داخل ہو گئی۔ اس میدان میں ایک بڑا سا نالا بہہ رہا تھا۔ اس نالے کے ساتھ ساتھ کپڑے دھوئے جا رہے تھے۔
کچھ آگے آنے کے بعد ٹیکسی رک گئی۔
"بس اب اتر آؤ۔" برکت نے کہا۔
انجم نے پھر پوچھنے کی ہمت کی۔ "یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو، کیا چاہتے ہو تم؟"
"پریشان نہ ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"
"برکت! میری بات مان لو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "کوئی لفڑا نہ ہو جائے۔"
"کچھ نہیں ہوگا۔ تو بھول جا کہ تو کسی کو میرے ساتھ یہاں لایا تھا اور اب ہمیں اتار کر چلا جا۔ تیرا کام ختم ہو گیا۔"
"تیری مرضی۔"
برکت نے انجم کو اشارہ کیا۔ وہ ٹیکسی سے اُتر گئی۔
"اس طرف چلو۔" برکت نے ایک کچے مکان کی طرف اشارہ کیا۔
انجم کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے چھا رہے تھے۔ یہ سب کچھ تو بہت حیرت انگیز تھا۔ پریشان کن۔ کیا ہو گیا تھا اس شخص کو۔
اس کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ اسے اغوا بھی کیا جا سکتا ہے اور اغوا کرنے والا کوئی اور نہیں اس کے دفتر کا چپراسی تھا۔

☆☆☆

ایک کمرا، اس میں ایک چارپائی اور دو کرسیاں تھیں۔ اس کمرے کے برابر دوسرا کمرا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔
انجم کو پہلے کمرے میں لے جا کر بٹھایا گیا تھا۔
"انجم!" برکت اسے بے تکلفی سے مخاطب کر رہا تھا۔ "یہ سب کچھ تمہارے لیے بہت حیرت کی بات ہو گی اور ہونی بھی چاہیے کہ تمہارے ہی دفتر کا ایک لنگڑا چپراسی تمہیں اس طرح اٹھا کر لے آیا ہے۔"
"برکت تم چاہتے کیا ہو؟" انجم نے پوچھا۔
"سب بتا دوں گا۔" برکت نے کہا۔ "لیکن پہلے اس بات کا یقین کر لو کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے لیے نہیں لایا بلکہ اپنی تکمیل کے لیے لایا ہوں۔"
"تم یہ جملہ پہلے بھی کہہ چکے ہو، کیا مطلب ہے اس کا؟"
"بتاتا ہوں۔" برکت نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن پہلے تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ بلکہ پانی پی لو۔ اس سے تمہارے حواس قابو میں آ جائیں گے۔"
انجم اسے پھر حیرت سے دیکھ کر رہ گئی۔
برکت نے مٹکے سے پانی نکال کے گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ "لو پانی پی لو۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔"
انجم کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے پورا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا۔
"ہاں، اب میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔" برکت اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام برکت نہیں ہے۔"

"کیا؟"

"ہاں، میرا نام شہریار ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور میں پڑھا لکھا انسان ہوں۔"

"اوہ۔" انجم نے ایک گہری سانس لی۔ "اس کا اندازہ مجھے ہوگیا تھا۔ جب تم نے یہ کہا تھا کہ تم اپنی تکمیل چاہتے ہو۔"

"ہاں، میں پڑھا لکھا انسان ہوں۔" برکت یا شہریار نے کہا۔ "میرے ساتھ کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ مجھے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے نام تک بدلنا پڑ گیا۔ اپنا اصل کام تک چھپانا پڑا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ میرے ہاتھوں ایک لڑکی کی موت ہو گئی تھی۔" برکت نے بتایا۔ "اور میری بدقسمتی سے لڑکی کے گھر والوں اور رشتے داروں کو پتا چل گیا حالانکہ وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں مارا تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ میں نے اس کا خون کیا ہے۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ لہٰذا مجھے فرار ہونا پڑا۔ اپنے آپ کو چھپانا پڑ گیا اور میں نے تمہارے دفتر میں برکت بن کر چپراسی کی نوکری کر لی۔"

انجم کو اب اس سے اتنا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا جتنا اس نے پہلے محسوس کیا تھا۔

"لیکن کیوں، وہ لڑکی کس طرح مر گئی؟" انجم نے پوچھا۔

"عین وقت پر گاڑی کا بریک فیل ہو گیا تھا۔" برکت نے بتایا۔ "میں گاڑی روک نہیں سکا اور وہ اس پر چڑھ گئی۔ بدقسمتی سے کچھ لوگ یہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی گواہی پر مجھے گرفتار کرلیا گیا حالانکہ عدالت میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ گاڑی کا بریک فیل ہو گیا تھا۔ اس لیے مجھے وہ سزا نہیں ہوئی جو کسی کو ہلاک کرنے کے جرم میں ہوتی ہے۔"

"کون تھی وہ لڑکی؟" انجم نے پوچھا۔

"میری ایک ماڈل۔" برکت نے بتایا۔

"تمہاری ماڈل؟" انجم کو یہ سن کر شاک سا لگا۔

"کیا مطلب؟"

"انجم! میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ ایک پینٹر۔" برکت نے بتایا۔ "ایک بے مثال پینٹر۔"

"اوہ، تو وہ، میری تصویریں۔۔۔"

"ہاں، میں ہی تمہیں پورٹریٹ کرتا رہا ہوں۔" برکت نے کہا۔ "کیونکہ دفتر میں تمہارا چہرہ دن بھر میری نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ اسی لیے تمہارے چہرے کی مکمل آؤٹ لائن ہر وقت میرے ذہن میں رہتی تھی۔ اسی بنیاد پر میں تمہیں پینٹ کرتا چلا گیا۔"

"اور تم وہ تصویریں مجھے بھیجتے رہے؟"

"ہاں۔"

"لیکن وہ ایڈریس؟"

"ظاہر ہے کہ وہ ایڈریس غلط ہے۔" برکت نے بتایا۔ "وہ ایڈریس اس مکان کا ہے جس کے احاطے کے ایک کوارٹر میں میرا یہ ٹیکسی ڈرائیور دوست رہا کرتا ہے۔"

"اب سمجھی۔ لیکن تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے؟"

"اس لیے کہ برسوں کے بعد میں نے تمہارے چہرے جیسا کلاسک چہرہ دیکھا ہے۔" برکت نے کہا۔ "تمہارے چہرے کے نقوش میں مغل شہزادیوں جیسا تیکھا پن اور گریس پایا جاتا ہے۔ تم خود کو آئینے میں دیکھو تو تمہیں یقین ہو جائے گا۔ ہم جیسے مصوروں کے لیے ایسا چہرہ بہت کام کا ہوتا ہے، بہت اہمیت ہوتی ہے اس کی۔ اسی لیے میں تمہیں ہر روپ میں پینٹ کرنا چاہتا تھا۔ بھکارن کے روپ میں۔ شہزادی کے روپ میں، ماڈرن لڑکی کے روپ میں، ان میں سے کچھ پینٹنگز میں نے تمہیں بھی بھیج دی تھیں۔"

"کیا مطلب، کیا اور تصویریں بھی بنائی ہیں؟"

"بہت، آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ دوسرا کمرا میرا اسٹوڈیو ہے۔"

انجم اس دوسرے کمرے میں ہر طرف اپنے آپ کو بکھرے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ہر طرف اس کی تصویریں تھیں۔ اسی کے پورٹریٹ تھے۔

بہت سی تصویریں نامکمل بھی تھیں اور بہت سی مکمل بھی۔

"میرے خدا۔" انجم نے ایک گہری سانس لی۔ "تم تو واقعی ایک بے مثال آرٹسٹ ہو لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب تم مجھے ہر زاویے سے پینٹ کر سکتے تھے تو پھر مجھے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی۔ کیونکہ ایک تاثر ایسا تھا جس کو میں اب تک پینٹ نہیں کر پایا ہوں۔"

"اور وہ کیا ہے؟"

"خوف۔" برکت نے بتایا۔ "بے پناہ خوف۔ ایسا خوف جو چہرے پر جم کر رہ گیا ہو۔ اس لڑکی کی موت بھی اسی تاثر کے پیدا کرنے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔"

''وہ کس طرح؟''

''میں نے اسے رسیوں سے باندھ کر ایک میدان میں ڈال دیا تھا۔ پھر ایک گاڑی کو دوڑاتا ہوا اس کے پاس لے گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ وہ گاڑی اس کے چہرے کے بالکل پاس آکر رک جائے گی اور اس سلسلے میں اس کے چہرے پر جو خوف کے تاثرات ہوں گے، اس کی تصویر بنالوں گا۔ بعد میں ان تاثرات کو پینٹ کرلوں گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ بدقسمتی سے اس گاڑی کے بریک فیل ہوگئے اور وہ اس کو روندتی ہوئی نکل گئی۔''

''اوہ خدا!'' انجم کو اب پہلی بار شدید خوف کا احساس ہوا۔

''تو تم نے اس طرح اس کی جان لے لی؟''

''ہاں، لیکن تم یہ غلط کہہ رہی ہو کہ میں نے اس کی جان لے لی۔ یہ ایک حادثہ تھا۔ اور ویسے بھی کسی بڑی تخلیق کے لیے بہت سے مصوروں نے اس قسم کے تجربے کیے ہیں۔ تم نے مشہور پینٹنگ ''چیخ'' کے بارے میں سنا ہے؟''

''نہیں، میں نے نہیں سنا۔''

''وہ پینٹنگ بھی شدید خوف کی شدید علامت کے طور پر بنائی گئی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ مصور نے خیالی تصویر نہیں بنائی ہوگی بلکہ پل پر اس عورت کو کھڑا کرکے اسے ایسا کوئی بھیانک منظر دکھایا گیا ہوگا کہ خوف اس کے چہرے پر جم کررہ گیا اور وہ تصویر لازوال ہوگئی۔''

''تو کیا تم...؟'' انجم بری طرح خوف زدہ تھی۔

''ہاں، اب میں تمہیں شدید خوف کی شدید کیفیت میں مبتلا کرنا چاہتا ہوں۔'' برکت نے کہا۔

''کیا، کیا کرنا چاہتے ہو تم؟'' انجم نے گھبرا کر پوچھا۔

''اپنی تکمیل۔'' برکت نے کہا۔ ''لیکن تم پریشان مت ہونا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ تم صرف خوف زدہ ہوجاؤ گی۔''

''نہیں۔'' انجم چیخ اٹھی۔ ''تم ایسا کچھ نہیں کرسکتے۔''

''مجبوری ہے میری۔ یہ ایک آرٹسٹ کی مجبوری ہے۔'' برکت نے کہا۔ ''اس نے اپنا پستول نکال کر اس کا رخ انجم کی طرف کردیا۔ ''تم اس کونے میں جاکر کھڑی ہو جاؤ، شاباش۔''

''برکت! پاگل مت بنو۔''

''خاموش۔ اس پستول میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔ میں تمہیں دو گولیاں ماروں گا۔ پہلی گولی تمہاری ایک ٹانگ میں لگے گی اور دوسری تمہارے سینے میں۔ موت تمہاری تکمیل کردے گی اور تمہارے چہرے کا خوف میری مصوری کی تکمیل کردے گا، یہ لو۔'' اس نے سفاک لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

انجم کے چہرے پر خوف جم کررہ گیا۔ پستول کی نال اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

برکت نے ایک کارنر پر پڑا ہوا کیمرا اٹھالیا تھا۔

''شاباش! اب میں تمہیں گولی مارنے جارہا ہوں۔''

''نہیں، خدا کے لیے۔'' انجم گڑگڑانے لگی۔

کلک کی آواز کے ساتھ برکت نے کیمرے کا بٹن دبادیا تھا۔

''تھینک یو۔'' اس نے انجم سے کہا۔ ''میں نے تمہارے خوف کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرلیا ہے۔ اب میں اسے پینٹ کروں گا۔ اس کے بعد تم جاسکتی ہو۔ میرا کام ختم ہوگیا۔''

''لیکن یہ سب کرنے کے لیے اتنا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم ویسے ہی کہہ دیتے؟''

''نہیں، اس وقت تم اسے ڈراما سمجھ کر بہت ایزی ہو جاتیں۔'' برکت نے کہا۔ ''تمہارے چہرے کے تاثرات حقیقی نہیں ہوتے۔ اب حقیقی تاثرات محفوظ ہوگئے ہیں۔''

باہر سے کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

''یہ لو چابی، تمہیں واپس لے جانے کے لیے ٹیکسی آگئی ہے۔'' برکت نے بتایا۔ ''اب تم جاؤ۔''

''کیا واقعی۔'' انجم کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''ہاں، اور مجھے معاف کردینا کہ میں نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا لیکن کیا کروں، تم اسے ایک مصور کا جنون سمجھ کر معاف کردینا اور کل سے میں دفتر بھی نہیں آیا کروں گا۔ میرا کام ختم ہوچکا ہے۔''

☆☆☆

کئی دنوں کے بعد اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی۔

''ایک گمنام لیکن باکمال مصور نے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کرلی۔ اس کے کمرے سے کسی لڑکی کی پینٹنگز ملی ہیں... جو اپنی مثال آپ ہیں اور خاص طور پر وہ پینٹنگ جس میں وہ لڑکی بےانتہا خوف زدہ دکھائی دے رہی ہے۔ مصور نے اتنی مہارت سے اس کے چہرے کے تاثرات کو پینٹ کیا ہے کہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ پولیس اس کیس میں مزید تفتیش کررہی ہے۔''

چارا

جمال دستی

دوستی نبھانے کے لیے بعض اوقات بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں... اس کا خیال تھا کہ وہ دوستی کے منصب پر فائز ہے... اور اپنے دوست کے ساتھ مل کر دوستی کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے... اتفاق سے قدرت نے انہیں ایک ایسا موقع فراہم کر دیا کہ وہ ایک دوسرے کو بہ آسانی پرکھ سکتے تھے...

تفریح کے لیے ساتھ جانے والے دو دوستوں کا قصہ جو ایک دوسرے کے پڑوسی بھی تھے...

"جب تم نے مجھے اپنے ہمراہ یہاں آنے کی دعوت دی تو مجھے حیرانی ہوئی تھی، رالف! میں سمجھتا تھا کہ شاید تم مجھے پسند نہیں کرتے ہو۔" جم نے کہا۔

کشتی کے انجن کے اسٹیئرنگ پر کھڑا ہوا رالف یہ سن کر ہنس دیا۔ "احمق پن کی باتیں مت کرو، جم!" یہ کہتے ہوئے رالف نے کشتی کا انجن بند کر دیا اور کشتی کے مستک سے پرے سمندر کے پانی پر طائرانہ نگاہ دوڑانے لگا۔ سمندر کے پانی میں کچھ اچھال تھا لیکن کشتی کے پیندے کا لوہا مضبوط تھا اور طوفانی لہروں کو سہارنے کی بھرپور طاقت رکھتا تھا۔

"ویل، ہم لگ بھگ دس سال سے ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں لیکن ہم نے آج تک ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کبھی کوئی کام نہیں کیا۔"

رالف نے شانے اچکا دیے۔ "میں کام میں بے تحاشا مصروف رہتا ہوں۔ میرے پاس فالتو وقت ہی نہیں ہوتا لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں ایک اچھا دوست سمجھا ہے، جم۔ مزید یہ کہ ہماری بیویاں ایک دوسرے سے بے حد قریب ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس طرح ہمیں ایک

دوسرے کو جاننے کا ایک اچھا موقع مل رہا ہے۔ بیلنڈا نے بتایا تھا کہ تمہیں بھی مچھلی کے شکار کا شوق ہے؟"

جم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں زیادہ تر میٹھے پانی کی مچھلی کا شکار کرتا ہوں۔ میں نے کھلے سمندر میں مچھلی کا شکار کم ہی کیا ہے۔ ویسے ہم یہاں کون سی مچھلی کا شکار کریں گے؟"

رالف نے اپنی کیپٹن کی ٹوپی درست کی اور بولا۔ "پہلے تو میرا ارادہ سامن اور سیل فش کے شکار کا تھا لیکن ایک عرصہ ہوا میں نے بگ گائیز کا شکار نہیں کیا۔"

"بگ گائیز؟"

"شارک، جم۔" رالف نے وضاحت کی۔ "کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟"

"یقیناً۔ بس مجھے بتادو کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"پہلا قدم سازوسامان سے لیس ہونا ہے۔" رالف نے بڑی سی لائف جیکٹ اٹھاتے ہوئے کہا جس پر تسموں اور کھٹکوں کا آڑا ترچھا جال سا بچھا ہوا تھا۔ "یہ کلپ ڈور چرخی سے منسلک ہوگا تاکہ ڈور تمہارے ہاتھ سے نکلنے نہ پائے اور گرفت میں رہے اور یہ سرا کشتی سے منسلک رہے گا تاکہ کہیں تم کشتی سے نیچے پانی میں نہ کھینچ لیے جاؤ۔"

"کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟" جم نے بھویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں ہوا لیکن احتیاط مفید ہوتی ہے۔ یہاں پر سمندر کی بڑی شارک پائی جاتی ہیں اور ان میں سے چند ایک تو دو ہزار پونڈ سے زیادہ وزنی ہوتی ہیں۔" رالف نے بتایا۔

پھر رالف نے لائف جیکٹ اٹھائی اور اسے جم کو پہنانے میں مدد کرنے لگا۔ اس نے تمام تسمے اور کھٹکے کس دیے۔

"اب کیا کرنا ہوگا؟" جم نے پوچھا۔

"اب ہمیں مچھلی کا چارا تیار کرنا ہوگا۔"

"میں نے اس بارے میں سنا ہے۔ مچھلی کا خون اور آلائش وغیرہ۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ شارک مچھلی کے لیے مقناطیس کی طرح ہوتا ہے۔ میں ڈور، چرخی اور چرخیاں وغیرہ سنبھالتا ہوں، تم تیار رہو۔"

"او کے۔"

رالف کولر کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے احتیاط سے پلاسٹک کی چارے کی بالٹی باہر نکال لی۔ ریفریجریٹر میں بند ہونے کے باوجود چارے کی بو ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے ڈوئی نما لمبے چمچے سے وہ بالٹی جم کی جانب بڑھا دی۔

"اس کو اس طرف پانی میں پھینک دو۔ کنجوسی سے کام مت لینا۔" رالف نے کہا۔

جم نے مچھلی کا چارا نیلے پانی میں ڈالنا شروع کر دیا۔

رالف نے سر گھماتے ہوئے چاروں طرف کا بغور جائزہ لیا۔ دور افق تک کوئی دوسری کشتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"اب کیا کرنا ہے؟" جم نے پوچھا۔

رالف نے قتلے بنانے والی چھری سے جم کے شانے میں ایک گہرا گھاؤ لگانے کے بعد ساتھ ہی اسے کشتی سے نیچے دھکا دے دیا۔

جم کے جسم نے پانی میں ایک ڈبکی کھائی۔ پھر جب وہ سطح پر ابھرا تو چلا رہا تھا۔ رالف نے اس کے ابھرتے ہی اس کے جسم پر مزید آلائش پھینک دی۔

"تم میرے! اچھے ہمسایہ ثابت نہیں ہوئے تھے، جم! جب میں اپنے کام پر چلا جاتا تھا تو تم میری بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔"

"رالف، پلیز۔"

جم کے ہاتھوں نے کشتی کے پہلو پر لنگر کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ خون میں لتھڑے ہوئے تھے اور لنگر پر بار بار پھسل رہے تھے۔

رالف نے جم کے سر کے اوپر مزید آلائش الٹ دی۔

جم ابکائیاں لینے لگا۔

"جدوجہد کرتے رہو، جم۔" رالف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شارک کو حرکت کرتے ہوئے ہدف سے عشق ہوتا ہے۔"

"ایسا مت کرو رالف! پلیز، میں تم سے التجا کر رہا ہوں۔"

"بہتر ہوگا کہ تم معافی مانگنے میں عجلت سے کام لو، جم! میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے ساتھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔"

جم نے پلٹ کر کھلے سمندر کی جانب دیکھا۔

پانی کے اوپر نکلا ہوا شارک کا عقبی پر تیزی سے اس کی جانب آ رہا تھا۔

"پلیز، رالف! تم نے کہا تھا کہ تم مجھے اپنا ایک اچھا دوست سمجھتے ہو۔"

"سوری! مجھ سے الفاظ کے انتخاب میں غلطی ہو گئی تھی۔ میں درحقیقت یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں تمہیں ایک اچھا CHUM سمجھتا ہوں۔ تم اس کا مطلب دوست سمجھے۔ جبکہ میری مراد چارے سے تھی۔" رالف نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

اور پھر جب سمندر کا پانی سرخ ہونے لگا تو فضا میں رالف کے قہقہے گونجنے لگے۔

نقشِ اوّل

امجد رئیس

وہ کمال کا منصوبہ ساز تھا... ان کو پوری احتیاط سے بروئے کار لانا اس کے ساتھی کی ذمّے داری ہوتی تھی... سارے خطرات ساتھی مول لیتا تھا، اس کا حصہ بھی زیادہ ہوتا تھا... وہ خود تھوڑے حصے پر قناعت کرتا رہا... مگر طمع نے اکسایا اور اس کی عقل پر پردہ ڈال دیا... زیادہ فائدے کے لیے اس نے پہلی بار خود ہی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا... منصوبہ مکمل اور بے داغ تھا، واردات بھی مکمل... مگر تقدیر کا داؤ کاری تھا...

سنسنی... تجسس اور سبک رواں مہم کا انوکھا ترین انجام

قانون کے رکھوالوں میں گلبرٹ پنکاٹ ''رنگ کٹ'' کے نام سے مشہور تھا۔ گلبرٹ ایک فراڈ، بلیک میلر تھا۔ وہ دولت کے حصول کے لیے مختلف غیر قانونی کاموں میں ملوث تھا۔ وہ اب تک قانون کی گرفت سے اس لیے دور تھا کہ وہ ایک ضابطے کے تحت کام کرتا تھا۔ ایک تو وہ تشدد اور قتل و غارت گری سے دور رہتا تھا۔ وہ رسک لینے کا قائل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ڈاسن کو پارٹنر بنایا ہوا تھا۔ جہاں اسے معمولی خطرہ بھی نظر آتا تو وہ ڈاسن کو آگے رکھ کر

خود پس منظر میں رہنے کو ترجیح دیتا۔

ڈاسن کی افتادِ طبع مختلف تھی۔ اس لیے وہ ہر وقت خطرہ مول لینے کے لیے تیار رہتا۔ دوسری وجہ یہ بھی کہ گلبرٹ لوٹ مار کی رقم میں سے ہمیشہ ڈاسن کو زیادہ حصہ ادا کرتا۔ اس تقسیم کے تناسب میں نمایاں فرق ہوتا۔ اگر شکار مشکل تر اور خطرناک ہوتا تو گلبرٹ کو اسّی فیصد تک بھی ڈاسن کو بخوشی ادا کر دیتا تھا۔

گلبرٹ کامیاب منصوبہ ساز تھا اور اسی حیثیت میں خوش تھا۔

کام ٹھیک چل رہا تھا اور دونوں میں خاصی ہم آہنگی تھی۔ تازہ واردات، اب تک کی سب سے بڑی واردات تھی جس میں دونوں کے ہاتھ ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر کی خطیر رقم آئی تھی۔ یہ ایک پُرخطر واردات تھی جس میں حسب معمول گلبرٹ پس منظر میں تھا۔ لہٰذا اس نے ڈاسن کو اسّی ہزار ڈالرز سے زائد رقم دی تھی۔ ڈاسن مسلح تھا۔ اس کے لیے یہ ایک خونی واردات ہو سکتی تھی۔ تاہم قتل و غارت گری کی نوبت ہی نہیں آئی۔

☆☆☆

گلبرٹ ہوٹل کے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹا خیالات کی یلغار کا سامنا کر رہا تھا۔ کئی ماہ سے اس کے طرزِ فکر میں نمایاں تبدیلیاں در آئی تھیں۔ آخر اس طرح کب تک چلتا رہے گا۔ روز بروز عدم اطمینان کے ساتھ حرص کا کیڑا اس کے دل و دماغ کو جکڑ رہا تھا۔

ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر میں سے اس کے ہاتھ بمشکل پینتیس ہزار ڈالر آئے تھے۔ منصوبہ بندی اس کی تھی۔ تاہم اصل خطرات ڈاسن نے مول لیے تھے۔ گلبرٹ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اب تک غلطی کرتا رہا ہے؟

تازہ واردات متواتر اس کے ذہن میں کچوکے لگا رہی تھی۔ وہ مالی طور پر حسبِ خواہش مستحکم نہیں ہو پا رہا تھا جبکہ خطرات اپنی جگہ پر تھے۔ اس آنکھ مچولی کو خیرباد کہہ کر اسے ایک بڑھیا نائٹ کلب کھول لینا چاہیے۔

اس کے پاس جمع شدہ رقم ناکافی تھی۔ البتہ اس کے اندازے کے مطابق ڈاسن کے پاس کم سے کم بھی کئی لاکھ ڈالر تھے۔ دونوں کی رقوم مل جانے کے بعد ضرورت پڑنے پر وہ کوئی سرمایہ کار بھی تلاش کر سکتا تھا۔

گلبرٹ کو بس ایک بار ہمت کرنی تھی پھر زندگی معقول ڈگر پر چل نکلتی۔ اسے ڈاسن کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔

ڈاسن، بڑی واردات کے بعد ہر مرتبہ ''شے لیک'' جاتا تھا۔ جہاں اس کا چوبی کیبن نما مکان تھا۔ وہاں وہ مچھلی کا شکار کرتا، آرام کرتا اور رقم گن گن کر لطف اندوز ہوتا۔

سونے سے قبل گلبرٹ فیصلہ کر چکا تھا۔ اب وہ منصوبہ بھی خود بنائے گا اور واردات بھی خود کرے گا۔ آخری منصوبہ اور پہلی واردات۔

اگلے روز وہ مشی گن بلیو... وارڈ جا پہنچا۔ اس نے جو لائحہ عمل ترتیب دیا تھا، اس میں گلوریا کا اہم کردار تھا۔ وہ گلوریا سے ملنے ہی وہاں پہنچا تھا۔ گلوریا ایک طرح دار اور لالچی عورت تھی۔ اسے ہر اس چیز سے دلچسپی تھی جسے وہ رقم میں تبدیل کر سکے۔ مثلاً جواہرات وغیرہ۔ براہ راست نوٹ مل جائیں تو کیا ہی بات ہے۔

کچھ دیر بعد وہ گلوریا کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ گلوریا نے اس کے لیے جام تیار کیا اور براہِ راست مطلب کی بات پوچھی۔ ''ڈیئر! کیا ضروری کام آن پڑا، وہ بھی مجھ سے؟''

''تم خود کو غیر اہم سمجھتی ہو کیا؟'' گلبرٹ نے اس کے بھڑکیلے لباس کا جائزہ لیا۔

''ظاہر ہے، ورنہ اتنے عرصے بعد شکل نہ دکھاتے۔''

''عرصے بعد آیا ہوں تو خوش کر کے جاؤں گا۔''

''اچھا...ا...ا...'' گلوریا نے لفظ کھینچ کر ادا کیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''کیا خیال ہے، اگر تمہیں دس ہزار ڈالر مل جائیں۔ وہ بھی کچھ کیے بغیر...؟''

گلوریا نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''خیال تو بہت حسین ہے مگر سخاوت کی وجہ؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔'' گلبرٹ نے مدعا بیان کرنا شروع کیا۔ ''میں کل رات ایک چھوٹا سا ٹرپ لگا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ظاہر ایسے ہو کہ میں یہاں تمہارے ساتھ، تمہارے اپارٹمنٹ میں تھا۔ یہی کوئی آٹھ سے رات دو بجے تک۔''

گلوریا نے ایک ابرو اچکائی اور معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''بہت خوب، اس کے علاوہ؟''

''اس کے علاوہ دوسرا چھوٹا سا کام یہ ہے کہ...''

''تم رات آٹھ سے دو بجے تک کہاں اور کیا کرنے جا رہے ہو؟'' گلوریا نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہی تو دوسرا کام ہے۔ یعنی تم کوئی سوال نہیں کرو گی۔ تمہارے لیے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کئی گواہ ہوں گے جو ثابت کر دیں گے کہ میں نے اس دوران یہاں تمہارے ساتھ وقت گزارا ہے۔ سب سے بڑی گواہ تم خود ہوگی۔ ممکن ہے اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ اوکے؟''

''بات تو ٹھیک لگتی ہے۔'' گلوریا نے کچھ سوچتے

ہوئے بے قراری سے کہا۔ ''ادائیگی کیسے ہوگی؟''

''پانچ ہزار ڈالر ابھی اور پانچ کام کے بعد۔''

''اتنے سے کام کے دس ہزار ڈالرز؟ کوئی بڑا ہاتھ مارنے جا رہے ہو؟''

''کوئی سوال نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔ پانچ ہزار نکالو۔''

''تم اپنی طرف سے بھی ایک آدھ گواہ بنالو تو کیا ہی اچھی بات ہو۔ مثلاً کسی بھی بہانے سے اپنی کسی سہیلی کے کان میں یہ بات ڈال دو کہ کل رات تم یہاں مجھے کمپنی دو گی۔''

''یہ تم تیسرا کام بتا رہے ہو۔''

''ہاں، لیکن اس طرح تم خود کو اور زیادہ محفوظ خیال کرو گی۔ چلو بونس کے طور پر ہزار ڈالر الگ سے۔''

''آئی لو بزنس ودیو۔''

''اینڈ آئی لو یو۔'' گلبرٹ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

☆☆☆

اگلی صبح، گلبرٹ نے جس قسم کا لباس زیب تن کیا، وہ دوسروں سے الگ نظر آرہا تھا۔ خاکی رنگ کا ڈربی ہیٹ بھی اس کے سر پر موجود تھا۔ خود کو نمایاں کرنا اس کے منصوبے کا حصہ تھا۔ تاکہ بعدازاں دیکھنے والوں کو وہ یاد رہ جائے۔ جائے واردات سے عدم موجودگی، مجرم کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ منصوبہ ساز تو وہ تھا ہی۔ واردات پہلی دفعہ خود کرنے جا رہا تھا۔

وہ ہوٹل کی لابی سے گزرتا ہوا، فرنٹ آفس ڈیسک پر روم کلرک کے پاس پہنچا۔

''ڈیٹرائٹ سے ایک اہم کال متوقع ہے۔'' اس نے روم کلرک سے کہا۔ ''اس کال کے علاوہ جو بھی کال آئے، کہہ دینا کہ میں نے ہوٹل چھوڑ دیا ہے... لیکن ڈیٹرائٹ سے جو کال آئے تو بتانا کہ میں گلوریا کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں مصروف ہوں۔'' اس نے بے تکلفی سے کلرک کو آنکھ ماری اور ایک تہ شدہ بیس ڈالر کا نوٹ اس کے آگے کھسکایا۔ ''بہتر ہے لکھ لو، کہیں بھول نہ جاؤ۔''

''بھولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' کلرک نے بتیسی کی نمائش کی۔

''گڈ۔''

بعدازاں گلبرٹ ہوٹل کی پھولوں کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے اس نے کئی درجن تازہ سرخ گلابوں کا گلدستہ بنوایا۔

''ایک خوب صورت کارڈ پھولوں کے ساتھ منسلک کر دیجیے۔ اس پر لکھیں ''گلوریا کی محبت کے لیے۔'' دستخط کی جگہ میرا نام لکھیں۔'' گلبرٹ نے اپنا پورا نام بتایا۔

مطمئن انداز میں وہاں سے نکل کر گلبرٹ نے ٹیکسی پکڑی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے معمول سے ہٹے ہوئے لباس اور ہیٹ پر نگاہ ڈالی پھر پھولوں کو دیکھا۔

''یہ پھول میری چاہت کے لیے ہیں۔'' گلبرٹ نے رومانوی انداز اختیار کیا۔ ''گلوریا نام ہے اس کا۔ تم نے رن کارن اپارٹمنٹ کی عمارت دیکھی ہے؟''

''جناب۔''

''بس وہیں لے چلو۔ میری گلوریا وہیں رہتی ہے۔'' گلبرٹ نے کہا۔ ''اسے گلاب بہت پسند ہیں۔''

ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے ٹیکسی کو آگے بڑھایا۔

گلبرٹ نے اسے پچاس ڈالر پکڑائے اور بولا۔

''کیپ دی چینج۔ گلبرٹ کی طرف سے موج کرو۔''

''لگتا ہے جناب آج بہت خوش ہیں۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے تبصرہ کیا۔

''ظاہر ہے آج رات میں اپنی چاہت کے ساتھ ہوں گا۔ تمہاری بھی تو کوئی دوست ہوگی؟'' گلبرٹ نے بات بڑھائی۔

''اپنی ایسی قسمت کہاں۔ سارا وقت دھندے میں ہی نکل جاتا ہے۔'' ڈرائیور نے ایک سرد آہ کھینچی۔

''او کے، او کے۔ وقت بدل جاتا ہے۔ دل چھوٹا مت کرو۔'' گلبرٹ نے اسے تسلی دی۔

گلبرٹ کی رقم تو خرچ ہو رہی تھی لیکن سودا بُرا نہیں تھا۔ ہوٹل کلرک، پھول والا، ٹیکسی ڈرائیور... اب تک وہ تین عدد گواہ بنا چکا تھا۔ وہ کوئی کسر اٹھا رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ عدم موجودگی کا ٹھوس ثبوت مع گواہان کے۔

☆☆☆

جب وہ مہکتے گلابوں کے ساتھ گلوریا کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو گلوریا کا چہرہ بھی گلاب ہو گیا۔

''اوہ گلبرٹ! یہ میرے لیے؟'' وہ بولی۔

''کوئی شک؟''

''سو سویٹ۔''

گلبرٹ اپنے استعمال شدہ سگریٹوں کے ٹوٹے لایا تھا۔ وہ اس نے مختلف کمروں میں ایش ٹریز میں ڈال دیے۔ مزید یہ کہ دو چار ٹوٹے اِدھر اُدھر فرش پر پھینک دیے۔ اپنی جیبی کنگھی اس نے باتھ روم میں چھوڑ دی۔ متعدد اشیا پر اپنی انگلیوں کے نشانات ثبت کر دیے۔ اس

کے لبوں پر فخریہ مسکراہٹ تھی۔

''تم پہلے سے زیادہ ہوشیار ہو چکے ہو۔'' گلوریا نے تبصرہ کیا۔

''وقت بنا دیتا ہے۔'' گلبرٹ نے جواب دیا۔

''اب غور سے سنو۔ بوقتِ ضرورت تم کو بھی اداکاری کرنی ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔ اس کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ نیچے گارڈ نے ایک بار پھر دیکھ لیا ہے کہ میں پھول لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ میں نے اس سے کچھ معنی خیز باتیں بھی کی تھیں۔ دو بجے تک واپس آجاؤں گا۔''

''گڈ نائٹ، پرنس۔'' گلوریا نے کہا۔

گلبرٹ کھڑکی کی راہ فائر اسکیپ کے ذریعے نکل گیا۔ اس نے کار دو بلاک دور کھڑی کی تھی۔ جہاں تک وہ پیدل گیا۔

کار کا رخ شمال کی سمت شے لیک کی جانب تھا۔ فاصلہ کافی تھا۔ وہ تقریباً پونے گیارہ بجے وہاں پہنچا۔

ڈاسن خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ گلبرٹ کو دیکھ کر اسے خاصی حیرت ہوئی۔ اس نے اپنے پارٹنر کو خوش آمدید کہا۔

''اس وقت، یہاں جنگل میں کیسے آن نکلے؟'' ڈاسن نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

''شہر کی یکسانیت اور ہنگاموں سے اکتا گیا تھا۔ تبدیلی کے لیے ادھر آنکلا۔ مچھلی کا شکار کیسا ہے؟''

''ابھی تو آرام ہی کر رہا ہوں، کل دیکھوں گا۔ کیا پیو گے؟''

''کچھ نہیں، پیٹ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' گلبرٹ نے کہا۔ ''یہاں کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔'' گلبرٹ نے خود کو یاد دلایا۔

''یار! اصل بات بتاؤ، یہ اچانک بے وقت آمد خالی از علت نہیں ہو سکتی؟'' ڈاسن نے استفسار کیا۔

''اندازہ تو ٹھیک ہے۔''

''پھر اگل دو۔ کوئی نیا منصوبہ؟''

''یہ اندازہ بھی درست ہے۔'' گلبرٹ نے جواب دیا۔

''اتنی جلدی ایک اور منصوبہ؟'' ڈاسن نے اظہارِ حیرت کیا۔

''اتفاق سمجھو۔ میرا ارادہ تو نہیں تھا لیکن کافی بھاری مچھلی ہے۔ لگتا ہے قسمت زور کر رہی ہے۔ اوپر تلے دو بڑے شکار۔''

''بہت خوب۔'' ڈاسن نے ہونٹ سکیڑے۔ ''پھر کیا کرنا ہے؟''

''تمہارا کام فوری طور پر شروع نہیں ہوگا۔ مجھے کچھ پلاننگ کرنی ہے۔ ساتھ ہی خاصی رقم بھی خرچ کرنی ہے۔ یہ رقم پانچ گنا ہو کر واپس آجائے گی۔ میں اپنی تمام جمع پونجی داؤ پر لگا رہا ہوں پھر بھی محض پانچ ہزار ڈالرز کم پڑ رہے ہیں۔''

''کام کب شروع کرنا ہے؟'' ڈاسن نے سوال کیا۔

''لگ بھگ دس دن لگ جائیں گے۔''

''کامیابی کے امکانات؟''

''پہلی بار یہ سوال کر رہے ہو؟'' گلبرٹ نے اعتراض کیا۔

''سوری، میں تمہاری منصوبہ سازی کا قائل ہوں۔''

''پھر پانچ ہزار ڈھیلے کرو، دو دن بعد میں تمہیں ابتدائی تفصیل بتاؤں گا۔''

''او کے باس۔'' ڈاسن ایک چھوٹی چوبی الماری کی جانب گیا۔ گلبرٹ کو اندازہ تھا کہ وہ رقم کہاں رکھتا ہے۔ ڈاسن نے الماری کھولی۔ دائیں جانب کپڑوں کے عقب میں ایک خفیہ لاکر نما خانہ تھا۔ اندر بھاری رقم موجود تھی۔ اس نے پانچ ہزار ڈالرز الگ کیے۔

گلبرٹ دبے قدموں کے ساتھ اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ قبل اس کے کہ ڈاسن واپس پلٹتا، اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ گلبرٹ نے فائر نہیں کیا تھا۔ ریوالور کا وزنی دستہ اس نے بار بار پوری قوت سے ڈاسن کے سر پر بجایا۔

ڈاسن کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ گلبرٹ نے خود کو خون کے چھینٹوں سے بچائے رکھا۔ ڈاسن گرتے گرتے بھی پانچ عدد شدید ضربیں کھا چکا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں موت کا اعلان کر رہی تھیں۔

سناٹے میں گلبرٹ باہر نکل گیا۔ گن اس نے دور جھیل میں اچھال دی۔ اسی پانی میں اس نے ہاتھ اور بازو دھوئے اور آستینیں پھر سے نیچے کرلیں۔ واپس آکر اس نے اچھی طرح اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ چوبی الماری کا خفیہ خانہ خالی کرنے سے پہلے اس نے دستانے پہن لیے تھے۔

واپسی پر گلبرٹ نے دستانوں میں ایک ایک وزنی پتھر رکھا۔ کلائی پر دستانوں میں گرہ لگائی اور انہیں بھی دور پانی میں اچھال دیا۔

☆☆☆

وہ گاڑی میں بیٹھا اپنے اعصاب کو تھپکیاں دے رہا تھا۔ یہ اس کا پہلا قتل تھا۔ گلبرٹ نے گھڑی دیکھی۔ دو بجے سے قبل گلوریا تک پہنچنا تھا۔

اس نے پانچ منٹ تمام جزئیات پر غور کیا۔ کہیں کوئی نقص نہیں تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ رقم چھپانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ رقم اس نے گلووکمپارٹمنٹ میں لاک کر دی۔

گیارہ پینتیس پر وہ واپس شکاگو روانہ ہوا۔ دو بجنے میں بیس منٹ تھے جب وہ شہر میں داخل ہوا۔ دس منٹ میں وہ بہ آسانی گلوریا تک پہنچ جاتا۔ عالم سرخوشی میں اس نے رفتار بڑھا دی۔ شکاگو میں حدِ رفتار کراس پر کیا ہوتا ہے، سب جانتے ہیں۔

وہی ہوا، ایک اسکواڈ کار گلبرٹ کے پیچھے لگ گئی۔ شکاگو میں ٹریفک ریگولیشنز سخت ہیں۔ گلبرٹ پُرسکون رہا۔ اسے کسی بحث میں نہیں الجھنا تھا۔ اچھے شہری کی طرح ٹکٹ وصول کر کے آگے بڑھ جانا تھا۔ وہ نشے میں تو تھا نہیں، ورنہ الجھن کھڑی ہو جاتی۔ اس نے گاڑی ایک طرف لگا دی۔ اسکواڈ کار اس کی گاڑی کے آگے جا کر رک گئی۔ ایک پولیس اہلکار اتر کر آیا اور کھڑکی میں جھانکا۔

”ویل... ویل... ل... ل.... یہ تو ’’رنگ کڈ‘‘ ہے۔“

”شاید میں کچھ تیز جا رہا تھا۔“ گلبرٹ نے کہا۔

”دوست ادھر آؤ، یہ تو ’’رنگ کڈ‘‘ بھاگا جا رہا ہے۔“ پولیس اہلکار نے اپنے ساتھی کو بلایا۔

”میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ ذرا رفتار بڑھ گئی تھی۔ تم ٹکٹ کاٹ دو۔“ گلبرٹ نے کہا۔

”رفتار اس وقت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ گلبرٹ نے حیرت کا اظہار کیا۔

”پولیس تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ جہاں ملے اٹھا لاؤ۔“

”کیا بکواس ہے۔ ایسا کیا کر دیا میں نے؟“ گلبرٹ نے خفگی کا اظہار کیا۔ تاہم اس کا سکون رخصت ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اب بھی خود کو ہر طرح سے محفوظ خیال کر رہا تھا۔

”مجھے تفصیلات کا علم نہیں۔ اتنا پتا ہے کہ سراغ رساں لیفٹیننٹ مارٹن، تم سے گپ شپ کے لیے بے چین ہے اور تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ اس کا تعلق ہومی سائڈ سے ہے۔“

گلبرٹ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

”میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔“

پولیس مین نے کھڑکی میں سے ہاتھ بڑھا کر گلبرٹ کی کار کی چابی قبضے میں لے لی۔

”تمہاری کار یہیں رہے گی اور تم اپنے صاف ہاتھوں کے ساتھ ہمارے ساتھ چلو گے۔“

☆☆☆

گلبرٹ، اسٹیشن پر مارٹن کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ اس نے کہیں غلطی نہیں کی تھی۔ پولیس جائے واردات سے اس کی عدم موجودگی کی شہادتوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ یہ بات بھی اس کے لیے معما تھی کہ قتل کرنے کے چند گھنٹوں میں ہی اسے دھر لیا گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ اتنی جلدی تو ڈاسن کی لاش بھی دریافت نہیں ہو سکتی۔ اس کا ذہن چکرایا ہوا تھا۔

بالآخر مارٹن کی شکل نظر آئی۔ وہ گلبرٹ کو اپنے آفس میں لے آیا اور اسے سگریٹ پیش کی۔

”چند معمولات کے سوالات کرنے ہیں۔“ مارٹن نے کہا۔

”کیوں نہیں، میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“ گلبرٹ نے کہا۔

”تم رات میں کہاں تھے، دس بجے کے بعد؟“

گلبرٹ نے سکون کی سانس لی۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی سوال ہے۔ اس کا جواب یقیناً تمہارے علم میں ہوگا۔ تمہیں بھی تفریح کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ تو اس میں کیا ہرج ہے؟“ گلبرٹ نے کمرے میں دیگر پولیس والوں کو دیکھا۔

”گلبرٹ دی کڈ، تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ قتل کا معاملہ ہے، جس میں تم گردن تک اتر گئے ہو۔“

”لیفٹیننٹ! تم مجھ پر کچھ نہیں تھوپ سکتے۔“ گلبرٹ نے کہا۔ ”رات میں کوئی قتل ہوا ہے تو تم خوب جانتے ہو کہ میں کہاں تھا۔ میں گواہ بھی پیش کر سکتا ہوں۔“

”گواہ تو سب مجھے مل گئے ہیں... لیکن اس سے تمہیں نقصان ہی ہوا ہے۔ گواہان کی ہی وجہ سے ہمیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑی۔“ مارٹن نے کہا۔

گلبرٹ نے نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ پھر کچھ بولنا چاہا۔

مارٹن نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”اب تم کچھ بھی بولے تو وہ تمہارے خلاف جا سکتا ہے۔ اتنا قانون تو تم جانتے ہو... میں تمہیں گلوریا ایسٹرلے کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔ رات میں اسے قتل کر کے اس کا اپارٹمنٹ لوٹا گیا ہے۔“

گلبرٹ کے دماغ میں بم کا دھماکا ہوا اور نگاہ کے سامنے تاریکی کا پردہ تن گیا۔

جواری

احمد اقبال

سترھویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

مجھے خود کو یقین دلانا مشکل ہو رہا تھا کہ جو میں نے دیکھا یا محسوس کیا وہ سب ایک خواب تھا اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں، جو اب بھی مجھے گزشتہ زندگی کا ایک حصہ لگتا تھا۔ ان واقعات جیسا حقیقی محسوس ہوتا تھا جو گزرے ہوئے کل کا حصہ تھے یا اس سے پہلے والے دن میں پیش آ چکے تھے۔ خواب کا ہر منظر میرے سامنے تھا۔ خواب میں کی جانے والی گفتگو کا ہر لفظ مجھے یاد تھا۔ ساون خان نے مجھے کیا بتایا تھا۔ وہ جس کمرے میں تنہا اور بیمار پڑا تھا۔ ہر لفظ جو اس نے بولا تھا۔ فاطمہ کے بارے میں کہا تھا یا نورین کے لیے، میں دہرا سکتا تھا۔ اگر دس بار لکھنے کو کہا جاتا تو میں یادداشت کی مدد سے یوں لکھتا جیسے مشین فوٹو کاپی بناتی ہے۔

ساون خان کے بھانجے کا مکروہ، شیطانی اور پُرہوس چہرہ میرے سامنے تھا۔ میرا ایک لاکھ کا انعام مت بھولنا۔۔۔ اس نے تھانے دار سے کہا تھا۔ اور تھانے دار کا سفاک چہرہ اور اس کے فاتحانہ الفاظ کہ دیکھا فرید۔۔۔۔ تو بہت بھاگا۔۔۔ بڑے روپ بدلے مگر قانون کے لمبے ہاتھوں سے بچ کے تو کہاں جا سکتا تھا۔ مجھے اس وقت بھی یوں لگ رہا تھا جیسے تختۂ دار پر جلاد نے پھانسی کا پھندا میری گردن میں کس دیا ہے۔ میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ ایک رات میں یہ دوسرا خواب تھا۔ اس سے پہلے استاد اور کلثوم مجھے سلا کے جا چکے تھے جب میں نے نورین کو دیکھا تھا۔

میرا حلق خشک ہونے لگا۔ میں نے اٹھ کے پانی پیا اور بہت دیر تک خالی گلاس ہاتھ میں تھامے دیوار کو دیکھتا رہا جس پر سینما اسکرین کی طرح مناظر خود روشن ہو کے مٹتے جاتے تھے۔ تھانے دار کے ایک دھماکے سے اندر آنے سے پہلے ساون خان اٹھا تھا کہ مجھے مٹی کا وہ ڈھیر دکھا دے جو نورین کا مدفن تھا۔ کیا ہوتا اگر تھانے دار کچھ دیر نہ آتا۔ مجھے اتنی مہلت مل جاتی کہ میں نورین کی قبر دیکھ لوں، پھر چاہے تھانے دار مجھے قبرستان سے پکڑتا یا واپس آتے ہوئے۔ وہ قبر بھی میری یادداشت میں محفوظ ہو جاتی۔

میں باہر آ کے ٹہلتا رہا۔ خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ خواہ کتنے بھی حقیقی محسوس ہوں۔ اگر ساون خان مجھے خواب میں نورین کی قبر دکھا دیتا تو کیا فرق پڑتا۔ وہ سب غیر حقیقی اور خواب کا حصہ تھا۔ رات گئی بات گئی۔ ایک رات میں دو خواب جو حقیقت کی طرح تھے۔

خواب کو حقیقت سمجھ لینے کا یہ پہلا واقعہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے نورین یوں مجھے نظر آ چکی تھی جیسے وہ حقیقی زندگی میں نظر آتی تھی اور میرے حواس نے مجھے ایسا دھوکا دیا تھا کہ میں نے اس کے قرب کی خوشبو کو محسوس کیا تھا۔ اسے ایک مادّی وجود مان کے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ میرے ہاتھ کیا آتی۔ میں دروازے یا دیوار سے ٹکرایا تو دوسرے سب مجھ سے پوچھنے دوڑے تھے کہ کیا ہوا۔ نورین کی طرح میں نے اپنے بھائی کو رُوبرو دیکھا تھا حالانکہ اس کو مرے زمانہ بیت چکا تھا۔

یہ میرے خیالات تھے جو خواب بن جاتے تھے مگر یہ میرے جذبات کی شدت تھی جو کسی خواب کو زندگی کی جیتی جاگتی حقیقت بنا دیتی تھی۔ کیا ایسا سب کے ساتھ ہوتا تھا۔ شاید نہیں۔ خود میں نے بچپن سے جوان ہونے تک نہ جانے کتنے اوٹ پٹانگ خواب دیکھے ہوں گے۔ ان کو میں آنکھ کھلتے ہی بھول گیا تھا۔ پہلے کسی خواب پر مجھے حقیقت کا گمان نہیں ہوا تھا۔ ایسا اب ہو رہا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا یہ کوئی ذہنی بیماری تھی؟

استاد کی آواز پر میں چونکا۔ ”تجھے تو جانا تھا۔۔۔۔ کہیں؟“

میں نے چونکے بغیر کہا۔ ”ابھی نہیں۔“

”ہاں، میں نے دیکھا کہ جیپ تو وہیں کھڑی ہے۔“ وہ ایک کرسی پر ٹک گیا۔ ”کیا ارادہ ملتوی کر دیا؟“

”نہیں۔“

وہ ہنسا۔ ”ملتوی نہیں کیا تو کیا چھوڑ دیا ہے؟ خیر، ایک بات بتانی تھی تجھے۔۔۔۔ سکندر شاہ آ رہا ہے۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”سکندر شاہ یہاں آ رہا ہے؟“

”ہاں، فون کیا تھا اس نے۔ میں اسے روک تو نہیں سکتا تھا۔ وہ پہلے کبھی نہیں آیا۔“

”خیریت تو ہے نا؟“

”یار یہ مجھے نہیں معلوم۔ خیریت ہو گی یا نہیں ہو گی مگر مجھ سے کام ہوتا تو وہ مجھے بتا دیتا یا بلا لیتا۔“

”مجھ سے بھی اسے کیا کام ہو سکتا ہے؟“

”بیٹے! اس کی ہوتی کوئی لڑکی تو میں کہتا کہ اس نے تجھے پسند کر لیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تیرے بارے میں اس کی رائے پہلے بھی اچھی تھی اور اس سے ملنے کے بعد خود تو نے دیکھ لیا تھا کہ وہ تیری قدر کرتا ہے۔ تجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے اور تیرے ساتھ انور کو بھی۔“

”میں نے ہامی نہیں بھری تھی۔“

''تو انکار کر سکتا ہے اُسے؟'' استاد نے طنز اور تمسخر سے کہا۔ ''اتنا پاگل نہیں ہے تو....''

''تھوڑا بہت تو ہوں۔ تم مجبور تھے استاد۔ مجھے کیا مجبوری ہے کہ میں اس کے حکم کا غلام بن جاؤں؟''

''ابے پاگل خانے، اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے۔ اسے تو غلامی کہہ رہا ہے؟ ہوش کے ناخن لے.... قسمت کی لاٹری کو مت ٹھکرا۔ میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تو اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تیرے ساتھ جانے سے بات بن گئی، اب میری زندگی بدل جائے گی انشاء اللہ! مجھے اندازہ ہے تیری ہر بات کا.... جو کام تو نہیں کر سکا سکندر شاہ کی مدد ہوگی تو آسان ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''کس کام کی بات کر رہے ہو استاد؟''

''ابے ایک جھاپڑ دوں گا نا تو سب سمجھ آجائے گا..... تجھے نورین چاہیے نا؟ وہ زندہ ہوگی تو سکندر شاہ اسے تلاش کرلے گا اور لا کے تیرے سامنے کھڑا کر دے گا اور معاملہ ہے نادر شاہ کا تو کیا اس سے بدلہ لے سکتا ہے تو؟''

میں نے خفت سے کہا۔ ''استاد تم ناراض ہو گئے۔ میں تو تمہاری بات بھی مانتا ہوں۔ تم نے بھی کہا اور بھابی نے بھی کہ میں بدلہ لینے کا خیال چھوڑ دوں۔''

وہ خوش نظر آنے لگا۔ ''پھر؟ کیا تو نے یہ خیال چھوڑ دیا ہے؟''

''عقل مانتی ہے پر دل نہیں مانتا استاد۔ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ میں ٹاس کروں اور فیصلہ ہو جائے۔''

''معاملہ دل کا ہی مشکل ہوتا ہے۔''

کسی گاڑی کے ہارن پر گیٹ کیپر نے باہر جھانکا اور سکندر شاہ کی گاڑی اندر آگئی۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ استاد کے ساتھ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے لیے تیسری کرسی کو قریب کیا۔ سکندر شاہ کسی سلام دعا کے بغیر میری جگہ بیٹھ گیا۔

''اچھا ہوا تم مل گئے۔ میں کسی اطلاع کے بغیر آ گیا تھا۔''

''خیریت تو ہے نا شاہ جی؟'' استاد بولا۔

''نہیں، خیریت ہوتی تو ایسے بھاگا ہوا آتا میں؟ تمہیں بلا لیتا۔'' اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ ''ملک سلیم! ایک مسئلہ آ گیا ہے جو تمہاری مدد سے حل ہو سکتا ہے۔''

میں حیرانی سے چونکا۔ ''ایسا کون سا مسئلہ ہو سکتا ہے شاہ جی؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہے نا یار..... میرا ذاتی مسئلہ ہے کسی اور کو کیسے بتاؤں، چل اٹھ۔''

''کہاں؟'' میں نے اٹھے بغیر کہا۔

وہ خفگی سے بولا۔ ''میرے ساتھ اور کہاں۔''

''ابھی اور اسی وقت؟''

استاد نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ ''کیا فضول سوال پر سوال کیے جا رہا ہے۔ یہاں کون سا تو ملک اور قوم کی تقدیر کے فیصلے کر رہا تھا۔ اور شاہ جی تجھے پھانسی لگانے تو نہیں لے جا رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''شاہ جی! مجھے تھوڑی سی مہلت نہیں مل سکتی..... مجھے بھی ایک ضروری کام تھا۔''

سکندر شاہ کی نظر مجھ پر جم گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ انکار سننے کا عادی نہیں۔ یہ مجبوری تھی کہ اس نے سر ہلایا۔ ''ایک دو دن.... زیادہ سے زیادہ۔''

میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ ''ایک دو ہفتے.... کم سے کم زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے کسی کی تلاش ہے۔ ملنے کا کیا ہے، میں تلاش کے لیے نکلوں اور قسمت کل ملا دے۔''

استاد سے پہلے سکندر شاہ بولا۔ ''تم نورین کی بات کر رہے ہو نا۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ تم اکیلے اب تک کچھ نہیں کر سکے لیکن میرے وسائل کے ساتھ یہ کام یوں ہو جائے گا۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

استاد نے خفگی سے مجھے گھورا۔ ''شاہ جی اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ تو اکیلا ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا ہے کب سے۔''

شاہ جی نے تحمل سے کہا۔ ''میرا کام اتنا لمبا نہیں ہے۔ دو چار دن کی بات ہے۔ شاید دو چار دن بھی نہ لگیں تمہیں۔''

میں نے کہا۔ ''عجیب لگتی ہے یہ بات مجھے..... آج تک آپ نے صرف میرا نام سنا تھا۔ آپ کے سارے کام ہو رہے تھے اور اب ایک ایسا کام آ گیا ہے کہ میرے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''اتفاق ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔'' میں کھڑا ہوا تو میرے ساتھ سکندر شاہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''شاہ جی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ آؤ اور ایک کپ چائے بھی نہ ہو۔'' استاد گھبرا کے بولا۔

''پھر سہی غلام محمد۔'' سکندر شاہ نے دوستانہ انداز میں اپنا بھاری بھرکم ہاتھ استاد کے کندھے پر رکھا۔ ''فرصت ملتے ہی میں خود آ جاؤں گا یہ ادھار وصول کرنے۔''

اندر جا کے میں نے لباس بدلا اور سوچتا رہا کہ سکندر

شاہ کو کیا مجبوری میرے پاس لے آئی۔ جس کی دسترس میں سب کچھ ہو اور جو خدائی کے دعوے کے سوا سب کچھ کر سکتا ہو اس کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں؟ اگر میں استاد کے ساتھ اس کے گھر نہ جاتا تو وہ کیسے جانتا کہ میں کہاں ہوں؟ پھر کیا اس کا یہ کام نہ ہوتا؟ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں۔ دنیا کے کام کسی ایک آدمی کے ہونے نہ ہونے سے نہیں رکتے۔ میں اپنے کسی سوال کا جواب تلاش کرنے سے قاصر رہا اور باہر آ کے سکندر شاہ کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سوری نورین .... معلوم نہیں یہ دنیا اور اس کے لاحاصل کام کیوں میرے اور تمہارے درمیان خلیج بن رہے ہیں۔ بے شک میں استقامت رکھتا ہوں اور تمہیں بھلا بھی نہیں سکتا۔ لیکن آج سے کل ہوتی جاتی ہے۔

سکندر شاہ نے راستے میں کوئی بات نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ ڈرائیور کی موجودگی ہو سکتی تھی لیکن دوسری زیادہ اہم وجہ اس کی فکرمندی اور پریشانی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں گم باہر دیکھتا پھر مجھے۔ اس کے ہونٹ یوں ہلتے تھے جیسے وہ کچھ کہہ رہا ہو مگر وہ خیالوں میں خود سے مخاطب تھا۔ یہ لاشعوری کیفیت تھی۔

وہ مجھے گھر کے اس کمرے میں لے گیا جو شاید اس کی خلوت کی پناہ گاہ تھی۔ یہاں ایک بیڈ تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور ایک بہت اچھا میوزک سسٹم جس کے مختلف شکل و صورت اور سائز کے اسپیکر چاروں طرف نظر آتے تھے۔ لیکن یہاں فون نہیں تھا۔ یہ کسی وکیل یا مصنف اور شاعر کی اسٹڈی اور لائبریری جیسی جگہ تھی جہاں اپنے ساتھ صرف وہ خود ہوتا تھا۔

”مجھے میوزک وہی سکون اور آرام دیتی ہے جو ماں کی گود میں بچے کو ملتا ہو گا یا سکون آور دوا جو میں نے کبھی کھائی نہیں.... بیٹھو۔“ وہ میرے مقابل صوفے کے بازو پر سر رکھ کے لیٹ گیا اور ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کافی بنالو میرے لیے بھی۔“

میں نے کافی درمیانی میز پر رکھی تو وہ آنکھیں کھول کے اٹھ بیٹھا اور مسکرایا۔ ”تھینک یو سلیم! دراصل معاملہ روزی کا تھا۔“

میں نے مگ رکھ دیا۔ ”آپ کا مطلب ہے.... روزینہ.... آپ کی بہو؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اس کو سب معلوم ہو گیا ہے۔“

”کیا معلوم ہو گیا ہے۔ اپنے والدین کے بارے میں؟“

سکندر نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”وہ یہاں نہیں تھی۔ مراد کے ساتھ ہوسٹن میں تھی۔ ٹیکساس.... اس سے پہلے وہ روم، لندن، پیرس اور نہ جانے کہاں کہاں تھی۔ ہنی مون تو خیر تھا۔ لیکن میں نے مراد سے کہا تھا کہ چھ مہینے، سال سے پہلے پاکستان کا رخ مت کرنا۔“

”خواہ تم دو سے تین ہو جاؤ۔“ میں نے لقمہ دیا۔

وہ ہنس پڑا۔ ”اس کا پتا نہیں۔ کیا پتا میں خود بلا لیتا انہیں.... کوئی دادا اپنی دادا گیری نہیں چلا سکتا پوتے یا پوتی پر۔ مگر ابھی تو دو ہی مہینے ہوئے تھے اور ایسی کوئی خبر ہوتی تو مراد ضرور بتاتا۔ میں نے تاکید کی تھی اسے.... لیکن ایک بات یہ بھی کہی تھی کہ روزینہ کو پاکستان کی خبروں سے دور رکھنا، نہ ٹی وی نہ اخبار.... میرا مطلب ہے پی ٹی وی اور یہاں کے اخبارات۔ ٹی وی پر تو خطرہ کم تھا مگر اخباروں کا کچھ پتا نہیں۔ یہ جو ملتان سے شائع ہوتے ہیں یہ پاکستان کے ہر شہر میں نہیں ملتے تو باہر کہاں ملیں گے لیکن ان کی کسی خبر کو جنگ یا ڈان والے اٹھا لیں، کسی کالم میں ذکر آ جائے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”آپ روزینہ کے والد پیر سائیں کی درگاہ کی بات کر رہے ہیں۔“

”ہاں، ایسے ڈبا پیر ویسے تو ہر جگہ ہیں۔ مگر اس نے میرے ساتھ پنگا لیا تھا۔ شامت آئی تھی اس کی۔ درگاہ میں وہ کچھ بھی کرتا، مجھے کیا۔ وہ بھی میرے کاروباری معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔ عیاشی بدمعاشی جو چاہے کرے.... وہ بھی اور میں بھی۔ لیکن معاملہ آ گیا میرے بیٹے کا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کی زندگی بچائی، میں نے کیا بس اللہ نے بچائی.... ورنہ وہ اکلوتا بیٹا تھا میرا۔ اس کی ماں بھی مر جاتی اور میں مرتا نہ تو تباہ ضرور ہو جاتا۔ پاگل ہو کے نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ بہت پہلے میں نے طے کر لیا تھا کہ اس خطرے کا وجود مٹا دینا ضروری ہے۔ وہ زندہ رہتا تو مراد نہ رہتا اور روزینہ کا معاملہ نہ ہوتا تو ظاہر ہے کوئی معاملہ ہی نہ ہوتا۔ خیر، مراد میری مدد کے بغیر ہی کامیاب ہو گیا۔“

”آپ نے اسے روکا تو ہو گا؟“

”میں نے؟ اس کی ماں نے پیر تک پکڑ لیے تھے مراد کے۔ روتی تھی اور ہاتھ جوڑتی تھی کہ مراد! روزینہ کو چھوڑ کے دنیا کی کوئی لڑکی بتا لیکن مراد کے لیے تو دنیا میں وہی ایک لڑکی تھی۔ ماں کی منت سماجت اور آنسو رائگاں

گئے تو میرے بھونکنے سے کیا ہوتا۔ مجھے کھڑا ہونا پڑا بیٹے کے ساتھ۔۔۔ اور میں نے کہا کہ اس پیر کی تو۔۔۔۔ خیر، مر گیا وہ تو اب گالی دینا اچھا نہیں لگتا۔ وہ دونوں نکل گئے تو میرا کام آسان ہوگیا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں بھی امریکا چلا جاؤں۔"

میں نے کہا۔ "جا تو سکتے تھے آپ۔"

"ہاں ہاں، جانا مشکل نہیں تھا لیکن یہاں سب کچھ لپیٹ دیتا، کام دھندا چھوڑ کے چلا جاتا تو وہاں کیا کرتا؟ بیکار ہو کے بیٹھ جاتا۔ شہریت مل جاتی۔ کاروبار بھی کر لیتا۔۔۔ اور پیسے کا مسئلہ بھی نہ ہوتا۔ مگر یار یہاں جو بادشاہت ہے نا اپنی۔۔۔ اس کا مزہ وہاں کہاں۔ جہاں وزیراعظم اور صدر عام لوگوں کی طرح پھرتے رہتے ہوں۔ تو میں نے سوچا کہ مراد ہی واپس آ کے یہ سارا کاروبار سنبھالے اور میں کچھ نہ کروں۔ بس اپنے پوتا پوتی کے ساتھ کھیلتا رہوں۔ ہاں نام چلتا رہے میرا۔۔۔۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مراد کی زندگی محفوظ ہو۔"

"اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کا دشمن نمبر ون نہ رہے۔"

"ہاں، یا ہم نہیں یا تم نہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ پلان تو کامیاب رہا میرا لیکن روزینہ کو پتا نہ چلے یہ کب تک ہو سکتا تھا اور بالآخر جس بات کا ڈر تھا وہ یہاں آنے سے پہلے ہی ہوگئی۔ مراد کی کوشش کے باوجود اسے پتا چل گیا۔ وہ جس ہوٹل میں تھے۔ کسی نے ہوٹل کا ہال شادی کے لیے کرائے پر لیا۔ یہاں کے ایک بزنس مین۔۔۔ اور سیاست داں کے بیٹے کی شادی تھی اور لوگ تو خیر تھے۔ انہوں نے ہوٹل میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کے لوگوں کو بھی بلا لیا۔ ایک طرح سے دعوتِ عام تھی کہ جو چاہے شریک ہو جائے۔ لیکن مراد کو دعوت نامہ ملا۔ وہ بے وقوف چلا گیا بیوی کے ساتھ۔۔۔۔ یا ممکن ہے روزینہ نے کہا ہو کہ چلو امریکا میں ایک پاکستانی شادی دیکھ لیں۔ اپنے پاکستانی اور پنجابی بولنے والے ہوں گے۔ وہاں بالکل پاکستانی اسٹائل میں عورتوں نے اپنی گپ شپ شروع کر دی۔ کسی عورت نے دوسری سے پوچھا کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو۔ وہ ملتان کی تھی اور پوچھنے والی بھی۔ بس قارورہ مل گیا۔ روزینہ کہیں قریب ہی بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی اور کسی سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ پیر سائیں کا نام سنا تو وہ چونکی۔ وہاں دوسری عورت نے بڑے دکھی لہجے میں بتایا کہ پیر سائیں کی درگاہ پر کیا قیامت گزری۔ پہلی عورت کے لیے یہ صرف ایک خبر تھی۔ وہ پیر سائیں کی مرید نہیں تھی لیکن واقعہ ملتان کا تھا۔ بات ختم ہونے سے پہلے روزینہ نے دخل دیتے ہوئے کہا کہ یہ جھوٹ ہے اور کسی بدخواہ نے افواہ پھیلائی ہے۔ خبر سنانے والی کا ناراض ہونا برحق تھا کیونکہ اسے جھوٹا اور افواہ پرداز کہا جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ کیا اخبار بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ دیکھ لو خود ورنہ میں دکھا دوں گی۔ پھر روزینہ نے بتا دیا کہ وہ کون ہے اور شادی کی محفل میں رونا پیٹنا شروع کیا تو مراد بڑی مشکل سے اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑا۔ اس نے مراد کو برا بھلا کہا کہ اس کو پتا ہو گا۔ پھر ڈاکٹر آیا اور اس نے روزینہ کو دوا دے کر سلا دیا۔ مگر وہ اٹھی تو پھر وہی رونا دھونا اور ضد کہ مجھے اخبار لا کے دو۔ پاکستان کا پرانا اخبار کوئی بازار میں ملنے والی چیز نہیں تھی کہ مراد لا دیتا۔۔۔ مگر روزینہ کہاں ماننے والی تھی۔ اس نے ہوٹل والوں سے کہا۔ سفارت خانے کا نمبر لے لیا۔ قصہ مختصر کہ اسے اخبار مل گیا اور اس نے خود ساری تفصیل پڑھ لی۔ اس کے بعد روزینہ نے ضد کی کہ پاکستان چلو۔۔۔۔ میرے ماں باپ اور میری بہن۔۔۔۔ سب مر گئے اور میں زندہ ہوں۔ مجھے بھی ان کے ساتھ دفن ہونا ہے۔ ظاہر ہے یہ روزینہ وہ نہیں تھی جو ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکال کے آئی تھی۔ جس نے خود سارے خون کے رشتوں پر مراد کی محبت کو ترجیح دی تھی۔ صدمے نے اس روزینہ کو مار دیا تھا اور دوسری روزینہ وہی تھی۔ اس گھر کی بیٹی۔" وہ خاموش ہوگیا۔

"پھر؟ مراد نے مان لی اس کی بات؟"

"کیسے نہ مانتا؟ وہ پاکستان نہیں امریکا میں تھے۔ وہ اکیلی آ جاتی۔ مراد اسے روک نہیں سکتا تھا۔"

"پھر آئی کیوں نہیں؟"

"کل آ رہی ہے، لندن اور دبئی کے راستے۔۔۔۔ ڈائریکٹ فلائٹ نہیں ملی تھی۔" وہ پھر چپ ہوگیا۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ کو فیس تو کرنا پڑے گا۔"

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے ایسی بے وقوفی کی بات کی وہ مجھ سے توقع نہیں رکھتا تھا۔ "یہی تو سارا مسئلہ ہے۔"

"ہاں، مسئلہ یقیناً ہوگا لیکن کتنے دن۔۔۔ ماں باپ سب کے مرتے ہیں۔"

"پاگل کے بچے وہ مجھے ذمے دار سمجھتی ہے۔" سکندر شاہ نے کافی کا مگ دیوار پر کھینچ مارا۔

"آپ کو؟" میں اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔

"ہاں مجھے۔"

"لیکن درگاہ کی تباہی اور ساری خونریزی کے ذمے دار آپ نہیں، ڈاکو تھے۔ خبر یہی ہوگی اور نام ہوگا کہ کس ڈاکو کے گروہ نے یہ سب کیا تھا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ہاں، اور اسی سے ساری خرابی ہوئی۔ گامارستم کا نام تھا اور وہ گامارستم کو جانتی ہے۔"

"کیا جانتی ہے؟"

"یہی۔۔۔ کہ وہ کس کے حکم کا غلام ہے۔ میں نے اسے پال رکھا ہے۔" وہ بولا۔

"اوہ۔۔۔ تو یہ ہے مسئلہ۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں بھی حیران تھا کہ میں اچانک تمہارے لیے کیسے اہم ہو گیا۔ اس حد تک کہ تم نے مجھے ایک پارٹنر، ایک مشیر اور فیملی ممبر کی حیثیت دے دی۔"

اس نے دکھی نظر سے مجھے دیکھا۔ "میرے جیسے شخص پر لوگ اعتبار نہیں کرتے۔ مگر اتنی ہمت کسی میں نہیں کہ میرے منہ پر ایسا کہہ سکے۔ مجھے آج صبح آٹھ بجے یہ سب معلوم ہوا۔ اس وقت وہاں گزشتہ رات کے دس بجے تھے۔ ہوسٹن میں۔۔۔ روزینہ جب سو گئی تو مراد نے مجھے فون کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے یعنی ڈیڑھ گھنٹا پہلے ڈاکٹر نے اسے سکون آور انجکشن دیا تھا۔ کل خود مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"آئی ایم سوری۔۔۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"میں نے تم سے جو بھی کہا تھا نیک نیتی سے کہا تھا۔ چودھریوں نے تمہیں قبول کرلیا تھا جو انتہائی تنگ دل تنگ نظر اور خودغرض لوگ تھے۔ اب وہ مر گئے تو میں انہیں نیک، فیاض اور شریف تو کہہ نہیں سکتا۔ شاہینہ زندہ رہتی تو تمہارا میری بہو روزینہ سے بہنوئی کا رشتہ ہوتا کہ نہیں۔ میں پارٹنرشپ کی جگہ ملازمت کی بات کرتا تو تم قبول نہ کرتے اور تمہاری ضرورت مجھے نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ تم مراد کے لیے وہی کرو جو انور کے لیے کر چکے ہو۔ جب وہ میرا بزنس سنبھالے تو مجھے فکر نہ ہو۔ باپ کی بات ویسے بھی بیٹے کہاں سنتے ہیں۔ تمہاری بات وہ سنے گا کیونکہ تم اس کے معاون اور مددگار تھے جب وہ روزینہ کے ساتھ نکلا تھا۔ پارٹنرشپ کا مقصد صرف تمہیں عزت دینا تھا۔ یہ احساس دلانا تھا کہ تم ہمارے ملازم نہیں ہو، الو کے پٹھے۔" آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔

"میں اپنی غلط فہمی پر شرمندگی کا اظہار کر چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "گالیاں دینے کی ضرورت نہیں۔"

"وہ۔۔۔ بس ایسے ہی منہ سے نکل جاتی ہیں، جن سے میرا واسطہ پڑتا ہے ان کو گالیاں دینا ضروری ہوتا ہے۔ ان کی اوقات یاد دلانے کے لیے کہ وہ شریف اور معزز نہیں ہو گئے ہیں۔ بری عادت ہے میری۔۔۔ میں جانتا ہوں، غصے میں آ گیا تھا میں۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہیں اب۔۔۔ میں کیا کروں اگر بیٹی اپنے باپ سے خفا ہے۔"

وہ سامنے دیوار کو گھورتا رہا۔ "تم اسے یقین دلا سکتے ہو کہ اخبار نے جو لکھا ہے جھوٹ ہے۔"

"اور وہ مان لے گی میرے کہنے سے؟"

"اگر تم چاہو اور کوشش کرو تو اسے یقین دلا سکتے ہو، مشکل ہے یہ کام ناممکن نہیں۔۔۔ ایک چیلنج ہے۔"

میں نے کہا۔ "سکندر صاحب۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی اور سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "اسے معلوم ہے کہ تم شاہینہ سے شادی کرنے والے تھے۔ وہ نہ ماری جاتی تو یہ شادی ہو جاتی۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ شاہینہ تم سے کتنی محبت کرتی تھی۔"

"یہ اس نے خود کہا آپ سے؟"

"نہیں، اس کی بات ماں سے ہوتی تھی۔ شاہینہ بھی اس کے بھائی کی بیٹی تھی روزینہ کی طرح۔۔۔ بہت پہلے اس نے کہا تھا کہ یہ ملک سلیم ایک سائے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ نورین ایک آسیب بن کر اس سے چمٹی ہوئی ہے مگر باجی اس کا علاج کرلے گی۔۔۔ بالآخر وہ ہتھیار ڈال دے گا اور پھر ساری عمر اس کا غلام بن کر رہے گا۔ کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ "لیکن یہ معاملہ کچھ اور ہے۔"

"بات اعتماد کی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ تم اچھے اور سچے آدمی ہو۔ تم بتا سکتے ہو کہ شاہینہ کیسے ماری گئی تھی۔ تمہاری نظروں کے سامنے۔۔۔ تم چشم دید گواہ ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔۔۔ تم نے سب دیکھا، اگر تم کہو گے کہ وہ ماجھے والا کا گروہ تھا۔"

"ماجھے والا؟"

"ہاں یہ بھی ایک ڈاکو ہے۔ ساہیوال کے علاقے میں تھا۔ پھر سندھ چلا گیا اور کچے کے علاقے میں وارداتیں کرتا رہا۔ اب کچھ عرصہ ہوا لوٹ آیا ہے۔ اگر تم کہو کہ گامارستم کا نام تو میری دشمنی میں لیا گیا ہوگا۔۔۔ ورنہ وہ ماجھا والا کے ساتھی تھے۔"

"روزینہ کہے گی کہ تم کیسے جانتے ہو؟"

''ہاں، وہ ایسا ضرور کہے گی لیکن تم کہہ سکتے ہو کہ ڈاکو اس کا نام لے رہے تھے اور خود شاہینہ نے تمہیں بتا دیا تھا کچھ دیر پہلے..... وہ اسی لیے ماری گئی۔ گامارستم کے ساتھی ہوتے تو ایسا ظلم بھی نہ ہوتا۔''

''کیا اسے علم نہیں کہ آپ کی اور پیر سائیں کی دشمنی تھی؟'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''معلوم ہے..... لیکن تم کو جھوٹ بولنا ہے تو کم زیادہ کچھ نہیں..... اور اس جھوٹ کا مقصد نیک ہے، گناہ سارا میرے سر، میں جانوں میرا خدا جانے۔''

''نیکی کا پہلو اس میں کیا ہے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اس ایک لڑکی کو بچانا..... اور اس رشتے کو بچانا جو مراد سے ہے تو ہم سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مراد کو چھوڑ دے کہ تمہارا باپ میرے ماں باپ اور میری بہن کا قاتل ہے، میں اس گھر میں کیسے رہ سکتی ہوں اور اس قاتل کے بیٹے سے رشتہ کیسے رکھ سکتی ہوں، ایک سو ایک سبب بن جائیں گے۔ وہ اپنے خاندان کے قاتل کی نسل کو آگے چلائے؟ ناممکن..... اور ایک کے بعد یہ دوسرا صدمہ ہوگا جب وہ مراد کو چھوڑے گی۔ پھر کیا رہ جائے گا اس کے پاس زندہ رہنے کے لیے..... کون سنبھالے گا اسے۔ مراد اسے لے کر الگ ہوجائے تب بھی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ بہرحال اس کے یقین کے مطابق اس کے سارے خاندان کے قاتل کا بیٹا رہے گا۔ ناممکن ہوگا اس کا مراد کی بیوی بن کے رہنا اور غلط بھی نہیں ہوگا لیکن الگ وہ ایک ہی صورت میں ہو گی۔''

وقفہ آیا تو میں نے پوچھا۔ ''کس صورت میں؟''

''لاش کی صورت میں..... وہ خودکشی کرلے گی۔ تم مجھ سے لکھوالو۔ ایک حادثے کو وہ برداشت کر جاتی۔ سب کر لیتے ہیں۔ لوگوں کے خاندان ختم ہو جاتے ہیں۔ سیلاب، زلزلے یا ٹرین کے حادثے میں۔ یہ مسئلہ مختلف ہے اگر اس کا شوہر مراد نہ ہوتا تو وہ بھی بالآخر رو دھو کے صبر کر لیتی کہ اللہ کی مرضی۔ مگر آگے معاملہ ہے اس کی اپنی مرضی کا، وہ قاتل کے خاندان سے رشتہ رکھے نہ رکھے۔ ان کی نسل کو آگے چلائے نہ چلائے۔ اس پر وہ سمجھوتا نہیں کرے گی، کبھی نہیں..... اور کوئی بھی لڑکی اس صورتِ حال میں نہیں کر سکتی۔ اس کے سارے عذاب کا آسان حل ہوگا موت جسے وہ یہاں آنے کے بعد گلے لگائے گی۔ ماں باپ کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے بعد۔ میری طرف سے تم آزاد ہو، جا سکتے ہو انکار کرکے..... مگر بعد میں میرے اندیشے سچ ثابت نہ ہوں تو یہاں آ کے میرے منہ پر تھوک دینا۔ تم اس انجام سے ہم سب کو بچا سکتے تھے مگر تم نے انکار کیا، اس بات پر وہی تھوک اپنے چہرے پر مل لینا۔''

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ میں ایک قاتل کو بچاؤں؟ اس سزا سے جس کا وہ مستحق ہے؟ اس کو قانون سزا نہ دے سکے..... یا اس کی سزا یومِ حساب تک التوا میں رہے۔ یہ تو بہت معمولی سزا ہوگی کہ اس کے بیٹے کا گھر اجڑ جائے۔ اس کی محبت چھن جائے۔ وہ سکندر جیسے باپ کا بیٹا ایک سال گزرنے سے پہلے دوسری شادی کرلے گا لیکن روزینہ؟ کیا اسے بھی مرجانا چاہیے؟ اسے کس جرم کی سزا میں محبت کا اور اپنے مستقبل کا خون کرنا پڑے؟ اسے بچایا جاسکتا ہے۔

سکندر نہ جانے کب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''دیکھو، میں تم سے مراد کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ مجھے نہیں وہ خود کو سزا دے گا۔ روزینہ نے اسے چھوڑا یا وہ مرگئی تو مراد بھی یہی کرے گا۔ مجرم اور گنہگار میں ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ سزا مجھے ملنی چاہیے تو ایک تحریر لکھ دیتا ہوں تمہیں..... ٹھیک ایک مہینے بعد میں خود کو شوٹ کرلوں گا۔ یہ تحریر میری لاش کے پاس ڈال دینا۔ مجھے مرنا قبول ہے لیکن پھانسی کے تختے پر نہیں۔ بس روزینہ اور مراد کو جینے کا سہارا فراہم کردو۔'' اس کی آنکھوں میں مجھے آنسو نظر آئے۔

''اوکے اوکے۔'' میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں یہ جھوٹ بولوں گا۔ اس کے لیے حلف اٹھانا پڑا تو وہ بھی اٹھاؤں گا۔ اللہ سب جانتا ہے، میں نے پہلے کتنے جھوٹ بولے ہیں۔ کتنے گناہ کیے ہیں۔ اس کی مرضی ہوتی تو میں بہت پہلے مرجاتا، آگے بھی یہی ہوگا۔ وہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ تم کو اپنی قبر میں جانا ہے، مجھے اپنی۔''

وہ صوفے پر گر گیا۔ ''تھینک یو سلیم..... میرا تم پر بھروسا غلط نہیں تھا۔ تم نے ہم سب کو بچالیا۔''

''لیکن اس کے بعد..... میں مراد کے ساتھ نہیں رہوں گا، نہ آپ کے ساتھ۔''

اس کی سوالیہ نظر میری طرف اٹھی۔ ''میری طرف سے تم پر نہ پابندی ہے نہ مجبوری..... لیکن اس کی وجہ؟''

''وجہ صاف ظاہر ہے۔ آپ کی طرح آپ کے جانشین بیٹے کو سب معلوم ہوگا کہ میں نے کتنا بڑا جھوٹ بولا ہے اور اس کی قیمت بھی وصول کی ہے پارٹنرشپ کی صورت میں۔ مراد تو سب جانتا ہے کہ گامارستم کے سوا یہ کام کوئی نہیں

کرسکتا۔ وہ آپ کے حکم کا غلام ہے۔''
وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ''کل میں نے گامارستم کو اپنی غلامی سے آزاد کیا تھا تمہارے سامنے۔''
''یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔''
''یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ مجھے معلوم ہے شادی کے بعد سے وہ آزادی چاہتا تھا۔ کل میں نے اس پر ایک احسان کیا۔ یہ اس نے خود بتا دیا کہ وہ کہیں بہت دور چلا جائے گا جہاں کوئی اس کا سراغ نہ لگا سکے۔ میں بھی یہی کہتا اس سے کہ اب اپنی شکل گم کرو۔ دوبارہ نظر آئے یا تمہارا نام بھی سنا میں نے تو زندہ دفن کرادوں گا۔ مراد نے پوچھا تھا کہ پاپا یہ کام آپ نے کرایا تھا؟ تو میں نے کہا کہ کیسی بات کرتے ہو، اخبار والے بکواس کرتے ہیں۔ گامارستم تو دو ماہ پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔''
''اور اس نے مان لیا؟''
''میں نے منوالیا۔ میں نے گامارستم سے کہا ہے کہ وہ دوبارہ سامنے نہ آئے۔ فوراً غائب ہو جائے۔ مراد چاہے بھی تو اسے تلاش نہ کر سکے، اس سے کچھ پوچھ نہ سکے، اسے قتل نہ کرا سکے۔ ویسے مراد جانتا ہے کہ میں نے اس سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جب تم گواہ ہو گے تو اس کے لیے بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ ابھی مراد کا فون آئے گا۔ وہ تم سے بات کرے گا۔''
میں چونکا۔ ''مجھ سے بات کرے گا۔''
''ہاں، فلائٹ کے ٹیک آف کرنے سے پہلے... وہ ائرپورٹ سے کال کرے گا۔''
میں تھوڑا سا نروس ہوا۔ ''پھر.... میں کیا کہوں؟''
''وہی جو میں نے کہا۔ ماجھا والا کا نام لو، کہو کہ تم نے خود سنا اور دیکھا۔''
''کیا دیکھا؟''
''جو سردار ہوتا ہے، وہ صرف حکم دیتا ہے۔ تم نے اسے ہدایات جاری کرتے دیکھا۔''
''وہ پوچھے گا کہ کیا میں گامارستم کو پہچانتا ہوں۔''
''تم جو چاہو کہہ سکتے ہو، ہاں یا نہیں... مگر ہاں کہنے کی صورت میں یہ بھی بتا سکتے ہو کہ تم نے اسے یہاں نہیں دیکھا۔ اس کا نام سنا تھا اور اس کی تصویر دیکھی تھی۔ اس کے سر پر دس لاکھ کا انعام ہے۔ وہ پکڑا گیا۔ اسے پھانسی ہونے والی تھی کہ وہ جیل سے فرار ہو گیا۔ اس کے ساتھی چھڑا لے گئے۔ یہ سب اخبارات میں آ چکا ہے۔''
میں ابھی تک پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ''یہ جو ملک غلام محمد بن کے یہاں رہتا ہے، کیا مراد کو نہیں معلوم کہ وہی گامارستم ہے؟''
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ تم جانتے ہو یا مجھے معلوم ہے۔ میں آج کہہ دوں گا اس سے کہ اب وہ جلد از جلد نکل جائے یہاں سے اور آئندہ مجھ سے رابطہ نہ رکھے۔''
''لیکن میں رابطہ رکھنا چاہتا ہوں۔''
''تم رکھو۔'' اس نے اچانک گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''سوری یار! تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔ کھانے کا وقت کب کا نکل گیا۔ دراصل یہاں مجھے ڈسٹرب کرنے کی اجازت میری بیوی کو بھی نہیں۔''
بھوک مجھے خاک لگتی۔ میرا دماغ مثبت اور منفی خیالات کی رزم گاہ بنا ہوا تھا۔ ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ متصل ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ایک خادمہ نمودار ہوئی اور اس نے خاموشی سے وائرلیس ریسیور سکندر شاہ کو تھما دیا۔ اس نے صرف ہیلو کہا اور کھڑا ہو گیا۔ اشارے سے اس نے مجھے پیچھے آنے کا کہا اور پھر روک دیا۔ ''تم کھانا کھالو اطمینان سے۔''
میں کھڑا ہو گیا۔ ''کھالیا میں نے۔''
اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔
''میں بلاتا ہوں ابھی۔''
صاف ظاہر تھا کہ وہ اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا اور فون مراد کا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ جب وہ بات کرلے اس کے بعد میں آؤں۔ میں عجیب صورت حال میں پھنس گیا تھا۔ نہ انکار کر سکتا تھا نہ اقرار سے مطمئن تھا۔ آگے کنواں پیچھے کھائی۔ کھانے کی میز پر اب میرے ساتھ افسردہ مزاج اور خاموش طبع وہ عورت رہ گئی تھی جو خوش قسمتی کے سارے لوازمات اپنی دسترس میں رکھنے کے باوجود بدقسمت تھی اور اس کی بدقسمتی کے اسباب بھی عیاں تھے۔ پہلا تو یہی کہ وہ سکندر شاہ کی بیوی تھی۔ پھر یہ کہ وہ مراد کی ماں تھی جس کی شادی اپنی پسند سے اور دھوم دھام سے کرنے کے ارمان اس کے دل میں بھی ہوں گے مگر یہ شادی ہی خانہ بربادی کا سبب بنی تھی اور الٹا اب وہ اکلوتی اولاد کی زندگی اور سلامتی کی دعائیں مانگتے ہوئے بھی ڈرنے لگی تھی۔
وہ اچانک بولیں۔ ''مراد کا باپ کہتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
مجھے یوں لگا جیسے آواز کہیں اور سے آئی ہے۔ وہ تو اسی طرح گم صم جذبات سے عاری سپاٹ چہرہ لیے بت بنی بیٹھی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''ہاں، انشاء اللہ۔''
ان کے لب ہلے۔ ''مگر ... اللہ نے پہلے تو کبھی یہ نہیں چاہا۔''
''دیکھیے، مایوسی کفر ہے۔ یہ آزمائش ہے۔''
''آزمائش میں تو زندگی گزر گئی۔'' انہوں نے جیسے خود سے کہا۔
''مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت میں آپ کے لیے خوشیاں ہی ہیں۔''
وہ ہنس دیں۔ ''تمہیں کیوں یقین ہے جب مجھے نہیں۔ مراد کا باپ کہہ رہا تھا کہ تم مراد کی مدد کرو گے۔''
''ہاں، وعدہ کیا ہے میں نے کہ کوشش کروں گا۔'' میں نے پہلو بدلا۔
''تو پھر اسے روک دو۔''
''روک دوں؟''
''ہاں، اسے یہاں مت آنے دو، کہو کہ اتنی دنیا پڑی ہے۔ کہیں بھی رہے... یہاں نہ آئے۔''
''ایسا کیوں چاہتی ہیں آپ؟''
''اس نے بتایا تھا مجھے... روزینہ نے... وہ امید سے ہے۔''
میں بے حس و حرکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ ''یہ تو خوشی کی خبر ہے۔''
''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں چلی جاؤں گی اس کے پاس۔''
میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی اکلوتی اولاد کی زندگی کی طرف سے کتنی متفکر اور خوف زدہ ہیں۔ ان کی فکرمندی جائز تھی لیکن صرف ان کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سکندر چاہتا تھا کہ بیٹا اب اس کی جگہ لے لے... ولی عہد اب تخت نشیں ہو جائے۔
''اگر تم کچھ کر سکتے ہو، اس کا بھلا چاہتے ہو تو مراد کو یہاں مت آنے دو۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے بولیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
''خدا کے لیے... مجھے عذاب میں مت ڈالیں۔ میں اب کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مراد جہاز میں ہے روزینہ کے ساتھ... میں کیا جہاز کا رخ موڑ دوں؟'' میں نے برہمی سے کہا اور اٹھا کیونکہ سکندر مجھے آواز دے چکا تھا۔
''سکندر کو کچھ مت بتانا۔'' وہ سرگوشی میں بولیں۔
میں نے دروازے میں رک کر کہا۔ ''اگر مراد آپ کی مانتا ہے تو آپ اس سے کہیں، وہ بھی یہاں نہ رہے اور آپ سب کو بھی لے جائے۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں۔''
سکندر نے پھر مجھے پکارا تو میں نکل گیا۔ سکندر نے ریسیور مجھے تھما دیا۔ ''مراد سے بات کرو۔''
میں نے ریسیور پکڑ کے کہا۔ ''مراد! کیسے ہو، روزینہ کیسی ہے؟''
اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ ''سلیم! کیا یہ سچ ہے؟''
''کیا سچ ہے؟''
وہ بولا۔ ''یہی جو ابھی پاپا نے بتایا۔ درگاہ پر ساری کارروائی مانجھا والا نے کی تھی؟''
''تمہیں اپنے باپ پر اعتبار نہیں؟''
اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں۔''
''اور مجھ پر ہے؟'' میں نے کہا۔
''ہاں، مگر میرے پاس وقت کم ہے۔ میں ٹرانزٹ لاؤنج میں ہوں۔ روزینہ اکیلی بیٹھی ہے۔''
''میں ایک چشم دید گواہ ہوں۔ میری ہونے والی بیوی... شاید دنیا میں مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والی عورت میرے سامنے مر گئی۔ ماردی گئی اور میں کچھ نہ کر سکا۔''
''میرا سوال کچھ اور تھا۔ یہ کارروائی مانجھا والا کی تھی؟''
''ہاں، اس کو بھی مانجھا والا نے قتل کیا۔ میں اسے نہیں جانتا۔ اس کا نام تک میں نے نہیں سنا تھا لیکن وہاں دوسروں کو وہی حکم دے رہا تھا۔ سب مانجھا والا کہہ رہے تھے۔ اس کے ساتھی۔''
''روزینہ کو یقین دلانے کے لیے تم حلف اٹھا کے کہہ سکتے ہو یہ بات؟''
''بالکل کہہ دوں گا۔''
''کیونکہ پاپا نے تم سے کہا ہے۔''
''شٹ اپ... میں غلام نہیں ہوں نہ تمہارے پاپا کا اور نہ کسی اور کا۔'' میں نے کہا۔
''میں غلام بن جاؤں گا تمہارا... اگر تم نے اپنے سچ سے روزینہ کو بچا لیا۔ اس کے بغیر نہ میں زندہ رہوں گا اور نہ کوئی اور زندہ رہے گا۔''
''مجھے اندازہ ہے، تمہاری ماں کی خواہش تھی کہ تم لوٹ کے نہ آؤ۔''
''میں نہ آتا لیکن روزینہ کی وجہ سے مجبور تھا۔ اچھا

"تھینک یو سلیم! تم پر بھروسا ہے مجھے۔"

"خدا حافظ۔" میں نے کہا اور لائن کٹ گئی۔ سکندر شاید دروازے سے لگا کھڑا تھا کہ اندر آ گیا۔

میں نے کہا۔ "تم دنیا میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "بدقسمتی ہے میری۔"

"بدفطرتی کہو اسے۔ یہ قصرِ عالی شان جس میں تم رہتے ہو، یہ ایک مکان ہے، گھر نہیں۔ کیونکہ اس میں جو لوگ رہتے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ اعتماد یا محبت کا کوئی رشتہ نہیں رکھتے۔ تم کو بیٹے پر اعتماد نہیں، بیٹے کو تم پر.... بیوی تمہاری شریکِ حیات نہیں، کنیز ہے جس کے ساتھ تم سو سکتے ہو، محبت کے بغیر۔"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ "میری مجبوری کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ.... ایسا نہ ہو میں تمہیں گولی مار دوں۔"

"دیر کیسی.... ریوالور نکالو اور شوٹ کر دو مجھے، میرے ساتھ مراد کی ماں کو بھی۔"

اس نے ریوالور نکال لیا اور پھر میرے سامنے پھینک دیا۔ "یہ کام تم کرو۔ مجھے مار دو.... سب سکھ کا سانس لیں گے۔ میری ضرورت کس کو ہے اب؟"

"ابھی کچھ زندگی کی مہلت ہے تمہارے پاس.... یہ ہو سکتا ہے سکندر شاہ کہ تم ایک ضرورت بن جاؤ، ان سب کی جو تمہارے اپنے تھے اور غیر ہو گئے۔"

"اب بہت دیر ہو گئی ہے سلیم۔" وہ مایوسی سے بولا۔

"تم نے انور کو دیکھا؟ اس نے کیسے راستہ بدل لیا۔ نیا آدمی بن گیا نئی زندگی کے لیے.... اور اس کو دیکھا جو گامار ستم تھا۔ ڈاکوؤں کا سردار.... ملک غلام محمد اس کا ظاہر ہے مگر اس کا باطن بھی بدل چکا ہے۔"

"ایک عورت نے کیا یہ جادو۔"

"وہ عورت کھانے کی میز پر اکیلی بیٹھی ہے.... ہمیشہ اکیلی رہی۔ یہ جادو وہ بھی جانتی تھی مگر تم نے اس کو مجبوری کی قید میں ڈال دیا۔ تمہارے پاس تو اکلوتا بیٹا بھی ہے اور وہ جو تمہیں ایک پوتا دے گی۔"

"آخر میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں۔ بس صرف ایک شوہر، ایک باپ اور ایک دادا بن جاؤ۔ ٹھیکے دار سکندر شاہ کو ان رشتوں کے درمیان اسی طرح مت آنے دو جیسے سیکیورٹی گارڈ کسی اجنبی کو تم تک نہیں آنے دیتے۔ مراد کے آنے میں ابھی چوبیس گھنٹے ہیں۔ فیصلہ کرنے کے لیے یہ مہلت بہت ہے ورنہ۔"

"ورنہ کیا....؟" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے.... تمہارا دل بھی خالی ہو گا۔ یہ دولت، تمہاری دہشت.... اثر رسوخ، یہ محل ان سب کے ساتھ جب تم مرو گے تو تمہیں رونے والا کوئی نہیں ہو گا۔"

"میری فیملی ہے۔"

میں تلخی سے ہنسا۔ "تمہاری فیملی یا تمہاری خوش فہمی۔ میں تم کو خبردار کر رہا ہوں۔ وہ سب تمہیں مرنے کے لیے اکیلا چھوڑ جائیں گے۔ وہ تینوں بلکہ چاروں یہاں تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔"

"چار کون؟" وہ کچھ ڈر گیا۔

"تمہاری بیوی، بیٹا، بہو اور تمہارا پوتا یا پوتی.... جو ان دیواروں کے اسیر تھے۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد وہ بولا۔ "ٹھیک ہے، تم جو کہو گے میں کروں گا۔"

"تو پھر اٹھو.... جا کے اپنی بیوی سے بھی یہی بات کہہ دو کہ آئندہ جو وہ کہے گی تم مانو گے۔ ایسے کہ وہ یقین کرے۔ مانے کہ جو اب تک نہیں ہوا تھا اب ہو گا۔ اگر میں تمہاری فیملی کو بچانے کے لیے اتنا بڑا جھوٹ بولوں گا تو کچھ تم بھی بولو۔ اسے میری شرط سمجھ لو۔ تمہارے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔ تم نے کچھ نہ کیا تو مراد کے آنے سے پہلے میں چلا جاؤں گا۔"

سب وقت وقت کی بات ہے۔ آدمی جو خود کو وقت پر حاوی اور نشۂ قوت و اقتدار میں سکندرِ اعظم سمجھتا ہے بالآخر وقت ہی کے ہاتھوں شکست کھاتا ہے۔ سکندر کے احساس کا یہ ناقابلِ تسخیر قلعہ بھی ٹوٹ کے بکھر رہا تھا۔ جس نے خود کو کسی کا بھی محتاج نہ سمجھا تھا وہ آج خود اعتراف کر رہا تھا کہ وہ رشتوں کا محتاج ہے۔ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور میں نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ سہاروں کا محتاج اب وہ ہے۔ جسے وہ عزت سمجھتا تھا وہ خوف تھا یا دہشت تھی اور خوف صرف نفرت کو جنم دیتا ہے۔

درمیان میں ایک رات تھی اور سکندر کی طرح میں نے بھی وہ رات سوتے جاگتے گزاری۔ میرا وجود دو متضاد قوتوں کی رسّاکشی میں ٹوٹ رہا تھا۔ عقل کہتی تھی کہ میں نے جھوٹ نہ بولا تو صرف سکندر کا گھر ہی برباد نہیں ہو گا اس احسان کا بدلہ چکانے کا یہ موقع بھی نکل جائے گا جو گامار ستم نے میری جان بچا کے کیا تھا۔ کسی نامعلوم ماجھا والا کے

بجائے روزینہ کے خاندان کا وجود مٹانے کا ملزم گا مارتم ہی ہوگا۔ پھر شاید وہ معافی بے اثر ہوجائے گی جو سکندر کی طرف سے اس کو ملی تھی۔ وہ اپنا گھر نہ بسا سکے گا۔ اپنا مستقبل نہ سنوار سکے گا۔ اس کی حیثیت ایک مفرور مجرم جیسی رہے گی۔

میں استاد کو کچھ بتا کے نہیں آیا تھا اور بتاتا بھی تو کیا۔ سکندر نے مجھے کہا کہ میرے ساتھ چلو اور میں چل پڑا۔ میں لوٹ کے نہیں گیا تو اس نے فرض کرلیا ہوگا کہ سکندر نے روک لیا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ صبح ہوئی تو طلوع آفتاب سے قبل ہی میں راستہ تلاش کرتا باہر نکل آیا۔

میری نظر ایک طرف گئی تو میں نے مراد کی ماں کو سنگ مرمر کے ایک حاشیہ دار چبوترے پر نماز پڑھتے دیکھا۔ وہ بے داغ سفید کپڑوں میں سفید دوپٹا سر کے گرد لپیٹے، آنکھیں بند کیے اور ہاتھ اٹھائے جانماز پر قبلہ رو بیٹھی تھیں۔ منہ پر ہاتھ پھیر کے انہوں نے مجھے دیکھا اور پھر آہستہ سے گردن ہلا کے مجھے قریب بلایا۔ میں نے نزدیک جا کے سلام کیا تو انہوں نے مسکرا کے کہا۔ ''بیٹھو، روز جلدی اٹھ جاتے ہو؟''

میں بیٹھ گیا۔ ''جی نہیں۔ بس آج آنکھ کھل گئی تو باہر نکل آیا۔''

میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ وہی افسردہ روح ہے جو گزشتہ روز سکندر کی بیوی کے روپ میں منجمد ہو کے رہ گئی تھی۔ ایک بے جان بت کی طرح۔ اس کا بے رونق بجھا ہوا ملول چہرہ اور اندر کے دکھ کی اذیت سے آنسو بہاتی آنکھیں، یہ سب میرے تصور میں ہی رہ گیا تھا۔ لگتا تھا صبح کی تازگی سے دمکتا یہ پُروقار حسین چہرہ، آنکھوں کی مہرباں روشنی اور لبوں پر کھیلتی پُرشفقت مسکراہٹ رکھنے والی عورت کوئی اور ہے..... اور یکلخت میرا دل ایک انوکھے احساس کی خوشی سے بھر گیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ نرمی سے بولیں۔

''کچھ نہیں۔ دیکھ رہا ہوں کہ ایک رات میں یہ کیا ہوا۔'' میں نے کہا۔

''سوال تو مجھے کرنا تھا۔ یہ سب کیسے ہوا آخر؟ تمہیں جادو آتا ہے؟'' وہ بولیں۔ ''کیسے تم نے پتھر کو موم بنا دیا؟''

''یہ جادو آتا تو سب سے پہلے میں دربدری کے عذاب سے نکلتا۔ اپنی تقدیر کی کتاب سے ذلت و رسوائی اور محرومی کو مٹاتا۔ مگر یہ سب خدائی فیصلے ہیں۔''

''کل رات مجھے اپنا گمشدہ شوہر مل گیا۔ جو مراد کا باپ بھی ہے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''اچھا، مبارک ہو۔ کتنے عرصے بعد ملا؟''

انہوں نے سوچ کے کہا۔ ''میرا خیال ہے.... دس بارہ سال بعد۔''

''آپ نے سنبھال کے کیوں نہیں رکھا تھا کہ وہ گم گیا؟''

''میں نے تو بہت سنبھال کے رکھا تھا۔ لیکن ضرور مجھ سے کہیں کوتاہی ہوئی یا قدرت کو میرا امتحان مقصود تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا ممکن ہے۔ کل رات کو اس نے مجھ سے معافی مانگی۔ اس سلوک پر جو وہ میرے ساتھ کرتا رہا۔ روتا رہا اور اپنی ہر غلطی تسلیم کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ وہ سب مراد کے حوالے کردے گا۔ وہ جو چاہے کرے۔ ہم دنیا گھومنے جائیں گے اور حج بھی کریں گے۔ اپنے پوتا پوتی کو کھلائیں گے۔''

''کیا وہ نشے میں تھا؟''

''نہیں، تم کو اندازہ نہیں کہ ایک رات میں کیا ہوگیا۔ اس نے شراب کی ساری بوتلیں توڑ دیں۔ پھر وہ قرآن اٹھا لایا اور میرے سامنے حلف اٹھایا کہ اب وہ اس حرام شے کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ وہ سارے غلط کام چھوڑ دے گا اور مراد کو بھی نہیں کرنے دے گا۔ میرے پاس تو مجبوری کا بہانہ تھا۔ اس کے پاس کوئی وجہ نہیں۔ وہ میرا کام جاری رکھے یا اپنا بزنس کرنا چاہے تو سب اس کا ہے۔ میں دخل نہیں دوں گا۔ اس نے کہا کہ وہ پچاس سے اوپر کا ہوگیا ہے۔ کیا پتا زندگی کے کتنے دن رہ گئے ہیں۔ بس ایسی ہی باتیں کرتا رہا۔ وہ پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ تم نے اسے مجبور کردیا کہ تمہاری بات سنے۔ دراصل اسے ضرورت بھی تم جیسے کسی آدمی کی تھی جو اسے صحیح مشورہ دے۔ تم پر اسے اعتماد تھا۔ تم نے اسے خوف اور مشکل سے باہر نکلنے کا راستہ دکھایا۔ اب اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''میں اسے اپنی کامیابی نہیں سمجھتا۔ خدا نے ہر کام کے لیے وقت مقرر کیا ہے۔ وہ وقت آتا ہے تو وسیلہ کوئی بھی بن جاتا ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔''

اچانک اندر سے سکندر نکلا اور سیدھا ہماری طرف آیا۔ نیند کی کمی سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر وہ مسکرایا اور ایک کونے پر ٹک گیا۔ ''بہت گپ شپ ہو رہی ہے۔'' وہ بولا۔

''ہاں، میں نکلا تو یہ نماز پڑھ کے فارغ ہوئی تھیں۔''

''اس نے سب بتا دیا ہوگا تمہیں؟''

میں نے بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "ہاں ..... سب بتا دیا مجھے۔"

"اچھا کیا، اب میرے سر پر بوجھ نہیں رہا۔" وہ بولا۔ "میں بزدل ہوں۔"

"اپنی غلطی کا اعتراف کرنے والا بہت بہادر ہوتا ہے۔"

اس کی بیوی جانماز سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ "میں ناشتا لگواتی ہوں۔"

وہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔ "یہ رات بھر پریشان رہی۔ پہلے سمجھی میں نشے میں ہوں۔ پھر شک ہوا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ میں نے تمہاری شرط پوری کر دی ہے۔ چوبیس گھنٹے پورے ہونے سے پہلے ہی۔"

"مجھے یقین ہے کہ اب تمہارے حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"یہ صرف تمہاری کوشش پر منحصر ہے۔"

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔"

"کھانے کے بعد ہم ائرپورٹ جائیں گے۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

"کہاں؟ اسلام آباد؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اتنا وقت کہاں ہے؟"

"نہیں امریکا سے تو فلائٹ اسلام آباد میں اترے گی۔ ملتان کی فلائٹ اسے فوراً ہی مل جائے گی۔ میرا خیال ہے چار بجے تک وہ ملتان پہنچ گا۔ وقت گزر ہی نہیں رہا ہے آج۔"

سکندر کی بے چینی ایک باپ کی بے چینی تھی۔ ابھی بیٹے کو علم نہیں تھا کہ یہاں دنیا وہ نہیں رہی جو تھی۔ ائرپورٹ جاتے ہوئے میں خود کو ایک چیلنج کے لیے تیار کرتا رہا۔ ایک جذباتی طوفان آنے کو تھا اور مجھے اس کا رخ بدلنا تھا۔ اس کے سامنے سچ نظر آنے والے جھوٹ کا بندھ باندھنا تھا۔ جیسے جیسے وقت قریب آ رہا تھا میری پریشانی اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیا میں یہ فرض نبھا پاؤں گا۔ روزینہ کو اپنے جھوٹ سے قائل کر پاؤں گا کہ یہی سچ ہے۔ بے شک وہ مجھ پر اعتبار کرتی ہے لیکن اسے پتا چل گیا کہ مجھے اس کے سسر نے یہ جھوٹ بولنے کے لیے مجبور کیا تھا..... مگر اسے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ مراد کے لیے بھی میں قابلِ اعتماد ہوں۔ کیسی عجیب بات ہے۔ چودھریوں کی حویلی سے پیر سائیں کی درگاہ اور پھر سکندر کے قلعے تک لانے میں ایک نادیدہ ہاتھ نے میری راہنمائی کی۔ میں جو اس تقدیر کے چکر سے نکل گیا تھا پھر گرفتار ہوا اور شاہینہ کی موت نے مجھے وہاں پہنچا دیا جہاں میرے خیال کی رسائی بھی نہ تھی۔ اب میں سکندر شاہ کے حالات کا اسیر تھا۔

یہ خیال مجھے بہت دیر سے آیا کہ میرے لیے اس جذباتی منظر کا حصہ بننا ضروری بالکل نہیں تھا۔ اچھا ہوتا کہ میں ایک دن بعد سامنے آتا اور ملاقات کے بعد والے طوفان کا سامنا کرنے سے بچ جاتا۔ ائرپورٹ پر سکندر کا روزینہ کے سامنے آنا بھی غلط نظر آیا۔ جب تک میں اسے یقین دلاؤں کہ اس کی فیملی کا نام ونشان مٹانے والا استاد گامار ستم نہیں بلکہ مانجھا والا ہے وہ اپنے سسر ہی کو اس خونی واردات کا ذمے دار سمجھتی رہے گی۔

اب مجھے اس جذباتی غلطی کے پیچھے چھپے طوفان کے آثار نظر آ رہے تھے جب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہم ائرپورٹ پر تھے اور اس جذباتی ہیجان میں مبتلا باپ کو قائل کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا جو اکلوتے بیٹے اور بہو کو خود ریسیو کرنے آیا تھا اور نتائج کچھ بھی ہوں، واپس نہیں جا سکتا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ بات خود اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی اور مجھے کیوں نہیں سوجھی۔

ائرپورٹ پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ فلائٹ نے ابھی تک اسلام آباد سے ٹیک آف نہیں کیا۔ وجہ ہمارے معلوم کرنے پر کوئی خرابی بتائی گئی۔ خرابی کیا تھی۔ کتنی دیر میں فلائٹ کے روانہ ہونے کا امکان تھا۔ یہ ملتان ائرپورٹ والے کیا بتاتے۔ سکندر پی آئی اے کو گالیاں دیتا رہا کہ سب سالے نالائق، سفارشی بیٹھے ہیں۔ ڈبو دیا ہے ائرلائن کو۔" وغیرہ وغیرہ۔ دیگر ریسیو کرنے کے لیے آنے والوں کے بھی کچھ ایسے ہی جذبات تھے۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ انتظار کتنا طویل ہوگا۔

میں نے سب کو سنانے کے لیے کہا۔ "ایسے کب تک انتظار کریں گے، واپس چلتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ ایک گھنٹا جانے کا اور پھر ایک گھنٹا دوبارہ آنے کے لیے .... کیا پتا ہمارے گھر پہنچتے ہی فلائٹ آ جائے۔"

میری مدد اس کی بیوی نے کر دی۔ "میری طبیعت بے چین ہو رہی ہے۔ مجھے چھوڑ کے آ جانا۔"

"بے چینی کس بات کی؟ بیٹھو ائرکنڈیشنڈ ویٹنگ روم میں .... کچھ کھا پی لیتے ہیں۔"

شاید قدرت میری مشکل آسان کرنے پر آمادہ تھی۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہونے لگا کہ اسلام آباد سے آنے والی

فلائٹ موسم کی خرابی کے باعث منسوخ کر دی گئی ہے، ہنگامہ کرنے والے موسم کے خلاف کیا احتجاج کرتے، گرج چمک اور بارش تو اسلام آباد کا معمول تھے اور جہاز کی سلامتی بہرحال مقدم تھی۔ مایوس لوگ فوراً ہی منتشر ہو کے جانے لگے۔ خفگی کے جذبات کی جگہ پریشانی نے لے لی۔

''اب کیسے آئے گا وہ.... ٹرین سے؟'' اس کی ماں نے پوچھا۔

سکندر نے پلٹ کے کہا۔ ''دماغ خراب نہیں ہے اس کا۔ وہ رینٹ اے کار سے گاڑی لے سکتا ہے۔ ائرپورٹ پر ہی مل جائے گی۔''

''لیکن اس خراب موسم میں سڑک سے آنا بھی تو ٹھیک نہیں۔''

''ڈرائیور بڑے ایکسپرٹ ہوتے ہیں اور خراب موسم ہوگا جہلم تک یالاہور تک۔ یہاں تو بادل بھی نہیں۔''

مراد کی ماں نے کہا۔ ''دس گھنٹے لگ جائیں گے آتے آتے.... رات ہو جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کل تک انتظار کرے موسم کے ٹھیک ہونے کا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ امریکا سے اٹھارہ بیس گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہوں گے۔ مزید دس گھنٹے سفر نہیں کریں گے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سلیم .... وہ ضرور فون کر کے بتا دے گا۔''

لیکن مراد کا کوئی فون نہیں آیا۔ شام سے رات ہو گئی۔ پی آئی اے نے منسوخ شدہ فلائٹ کے مسافروں کو ٹکٹ کا ریفنڈ دے دیا تھا یا اگلے دن کی فلائٹ پر جگہ دی تھی مگر ان کے ٹھہرانے کی ذمے داری نہیں لی تھی۔ شام تک سکندر کا پارا چڑھنے لگا۔ پی آئی اے کے بعد وہ مراد کو گالیاں دینے لگا۔ ''الو کا پٹھا.... ایک کال نہیں کر سکتا گھر والوں کو بتانے کے لیے.... روانہ ہو گیا ہے گاڑی لے کر یا ہوٹل میں ٹھہر گیا ہے تو کہاں.... ذرا احساس نہیں کہ ہم پریشان ہوں گے۔ اب بتاؤ میں کس ہوٹل سے معلوم کروں۔ مجھے تو اسلام آباد، پنڈی کے سارے ہوٹلوں کا بھی پتا نہیں.... سیرینا ہے اور میریٹ۔''

میں نے کہا۔ ''ائرپورٹ راولپنڈی میں ہے۔ پی سی قریب ہے۔''

اس نے پی سی راولپنڈی سے پوچھا۔ پھر ان سے نمبر لے کر دوسرے ہوٹلوں میں معلوم کیا۔ شالیمار بھی پی سی کے پاس تھا۔ ائرپورٹ سے آگے بھی ایک دو ہوٹل تھے۔

میریٹ، سیرینا کہیں بھی مسز اور مسز مراد نہیں تھے۔ تھک ہار کے وہ بیٹھ گیا۔ ''وہ پاگل کا بچہ کہیں نہیں تو پھر گاڑی لے کر چل پڑا ہے۔ پہنچے گا رات بارہ بجے۔ یہ ہے کوئی عقل مندی کی بات؟''

رات تک جب وہ نارمل ہو گیا تھا تو میں نے کہا۔

''سکندر شاہ جی! میرے خیال میں تو یہ اچھا ہوا۔''

''کیا اچھا ہوا؟'' وہ برہمی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''اگر فلائٹ وقت پر آجاتی تو ائرپورٹ پر تماشا ہو سکتا تھا۔''

''تماشا؟ کیسا تماشا؟''

''آپ تو صرف بیٹے کے لیے سوچ رہے ہیں۔ مگر جب روزینہ آپ کے سامنے آتی تو کیا خیال ہے، وہ آپ کو سر جھکا کر سلام کرتی اور آپ اس کے سر پر دستِ شفقت رکھ کے دعا دیتے۔ جی نہیں، آپ کو دیکھ کر اس پر ہسٹریا غالب آسکتا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کے خاندان کے قاتل آپ ہیں۔ آپ کے حکم کا غلام ہے گامارستم۔''

''اتنی بے وقوف نہیں ہے وہ کہ وہاں ہنگامہ کرتی۔''

''یہ بے وقوفی کی نہیں ---- جذباتی ردِعمل کی بات ہے۔ میں وہاں کیسے بتاتا کہ جیسا وہ سمجھ رہی ہے ویسا نہیں ہے۔ کیا وہ سنتی میری؟''

وہ متفکر ہو گیا۔ ''یہ تو نہیں سوچا تھا میں نے.... پھر اب کیا کرنا چاہیے؟''

''کچھ نہیں، وہ گھر آجائیں پہلے.... روزینہ روئے، چیخے چلائے.... دل کی بھڑاس نکل جائے تو وہ سنے گی ہماری بات.... اور بالآخر مان بھی لے گی۔ تھکن سے ہی اس کا حال خراب ہو گا مگر وہ کہے گی کہ مجھے ابھی جانا ہے ماں باپ کی قبر پر۔''

''اس مسئلے کا حل بھی بتاؤ یار۔''

''بہتر تو یہ ہے کہ ماں اسے سمجھائے.... اس کے بعد آپ اور میں سامنے جائیں اور مراد کوشش کر کے اسے سلا دے۔ وہ ضرور اسے سکون آور گولیاں دے رہا ہو گا اور وہ قابو سے باہر ہونے لگے تو زبردستی پکڑ کے انجکشن لگا دیا جائے۔ کوئی ڈاکٹر ہے ایسا؟''

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''میں بلا لیتا ہوں کہ ایمرجنسی ہے.... اس کا تو باپ بھی آئے گا۔''

میں استاد گامارستم کے گھر سے کسی تیاری کے بغیر اچانک اٹھ کے آیا تھا بلکہ لایا گیا تھا۔ ابھی تک میرے تن پر وہی کپڑے تھے جو میں نے سوتے جاگتے استعمال کیے

تھے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ درمیان کے چند گھنٹوں کی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جاؤں اور اپنا جو تھوڑا بہت اسباب ہے یہاں اٹھا لاؤں۔ دیکھ آؤں کہ ریشم اپنے نئے گھر میں خوش ہے یا نہیں۔ اس کی انور کے ساتھ رخصتی کے معاملات تو طے ہو گئے تھے لیکن رخصتی ابھی باقی تھی۔ انور نے تمام شرائط کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ زمین وہ ہاریوں میں بانٹ چکا تھا اور یہ بھی طے تھا کہ شادی استاد کے گھر سے ہوگی اور وہ ریشم کو رخصت کرا کے اپنے آبائی گھر یعنی چودھریوں کی حویلی میں لے جائے گا لیکن بالآخر وہ اس دس مرلے کے گھر میں رہیں گے جس کی مالک اب ریشم تھی۔ اپنے حصے کی آبائی زمین سے محروم ہو کے بھی انور اپنے حویلی اور باغات کے ساتھ لاکھوں کا مالک تھا۔ مستقبل میں وہ کیا کرے گا۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا لیکن مجھے اس تک سکندر کا یہ پیغام ضرور پہنچانا تھا کہ وہ ایک آرکیٹیکٹ اور پارٹنر کے طور پر اس کے بزنس میں شامل ہو سکتا ہے۔

میں نے گھڑی دیکھی تو ابھی ساڑھے سات بجے تھے۔ مراد کی طرف سے تا حال کوئی اطلاع نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ غالب امکان جس پر ہم یقین کیے اس کی آمد کے منتظر تھے یہ تھا کہ فلائٹ نہ ملنے کے بعد اس نے بائی روڈ آنے کو ترجیح دی اور اب کہیں راستے میں تھا۔ وہ اگلے دن فلائٹ لینے کی کوشش کرتا تو اسے چوبیس گھنٹے انتظار کرنا پڑتا اور اس کے بعد بھی سیٹ ملنا چانس پر منحصر تھا چنانچہ کسی ہوٹل میں قیام پر اس نے سفر کو ترجیح دی تھی اور آدھے گھنٹے بعد وہ گاڑی کرائے پر لے کر نکلا ہوگا تو رات گیارہ بارہ بجے سے پہلے گھر نہیں پہنچے گا۔ میرے پاس کم سے کم بھی تین گھنٹے کی مہلت تھی۔

میری بات سن کے سکندر پریشان ہو گیا۔ ”ایسا کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ کوئی نہیں شاہ جی.... میں اچانک اٹھ کے آ گیا تھا۔“

”پھر؟ اسے جو بتانا ہے فون پر بتا دو..... ویسے تو میں نے کہہ دیا تھا کہ ابھی سلیم یہاں رہے گا کچھ دن۔“

”ایک تو مجھے ریشم سے بات کرنی تھی ....“

”فون پر کر لو۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔

”اگر بہت ضروری ہے۔“

”دیکھیے ابھی تک میں انہی کپڑوں میں ہوں۔ ایک سوٹ کیس ہے میرا وہاں وہ اٹھا لاؤں۔“

سکندر نے بیوی کو آواز دی۔ اس نے دروازے سے جھانکا۔ ”کیوں چلا رہے ہو؟“

”اسے کپڑے دو بدلنے کے لیے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”وہ سوٹ کیس ضروری ہے تو منگوا لیتے ہیں۔ ورنہ مراد کے کپڑے فٹ آئیں گے تمہیں.... الماری بھری پڑی ہے۔“

مجھے کچھ غصہ آنے لگا تھا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے میں جا نہیں سکتا۔ اجازت نہیں اس کی۔“

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ”ہاں، جب تک مراد نہ آ جائے، مجھے تمہاری ضرورت رہے گی۔ کوئی تو ہونا چاہیے نا میرے پاس.... پابندی کوئی نہیں۔ تم جہاں چاہو چلے جانا۔“

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں نہیں جاتا۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ سکندر کی بیوی نے کہا اور میں اس کے پیچھے جانے پر مجبور ہو گیا۔

”یہاں دیکھ لو۔ میرا ابھی خیال ہے کہ تم میں اور مراد میں کوئی فرق نہیں۔“ اس نے مراد کے بیڈ روم کے ساتھ وسیع ڈریسنگ روم کی ایک الماری کھولی۔ غسل خانہ اس کے ساتھ تھا۔

”فرق تو ہے۔ وہ بیٹا ہے آپ کا۔“ میں نے کہا۔

وہ رک گئی اور مجھے دیکھنے لگی۔ اذیت کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ ”میرا مطلب تھا کہ کپڑوں کا سائز ایک ہی ہوگا۔“ وہ بولی اور نکل گئی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ایسی بات کہی۔

ایک شرٹ پینٹ منتخب کر کے میں واش روم میں گھس گیا جو شاہانہ لگژری کا نمونہ تھا۔ نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد میں نے ریشم سے فون پر بات کرنی چاہی تو فون لاؤنج میں ملا۔ وہاں مراد کے ماں باپ سی این این سے خبریں دیکھ رہے تھے مگر ٹی وی کی آواز بند تھی۔ میں ان سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اٹھ جائیں یا مجھے بتا دیں کہ دوسرا فون کہاں ہے۔ میں نے نمبر ملایا تو ریسیور استاد نے اٹھایا۔

”اے یہ کیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اٹھ کے چلا گیا اور پھر کوئی خبر نہیں؟“ استاد بگڑنے لگا۔

”وہ..... دراصل کام کی وجہ سے رکنا پڑا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن فون پر بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں نے فون کیا تھا تو سکندر شاہ نے کہا کہ ابھی وہ نہیں آ سکتا۔ فون کر کے پریشان کرنے کی ضرورت نہیں، کتنی غلط بات کی اس نے۔“

میں نے کہا۔ "ہاں، بس ابھی کام ہے کچھ..... تم فکر مت کرو، بہت آرام سے ہوں میں۔ ریشم کہاں ہے؟"

مجھے احساس تھا کہ میری طرف نہ دیکھنے کے باوجود سکندر شاہ کے کان میری طرف لگے ہوئے ہیں۔ ریشم سے پہلے استاد کی بیوی آگئی۔ "بڑے خودغرض اور بے وفا ہو دیور جی..... بھاگ گئے باہر باہر سے..... مجھے بعد میں پتا چلا۔"

"وہ..... دراصل بھابی..... خود مجھے اندازہ نہ تھا۔ کام کچھ ایسا ہے کہ میں فون بھی نہ کرسکا۔"

"اچھا یہ لو ریشم آگئی، اس سے بات کرو۔"

دوسرے لمحے ریشم ناراض ہونے لگی۔ "یہ کیا ہے بھائی؟"

"ارے بھئی ایک کام ہے یہاں کل پرسوں تک آجاؤں گا، وہ آیا تھا۔"

"وہ کون؟"

"آپ کے وہ..... مجنوں کے چچا انور صاحب اور کون؟"

"آئے تھے۔" میں نے اس کی شرمیلی ہنسی سنی۔ "آپ کو پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتایا تو موڈ خراب ہو گیا۔ کہنے لگے کہ ایک چکر سے نکلتا نہیں دوسرے میں پڑ جاتا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "بس ایک دو دن اور۔ میں نے سوچا بتادوں..... سب کو فکر ہوگی۔"

اس رسمی گفتگو کا مقصد ہی خیریت کی اطلاع دینا تھا۔ سکندر شاہ کی موجودگی میں یہی رسمی گفتگو ہوسکتی تھی۔ باقی معاملات اعتماد کے تھے اور رازداری کا تقاضا کرتے تھے۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نمودار ہوا۔ دیکھنے میں وہ کہیں سے بھی ڈاکٹر نظر نہیں آتا تھا، ایک چھ فٹ کا دیوپیکر آدمی جو کا میڈین بھی ہو۔ بات بات پر گلا پھاڑ کے ہنستا ہو، ڈاکٹر کے روایتی تصور سے بالکل مختلف تھا۔ جب وہ ایک صوفے میں فٹ ہو گیا تو مسئلہ پوچھنے کے بجائے جس کے لیے اسے طلب کیا گیا تھا اس نے کہا۔ "گھر میں جو بھی ہے کھانے کے لیے وہ لے آؤ ورنہ مہمان کو فاقے سے مارنے کا الزام تمہاری گردن پر۔"

ایسے شخص سے روزینہ کے نفسیاتی مسئلے کی سنگینی پر بات کرنا ہی مشکل تھا۔ سکندر شاہ نے اسے اپنے طریقے سے بتایا۔ وہ بظاہر کھانے میں مگن رہا لیکن اس کے کان سکندر شاہ کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ اس نے بھی مختصر بات کی۔

ڈاکٹر نے سب کچھ صاف کر کے ڈکار لی اور بولا۔ "سب ٹھیک ہوجائے گا شاہ جی..... ان بچوں کے معاملات پر زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا تو خیر ایک ہے..... ہم تو ہر سال دنیا کی آبادی بڑھاتے رہے۔ اب وہ سب ایک ساتھ پڑ جائیں گے کسی نہ کسی کے چکر میں۔"

"ڈاکٹر صاحب! یہ معاملہ مختلف ہے۔"

وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "ہر معاملہ مختلف ہوتا ہے شاہ جی۔ خود ہم نے جوانی میں ماں باپ کی ایسی تیسی کردی تھی۔ اب ہماری باری ہے۔ دنیا تو ایسے ہی چلتی ہے۔"

سکندر شاہ نے میرا تعارف کرایا تو اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "تم بھی ہو کسی کے چکر میں یا سب کو اپنے چکر میں ڈال رکھا ہے؟"

جواب سکندر شاہ نے دیا۔ "یہ تو ایسا مجنوں ہے کہ اس کے سامنے مجنوں کان پکڑے..... لیلیٰ تھی تو سہی لیکن یہ ایک روح کے پیچھے خوار ہو رہا ہے جس کے وجود کا کوئی اتا پتا نہیں۔"

مجھے کچھ بولنے کا موقع ہی نہ ملا۔ "یعنی یہ بھی نفسیاتی کیس ہے۔ شاہ جی تم اپنے غریب خانے کا نام رکھ دو، پاگل خانہ۔" اور پھر گلا پھاڑ کے ہنسا۔ وہ سکندر شاہ سے اتنا بے تکلف اس لیے تھا کہ اس کے بچپن کا دوست تھا اور کچھ بھی بول سکتا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں مراد کی ماں نے بتائی۔ مجھے ایسا لگا کہ سکندر شاہ کی تشویش زدہ صورت اور اس کی بیوی کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کے اس نے فکرمندی کا اظہار یا ہمدردی کرنے سے بہتر سمجھا کہ ہنسی مذاق کرے جس سے ٹینشن کم ہو اور وہ کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا۔

رات بارہ بجے تک ہم ذہنی اور جسمانی اذیت سے تھک چکے تھے۔ سب کے کان کسی گاڑی کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ سیکیورٹی گارڈز کو الرٹ کردیا گیا تھا جو قطعی غیر ضروری تھا۔ تمام لائٹس آن تھیں۔ سارے ماحول پر انتظار کی کیفیت کا غلبہ محسوس ہوتا تھا۔ نظر بار بار گھڑی کی طرف جاتی تھی جس کی سوئیاں مسلسل گردش میں تھیں۔ پھر بھی وقت جیسے تھم گیا تھا۔

ساڑھے بارہ بجے تک سکندر شاہ کی پریشانی اس کے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی۔ "آخر اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اب تک آجانا چاہیے تھا اسے۔ میں نے معلوم کیا تو موسم بھی ٹھیک ہے۔ جہلم تک کچھ اثر تھا۔ آگے آسمان بالکل صاف ہے۔"

اس کی بیوی نے کہا۔ ''فون کر کے معلوم کرو۔''

وہ دہاڑنے لگا۔ ''کہاں فون کروں؟ گاڑی میں؟ پتا ہوتا کس کمپنی سے گاڑی لی ہے تو پوچھتا۔۔۔۔ ان کا ڈرائیور کے ساتھ وائرلیس پر رابطہ ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر نے جیب میں سے گولیوں کا ایک پتا نکالا۔ ''یہ آپ سب ایک ایک کھالیں پلیز! ورنہ مجھے کھانی پڑیں گی یہ سب۔ دیر سویر ہو جاتی ہے اور پھر آپ کو کیا پتا، وہ چلا بھی ہے پنڈی سے یا نہیں؟ کیا پتا سو رہا ہو کسی ہوٹل میں۔''

''الو کا پٹھا، اس سے کچھ بعید نہیں۔ ایسی ہی ہوتی ہے آج کل اولاد۔۔۔۔ ماں باپ فکر سے مرتے ہیں تو مرجائیں، ایک فون نہیں کیا سوّر کے بچے نے۔''

میں نے کہا۔ ''شاہ جی! آپ جانتے ہیں کہ وہ بھی پریشان تو ہے۔۔۔ نہیں خیال رہا۔''

''یعنی خود پریشان ہو تو ماں باپ کو زیادہ پریشان کرو۔'' اس نے بیٹے کو مزید گالیاں دیں۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ یہ ضرور اس گولی کا اثر ہوگا کہ مجھے بھی غنودگی نے آلیا۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ جاگنا فضول ہے۔ جا کے سو جاؤ شاہ جی۔۔۔۔ وہ آئے گا تو پتا چل جائے گا۔''

جب میری آنکھ کھلی تو صبح کی سنہری دھوپ کھڑکی کے شیشوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی مجھے کھڑکی کے نیچے وہیں نماز پڑھتی نظر آئی جہاں میں نے اسے گزشتہ روز دیکھا تھا۔ ظاہر ہے رات کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ اپنے وظیفے میں مصروف تھی۔ میں نے اس کے پاس جانے سے گریز کیا ورنہ وہ ممتا کی ماری پریشانی کا اظہار مجھ سے کرتی۔ سکندر کی آواز سن کے میں باہر نکلا۔ وہ رات کے مقابلے میں پُرسکون تھا۔

''وہ چلا ہی نہیں۔ ہم خواہ مخواہ ٹینشن میں رہے رات بھر۔'' اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''ڈاکٹر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چلا گیا تھا ڈیڑھ بجے کہ میرا کوئی کام نہیں ابھی۔۔۔۔ مراد ضرور آج والی فلائٹ پکڑے گا۔''

''ہاں، معلوم ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اسے سیٹ ملی یا نہیں۔''

نو بجے اسلام آباد سے بتایا گیا کہ سہ پہر کی فلائٹ بک ہے۔ اس میں مسٹر اور مسز مراد نام کا کوئی پسنجر نہیں۔ ایک بار پھر سکندر شاہ کی تشویش بڑھ گئی۔ ایک گھنٹے تک وہ نہ جانے کس کس ہوٹل میں فون گھماتا رہا لیکن اسے کہیں سے بھی مسٹر اور مسز مراد شاہ کے رات گزارنے کی تصدیق حاصل نہ ہوئی۔ اب اس کی جھنجلاہٹ غصے میں نہیں گھبراہٹ میں بدل رہی تھی اور وہ بار بار خود سے سوال کرتا تھا۔ ''آخر گیا کہاں سوّر کا بچہ؟''

تشویش کی عام حالات میں کوئی بات نہ ہوتی۔ نوجوان جوڑا شادی کے بعد نکلا ہے تو ہنی مون کو جتنا لمبا کرنا چاہے کرے اور کسی پروگرام کے بغیر جدھر دل کہے جائے لیکن ہنی مون تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب روزینہ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ اس کے سارے خاندان کا وجود مٹ گیا ہے۔ اب اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ گھر جو صرف اس کے خیال اور تصور میں رہ گیا تھا۔ جہاں اس نے پیدائش سے جوان ہونے تک زندگی گزاری تھی اور جسے وہ خود چھوڑ آئی تھی، اپنی محبت اور اپنے مستقبل کی خوشی کے لیے۔ واپسی اب کتنا پُراذیت سفر تھا، پچھتاووں سے بھرا ہوا۔ احساسِ جرم و گناہ کے آزار سے بھرا ہوا۔ معافی کے طلبگار آنسوؤں سے بھرا ہوا۔ جوابُ لاحاصل اور بے مصرف ہو چکے تھے۔

ان حالات میں یہ ناممکن تھا کہ وہ امریکا سے آ کے اسلام آباد میں اتریں تو مری جانے کا موڈ بن جائے۔ گرمی، سردی ملکۂ کوہسار کے حسن کی کشش کھینچ لیتی ہے اور اب تو رفتہ رفتہ نئے شادی شدہ جوڑے جو باہر جانا افورڈ نہیں کر سکتے مری کا رخ کرتے ہیں۔ یہ ہنی مون سے زندگی کی رفاقت کا آغاز کرنے والے سب سے الگ نظر آتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ساری دنیا کی نظر سے بے خبر۔۔۔۔ مہندی لگے ہاتھوں والی نوعمر لڑکیاں اور شادی کے سوٹ اور ٹائی والے لڑکے جو پہلی بار بابو بنتے ہیں اور نئی نویلی بیوی کے ساتھ ایسے اکڑ کے چلتے ہیں جیسے مجازی خدا بن کے ان کا قد بلند ہو گیا ہے اور یہ واقعہ دنیا میں پہلی بار پیش آیا ہے۔

سکندر کی آواز پر میں چونکا۔ ''یار کس خیال میں گم ہو۔۔۔۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟'' وہ چلا کے بولا۔

میں نے خود کو پُرسکون رکھا۔ ''جو آپ کر رہے ہیں۔''

فون کی گھنٹی نے مجھے خاموش کر دیا۔ سکندر شاہ نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔ ''ہیلو، جی۔۔۔ ہاں میں سکندر شاہ بول رہا ہوں۔ کہاں سے۔۔۔۔ اسلام آباد۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔ شفا انٹرنیشنل۔۔۔۔ یہ وہی اسپتال ہے۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہاں مراد بیٹا ہے۔۔۔۔ میرا۔'' پھر وہ ایک دم چلایا اور کھڑا ہو گیا۔ ''کیا؟ کب؟ کیسے؟ ہاں ہاں بولو۔۔۔۔ سن رہا ہوں۔''

اس کی آواز ہی نہیں اس کا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ خود بھی کانپ رہا تھا اور اس کے ماتھے پر پسینا تھا۔ اس نے پھٹی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”ایکسیڈنٹ .... مراد کا۔“ وہ پھر فون پر بات کرنے لگا۔ ”تم کون ہو.... اچھا ڈاکٹر الیاس .... روزی کیسی ہے .... روزینہ نام ہے اس کا .... ہاں .... ٹھیک ہے .... خطرے کی کوئی بات نہیں .... اچھا میں آرہا ہوں۔ ابھی آرہا ہوں۔“

میں نے پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھا جو وہ ایک سانس میں پی گیا۔ پھر وہ پھولی ہوئی سانس میں بولا۔ ”مراد اور روزینہ کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ اسلام آباد سے آتے ہوئے .... وہ اسپتال میں ہیں۔“

”ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ میں نے کہا اور دیکھا کہ اس کی بیوی دروازے کے فریم میں کسی تصویر کی طرح ساکت کھڑی ہے۔ ضرورت تھی مگر ڈاکٹر کو بلانے کا وقت نہیں تھا۔ دس منٹ بعد ہم گاڑی میں اسلام آباد کی طرف رواں تھے۔ سکندر شاہ پیچھے اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ خود بھی کم نروس نہیں تھا مگر بیوی کو مسلسل تسلی دے رہا تھا۔ ”روتی کیوں ہو، چھوٹے موٹے حادثات ہو جاتے ہیں اور یہ بڑی گاڑیاں خاصی محفوظ بنائی جاتی ہیں .... آگے ڈرائیور ہوگا، پیچھے وہ دونوں .... سامنے سے ٹکر ہو تب بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ گاڑیاں الٹتی نہیں ہیں۔ زخمی ہوں گے معمولی سے یہ شفا انٹرنیشنل ایسا اسپتال ہے جیسے لندن، امریکا میں ہوتے ہیں، انشاء اللہ ہم انہیں ساتھ ہی لے آئیں گے۔“

میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا سب سن رہا تھا۔ یہ تسلی کے الفاظ وہ مراد کی ماں سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اپنے دل کو قائل کر رہا تھا کہ جیسا وہ کہہ رہا ہے ایسا ہی ہے۔ میں بھی ناامید نہیں تھا۔ واقعی بڑی گاڑیاں زیادہ محفوظ ہوتی ہیں اور ہیڈ لانگ تصادم میں بھی سیٹ بیلٹ بچا لیتی ہے۔ آگے ڈرائیور ہوگا۔ پیچھے وہ زخمی ضرور ہوئے ہوں گے مگر معمولی۔ ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ حادثہ کہاں پیش آیا اور کیسے ہوا‘ سڑک بہت اچھی ہے اور کار بھی نئی ہوگی۔ اس کے ٹائر بھی نئے ہوں گے ....

پرانے اور گھسے ہوئے ٹائر ہوں اور ہائی اسپیڈ پر اگلا ٹائر پھٹ جائے تو گاڑی الٹ جاتی ہے۔ مجھے اصل خوف گاڑی کے کسی کھڈ میں گرنے کا تھا۔ ٹرین سے جاتے ہوئے گاڑی سرنگوں میں سے گزرتی ہے۔ سڑک پہاڑوں کے گرد گھوم کے آتی ہے اور جہلم سے پہلے کئی خطرناک موڑ ہیں ....

لمحہ فکر

☆ گناہ اسی وقت دلچسپ نظر آتا ہے جب تک سرزد نہ ہو جائے۔

☆ جو شخص ہر چیز کو بے یقینی سے دیکھتا ہے۔ موقع ملنے پر ہیرے کو پتھر سمجھ کر پھینک دیتا ہے۔

کھائیاں ہیں، پتھریلی زمین ہے جس میں خشک جھاڑیاں اگتی ہیں اور بارش کے کٹاؤ سے بن جانے والے غار اور ٹیلے۔

میں مراد کے ماں باپ کو مسلسل حوصلہ دیتا رہا اور لاہور سے گزر کے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ کچھ کھا لیں مگر انہوں نے صرف چائے پی۔ انہیں جلد از جلد بیٹے کے پاس پہنچنا زیادہ ضروری لگتا تھا اور بس میں ہوتا تو وہ اڑ کر پہنچ جاتے۔ سکندر شاہ نے ڈرائیور کو ڈانٹا کہ اس رفتار سے تو رات ہو جائے گی لیکن میں نے اسے تسلی دی کہ ہم شام چھ بجے تک اسلام آباد میں ہوں گے اور ڈرائیور کو تیز رفتاری سے روکے رکھا۔ وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ احتیاط ضروری تھی تاکہ ایک مسئلہ حل کرنے کے چکر میں دوسرا مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ مراد کی ماں ویسے تو اپنے خیالوں میں گم تھی مگر بار بار کسی خیال سے پریشان ہو کے رونے لگتی تھی اور وہی سوال دہراتی تھی۔ ”تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا .... انہوں نے یہی کہا تھا .... اسپتال والوں نے کہ زخم معمولی ہیں؟“ پھر کوئی دعا دہرانے لگتی تھی۔

شام چھ بجے سے پہلے ہی گاڑی اسلام آباد کے سیکٹر آئی ایٹ میں واقع شفا انٹرنیشنل اسپتال کے گیٹ میں داخل ہوئی اور ”ایمرجنسی“ کے سامنے رکی تو ہم ایک ساتھ اترے۔ پھر ڈرائیور گاڑی کو پارکنگ ایریا میں لے گیا۔ مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ وہاں کیا قیامت نازل ہونے والی ہے۔ آدمی بدترین حالات میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ میں نے ان کو پیچھے رکھا اور معلومات حاصل کرنے کے سارے مراحل طے کیے۔ ہر اسپتال کا عملہ دن رات بیماری، حادثات اور موت سے نمٹتا ہے اور بے حس ہو جاتا ہے۔ یہ بے حسی ہونا ایک ضرورت بھی ہے ورنہ ایک کے بعد دوسرے کیس کو سنبھالنا دشوار ہو جائے۔ مریض آپریشن ٹیبل پر مر جائے تو ڈاکٹر کامل لاتعلقی اور یکسوئی کے ساتھ دوسرا کیس لے لیتے ہیں۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ مراد مر چکا ہے اور اس کی ڈیڈ باڈی کولڈ اسٹوریج میں رکھی ہے۔ قانونی وارث کے مسئلے میں اس کی بیوی روزینہ مراد کو معمولی خراشیں آئی ہیں لیکن وہ

شاک میں تھی اس لیے سکون آور دواؤں کے زیر اثر اسے سلا دیا گیا ہے۔ ہم چاہیں تو اسے دیکھ سکتے ہیں۔ حادثے کے بعد مراد کی فوری موت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور اسپتال میں داخلے کے مراحل اس نے ہی پورے کیے تھے۔ اس نے ادائیگی کی۔ اپنا نام پتا اور فون نمبر بتایا لیکن کہا کہ اس کے گھر ابھی اطلاع نہ دی جائے۔ اطلاع اس کی موت کے بعد دی گئی تھی۔ ابھی تک روزینہ کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ بیوہ ہو چکی ہے۔

مجھے اندازہ تھا کہ یہ عام ٹریجڈی نہیں اور میں نے صورتِ حال کو نہ سنبھالا تو اس کے نتائج کس حد تک تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ ہر ماں کے لیے جوان اولاد کی موت کا صدمہ زندگی کے سارے صدمات پر بھاری ہوتا ہے لیکن یہاں صورت یہ تھی کہ مراد کتنی اولادوں کے چھن جانے کے بعد بالآخر ان کی دعاؤں کے قبول ہو جانے سے زندگی کا سہارا بننے والا ایک ہی بچہ تھا۔ اس سے انہوں نے ساری امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں اور عین اس وقت جب وہ اپنے خوف کو بھول کر مستقبل کی ساری خوشیاں اس سے وابستہ کر چکے تھے۔ نہ جانے کس گناہ کے پاداش میں ان سے چھین لیا گیا تھا۔ آگے ان کے پاس امید کا آسرا بھی نہ تھا اور بڑھاپے میں تنہا رہ جانے کا عذاب افق سے اٹھتی گھٹا کی طرح ان کی زندگی پر اپنے تاریک سائے پھیلانے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

وہ دن میرے لیے انتہائی صبر آزما تھے۔ مراد کی ڈیڈ باڈی وصول کرنے سے پہلے ماں، باپ تک یہ روح فرسا خبر پہنچانا بھی مجھے ہی کرنا پڑا۔ روزینہ کو یہ خبر دینے کا ناخوش گوار ترین فریضہ بھی مجھے نبھانا پڑا کہ اس کا ہونے والا بچہ پیدائشی یتیم ہوگا۔ میں نے اپنی مدد کے لیے استاد اور اس کی بیوی کلثوم کے ساتھ انور کو بھی طلب کر لیا تھا۔ ان کے پہنچنے تک میں نے تمام ضابطے کی کارروائیاں پوری کرنے کے علاوہ ایک ایمبولینس کا انتظام کر لیا تھا۔ پھر ڈاکٹروں کے مشورے سے روزینہ کو دوسری ایمبولینس میں لے جانے کا بندوبست کیا۔ اسے مسلسل غنودگی میں رکھا گیا ورنہ ہوش میں آتے ہی وہ چیخ پکار، بال نوچنا، کپڑے پھاڑنا اور دشمنوں کو کوسنا شروع کر دیتی تھی۔ ایسی ہی کیفیت مراد کی ماں کی تھی جو بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اس نے حال کی حقیقت سے رشتہ توڑ لیا تھا اور اس وقت کے خیالوں میں گم ہو گئی تھی جو مراد کی زندگی کا حصہ تھا۔ کبھی وہ اچانک شوہر سے پوچھتی تھی۔ ”یہ مراد کیوں نہیں آیا ابھی تک اسکول سے....“ کبھی خواب کی طرح اس کا تصور مراد کی جوانی دیکھنے لگتا تھا۔ وہ سکندر شاہ سے کہتی تھی کہ ”مراد پاگل ہو رہا ہے روزینہ کے لیے.... اسے سمجھاتے کیوں نہیں کہ اس سے کتنے مسئلے پیدا ہوں گے۔“

سکندر بھی کم غم زدہ نہ تھا لیکن اس نے بیوی اور بہو کے لیے خود کو سنبھالے رکھا۔ ایمبولینس میں روزینہ کے ساتھ کلثوم بھی رہی۔ دوسری ایمبولینس میں مراد کی لاش کے ساتھ انور اور استاد تھے۔ میں کار میں سکندر شاہ کے ساتھ گیا، اس کی بیوی کو بھی پُرسکون رہنے کے لیے انجکشن دیا گیا تھا۔ یہ دس گھنٹے کا سفر انتہائی حوصلہ شکن تھا۔ سکندر شاہ خود بیوی کو سنبھال رہا تھا لیکن اس کا ذہنی انتشار میری کسی بات پر بلاوجہ بھڑک اٹھتا تھا۔ مثلاً ایک بار پھر لاہور سے گزرتے ہوئے میں نے کہہ دیا کہ شاہ جی چائے لاؤں؟ تو اس نے مجھے گالیاں دیں۔ چائے نہیں چکن بروسٹ لا۔ بھوک لگ رہی ہوگی نا مجھے.... قورمہ، بریانی لے آ.... کل سوم تک انتظار نہیں ہوتا تجھ سے۔ وہ پاگل ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی سنبھل جاتا تھا تو رونے لگتا تھا۔ چپکے چپکے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہنے لگتے تھے۔ بیوی اس کے کندھے پر سر رکھے بے سدھ پڑی تھی۔ وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا تھا۔ وہ بڑبڑاتی تھی۔ سکندرا تم نے سوچا ہے کچھ نام پوتے کا.... میں نے سوچا ہے.... اگر پوتی ہوئی تو تم اپنی مرضی سے رکھنا تم نے فاطمہ کہا تھا نا.... بڑا مبارک نام ہے۔“

شام تک وہ سب ہو گیا جو ناگزیر تھا۔ مراد ایک مٹی کا ڈھیر بن گیا۔ مراد کی بیوی نے اور ماں نے اس سنگین حقیقت کو قبول بھی کر لیا اور ان پر وحشت کے دورے کم ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کے آنسو بھی ختم ہو گئے۔ یہ صبر کا پہلا مرحلہ تھا۔ ایک اعتراف کہ اب انہیں ایسے ہی مراد کے بغیر زندہ رہنا ہوگا۔ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ مرنے والے کے ساتھ مرتا کوئی نہیں۔ صرف ایسا لگتا ہے کہ وہ جی نہیں سکتا مگر ایک دن گزرتا ہے.... پھر دوسرا دن.... بہت آہستہ آہستہ.... بالکل نامعلوم طریقے پر حقیقت خود کو تسلیم کرانے لگتی ہے۔ یہی سب مراد کے گھر میں بھی ہوا۔ تدفین ہوئی پھر سوم، تعزیت کا سلسلہ بالآخر ختم ہوا۔ سکندر کا بیٹے کی قبر پر جا کے بیٹھنا اور آنسو بہاتے رہنا بھی ختم ہو گیا۔ گھڑی کی سوئیاں صبح، دوپہر، شام، رات کا اعلان کرتی آگے بڑھیں۔ آنے والے چلے گئے۔ استاد اور انور بھی چلے گئے۔ صرف کلثوم کو میں نے روک کے رکھا۔

میری اپنی حالت انہیں سنبھالتے سنبھالتے غیر ہو گئی

تھی۔ کلثوم نے گھر کے معمولات کو جلد از جلد واپس لانے کی کوشش میں میری مدد کی۔ میری مدد کرنے والا وہ ڈاکٹر بھی تھا جو صبح، دوپہر، شام سکندر کو، اس کی بیوی کو اور بہو کو دیکھنے آتا تھا۔ اب انجکشن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ سکون آور گولیاں ضروری تھیں مگر ان کو کھلانے کے سو جتن کرنے پڑتے تھے۔ روزینہ وقتی طور پر اس ٹریجڈی کو بھول گئی تھی جس کی وجہ سے وہ واپس آئی تھی۔ مراد سے مل کے بچھڑ جانے کا صدمہ تازہ تھا۔ یہ زخم اتنا گہرا تھا کہ پہلے کے ہر زخم کی ٹیس پر یہ درد غالب آ گیا تھا۔

خواتین کو روتے رہنے سے یہ سہولت تھی کہ غم کا غبار دل میں جمع نہیں ہوتا تھا۔ آنسو بن کے خارج ہوتا رہتا تھا۔ سکندر نے صدمے کو مردانہ وار جھیلنے کی پوری کوشش کی تھی اور کسی حد تک اس ذمے داری کو قبول کیا تھا کہ اسے ہی بیوی کو اور مراد کی بیوہ کو سنبھالنا ہوگا۔ حالانکہ وہ خود ڈھے گیا تھا۔ اچانک بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک بات میں نے سنی تھی کہ صدمے کی شدت نے راتوں رات بال سفید کر دیے۔ یہ میں نے دیکھا۔ چند دن میں سکندر کے سر کے تمام بال سفید ہو گئے۔ اس نے شیو نہیں بنائی تھی۔ رفتہ رفتہ چہرے پر سفیدی پھیل گئی۔ بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ اب وہ داڑھی رکھ لے گا۔

جیسے ڈاکٹر کسی حادثے یا فالج کے نتیجے میں معذور ہو جانے والے کو رفتہ رفتہ بیساکھیوں پر کھڑا کرنے اور چلانے کی کوشش کے بعد یہ سہارے بھی باقی نہیں رکھتے تاکہ مریض خود اپنے پیروں کی طاقت پر چل سکے۔ ایسے یہ سکون آور دوا کم کی گئی۔ کلثوم بھی واپس چلی گئی۔ گھر میں بالآخر وہی رہ گئے جو اس کے مکین تھے۔ ان میں صرف مراد نہیں تھا اور باقی لوگوں کو اس کے بغیر جینے کی عادت ڈالنا تھی۔ میں ان کے ساتھ خود کو اس قابل رکھنے کی پوری کوشش کرتا رہا کہ گھر والوں کا خیال رکھ سکوں۔ ایک ہفتے بعد حالات میں بہتری آئی۔ دوسرے ہفتے میں معمولات بحال ہونے لگے۔ یہ حادثہ سکندر شاہ کے لیے قلبِ ماہیت کا سبب بنا۔ وہ پانچوں وقت نماز پڑھنے لگا۔ بات بات پر کہنے لگا۔ ”رحم کر مجھ پر میرے مولا۔“ لیکن اس کی بیوی تو چلتی پھرتی لاش بن گئی۔

سکندر شاہ کا سارا کاروبار ٹھپ ہو کے رہ گیا تھا۔ اس نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی کاروبار کے سلسلے میں آنے والے ملاقاتی کو دور رکھا جائے۔ اب یہ میری ذمے داری بن گئی کہ ہر آنے والے سے مقصدِ ملاقات پوچھوں۔ اِکا دُکا تعزیت کرنے والے اب بھی آ جاتے تھے۔ میں ان کو ہدایات دیتا تھا کہ کم سے کم وقت لیں۔ میری مدد کلثوم اور انور نے کی۔ ریشم کو میں نے خود روز آنے سے روک دیا تھا۔ پہلے ہفتے میں وہ روزینہ کے ساتھ ہی رہی تھی۔ گھر میں ہر وقت ایک نحوست زدہ خاموشی ڈیرا ڈالے رہتی تھی۔ سکندر شاہ کو رفتہ رفتہ اس کے احساسِ جرم نے گھیر لیا تھا۔ ”یہ سب میرے اعمال کی سزا ہے۔“ وہ بات بات پر کہتا تھا۔

ایک محاورہ ہے دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار.... صدمے کی شدت سے پاگل ہو جانے والا بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ انسانوں یا شیشے کے دریچوں پر پتھر نہیں مارتا پھرتا۔ ایسی ہی کیفیت میں روزینہ تھی جس کو یہاں روبی کہا جاتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ روزی کہا جاتا تو بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ شاید مراد اسے روبی کہتا ہوگا۔ اس کے آنے کا سبب ایک حادثہ تھا لیکن پھر دوسرا شدید تر حادثہ پیش آیا تو وہ پہلے والے حادثے کو بھول گئی لیکن صرف وقتی طور پر.... وہ سین جس کی تیاری ہم سب نے کی تھی اور جس میں میرا رول مرکزی ہوتا، پیش ہی نہیں ہوا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بہن نہیں رہے تھے اور اس کے یقین کے مطابق یہ اس کے سسر کی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ وہ مراد کے ساتھ آتی تو ہنگامہ ہوتا۔ میں وکیل صفائی کی حیثیت سے حلفیہ جھوٹ بولتا کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ مطمئن ہوتی نہ ہوتی یہ الگ بات ہے مگر اپنے محبوب اور شریک زندگی سے بچھڑنے کا غم سب پر غالب آ گیا۔ جس کے لیے میں تیار تھا وہ تماشا نہ ہوا۔

لیکن ایسا نہیں کہ وہ بات پرانی سمجھ کے بھلا چکی تھی۔ یہ ناممکن تھا۔ اس کے ذہن نے مراد کی جدائی کو زندگی کی ایک تلخ حقیقت سمجھ کے قبول کر لیا کہ خدا کو یہی منظور تھا تو اس کو پھر پرانے غم نے خلش سے دوچار کیا۔ یہ پندرہ سولہ دن بعد کی بات ہے۔ میں ریشم کے ساتھ اس کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ مراد کی باتیں کر رہی تھی اور ہم اس کا دل بہلانے میں مصروف تھے۔ جب اچانک اس نے مجھ سے سوال کر لیا۔ ”ملک سلیم اختر! ایک بات پوچھوں؟“

اس طرزِ تخاطب پر میں چونکا۔ ”ایسی کیا بات ہے کہ اجازت مانگ رہی ہو؟“

”سچ بتاؤ گے؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

ایک دم میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا کہ سوال کیا ہوگا۔ ”تم پوچھو، لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں تم کیا سمجھتی ہو؟ میں جھوٹ بولتا ہوں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ ریشم اٹھی اور خاموشی سے

باہر نکل گئی۔

''پھر یہ سوال کیوں کیا تم نے مجھ سے؟'' میں نے کہا۔

''باجی تمہیں بہت پسند کرتی تھی۔ پاگل تھی تمہارے لیے۔ تمہاری ہر بات مجھے بتاتی تھی۔ ہر وقت تمہاری بات کرتی رہتی تھی۔ میں تو عاجز آجاتی تھی۔ اب تم اس سے شادی کرنے والے تھے۔''

''ہاں، مگر سوال کیا ہے؟ جو تم پوچھنا چاہتی تھیں؟''

''تم کو کتنا صدمہ ہے اس کی موت کا؟''

''جتنا تمہیں مراد کی موت کا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''نظر تو نہیں آتا۔''

''میں صدمے کا اظہار کسی کو دکھانے کے لیے نہیں کرتا اور میں تم سے پوچھوں کہ تمہارا صدمہ حقیقی ہے یا صرف دکھاوا تو کیا تمہیں برا نہیں لگے گا؟'' میں نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''اسے کس نے مارا تھا؟'' روزینہ نے سوال داغ دیا۔

''اس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ مانجھا والا کا گروہ تھا۔''

''بعد میں کب؟''

''کچھ دیر بعد جب وہ سارے ڈاکو فرار ہو رہے تھے۔ کارروائی کے بعد.... اس کی ہسٹری بعد میں معلوم ہوئی۔'' میں نے کہا۔

''میں نے تو کبھی یہ نام نہیں سنا۔''

''میں نے کب سنا تھا۔ وہ کوئی مشہور ڈاکو تھا۔ اس کے سر پر دس لاکھ کا انعام تھا۔ یہاں سے بھاگ کے سندھ چلا گیا تھا اور کسی وڈیرے کی سرپرستی میں وارداتیں کرتا تھا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''تم تو چودھریوں کی حویلی میں تھے۔ ان کا بہت اعتماد حاصل تھا تمہیں، پھر تم میرے ابا کے گھر پہنچے؟''

''کیسے پہنچے؟ یہ بھی پوچھو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''وہ معلوم ہے مجھے، اپنی مرضی کے خلاف۔''

''صاف کہو نا.... مجھے اغوا کر کے قیدی کی حیثیت سے لے جایا گیا تھا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''چلو یونہی سہی، لیکن میرے ساتھ تم بھی نکل گئے تھے۔ ریشم بھی نکل گئی تھی۔''

''میں پھر پکڑا گیا تھا۔ صرف میں۔'' میں نے کہا۔ ''اور واپس اسی قید خانے میں بھیجا گیا تھا۔ یہ نہیں بتایا تمہیں کسی نے؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''باجی نے سب بتا دیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ اب اس نے تمہاری محبت جیت لی ہے بالآخر، تم نے اسے دل سے قبول کر لیا ہے، یہ سچ ہے؟''

''ہاں، مگر اب ان باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل؟''

''ابا نے تمہیں اپنی فرزندی میں لے لیا تھا اور جانشین بھی بنا دیا تھا؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سوالات کیوں کر رہی ہو مجھ سے؟''

وہ برہم ہو گئی۔ ''سب سمجھتے ہو تم کہ میرے سوالوں کا مقصد کیا ہے۔ یہی سب سوالات کرنے آئی تھی میں مگر مجھے ایک حادثے نے بیوگی کا تاج پہنا دیا تو مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ لیکن وہ سوالات اپنی جگہ تھے۔ میں بھولی نہیں کہ کس طرح ایک رات میں میرے سارے خاندان کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ تم کہتے ہو کہ وہ مانجھا والا ڈاکو تھا۔''

''شاہینہ نے میرے بازوؤں میں دم توڑا۔ ایک لمحہ پہلے وہ میرے ساتھ تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ ہم نکل آئے۔ کیا میرے لیے یہ صدمہ معمولی تھا۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ اس وقت ریوالور ہوتا میرے پاس تو میں شاہینہ کے قاتل کے سینے میں ساری گولیاں اتار دیتا اور اسی پاگل پن کی کیفیت میں شاہینہ کو چھوڑ کے بھی بھاگا تھا کہ وہ میرے ہاتھ آئے تو اس کی گردن توڑ دوں۔ تم جانتی ہو کہ خالی ہاتھ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ جوڈو کراٹے آتا ہے مجھے۔ اس کے قاتل کا نام سن لیا تھا میں نے۔ وہ سب بھاگ رہے تھے جو اسے مانجھا والا کہہ رہے تھے۔ میرے نزدیک تو وہ سب ڈاکو تھے لیکن وہ جیپ اور دوسری گاڑیوں میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو؟'' روزینہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

''تم جو چاہو کہہ سکتی ہو۔ میں برا نہیں مانوں گا۔'' میں نے آزردگی سے کہا۔

''سچ کیا ہے۔ میں اخباروں میں دیکھ چکی ہوں۔ وہ مانجھا والا نہیں.... گامار ستم تھا۔'' وہ چلا کے بولی۔

''تمہاری مرضی اخبار پر اعتبار کرو یا مجھ پر.... لیکن کچھ دیر پہلے تم نے مانا تھا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

''اخبار جھوٹ کیوں لکھیں گے، تم ہی بتاؤ۔''

''اخبار وہ لکھتے ہیں جس کے لیے پیسا ملے۔ تم آج کی صحافت یا سیاست کو کیا جانو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''کس نے دیا ہوگا تمام اخباروں کو اتنا پیسا کہ وہ مانجھا والا کے بجائے گامارستم کا نام لکھیں؟''

''ابھی نہیں مگر جب فرصت ملے یہ سوال ضرور پوچھنا، اخبار والوں سے یا پولیس سے..... اور جو معلوم ہو وہ مجھے بھی بتانا۔''

''تم جانتے ہو گامارستم کو؟'' اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''تم جانتی ہو تو مجھے بتا دو۔''

وہ بولی۔ ''ہاں میں جانتی ہوں۔ سارا زمانہ جانتا ہے کہ اسے سکندر شاہ پالتا تھا۔ ٹھیکے دار سکندر شاہ۔ جو میرا ماما بھی ہے اور سسر بھی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میرا تو گھر ہے یہ۔''

''میں یہاں کام کر رہا ہوں۔ سکندر شاہ کے ایک پارٹنر کی حیثیت سے۔''

''پارٹنر؟'' وہ چلائی۔ ''کیا تم نہیں جانتے کہ وہ میرے بابا کا جانی دشمن تھا اور مراد کا بھی۔''

''میرا کسی کی دوستی دشمنی سے کیا تعلق۔ سکندر شاہ میرا دشمن نہیں ہے، دوست بھی نہیں ہے۔ اس نے مجھے بطور مشیر بلایا اور بس۔''

''جھوٹ، سب جھوٹ۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور مجھے چھوڑو، میں نہ تین میں نہ تیرہ میں..... تم یہاں کیوں ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ سکندر شاہ تمہارے باپ کا جانی دشمن تھا۔''

''میں، میں مراد کی وجہ سے ہوں۔'' وہ تلملائی کیونکہ یہ وار کاری تھا۔

''میں کام کی وجہ سے ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ایسا کیا کام آتا ہے تمہیں آخر..... کہ اس نے تمہیں پارٹنر بنا لیا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تم خود اپنے سسر سے پوچھنا اور میں کیا اس نے تو انور کو آفر دی ہے کیونکہ وہ ایک کوالیفائیڈ آرکیٹیکٹ ہے۔ میں انور کا دوست ہوں اور سکندر شاہ سمجھتا ہے کہ میں پبلک ڈیلنگ اچھی کر سکتا ہوں۔ یہ خیال انور کے مرحوم والد کا بھی تھا۔ انور کی ماں مجھے بیٹا سمجھتی ہے۔ اس پر تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ انور کی شادی ریشم سے ہو رہی ہے۔ کیا تم اس پر بھی اعتراض کرو گی؟''

اس کی ذہنی مخاصمت کے غبارے کی ہوا نکل چکی تھی۔ وہ رو رہی تھی مگر میں چاہتا تھا کہ بات چل نکلی ہے تو پھر انجام تک پہنچ جائے۔ حلف اٹھائے بغیر میں اسے قائل کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔ ''میرے خاندان کو ڈاکو گامارستم سے سکندر شاہ نے قتل کرایا۔'' وہ بچوں کی طرح ضد پر آ گئی۔

''تم چاہو تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کرو۔ خود قتل کر دو اپنے ماموں کو..... لیکن میں وہی کہوں گا جو دیکھا تھا، جو میں جانتا ہوں کہ سچ ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں نے مراد کی اور تمہاری مدد کی۔ ریشم کو تمہارے ساتھ جانے دیا۔ تم کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ آج تم میری بات نہ مانو۔ چھوڑو اس سب کو جو میں نے تمہارے لیے کیا۔''

میں اٹھا اور باہر نکل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ بازی میں نے جیت لی ہے اب روئے یہ رات بھر جاگتی رہے، روتی رہے لیکن صبح تک وہ میرے سچ کو کڑوی گولی کی طرح نگل لے گی۔ سکندر شاہ نے جو کام مجھے سونپا تھا میں نے کر دیا تھا کیونکہ اسی میں سب کی بھلائی تھی۔

صبح میں نے موقع پا کے ساری رپورٹ سکندر شاہ کے گوش گزار کر دی۔ ''میرا خیال ہے کہ میں اس کا ذہن بدلنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا ہوں۔''

وہ مجھے احسان مندی سے دیکھتا رہا۔ ''مجھے معلوم تھا، تم یہ کام کر سکتے ہو۔''

''اللہ مجھے اس جھوٹ پر معاف کرے۔''

''تم نے بڑی نیکی کمائی ہے سلیم، تم نے کیا نہیں کیا میرے لیے اور اس گھر کے لیے..... اور کون تھا۔''

''انور تھا، آپ کا بھانجا..... بھتیجا۔''

''وہ بھی تمہاری وجہ سے تھا۔ ورنہ پہلے تو کبھی مامے کو سلام کرنے نہیں آیا۔ پھوپا بھی ہوں میں اس کا۔''

''وہ اچھا آدمی ہے۔ کسی کی دشمنی نہیں پالتا۔ اس کے باپ نے بہن سے تعلق نہیں رکھا اس لیے وہ بھی نہیں آیا تھا۔''

''تم اسے لے آؤ گے میرا کام سنبھالنے کے لیے؟''

میں نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ریشم کہے گی تو مان جائے گا۔''

''مجھے اب دنیا کے کاموں میں دلچسپی نہیں۔ جب وارث کوئی نہیں۔''

''کیوں؟ آپ کا پوتا ہے اس کا وارث..... یا پوتی مالک ہو گی۔'' میں نے کہا۔

"تب تک، ان کے کاروبار کو خود سنبھالنے تک.... میں تو نہیں رہوں گا۔" وہ خلا میں دیکھنے لگا۔ "اور مراد کی ماں، وہ اس وقت بھی کہاں زندہ ہے۔"

"مایوسی کی باتیں نہ کریں شاہ جی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

اس رات میں اپنی بے بسی اور مجبوری پر غور کرتا رہا۔ یہ بڑا عجیب اتفاق تھا جو قدرت کی سازش لگتا تھا۔ جیسے کوئی نادیدہ قوت میرے ارادوں کی راہ میں حائل ہے۔ نئی سے نئی رکاوٹ بن رہی ہے۔ مجھے نورین کی تلاش میں نہیں جانے دیتی، اس میں ایک کے بعد ایک میرا راستہ روکنے والے آجاتے تھے۔ پہلے انور آیا، پھر اس کا باپ اور اس کی ماں۔۔۔ پھر شاہینہ آگئی نہیں سب سے پہلے ریشم آئی۔ پھر باقی لوگ یکے بعد دیگرے آتے گئے۔ یہاں تک کہ خود پیر سائیں۔ اس کے بعد گامارستم اور اس کی لاجواب بیوی کلثوم جو مجھے بڑے پیار سے اور بڑی اپنائیت سے دیور جی کہتی تھی۔ آخر میں سکندر شاہ آگیا۔ ایک حادثے کے بعد روزینہ دوبارہ نمودار ہوگئی۔ پے در پے میرے ارادوں کو التوا میں رکھنے والے آتے گئے اور میرے عزم کی شکست کا سبب بنے۔ ابھی تک میں خواہش کی شدت کے باوجود نورین کی تلاش میں نہ جاسکا تھا۔ مجھے اب خود سے بھی شرم آتی تھی۔

اگلے دن روزینہ سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں سکندر شاہ سے اجازت لے کر استاد کے پاس چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھ کے کچھ حیران اور خوش ہوا۔ "آ بھئی شہزادے! گھر کا راستہ ہی بھول گیا تجھے آبیٹھ۔"

میں نے کہا۔ "تم جانتے ہو استاد، میں نہیں آسکتا تھا۔ سکندر شاہ کی حالت ایسی تھی اور نہ اس کی بیوی کی۔ سب سے برا حال روبی کا تھا۔ مراد کی بیوی کا۔"

وہ لاؤنج میں لگے صوفے پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"اس کو روزینہ کہتا تھا انور۔"

"ہاں، مگر سکندر کے گھر میں وہ روبی ہے۔ پتا نہیں کیوں۔ پہلے ماں باپ اور بہن گئے۔ اب شوہر گیا۔ وہ آئی تھی ان کے سوگ میں۔ اب بیٹھی ہے عدت میں۔ چار مہینے دس دن تو وہاں جا بھی نہیں سکتی جہاں کبھی اس کا گھر تھا۔"

"بات تو کی ہوگی اس نے تجھ سے بھی؟"

"ہاں، ابھی دو دن پہلے ہوئی تھی۔"

وہ بولا۔ "مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہوگی وہ؟"

"تمہیں نہیں، ڈاکو گامارستم کو سمجھتی تھی۔ تم تو ملک غلام محمد ہو۔ اس دن جو سکندر شاہ مجھے یہاں سے لے گیا تھا اس کا بھی یہی مقصد تھا۔" پھر میں نے اسے ساری بات بتائی۔

وہ خاموشی اور حیرانی سے سنتا رہا۔ "تیری وجہ سے جان بچ گئی میری۔"

"میری وجہ سے؟"

"ہاں، تیری وجہ سے.... اس نے تجھ سے جھوٹ بولنے کو کہا اور تو نے بولا۔ ورنہ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ خود کو اس معاملے میں بے قصور ثابت کرنے کے لیے کہتا کہ گامارستم مجرم ہے تو اس نے یہ کام میرے کہنے پر کہیں کیا۔ وہ میرا ماتحت نہیں ہے۔ اور تم سمجھتی ہو کہ وہ مجرم ہے تو اس کی ایسی تیسی.... میں اسے اور اس کے ایک ایک ساتھی کو جو اس واردات میں شریک تھا تمہارے سامنے گولی ماردوں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں استاد، روزینہ یقین نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ سالے بہنوئی میں کیسی دشمنی چل رہی ہے۔ وہ ذمے دار سکندر ہی کو سمجھتی۔ اس نے جب مجھ سے جھوٹ بولنے کو کہا تو دراصل خود کو الزام سے بچایا۔ مجرم ایک ایسے شخص کو بنادیا جس کا وہ نام بھی نہیں جانتی تھی۔"

"اخباروں میں تو نام میرا ہی تھا اور پولیس نے ایف آئی آر لکھنے کی جو رسمی کارروائی کی ہے اس میں بھی مفرور مجرم ڈاکو گامارستم کو نامزد کیا ہے۔"

"اخبار دیکھ کے ہی اسے پتا چلا۔ مراد نے تو چھپایا تھا مگر ایسی بات کہاں چھپتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سب سیاست ہے۔ وڈیروں کے کھیل ہیں۔ اصل مجرم کو بچالیا اور اس کا نام دے دیا جو پہلے ہی مفرور ہے۔ بالآخر میں نے اسے قائل کرلیا کہ یہاں پولیس مقابلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ خبر ایسے ہی بنائی جاتی ہے۔ کرے کوئی بھرے کوئی۔ اس کا بھروسا نہ ہوتا مجھ پر کہ میں اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تو وہ کبھی نہ مانتی۔"

"تو جانتا ہے ماجھا والا کو؟"

"میں نے تو سکندر سے یہ نام سنا۔ اس نے بتایا کہ وہ پہلے یہاں تھا پھر سندھ کے علاقے میں چلا گیا۔"

"وہ اب بھی وہیں ہے۔ اسے پتا چلا تو تیری خیر نہیں۔"

میں نے کہا۔ "اسے کون بتائے گا۔ جو بات صرف تین افراد تک محدود تھی۔ سکندر نے مجھے بتائی۔ میں نے روزینہ کو۔ تم چوتھے ہو۔"

"تو نہیں جانتا پتر ان سازشی لوگوں کے ہتھکنڈے، سکندر کو ڈر رہے گا کہ کہیں روزینہ خود پولیس سے مل کے

تصدیق نہ کرے۔ ایسا ہوا تو روزینہ کو پتا چل جائے گا کہ تو نے جھوٹ بولا تھا اور پولیس کے ذریعے یہ بات مانجھا والا تک بھی پہنچا دی جائے گی کہ جرم کیا گامارستم نے مگر مجرم بنا کے تمہیں پیش کیا جارہا ہے۔ سکندر تو صاف انکار کردے گا کہ اس نے کسی سے ایسا نہیں کہا۔ ملک سلیم نے یہ بات کی تو اسی سے پوچھو۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے پُتر..... تجھے کون جانتا ہے۔ مانجھا والا شکایت کرے گا سکندر شاہ سے؟ وہ آج کل جس وڈیرے کی سرپرستی میں ہے' وہ کہے گا کہ شاہ جی، ہمارے بندے کو کیوں بدنام کررہے ہو جب کام تم نے اپنے بندے سے کرایا تھا، یہ کوئی مردوں والی بات ہے۔ اس وقت وہ اپنی عزت بچانے کے لیے کہے گا کہ.... صاحب! آپ ہمیں جانتے ہو، ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ پھر نام آئے گا تمہارا کہ تمہارے اس بندے نے کی ہے اور ابھی جو سکندر نے تمہیں بانس پر چڑھایا ہے، وہی سولی چڑھا دے گا۔ تمہیں وڈیرے کے حوالے کردے گا کہ ایسی بات ہے تو مجرم کو جو چاہو سزا دو۔ وڈیرا تمہیں بھیج دے گا مانجھا والا کے پاس اور وہ پوچھے گا کہ ہاں جی ملک سلیم صاحب! آپ نے لیا تھا میرا نام؟''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ کلثوم بھابی کے آجانے سے آیا۔ وہ کہیں بازار گئی ہوئی تھی۔ اچانک اندر آکے اس نے کہا۔ ''ارے دیور جی! تم کب آئے؟''

میں نے فوراً اپنا موڈ بدلا۔ ''ابھی، تھوڑی دیر ہوئی۔ آپ نہیں تھیں تو کسی نے چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔''

وہ مسکرائی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''چائے پی لو گر کھانے کا وقت ہورہا ہے۔ گھنٹا بھر لگے گا۔''

وہ چلی گئی، چند منٹ میں چائے لے کر آئی اور پھر چلی گئی۔

''سمجھ میں آگئی میری بات؟'' استاد نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی پندرہ دن گزرے ہیں۔ تقریباً چار مہینے اور ہیں۔ اس عرصے میں روزینہ کا کسی نامحرم سے رابطہ نہیں ہوگا۔ اس کے پولیس سے پوچھنے کا کیا سوال۔ اس کے بعد بھی وہ کہیں نہیں جائے گی تفتیش کرنے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایسا کر نہیں سکتی۔ اس لیے کہ وہ مجھ پر اعتبار کر چکی ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ وہ مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے پولیس سے تصدیق کرے۔ پیر سائیں کے گھرانے کی عورت نے آج تک غیروں سے بات نہیں کی۔

نہ سکندر شاہ کی بہو اور مراد کی بیوہ کرے گی۔ وہ سب نہیں ہوگا جو تم نے کہا۔ میں خود اس کا خیال رکھوں گا۔''

''وہ فون پر بات کرسکتی ہے۔''

''بات کیسے کرے گی اور کس سے۔ فون رکھا ہے لاؤنج میں، ہر وقت سکندر شاہ، اس کی بیوی اور میری نظر کے سامنے ہے۔ مگر اصل بات تو وہی ہے جو میں نے کہا۔ وہ میرے بیان پر شک کر ہی نہیں سکتی۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد اور حمایتی مانتی ہے۔ آنے والے دنوں میں پھر بات ہوئی تو میں اندازہ کرلوں گا۔ اس کے دل میں ذرا بھی شک ہوا تو وہ مجھے بتائے گی اور میں آسانی سے اسے مطمئن کرلوں گا۔ اس بات سے تم بالکل بے فکر رہو۔ لیکن استاد، خطرے میں تم ہو۔''

اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ روزینہ سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن یہ خوف سکندر شاہ کے دل میں خلش بن کے رہے گا کہ کہیں یہ راز فاش نہ ہوجائے کہ گامارستم ہی ملک غلام محمد ہے۔''

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور مجھے دیکھتا رہا۔

''اس نے موقع دیا ہے تمہیں، نکل جاؤ اس شہر سے۔ بہت دور چلے جاؤ، گم ہو جاؤ اپنی نئی زندگی میں، نئی دنیا میں، نئی شناخت کے ساتھ۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ''ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔''

''میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔ انور کا فون نمبر یاد رکھنا اور اسے اپنا نمبر بتا دینا۔ تم جانتے ہو نا میرے بڑے بھائی کا نام.... وہی نام بتا دینا۔ میں سمجھ جاؤں گا۔''

ہم چپ بیٹھے تھے جب کلثوم اندر آئی۔ ''ایسے خاموش بیٹھے ہو، کمال ہے۔''

''صرف دو عورتیں خاموش نہیں بیٹھ سکتیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا دیور جی، یہ بات ہے۔ کرتی ہوں تمہارا بھی بندوبست۔ آؤ کھانا لگا ہوا ہے۔''

کھانے کے دوران میں نے پوچھا۔ ''انور آیا تھا؟''

''وہ ہر روز حاضری دیتا ہے لیکن میں نے بھی پہرا بٹھا رکھا ہے ریشم پر۔'' وہ بولی۔

''یہ تو بڑا ظلم ہے۔''

''تم نہیں سمجھتے، یہ آزمائش ہے۔ آسانی سے کچھ مل

جائے تو اس کی قدر نہیں ہوتی۔ بات تو ساری طے ہوگئی ہے اس کی ماں سے.... لیکن بیچ میں آرہا ہے یہ مراد کی موت کا معاملہ۔"

"اس کا انور سے تو تعلق نہیں، آپ اپنے پروگرام کے مطابق چلیں۔"

استاد نے بیچ میں کہا۔ "نہیں، دیر سے کوئی فائدہ نہیں کلثوم، ریشم کو رخصت کرو، دو چار دن میں۔"

"دو چار دن میں؟ مگر کیوں؟"

"کیوں کیا، میں کہہ رہا ہوں اس لیے۔ ہم جا رہے ہیں یہاں سے.... تمہیں یاد نہیں کیا؟"

"یاد ہے، مگر ابھی کچھ طے نہیں ہوا تھا۔"

"سمجھ لو اب ہوگیا ہے۔" وہ ناراضی سے بولا۔

"کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"بتا دوں گا بتا دوں گا، اتنی جلدی کیا ہے۔ کھانا کھاؤ۔" وہ غصے میں آگیا۔

کلثوم نے میرا اشارہ پا کے خاموشی اختیار کرلی۔ اس نے یہ سمجھا کہ شاید شوہر میری موجودگی میں بات کرنا نہیں چاہتا۔ کچھ دیر بعد جب میں نے وہاں سے سوٹ کیس اٹھالیا تو استاد ساتھ تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تو پھر نہیں آئے گا؟"

"کیوں نہیں آؤں گا۔ ریشم کی رخصتی کیا میرے بغیر ہوگی؟"

"رخصتی کہیں اور سے بھی ہوسکتی ہے۔ کلثوم کی بات غلط نہیں تھی۔ جلدی نہیں کرنی۔ بس میں یہ مکان بدل لوں گا آج کل میں۔ اسی شہر میں گم ہوجاؤں گا فی الحال، کسی اور نام سے۔ ریشم کی ذمے داری سے فارغ ہوکے شہر کیا یہ ملک بھی چھوڑنا پڑا تو چھوڑ دوں گا۔ تو نے اچھا کیا مجھے خبردار کردیا خطرے سے۔"

"اللہ نے چاہا تو تمہاری زندگی بھی اچھی گزرے گی۔ جیسی تم چاہتے تھے۔"

میں نے روزینہ کو لان میں ٹہلتا دیکھا مگر سیدھا اندر چلا گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ مجھے تلاش کرتی آئی تو میں اپنے کمرے میں تھا مگر سوتا بن گیا۔ ابھی میں ایک مسئلے سے نمٹ کے آیا تھا اور میرے ذہن میں ریشم کے مستقبل کی فکر تھی۔ بظاہر فکر کی بات کوئی نہیں تھی لیکن لڑکی کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھائی اور ماں باپ تمام عمر متفکر رہتے ہیں۔ رات تک میں.... سکندر سے باتیں کرتا رہا۔ وہ کاروبار سے عملاً کنارہ کش ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ میں اسے حوصلہ دیتا رہا کہ ایسے کاروبار کو نہ چھوڑے۔

"اب میں نفع نقصان کیا دیکھوں، کس کے لیے کاروبار کی فکر کروں؟"

میں نے کہا۔ "پھر وہی بات شاہ جی! آپ کی نسل ختم نہیں ہوئی۔ مراد کی نشانی باقی ہے۔"

"میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔ انور سے بات ہوئی؟"

"ابھی نہیں، لیکن میں اسے لے آؤں گا۔ ابھی اس کی شادی کا معاملہ چل رہا ہے۔"

وہ چونکا۔ "شادی؟ کس سے؟"

"ہے اسی گاؤں کی ایک لڑکی.... ریشم۔"

وہ تلخی سے بولا۔ "جانتا ہوں میں۔ وہ پیر اس سے نکاح ثانی کرنے کے چکر میں تھا۔ انور اچھا ہے۔"

تاہم اگلی صبح روزینہ نے مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا۔ اس وقت میں معمول کے مطابق صبح اٹھ کے لان پر ادھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا جو خالی ہوچکا تھا۔ معلوم نہیں کیوں سکندر کی بیوی اس روز باہر ماربل کے چبوترے اور حاشیے والی نماز کی جگہ پر کیوں نماز میں مصروف نہیں تھی۔ شاید اس کی طبیعت خراب ہوگی۔ میں نے سوچا اور مگ کو اسی پلیٹ فارم کے ایک کونے پر رکھ دیا۔

اسی وقت روزینہ برآمد ہوئی۔ شوہر کو کھو دینے کے صدمے کا ابتدائی اعصاب شکن دور گزر چکا تھا جب وہ مسلسل روتی رہی تھی اور اس نے کھانا پینا تک چھوڑ رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ انسان کی فطرت کے مطابق صدمے کو قبول کرنے اور زندگی کے سفر کو معمول کے مطابق جاری رکھنے کا حوصلہ آرہا تھا۔ اس کی کچھ مدد سکون بخش دواؤں نے بھی کی تھی لیکن بیشتر یہ اس کا اپنا حوصلہ تھا جو بحال ہونے لگا تھا۔ وہ کچھ کمزور اور پژمردہ ضرور نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ میک اپ وغیرہ چھوڑ دینے سے چہرہ بے رونق لگنے لگا تھا اور اداسی نے اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جیسے ہمیشہ کے لیے چھین لی تھی۔ وہ آہستہ بولنے لگی تھی اور اس کی حرکات و سکنات میں بھی یہی دھیما پن آگیا تھا۔

اس نے مجھے سلام کیا۔ "آپ جلدی اٹھ گئے؟" اور میرے ساتھ چلنے لگی۔

"میں، ہاں اکثر اٹھ جاتا ہوں آج کل.... تم کیوں جاگ گئیں؟"

وہ دھیرے سے بولی۔ "میرا جاگنا سونا چلتا رہتا

ہے۔ اپنے کمرے میں رہتی ہوں تو گھبراہٹ ہوتی ہے۔ لگتا ہے مجھے قید کردیا گیا ہے۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں، تم نے اچھا کیا باہر نکل آئیں۔ اس وقت بڑی فرحت ملتی ہے۔"

وہ اپنی دھن میں بولتی گئی۔ "جو لوگ آتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے میرا دکھ بانٹنے نہیں بڑھانے آئے ہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"بس، مجھے لگتا ہے۔ جیسے وہ مجھے بار بار صبر کرنے کے بہانے یاد دلاتے ہیں کہ اب تم بیوہ ہو۔ تمہارا والی وارث کوئی نہیں۔ خبردار، مرنے والے کو بھول مت جانا۔ وفادار بیویاں پہلے تو مرجاتی تھیں شوہر کے ساتھ مگر تم زندہ ہو تو ہر وقت اسے یاد رکھو، اس کے خیال میں خود کو بھلائے رکھو۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ تمہارا احساس ہے۔"

"نہیں، ایسا ہی ہے۔ کسی نے نہیں کہا کہ ہمت سے کام لو، دنیا میں حادثات بھی ہوجاتے ہیں۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا۔ بھول جاؤ مراد کو، یاد رکھو کہ تمہارے ساتھ ایک ذمے داری ہے۔ تمہیں خود بھی جینا ہے اور اسے بھی پالنا ہے جو مراد کی نشانی ہے۔ کسی اور کی نہیں صرف تمہاری زندگی چاہیے اسے۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ عام طور پر لڑکیاں ایسا سمجھتی نہیں اور سمجھتی ہوں تو اس کا اعتراف نہیں کرتیں۔ یہ بڑا عملی احساس تھا۔ پُریقین اور مستحکم کہ جو ہونا تھا کسی کے چاہنے سے نہیں ہوا۔ حادثات تو یونہی ہوتے ہیں۔ اب یا تو مرجاؤ فوراً تاکہ نہ رہے زندگی نہ اس کے غم یا ہمت کرو اور زندگی کو آگے لے کر چلو۔ وہ بہادر لڑکی نہ ہوتی تو مراد کے ساتھ نکل جانے کے فیصلے پر عمل کیسے کرتی جبکہ یہ جان کی بازی لگانے کا فیصلہ تھا۔ وہ مرنے سے نہیں ڈری تھی۔ اور اب بھی موت کے سامنے سینہ سپر تھی کہ میں ہار ماننے والی نہیں ہوں۔"

"تم کہتے ہوگے، کیسی عجیب باتیں کرتی ہوں میں۔" وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولی۔

"نہیں، میں دل سے تمہارے حوصلے کا معترف ہوں۔ تمہاری ہمت اور استقامت کو سلام کرتا ہوں۔ ایسی باہمت عورت کو زندگی میں کون ہرا سکتا ہے جسے موت نہ ہرا سکی۔"

"تھینک یو، تھینک یو سلیم، تم نے پہلے بھی مجھے سپورٹ کیا تھا۔ مراد کی محبت کو اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی یاد کو میں دل سے کیسے نکال سکتی ہوں۔ میں نے بچپن میں جو پہلی بولنے والی گڑیا لی تھی، وہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ مراد تو میرا محبوب تھا۔ شوہر تھا۔ سب کچھ تھا۔ بہت تھوڑے دن اس کے ساتھ گزرے مگر اس وقت کا ایک ایک لمحہ میری یاد میں فریم کی ہوئی تصویر کی طرح رہے گا۔ جس کے رنگ بھی ماند نہ پڑیں گے۔ لیکن میں اس کے بچے کو خود پالوں گی، کسی اور کو یہ ذمے داری نہیں دوں گی۔ نانا نانی، چاچے، تایے.... ماں سے بڑھ کر کیسے ہوسکتے ہیں۔ اس بچے کی بدقسمتی کی انتہا تب ہوتی جب ماں باپ دونوں نہ رہتے۔ اس کی تو ماں باقی ہے۔"

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں، ہر طرح۔ اگر تم ہمت سے کام لوگی تو زندگی تمہاری رہے گی۔ تمہاری مرضی اور خوشی کے مطابق چلے گی۔ تم اپنے بچے کے لیے وہ سب کرسکو گی جو مراد کرتا۔ حوصلہ نہ ہوتا تو یہ سب بیکار تھا جو اب تمہارا ہے جو مراد کا ہوتا۔"

"تم مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے؟ باجی کہتی تھی دنیا میں پرفیکٹ کوئی نہیں سمجھا جاتا لیکن سلیم ہے۔ میں کہتی تھی کہ پاگل ہو تم.... وہ کہتی تھی کہ دیکھو نورین کے لیے اس کی محبت کم نہیں ہوئی۔ اس نے کیسے ریشم کو ایسے محفوظ رکھا کہ اس کا سگا بھائی نہ رکھتا۔ انور اور اس کا باپ ایک طرح اس کے گرویدہ ہیں۔ اس نے غیر ہو کے سب کو اپنا لیا ہے۔ یہ تنگ نظر اور متعصب لوگ اپنی ذات اور نسل اور خاندان کی برتری سب بھول گئے۔ اس کے لیے بند دروازے کھول دیے۔"

"چھوڑو یہ بات، بہت ہوچکی میری تعریف۔"

"میں دیکھ رہی ہوں کیسے یہاں تم نے سب کو جیت لیا ہے۔ سب کو اپنا محتاج بنا لیا ہے۔ کیا یہ درست ہے کہ سکندر شاہ میرے ماما اور میرے سسر محترم نے سب کچھ تمہارے حوالے کردیا ہے؟"

"نہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ اس نے ایک ذمے داری مجھے سونپی ہے۔ دس فیصد کی پارٹنرشپ اس کا معاوضہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انور یہاں تیسرا پارٹنر ہو۔ ہم یہ کاروبار چلائیں۔ مگر کاروبار ہمارا نہیں۔ یہ سب مراد کا تھا جو اب تمہارا ہے۔ تمہارے بچے کا ہے۔"

"لیکن تم اور انور اسے سنبھالو گے؟"

"ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ انور سے بات بھی نہیں ہوئی۔ یہ سکندر شاہ چاہتا ہے۔"

"یہ میں بھی چاہتی ہوں۔ اگر میں یہ کہوں؟ پھر؟"

"یقیناً مجھ پر دباؤ بڑھ جائے گا لیکن تم میرے بغیر بھی معاملات سنبھالنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتی ہو۔ انور ہوگا تمہارے ساتھ۔"

"تم کہتے ہو ابھی بات بھی نہیں ہوئی اس سے۔"

"میں بات کرلوں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گا۔ سکندر شاہ ہمت ہار چکا ہے۔ اس کی بیوی تو جیسے جینا ہی نہیں چاہتی۔ یہ میری نہیں ہم سب کی ذمے داری ہے کہ کاروبار سے زیادہ ان کا خیال رکھیں۔"

"اسے تم اپنی ذمے داری نہیں سمجھتے؟" وہ بولی۔

"کہنے کی بات اور ہے۔ رشتہ تمہارا ہے یا انور کا اور بہت قریبی، تم ہی وارث بھی ہو، میں نہیں۔"

"تمہاری اس بات سے مجھے لگتا ہے کہ تم چلے جاؤ گے۔" اس کے لہجے میں مایوسی آگئی۔

"مجھے نہ جانے کون سی نادیدہ قوت روکتی رہی کہ میں اب تک یہاں ہوں۔ اپنی مرضی سے جا نہیں پایا۔"

"تم نورین کو تلاش کرنے کے لیے جانا چاہتے ہو نا؟"

"جب جانتی ہو تو پوچھ کیوں رہی ہو؟"

"میں تمہیں روک نہیں سکتی لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم واپس آؤ گے ہر صورت میں۔"

"اور مجھے یقین ہے کہ تب تک تمہیں میری ضرورت بھی نہیں رہے گی، تم نے معاملات اسی طرح سنبھال لیے ہوں گے جیسے مراد سنبھالتا۔" میں نے کہا۔

"تمہاری ضرورت پھر بھی ہوگی، کوئی اور تمہاری جگہ کیسے لے سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چلو ناشتا کریں۔ سکندر اور تمہاری ساس انتظار کررہے ہوں گے۔"

لیکن اندر جاکے پتا چلا کہ وہ ابھی تک کمرے سے ہی نہیں نکلے۔ ناشتے کی میز پر ہم دونوں ہی رہے۔ وہ کونے کی کرسی پر تھی۔ مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ وہ پہلی بار ناشتے کی میز پر آئی تھی۔ اس سے پہلے ناشتا کمرے میں ہی کرلیتی تھی۔

جب خادمہ ناشتا لگا کے چلی گئی تو اس نے پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ "میں مراد کی موت سے پہلے بھی صدمے اور غصے سے پاگل ہورہی تھی۔ وہ سب تو مراد کو بھی علم نہیں تھا جو تم نے بتایا۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ "ہاں، وہ باہر تھا۔"

"میں یہاں رہ نہیں سکتی تھی۔ اپنے والدین اور بہن کے قاتلوں کے ساتھ۔ کسی اور کا میں اعتبار بھی نہ کرتی۔ مگر تم نے جو بتایا اس نے ساری غلط فہمی دور کردی۔ میری آنکھیں کھول دیں تم نے۔ ورنہ پتا نہیں کیا کر بیٹھتی میں۔ حقیقت جانے بغیر..... اب بھی صدمہ ضرور ہے لیکن اب یہاں رہ سکتی ہوں۔ اپنی سسرال میں۔ مراد کے گھر میں۔ کتنی بھیانک غلط فہمی تھی کہ میں انہیں قاتل سمجھتی تھی اور سوائے تمہارے یا انور کے حقیقت کسے معلوم تھی۔ کون یقین دلا سکتا تھا مجھے کہ واردات گاما رستم کی نہیں ماجھا والا کے گروہ کی تھی۔"

"وہ بھی ڈاکو ہی ہے۔"

"ہاں، مگر اب یہ صرف ایک واردات ہوگئی۔ سازش نہیں رہی۔ دشمنی کی بات نہیں رہی۔"

میں دل ہی دل میں سخت شرمندہ تھا مگر میں نے کہا۔

"غنیمت ہے کہ تم نے یقین کرلیا۔"

"یقین کیسے نہ کرتی۔ وہ بھی تم پر..... تم نے بہت آسان کردی میری زندگی اور آئندہ بھی رکھو گے مجھے معلوم ہے۔"

موضوع بدلنے کے لیے میں نے کہا۔ "انور کی شادی ہورہی ہے ریشم سے۔"

وہ چونکی۔ "اچھا، کب؟"

"دو چار دن میں۔ تمہارے والد مرحوم کے ایک عقیدت مند ہیں، ملک غلام محمد..... انہی کے گھر پر نکاح کی تقریب ہوگی۔ کوئی دھوم دھام نہیں۔"

"کاش میں شریک ہوسکتی۔ وہ کزن ہے میرا۔ اس سے کہو کہ تاریخ آگے بڑھالے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اندازہ ہے تمہاری مجبوری کا۔ تم کو عدت کا زمانہ گھر میں رہ کے گزارنا ہوگا لیکن انور کی مجبوری ہے، اس کی ماں اکیلی رہ گئی ہے۔ بہت بیمار ہے اور بوڑھی ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ اس نے ساری زمین مزارعوں میں بانٹ دی ہے۔"

"ہاں، جب وہ باہر سے آیا تھا تب بھی یہی خیال تھا اس کا۔ گزارے کے لیے کوئی کمی نہیں پڑے گی اسے۔"

"میرا خیال ہے ایسا ہی میں بھی کروں۔" وہ بولی مگر میرے کچھ پوچھنے یا کہنے سے پہلے سکندر شاہ آگیا۔

وہ ہمیں ایک ساتھ ناشتا کرتا دیکھ کے اور خصوصاً روزینہ کو دیکھ کے خوش ہوا۔ "تم نکلی ہو کمرے سے تو رونق آگئی گھر میں۔" اس نے روزینہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ

رکھا۔ ”طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ سپاٹ روکھے لہجے میں بولی اور پھر خاموشی سے اندر چلی گئی۔

سکندر شاہ اسے دیکھتا رہا۔ ”اس کی بدگمانی ابھی تک دور نہیں ہوئی۔“

میں نے اسے تسلی دی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ اتنی جلدی نارمل کیسے ہوسکتی ہے۔“

”کتنی دیر سے وہ تم سے باتیں کررہی تھی۔ میرے آتے ہی چلی گئی۔ حالانکہ تم غور کرو کہ کس طرح میں نے اس کو سپورٹ کیا، اسے محفوظ رکھا۔“

”یہ تو آپ نے سب کچھ اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے کیا تھا شاہ جی، یہ آپ کی بھی مجبوری تھی۔ اس کی جگہ دوسری کوئی لڑکی پسند ہوتی مراد کو تب بھی آپ مجبور ہوتے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر آپ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا بھی چاہتے تھے، اس ڈبا پیر سے جس نے انکار کر کے آپ کی بے عزتی کی تھی۔“

”لیکن روزینہ کو مجھ سے تو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔“

”شاہ جی! کیا یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ اپنی دشمنی میں بہت آگے تک چلے گئے۔ آخری انتہا تک۔ مراد کو بچانے کے لیے آپ کو کیا کچھ کرنا پڑا تھا۔ اب قسمت کے لکھے کو تو کوئی بھی نہیں مٹا سکتا۔ وہ دشمنی کی بھینٹ نہیں چڑھا۔ حادثے میں اللہ کو پیارا ہوا۔ زندہ رہتا تو جانے کیا ہوتا مگر روزینہ کے خاندان کا وجود تو آپ نے ہی مٹایا۔“

وہ برہمی سے بولا۔ ”تم کہہ رہے تھے کہ اس کی غلط فہمی دور کردی ہے۔“

”ہاں، اس نے میری بات پر سو فیصد یقین کرلیا ہے کہ واردات گامارستم نے نہیں کی تھی لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”اس کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ گامارستم کو چھوڑ کے آپ نے بانجھاوالا کو استعمال نہ کیا ہو تاکہ آپ پر شک نہ جائے۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ ”پھر؟ اس کا یہ شک کیسے دور ہوگا؟“

”ہوجائے گا وقت گزرنے کے ساتھ۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو مراد کا چہلم بھی نہیں ہوا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے، جب وہ باہر نکلے گی تو دیکھیں کیا کرتی ہے۔“

”تمہیں اس کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ اسے روکنا ہوگا اگر وہ غلط قدم اٹھائے یا کوئی اسے گمراہ کرے۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں کاروباری معاملات پر ایک نظر ڈال لوں۔ ایسا نہ چاہنے کے باوجود میں اسے انکار نہ کرسکا۔ میری ذہنی کیفیت بہت عجیب سی ہورہی تھی۔ لگتا تھا کہ اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کا اختیار مجھ سے لے لیا گیا ہے اور جب سے میں تختۂ دار تک پہنچ کے جیل سے فرار ہوا تھا، عین اس وقت جب میرے پاس زندگی کی امید کرنے کی وجہ کوئی نہ رہی تھی اور میں نے مان لیا تھا کہ بس زندگی اتنی ہی تھی۔ نہ جانے کیوں کسی نادیدہ قوت نے مجھے مرنے نہ دیا۔ بقول غالب ۔۔۔ میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں۔۔۔ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا، اور تب سے ایسا ہی ہورہا تھا، جو میں سوچتا تھا پلان کرتا تھا وہ نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے مجھے جیسے چاہتے تھے استعمال کرلیتے تھے اور ان کو میری طرف سے مایوسی نہیں ہوتی تھی۔

اب میں بالآخر اس یقین میں مبتلا ہوگیا تھا کہ میں نورین کی تلاش میں جاسکتا ہوں۔ تو پھر کسی دستِ غیب نے میرا راستہ روک لیا اور میرے لیے اپنے ارادے پر عمل کو ناممکن کردیا۔ میں اندرونی طور پر انتہائی شکست خوردگی اور مایوسی کے احساس سے دوچار تھا کہ اپنی مرضی سے میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ اسی خیال نے مجھے اس ذہنی کیفیت میں پہنچا دیا تھا کہ میں واقعی نورین کو بھول کر شاہینہ کے سامنے بے بس ہوگیا تھا۔ اس کی محبت میں بھی اتنی بے پناہ قوت تھی کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہار جاتا۔ وقت الگ دیمک بن کے نورین کے خیال کو کھا رہا تھا پھر بھی جب اس کا خیال آتا تھا تو پھر اور کوئی خیال نہیں رہتا تھا۔ اس کے حسب حال بھی کسی کا شعر تھا کہ نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی۔ مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں۔

میں نے کوئی ہامی نہیں بھری تھی مگر سکندر شاہ نے فرض ہی نہیں کیا تھا مان لیا تھا کہ میں اس کی تجویز سے اتفاق کرچکا ہوں۔ میری کیفیت یہ تھی کہ کوئم مشکل وگرنہ کوئم مشکل۔۔۔ انکار کروں تو کیسے۔۔۔۔ وہ پیچھے پڑ جائے گا اور خود میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد حالات کا اسیر ہوگیا تھا۔ یہ جگہ میرے پیروں کی زنجیر بن گئی تھی۔ لوگوں سے میرے رشتے

ازخود استوار ہوتے جارہے تھے۔ جہاں میں اجنبی تھا وہاں اب اجنبی نہیں رہا تھا۔ میں مستقبل کو دیکھتا تھا تو نورین کے ساتھ ہی مجھے یہاں اپنا مستقبل محفوظ نظر آتا تھا جہاں اب اجنبی بھی اپنے ہو گئے تھے۔ میں ایک فرد کی طرح اس خاندان میں بس گیا تھا جس میں بڑے چودھری اور پیر سائیں کے ساتھ ان کی بہن کا گھر تھا۔ سکندر کا گھر... مراد کا گھر جو اَب روزینہ کا گھر تھا۔ یہی میرا خاندان ہو گیا تھا۔ نورین کو یہاں تحفظ اور اپنائیت مل سکتی تھی۔

''کہاں ہو تم؟'' سکندر بولا۔

میں چونکا۔ ''آپ کے سامنے۔''

''تمہارا دماغ کہاں ہے؟ کیا کہہ رہا تھا میں؟'' وہ بولا۔

''آئی ایم سوری۔ ذرا سی دیر کے لیے میں کچھ اور سوچنے لگا تھا، آپ بتائیے۔''

''میں کیا بتاؤں.... تم بتاؤ کہ انور سے بات کی؟''

''ابھی تک اس کا موقع نہیں آیا۔'' میں نے کہا۔ ''دراصل، چہلم گزر جائے۔''

''چہلم؟ چالیس دن بعد کیا ہوگا؟ سوائے دعوت کے جس میں لوگ آئیں گے، پلاؤ زردہ، قورمہ کھانے اور ڈکاریں مارتے جائیں گے۔ اس سے مراد کا باب بند ہو جائے گا؟ ہم اسے بھول جائیں گے؟ تب تک چھٹی ہے کہ کچھ نہ کریں۔ بس اسے یاد کر کے روتے رہیں اور اس کے بعد سب ختم۔'' وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''مگر میرا وہی مطلب تھا جو میں نے کہا۔ میں نے اس بے رحم حقیقت کو قبول کرلیا ہے کہ مراد مرگیا۔ اسی طرح جیسے پہلے والے مرے تھے، اس کے بھائی بہن، بس وہ ذرا دیر سے گیا۔ لیکن اب رونے دھونے، سوم چہلم یا اس کے عالی شان مزار پر اگربتیاں جلانے اور ہر جمعرات کو قوالی کرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ واپس نہیں آئے گا یا تو میں اس کے ساتھ ہی مرجاتا لیکن زندہ ہوں تو خود کا اور دوسروں کا عذاب بن کے جینے سے کیا فائدہ۔''

''میں اس ہمت اور سوچ کی تعریف کرتا ہوں۔''

''جب تک میں زندہ ہوں۔ اس کی ماں میرے ساتھ ہے تب تک زندگی کو روگ بنا کے قابلِ رحم بن کے کیوں جیوں، میں سہارا ضرور چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں بہرحال بوڑھا ہو رہا ہوں لیکن میں پیچھے نہیں ہٹ رہا ہوں۔ زندگی سے موت کی طرف مجھے وقت خود ہی لے جائے گا۔ ہم سب کو جانا ہے۔ میں کیوں خود کو دھکیلوں تم اور انور مل کے اس کام کو جاری رکھو جس کی ضرورت تمہیں ہوگی مجھے نہیں ہے۔ تمہارے سامنے ایک پورا مستقبل ہے۔ پھر تمہارے بچوں کے سامنے، تم دنیا میں کچھ تو کرو گے۔ یہ بھی کام ہے اور تمہارا اپنا کام ہوگا تو زندگی اچھی گزرے گی تمہاری اور بعد میں اگلی نسل کی۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟''

میں نے گھڑے کی طرح سر ہلایا۔ اس آدمی کی سوچ بے حد مثبت تھی۔ تعمیری اور پریکٹیکل۔ اس کی بات نے تمام شکوک وشبہات کے جالے صاف کردیے تھے۔ بے یقینی دور کردی تھی۔ وہ ہمت والا آدمی تھا اور آہستہ آہستہ مجھ پر ذمے داریوں کا بوجھ منتقل کرنا چاہتا تھا کہ وہ سب کاروبار چلتا رہے سوائے دشمنی کے کاروبار کے.... جو اس نے بڑی محنت سے سیٹ کیا تھا۔ جائز اور ناجائز طریقے سے، حریفوں کو راستے سے ہٹا کے۔ اسے ختم ہوتا دیکھنا ایسا ہی تھا جیسے محنت سے لگائے ہوئے پھل دار باغ کے درختوں کو بے ثمر ہوتا، سوکھتا اور ختم ہوتا دیکھنا۔ وہ ایک تجربہ کار مالی کی طرح ایک طرف بیٹھ کے نگرانی کرنا چاہتا تھا اور اپنی جگہ اس نے دو اپنے جیسے محنتی اور ذہین افراد کو دے دی تھی جو اس کے عزیز بھی تھے اور مستحق بھی۔

میں نے ریشم کو استاد کی گاڑی میں اندر آتا پھر گاڑی کو واپس جاتا دیکھا۔ اب وہ اکثر آجاتی تھی۔ روزینہ خود اسے بلالیتی تھی۔ وہ دونوں شریکِ راز تھیں۔ ہم عمر تھیں اور اس گھر کی فرد بھی۔ ریشم کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میں انور کو نہ منا سکا تو وہ منا لے گی۔ اس کے ٹھکانے تین ہی تھے۔ وہ اپنی حویلی میں رہے جس کا امکان زیادہ تھا یا یہاں یا پھر ملتان کے اس گھر میں جو اَب ریشم کا تھا۔ وہ صبح آتی تھی تو بعض اوقات رات کو بھی رک جاتی تھی۔ لڑکیوں کی باتیں ختم کہاں ہوتی ہیں اور ان کے پاس تو کہنے سننے کو بہت کچھ تھا۔ دن کے کھانے پر تھوڑی سی رونق ہوئی جب وہ دونوں بھی آ کے بیٹھ گئیں۔ بظاہر ایسا ضرور لگتا تھا کہ روزینہ اور سکندر کے درمیان خلیج کم ہونے لگی ہے لیکن دوسری طرف مراد کی ماں کو اس کی شکل دیکھنا گوارا نہ تھا جو یہ سمجھتی تھی کہ اس کا اکلوتا بیٹا اسی ایک عورت کی وجہ سے مارا گیا۔ کسی ساس کے لیے ایسا سوچنا زیادہ غیر فطری بھی نہ تھا۔ عمل کے ردِعمل کے طور پر روزینہ کے دل میں مراد کی ماں کے لیے رعایت کی گنجائش نہ تھی۔ اس میں کوئی امن کمیٹی یا سیکیورٹی کونسل کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ ساس بہو کا رشتہ اندرا گاندھی وزیراعظم بھارت سے ملکہ برطانیہ تک سب کا ویسا

ہی تھا جیسا کسی عام پاکستانی گھرانے میں ہوتا ہے۔
شام کے وقت ریشم کو اچانک یاد آیا۔ ''یہ آپ کے لیے ایک خط تھا۔''
''خط! کس کا خط؟''
''کلثوم بھابی نے دیا تھا۔'' وہ بولی اور لفافہ مجھے تھما دیا۔
میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اپنے کمرے میں آکے خط کو دیکھا۔ یہ اسکول کاپی کے ایک صفحے پر لکھا گیا تھا اور کیڑے مکوڑے والی زنانہ ہینڈ رائٹنگ میں کلثوم نے لکھا تھا۔
''دیور جی!
ہمیں معاف کر دینا کہ ہم اچانک تمہیں بھی کچھ بتائے بغیر جا رہے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں، یہ ابھی نہیں بتا سکتی کیونکہ خود مجھے معلوم نہیں۔ وجہ تم خوب جانتے ہو۔ ریشم اب وہیں رہے گی۔ اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہاں تم اس کے بھائی ہو تو روزینہ اس کی سہیلی.... میری بڑی خواہش تھی کہ ریشم کو خود دلہن بنا کے رخصت کروں لیکن یہ قسمت میں نہیں تھا۔ یہ کام وہاں بھی ہوسکتا ہے۔ شاید بہتر طریقے سے ہوسکتا ہے۔ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ ریشم اپنے گھر میں خوش رہے۔ دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ دیکھا کیسی نانی اماں جیسی دعائیں دے رہی ہوں۔ ہم اس خوشی کی تقریب میں موجود نہیں ہوں گے۔ اس کا افسوس ضرور ہے لیکن ہم پھر ملیں گے اس کا مجھے یقین ہے۔ تمہاری بھابی کلثوم۔''
بہت دیر تک میں اس خط کو ہاتھ میں تھامے اس پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ استاد کے یوں چلے جانے کا مجھے دکھ ضرور تھا لیکن اس میں اطمینان کا پہلو غالب تھا کہ اب وہ محفوظ ہے۔ نئی زندگی کی طرف سفر کا پہلا قدم اٹھانا مبارک تھا۔ مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ جلد یا بدیر ہم پھر ملیں۔ جب حالات بہت موافق ہوں گے۔ مجھے حیرانی بھی ضرور تھی کہ خط دیتے ہوئے ریشم بالکل نارمل تھی۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ اب اسے لوٹ کے نہیں جانا۔ تقدیر نے اسے ایک اور گھر میں پہنچا دیا ہے۔ شطرنج کے مہرے کی طرح اس کا خانہ پھر بدل گیا ہے۔
اور اسے واقعی معلوم نہیں تھا۔ شام سے رات ہوگئی تو اس نے کہا۔ ''گاڑی نہیں آئی مجھے واپس لے جانے۔''
روزینہ نے کہا۔ ''تو کیا ہوا۔ کل چلی جانا۔'' اور ریشم نے سر ہلا دیا کہ ٹھیک ہے۔ اگلے دن میں انور سے ملنے گیا اور خط اس کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے خط اٹھا لیا اور کچھ دیر سوچتا رہا۔
''کچھ سمجھ میں آئی بات؟''
اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''تو جانتا ہے تو بتا دے۔'' میں نے بہتر سمجھا کہ قطعی لاعلمی کا اظہار کروں۔ ''ہوگا ان کا اپنا کوئی مسئلہ جو انہوں نے نہیں بتایا۔ لیکن اس سے ہمارے لیے ایک مسئلہ ضرور پیدا ہوا ہے۔''
''وہ کیا؟''
''شاید اب ریشم کی رخصتی طے شدہ وقت پر نہ ہو سکے۔ وہ سکندر شاہ کے گھر میں ہے روزینہ کے ساتھ۔''
''پھر کیا ہوا۔ روزینہ کا اپنا گھر ہے وہ بھی۔''
''لیکن اس کی عدت کا زمانہ ہے۔ ابھی تو خیر چہلم بھی نہیں ہوا امراد کا۔''
وہ بولا۔ ''چہلم تک تو جائز سمجھا جا سکتا ہے لیکن چار مہینے دس دن کا کیا مسئلہ ہے۔ روزینہ باہر نہیں جاسکتی تو نہ جائے، ریشم کو جانے دے۔''
''یہ ہوسکتا ہے لیکن فیصلہ میرا نہیں۔ ماں جی مل لیں سکندر شاہ کی بیوی سے۔ حالانکہ وہ بھی اس قابل نہیں کہ فیصلہ کرے یا دخل دے۔ فیصلہ سکندر شاہ کرے گا۔ وہ مان جائے گا۔''
''یار! یہ بڑے خاندانی چکر ہیں۔ ماں جی کہاں بات کریں گی اس سے۔'' وہ مایوسی سے انکار میں سر ہلانے لگا۔
''دیکھ انور! جو لوگ یہ خاندانی دشمنی کے سلسلے چلاتے رہے وہ چلے گئے۔ اب یہ بلاوجہ کی رنجش اور دوستی دشمنی ختم ہونی چاہیے۔ تو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ تو نے زمین داری چھوڑ دی۔ ایک کم ذات لڑکی سے شادی کر رہا ہے تو اپنی ماں کو بھی منا سکتا ہے اور وہ بھی مانے گی کیونکہ وہ مجبور ہے۔ تاریخ بدل سکتی ہے اگر تو چاہے۔''
''ایک آدمی نے کبھی تاریخ بدلی ہے؟''
''بدلی ہے۔ تاریخ میں بہت لوگ ہیں مگر تو اپنی بات کر۔ سکندر شاہ چاہتا ہے کہ تو اور میں مل کے اس کا سارا کام سنبھال لیں۔''
وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''میں اور تو؟ کیا وہ پاگل ہو گیا ہے؟''
''وہ پہلے پاگل تھا یا اب ہے۔ تو پہلے پاگل تھا یا آج ہے۔ کون کرے گا اس کا فیصلہ؟ اس نے مجھے کیوں کہا؟ میں تو باہر کا آدمی ہوں۔ اجنبی، غیر ذات، لیکن چودھری

صاحب نے بھی مجھے اپنا لیا تھا۔ ماں جی بیٹا کہتی ہیں مجھے.... پیر سائیں نے قبول کرلیا تھا مجھ بے گھر اور بے نام و نشان کو۔ آج ایک شناخت مل گئی ہے عزت مل گئی ہے۔"

"تو نے محمود غزنوی کی طرح آ کے سارے بت توڑ دیے۔" وہ ہنسا۔ "خاندانی نجابت اور نسلی برتری کے جن کی یہ سب صدیوں سے پوجا کر رہے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ شرافت تو خون میں ہوتی ہے۔"

"یہ صدیوں کی جہالت کے اصنام ہیں انور.... اور یہ اس کے پجاری۔ پجاری کب چاہتا ہے کہ اس کے صنم خانے کا کوئی بت ٹوٹے۔ اس کا ایمان باطل ہوجائے۔"

"خیر اب انہیں کیا کہنا جو اس دنیا میں ہی نہیں رہے۔ باپ دادا کے زمانے سے وہ جن قدروں کو سنبھال کر رکھتے آئے تھے وہ ان کی نظروں کے سامنے ہی پامال ہوگئیں۔ ان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ شرفات کوئی موروثی چیز نہیں، نہ مرحوم چودھری صاحب نے اور نہ پیر صاحب نے کبھی مجھ سے میری ذات پوچھی، مجھے بیٹا بناتے وقت۔"

"ان کو ڈر ہوگا کہ تو موچی، نائی، میراثی یا مسلی کا بیٹا ہوا تو اپنانا مشکل ہوجائے گا۔ چنانچہ انہوں نے تجھے ملک بنا دیا۔ ملک سلیم اختر کے نام سے ان کے دل کو بھی تسلی حاصل ہوگئی کہ کسی کے سامنے ناک نیچی نہیں ہوئی اور چشم پوشی سے ان کی ضرورت بھی پوری ہوگئی۔"

"یہ سب پرانے وقتوں کی باتیں پرانے لوگوں کے ساتھ گئیں۔ اب نئی نسل کا زمانہ ہے، نہر کے پار والے بھائی کی ایک نشانی روزینہ بچی ہے۔ ادھر تو ہے۔ سکندر کے گھر میں مراد تھا۔ اب مراد کا جانشین روزینہ کے بطن سے جنم لے گا۔ میری بات مان اور سکندر کے کاروبار کو سنبھالنے میں میری مدد کر، یوں تو پتا کسی کا نہیں کہ کون پہلے جائے گا مگر عمر کے پیمانے سے دیکھیں تو سکندر اور اس کی بیوی بھی زیادہ نہیں جئیں گے۔ سکندر کا جی کاروبار سے اور اس کی بیوی کا دنیا سے اچاٹ ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ان کو جینا چاہیے۔ مراد کی جگہ لینے والا آجائے گا۔ پوتا ہو یا پوتی۔ نسل اسی سے آگے چلے گی۔ وہ اپنی ساری محبت اسے دے سکتے ہیں اور اسے ضرورت بھی ہوگی۔" انور بولا۔

"پھر بتا کیا کہوں میں سکندر کو.... بڑے دعوے سے آیا تھا میں کہ انور میری مان لے گا۔ روزینہ کو بھی یقین تھا۔"

"پہلے والا انور شاید تجھے مایوس کرتا۔ مگر انور کو بھی اس کے حصے کی کچھ سزا تو مل چکی ہے۔"

"اپنی زمین غریب مزارعوں کو دے کر تو نے سب کے گناہوں کا کفارہ ادا کردیا ہے۔"

وہ ہنسا۔ "یہ تو اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے؟"

"بہت بڑی قربانی دی ہے تو نے۔ تیرے اسلاف تو ایک انچ زمین کسی بیٹی کے نام کرنے کو بھی تیار نہ تھے۔ اب تجھے دعائیں دینے والے کتنے ہیں، جو وہ خواب میں نہیں دیکھ سکتے تھے وہ ہوگیا۔ وہ اپنی زمین کے مالک بن گئے ہیں۔ عزت داروں میں شامل ہوگئے ہیں۔ ان کی خوشیوں کا اندازہ کرسکتا ہے کوئی.... وہ ساری عمر تجھے دعائیں دیتے رہیں گے۔"

"میں نے سوچا تھا، ملتان چلا جاؤں گا۔ بعد میں یہ حویلی بیچ کے وہاں اپنا کام شروع کروں گا۔ سکندر کی طرح کنسٹرکشن کمپنی بنالوں گا۔ اس ملک میں جہاں مزدور کچھ دن بعد راج.... اور راج بالآخر انجینئر بن جاتا ہے۔ کسی آرکیٹیکٹ کو کون پوچھتا ہے۔ گنے چنے لوگوں کے سوا کوئی اپنے محل بھی ڈیزائن نہیں کرواتا۔ سب باہر کے رسالوں کی تصویروں سے کام چلاتے ہیں۔ میں تعمیرات میں کون سا انقلاب لاسکتا تھا۔ مگر ہاں بہتر گھر بنا سکتا تھا۔ پیسے والوں کو مشورے دے سکتا تھا کہ محل بنائیں تو اپنا اوریجنل آئیڈیا سامنے رکھیں۔ آج وہ کسی کو کاپی کر رہے ہیں کل کوئی انہیں کاپی کرے۔"

"یہ کام تو سکندر کے لیے کرسکتا ہے۔"

"یہی بہتر ہے۔ اگر مراد نہ رہا تو سکندر بھی کب تک رہے گا۔ مراد کے بیٹے کو سب کچھ سنبھالنے میں کم سے کم پچیس سال تو لگیں گے۔ چوتھائی صدی.... تب تک میرا کوئی مستقبل نہیں رہے گا۔ میری بنائی ہوئی عمارتیں رہ جائیں گی مگر ان میں انور کی مہارت کسی کو نظر آئے گی۔ اپنا کام کرتا تو پیسا بہت ملتا مگر کیا کروں گا میں بہت زیادہ پیسا کما کے۔ میرے دل میں اب کوئی ہوس نہیں، مگر دس فیصد کم ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہم سکندر سے بات کرسکتے ہیں۔ فرض کر پچیس فیصد تیرے ہوں اور اتنے ہی میرے.... تب بھی پچاس فیصد یعنی آدھے کا مالک تو وہی رہے گا۔"

"کیا روزینہ مانے گی؟"

"مانے گی، کسی اور کے لیے نہ سہی.... میرے اور

تیرے لیے مانے گی۔ یہ پھر بھی ایک فیملی بزنس رہے گا جس کو کنٹرول سکندر کرے گا۔ اس کے بعد روزینہ یا مراد کا وارث..... یہ بڑے دور کی بات ہے۔''

''مگر یہ قانونی معاملہ ہے۔ اس کاروبار میں ریشم کا اور میرا حصہ اس وقت تک ہمارا رہے گا جب تک ہم چاہیں گے۔ یہ ہمارے وارثوں کا بھی ہوگا۔ لیکن ہم اپنا حصہ کسی کو فروخت کر کے جانا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ وہ پھر ہم سے خرید لیں یا ہماری جگہ کسی اور کو پارٹنر قبول کریں۔''

''تو بہت دور کی سوچنے لگا۔''

''یہ کوئی خیالی بات نہیں۔ کیا پتا تجھے بھی نورین مل ہی جائے۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''تجھے یہ ناممکن لگتا ہے؟''

''نہیں، نورین نام کی دنیا میں ایک ہی تو نہیں تھی۔ اس نام سے پیار ہے تو ہم اشتہار دے دیں گے کہ نورین نام کی لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ ایک نہیں دس مل جائیں گی انتخاب کے لیے سارے پاکستان میں سے۔''

''تو جتنا مذاق چاہے اُڑا لے۔ مجھے یقین ہے کہ میری نورین مجھے ملے گی۔''

وہ مجھے پُرتمسخر نظروں سے دیکھتا رہا۔ ''فرض کر وہ مل جاتی اور تیری بیوی ہوتی شاہینہ؟''

''بکواس مت کر، اب باقی کام تیرا۔''

''کون سا باقی کام؟''

''ماں جی کو راضی کرنے کا یار۔'' میں نے کہا۔

وہ ایک دم سیریس ہوگیا۔ ''اب ان کی مرضی کیا۔ وہ ہاری ہوئی فوج کی آخری صف میں ہیں۔ انہوں نے شکست قبول کر لی ہے، اپنی مرضی کرنا تو بہت پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ابا جی کے زمانے میں ہی۔''

''ایسا ہی حال مراد کی ماں کا ہے۔ زندہ ہے کیونکہ اپنی مرضی سے نہیں مر سکتی۔ بس انتظار میں ہے کہ وقت پورا ہو۔''

واپسی سے پہلے میں نے ماں جی کو سلام کیا تو انہوں نے غور سے دیکھا۔ ''کون؟ پتر انور؟''

میں نے کہا۔ ''میں سلیم ہوں۔'' اور لائٹ جلا دی۔

''اچھا اچھا، کب آیا؟ سب خیر ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کی دعا ہے ماں جی۔ بس اب انور کی شادی کر دیں جلدی سے تاکہ پوتا پوتی مل جائیں۔''

انہوں نے ایک آہ بھری۔ ''پہلے بھی کچھ ہوا ہے میرے چاہنے سے؟''

''اب ہوگا انشاءاللہ..... ایسا ضرور ہوگا۔''

''تو بھی گواچی گاں (گم شدہ گائے) کی طرح نہ پھر..... وہ جو تیری بھابی ہے نا کلثوم..... وہ کہہ رہی تھی کہ میں کرتی ہوں اس کا بھی بندوبست، اچھی ہے تیری بھابی۔''

میں کیا بتاتا کہ وہ اچھی بھابی گم ہوگئی ہے۔ ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح جو اپنی روشنی تاریک آسمان میں چھوڑتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ میں کچھ دیر بعد اٹھا اور چلا آیا۔ اس وقت تک رات ہو گئی تھی۔ سکندر شاہ مجھے باہر ہی مل گیا۔ وہ کچھ پریشان تھا۔

''بھئی وہ ریشم بار بار فون کر رہی تھی۔ نمبر ہی نہیں ملتا۔''

''کسے فون کر رہی تھی مجھے؟''

''نہیں، وہ اپنی کلثوم بھابی کو فون کر رہی تھی۔ اچھا ہوا تم آگئے۔ میں اسے کسی ڈرائیور کے ساتھ بھیجنا نہیں چاہتا تھا اور وہ خود بھی تیار نہ ہوتی۔ تم جاؤ اسے چھوڑ آؤ۔''

میں اقرار میں سر ہلانے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ ریشم نے حیرانی سے زیادہ پریشانی کا اظہار کیا۔ ''کیا گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوتا۔ کوئی نہ ہو تو نوکر ہوتے ہیں۔ تین گھنٹے میں پانچ چھ بار فون کر چکی ہوں میں۔''

''ارے بی بی..... فون خراب بھی ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پریشانی کی کون سی بات ہے؟''

''پھر بھی..... کسی نے میری خبر تک نہیں لی۔ مجھے لینے کوئی نہیں آیا۔ یہاں نئے ڈرائیور ہیں، سکندر چچا نے خود ہی کسی کے ساتھ نہیں بھیجا۔ کلثوم بھابی کو ویسے تو بڑی فکر رہتی ہے میری۔''

''اُفوہ..... تم کتنا بولنے لگی ہو۔ تم کیا کسی دشمن کے گھر میں تھیں کہ انہیں فکر ہوتی۔ روزینہ بھی تمہاری بہن کی طرح ہے اور یہاں تم آتی ہو اس کا دل بہلانے، اس کا غم بٹانے۔''

''اب تو بہت سنبھال لیا ہے اس نے خود کو..... معلوم ہے کیوں؟''

''میں غیب کا کوئی علم نہیں رکھتا۔''

''اس بچے کی وجہ سے..... وہ کہتی ہے کہ یہ نہ ہوتا تو میں مراد کے بغیر زندہ کیوں رہتی۔ میں ساتھ ہی مر جاتی لیکن اپنے ساتھ اسے بھی مار دوں؟ مجھے تو اب اس کے لیے زندہ رہنا پڑے گا۔ مراد ایک ذمے داری چھوڑ گیا ہے مجھ پر۔''

میں سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ گھر میں کسی کو نہ پا کے ریشم کا ردِعمل کیا ہوگا۔ حیرانی اور پریشانی کا مظاہرہ مجھے بھی کرنا

تھا حالانکہ مجھے سب معلوم تھا۔ گیٹ کی لائٹس جل رہی تھیں مگر بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود کوئی بھی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔

''معلوم نہیں اتنے بجے کہاں چلے گئے دونوں۔'' ریشم نے کہا۔ ''ادھر والے پڑوسی سے پوچھتی ہوں۔ ان کا آنا جانا تھا۔'' ریشم کا اندازہ درست نکلا۔ پڑوسی کا بیٹا ہمیں اندر لے گیا۔ پھر پڑوسن نمودار ہوئیں اور انہوں نے مجھے دیکھ کر کچھ حیرانی کا اظہار کیا۔ ''تم کہاں چلی گئی تھیں ریشم .... تمہارے بھائی اور بھابی انتظار کرتے رہے .... پھر چلے گئے۔''

ریشم چونکی۔ ''چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟ اور انہیں تو معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں۔''

پڑوسن کا چہرہ تشویش زدہ ہوگیا۔ ''اچھا؟ مجھے تو خیر یہ سب نہیں معلوم وہ گھر چھوڑ گئے۔''

ریشم کا رنگ اڑ گیا۔ ''گھر چھوڑ گئے؟ یوں اچانک؟ اور گئے کہاں؟''

''بھئی یہ سب چکر تو مجھے پتا نہیں۔ تمہارا اسباب دے گئے تھے کہ آئے ریشم تو دے دینا۔ میں نے بھروسے میں رکھ لیا۔ اب اس میں کیا ہے کیا نہیں ہے، یہ نہ مجھے پتا ہے نہ میں اس کی ذمے دار ہوں۔ جا منّا سوٹ کیس لے آ۔''

منّا گیا اور ایک خاصا بڑا سوٹ کیس لا کے ریشم کے سامنے رکھ دیا۔ پڑوسن اس پُراسرار قسم کی صورتِ حال سے پریشان ہوگئی تھی۔ اس کو کچھ بتائے بغیر استعمال کیا گیا تھا۔ معاملہ پُراسرار نہ ہوتا تو اتنا جھوٹ کیوں بولا جاتا۔ وہ سارے آدابِ میزبانی بھول گئیں اور یوں اٹھ کھڑی ہوئیں جیسے وی آئی پی اٹھ جاتے ہیں کہ آپ کا وقت ختم۔ کوئی تکلف کیسا چائے پانی کا .... یہ رویہ تقریباً رخصت کرنے کا تھا کہ اب آپ جاسکتے ہیں۔ میں سوٹ کیس کو کھینچتا ہوا باہر لے آیا جو بالکل نیا تھا۔

''بھائی! یہ کیا چکر ہے۔ کہاں گئے یہ لوگ؟'' ریشم سخت اپ سیٹ تھی۔ ''اچانک غائب ہوگئے۔''

''یار مجھے کیا معلوم؟''

''جھوٹ بول رہے ہو تم .... تمہیں ضرور پتا ہوگا۔ تمہارا دوست تھا وہ۔'' وہ چلائی۔

''جب دوست ملے گا تو پوچھوں گا اس سے کہ تم مجھے بتائے بغیر کہاں چلے گئے تھے اور کیوں؟ ابھی تو گھر چلو خاموشی سے، یہاں چیخ پکار مچانے سے کچھ فائدہ نہیں۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی اور میں نے گاڑی کو واپسی کے راستے پر موڑ لیا۔ گھر پہنچ کر ریشم نے پھر ہنگامہ کیا اور میں نے اسے پھر ڈانٹا کہ کیا وہ مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہے؟ میں کیا بتاؤں کہ ملک غلام محمد اور اس کی بیوی پر کیا افتاد آئی کہ وہ راتوں رات گھر چھوڑ کے چلے گئے۔ روزینہ خاموش رہی مگر سکندر شاہ نے میری حمایت کی۔ معاملہ رات بھر کے بعد رفع دفع ہوگیا۔ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے انور کو پہلے بتادیا تھا کہ ملک غلام محمد کے گھر نہیں اب وہ ماں کے ساتھ سکندر کے گھر آئے۔ صبح سویرے میں نے اسے اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

اس سے سکندر کو فرق نہیں پڑتا تھا کہ ریشم اس کے گھر میں روزینہ کے ساتھ رہے یا انور اسے یہاں سے بیاہ کے لے جائے۔ وہ ملک غلام محمد کے اچانک روپوش ہونے سے تشویش میں مبتلا تھا۔

''اس الو کے پٹھے نے ایسا کیوں کیا؟'' اس نے فرصت اور موقع ملتے ہی مجھ سے پوچھا۔

''مجھے بھی اتنا ہی معلوم ہے جتنا آپ کو۔''

''اس کی سفارش تم نے کی تھی۔ تم لائے تھے اسے یہاں۔''

''غلط، وہ مجھے اپنے ساتھ لایا تھا۔ مجھ سے زیادہ اسے تم جانتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے زبانی معاف کر دینے پر اسے اعتبار نہیں تھا، اسے ڈر ہوگا کہ میرے سامنے تم نے بڑی فراخ دلی دکھائی لیکن بعد میں تم ضرور کچھ کرو گے۔''

وہ برہم ہوگیا۔ ''کیا کروں گا بعد میں؟''

''مروا دو گے اسے، سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ جو سارے معاملات سے واقف ہو۔ وہ راز جانتا ہو جو بعد میں کمزوری بن جائیں اور ڈر ہو کہ وہ فائدہ نہ اٹھائے، بلیک میل نہ کرے، اس کو زندہ رکھنے کا رسک کیوں لیا جائے۔''

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ''ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا میرا۔''

''اسے تو ڈر تھا نا، جانے دو اب وہ گیا تو گیا۔ بھول جاؤ اسے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''او کے، میں بھول گیا۔ کیا وہ بھی بھول جائے گا۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ مجھے بلیک میل نہیں کرے گا۔''

''میں دیتا ہوں اس کی ضمانت۔'' میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ ''اتنا اعتماد ہے اس کا.... کب سے جانتے ہو اسے؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اعتماد ساری عمر ساتھ رہ کے بھی نہیں بنتا اور دو دن میں حاصل ہو جاتا ہے۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ''کل تم انور کی طرف گئے تھے۔ بات کی اس سے؟''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''بات ہوگئی لیکن وہ دس فیصد پر راضی نہیں۔''

''وہ کیا مانگتا ہے؟''

''پچیس فیصد.... اور اب میں بھی یہی مانگتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ خفگی سے بولا۔ ''تمہیں بھی بہکا دیا اس نے؟''

''میں کیا دودھ پیتا بچہ ہوں کہ وہ مجھے بہکائے۔ دس فیصد کا پروپوزل آپ کا تھا۔ میں نے قبول نہیں کیا تھا ابھی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔''

''یہ آپ کی مرضی.... ابھی کسی نے بھی ایگریمنٹ سائن نہیں کیا تھا۔ آپ اپنا کام خود کریں یا کسی کو رکھ لیں۔''

''یہ بلیک میلنگ ہے۔'' اس نے غصے سے چھوٹی میز کو لات ماری۔

''یعنی سودا آپ کے فائدے کا ہونا چاہیے۔ ہم اپنے فائدے کی بات کریں تو بلیک میلنگ؟''

وہ ناراضی سے اٹھ کے چلا گیا۔ میں نے بھی روزینہ کے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں دونوں لڑکیاں سوٹ کیس کھولے پریشان بیٹھی تھیں۔

''بھائی! یہ سامان میرا نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کپڑے تمہارے لگتے ہیں مجھے۔''

''مگر یہ سوٹ جو بغیر سلے ہیں اتنے مہنگے اور کام والے.... اور اس کے ساتھ یہ سب زیور.... سونے کے سیٹ.... نیکلس اور کڑے۔''

''یہ شادی کا سامان ہے۔ بہت مہنگا۔'' روزینہ بولی۔

''یہ کلثوم بھابی نے تمہاری رخصتی کا بندوبست کیا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''رخصت خود ہوگئیں کچھ بتائے بغیر.... میں اسے نہیں رکھ سکتی۔'' ریشم بولی۔

''اوکے، میں رکھ لیتا ہوں۔ تمہاری رخصتی کا انتظام تو مجھے ہی کرنا ہے۔ اگر وہ تحفہ دے گئے ہیں تو میں ٹھکرا نہیں سکتا اور واپس کرنے کہاں جاؤں؟''

''بھائی! یہ کل اثاثہ زیور ہے۔'' ریشم نے کہا۔

''تحفے کی مالیت نہیں دیکھی جاتی۔ خلوص دیکھا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''خلوص خاک ہے۔ یوں راتوں رات غائب ہو گئے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ ضرور کوئی خطرے کی بات ہوگی مگر ان کے معاملات سے ہمیں کیا، ہمارے ساتھ تو اچھے ہیں وہ.... اور تم یہ دیکھو، کس ٹھاٹ سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ کہاں سے ہو رہی ہے اور کس سے ہو رہی ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' وہ نظر جھکا کے بولی۔ ''قسمت کے کھیل بڑے عجیب ہیں بھائی، پتا نہیں سب کچھ کیسے ہوتا چلا گیا۔ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تقدیر مجھے لے گئی۔ ورنہ وہ بھی وقت تھا کہ اکبر جیسا بھیڑیا میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور آج وہ نہیں ہے دنیا میں۔ میرا ابھی باپ نہیں ہے لیکن اس کی روح دیکھ رہی ہوگی سب تو کتنی خوش ہوگی۔ بھائی مل گیا۔ ملتان میں گھر مل گیا اپنا.... انور بھی مل گیا۔''

''خدا نے میرا نصیب ایسا کیوں بنایا؟'' روزینہ نے اچانک دیوار کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

پھر دونوں کو چپ لگ گئی۔ اس کی بدقسمتی کے سامنے ریشم اپنی خوش قسمتی کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی فاقہ کش کے سامنے کوئی جانتے بوجھتے شیخی مارے کہ وہ کیسے مزیدار مرغن اور طرح طرح کے کھانوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

بالآخر میں نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ''روزینہ! قسمت پر اپنا اختیار کسے ہے۔ ایسے دیکھو تو قسمت نے تمہیں بھی سب کچھ دیا تھا۔ ایک مراد واپس لے لیا۔''

''وہی تو سب کچھ تھا میرے لیے۔'' وہ چلائی۔ ''اب میں کیوں جیوں؟''

''جینے کا مقصد تو اب ہے تمہارے پاس۔'' میں نے کہا۔ ''مراد بھی چاہے گا کہ تم اس کے بچے کی ماں بنو اور اسے پال پوس کے بڑا کرو.... آخر شادی کا مقصد اور کیا ہوتا ہے۔ تم پر زندہ رہنے کی ذمے داری عائد ہوگئی ہے مراد کی طرف سے۔''

یہ سب دل کو تسلی دینے والی اور فضول باتیں تھیں اور وہ سننے پر مجبور تھی۔

ریشم نے اچانک کہا۔ ''کیا اب میں بھی یہاں رہوں گی؟''

''ہاں، جب تک انور تمہیں نہیں لے جاتا۔ اب اسے بھی یہاں آنا ہوگا۔ تم مہمان ہو اس وقت تک۔''

''بڑا عجیب لگتا ہے یہ سب مجھے .... باپ کا گھر تھا پہلے، پھر چودھریوں کی حویلی .... وہاں سے ملتان میں نادر شاہ کی حویلی .... پھر خالہ کے گھر .... ان کا گھر میرا ہوگیا مگر مجھے آنا پڑا غلام محمد کے گھر، وہاں سے سکندر کے گھر .... اور لوٹ کے پھر انور کے گھر۔''

''ہوسکتا ہے آگے تمہیں لندن یا پیرس جانا پڑے مگر ابھی تو ہم سب کو قسمت نے یہاں جمع کر دیا ہے۔ میں اور انور پارٹنر بن سکتے ہیں سکندر شاہ کے .... کاروباری شریک۔''

''کاروباری شریک؟'' روزینہ نے اور پھر ریشم نے تقریباً ایک ساتھ کہا۔

''ہاں، سکندر شاہ نے ہمیں آفر دی ہے کہ ہم دس فیصد کی شراکت پر اس کے کاروبار کو سنبھالیں۔''

روزینہ ساکت بیٹھی رہی۔ ''پھر؟''

''پھر کیا، ہم نے انکار کر دیا۔'' میں نے کہا۔

''مگر کیوں؟'' روزینہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی تھی۔ تم اور انور بھی یہاں ہوتے .... ہمارے ساتھ۔''

''لیکن روزینہ، یہ مراد کی وراثت ہے .... جس میں سے ہم کو حصہ دیا جا رہا ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو تم۔'' وہ خفگی سے بولی۔ ''اگر مراد ہوتا تو وارث ہوتا۔ اب تو وہ ہے ہی نہیں۔''

''مگر اس کی جگہ تم ہو۔ اس کے بیٹے کی ماں .... یا بیٹی کی .... اس سے فرق نہیں پڑتا۔''

''دیکھو سلیم! تم پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی ہو کے ایسی بات کیوں کر رہے ہو۔ ابھی مالک ہے سکندر شاہ، وہ چاہے تو یہ سب کچھ اٹھا کے کسی کو بھی دے دے۔ خیرات کر دے یا بیچ دے۔ اگر وہ تمہیں پارٹنر بنا رہا ہے تو وہ بنا سکتا ہے۔ میں خود یہی کرتی۔''

''ہمارے انکار کی ایک وجہ اور بھی ہے۔'' میں نے مسکینی سے کہا۔

''وہ کیا؟'' روزینہ بولی۔ ''انور کی ماں بھی اسے اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ چنانچہ انور نہیں آسکتا، اس کی وجہ سے تم ....''

''ایسی کوئی وجہ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''پھر بتاتے کیوں نہیں۔'' اس بار ریشم بولی۔

''یہ کم ہے۔ دس فیصد جو وہ دینا چاہتا ہے۔ انور ایک چوتھائی پر راضی ہے اور میں بھی۔'' میں نے کہا۔

''اتنا تو ہونا چاہیے کم سے کم .... اگر برابر نہیں۔'' روزینہ نے کہا۔

''پھر تم صرف آدھے کی حق دار رہ جاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ ''سلیم! یہ آدھا کیا معنی رکھتا ہے میرے لیے؟ نہر کے پار سب میرا ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی ہے کتنی زمین ہے وہ .... میرے والد کی حویلی اور درگاہ نہ سہی .... کیا دیا اس جاگیر نے انہیں .... باجی کو .... یا مجھے۔''

اس کے مزید جذباتی ہونے سے پہلے میں نے کہا۔ ''سکندر شاہ مجھے مشیر بنانا چاہتا ہے اور انور تو خیر سند یافتہ انجینئر ہے۔ وہ تارک الدنیا ہو کے نہیں بیٹھے گا۔ پچاس فیصد پھر بھی اس کا رہے گا۔ وہ صرف نگرانی کرے گا۔ کام تو ہم کریں گے۔''

''وہ مان جائے گا، نہ مانے تو مجھے بتانا۔'' روزینہ بڑے عزم سے بولی۔

''تم کیا کرو گی؟ ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ وہ مالک ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں بھی مرضی کی مالک ہوں۔ اس نے تمہاری نہ مانی تو میں اس گھر سے چلی جاؤں گی۔ انور کا گھر بھی تو میرا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم دھمکی دو گی اسے؟''

وہ بولی۔ ''وہ اپنا سب کچھ تمہیں دینے کو تیار ہو سکتا ہے مگر مراد کا بیٹا نہیں۔ اپنا پوتا نہیں۔ اس پر قانونی حق میرا ہے۔''

میں اسے دیکھتا رہا اور پھر مسکرایا۔ ''زبردست ٹرمپ کارڈ ہے تمہارے پاس، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ ویسے ہی مان جائے گا۔''

''مان جائے تو اچھا ہے۔ پھر کتنا اچھا ہو جائے گا۔ تم سب یہاں میرے ساتھ رہو گے۔ ہم چاروں ایک ہی جگہ رہیں گے۔''

''یہ ہو سکتا ہے کہ انور اپنی آبائی حویلی میں رہے یا اس گھر میں چلا جائے جو اب ریشم کا ہے۔''

''ریشم اسے منا لے گی یہاں رہنے پر .... کیوں ریشم؟'' روزینہ بولی۔

ریشم کا رنگ لال ہوا۔ پھر اس نے مسکرا کے سر ہلایا۔

''انور کہتا ہے کہ میں وہ حویلی اور باغ بھی بیچ دوں گا، اب وہ مراداں والی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ اس سے اچھی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔ کیا ہے وہاں سوائے ایک قبرستان کے۔ شاید ماں کی زندگی تک ایسا نہ ہو۔ اس کی خواہش ہے کہ وہیں دفن ہو۔ جہاں اس کا شوہر ہے اور بیٹا ہے۔ ابھی ہم وہاں رہیں گے۔ مگر وہ جگہ کون سی دور ہے۔''

''میں نے بھی بہت سوچا کہ نہر پار کی زمین کا میں کیا کروں۔'' روزینہ بولی۔

''تم اسے کاشت کے لیے دے سکتی ہو۔'' میں نے کہا اور یہ کہنے سے گریز کیا کہ ابھی زندگی بہت پڑی ہے۔ تم چاہو تو پھر شادی کر سکتی ہو۔ ابھی یہ مشورہ بہت قبل از وقت ہوتا اور اس کے جذبات شدید مجروح ہوتے کیونکہ ابھی مراد کا چہلم بھی نہیں ہوا تھا۔ دوسری وجہ مراد کا وہ بچہ ہوتا جو روزینہ کے وجود میں پرورش پا رہا تھا۔ اس کے لیے کسی سوتیلے باپ کا تصور بھی وہی ماں کر سکتی تھی جو اولاد سے زیادہ خود اپنی زندگی کی خوشیوں کا سوچے۔ روزینہ ایسی نہیں تھی۔

''فصل اگانے میں فائدہ ہے۔ بہت فائدہ ہے۔ کیونکہ وہ نہری زمین انتہائی زرخیز ہے جو نہر کے ساتھ ہے اس سے بہت پیسا آئے گا۔ لیکن اسے کنٹرول کون کرے گا۔ یہ مردوں کا کام تھا۔ مزارعوں پر چھوڑ دیا جائے تو وہ قابض بھی ہو جاتے ہیں اور بے مہار بھی۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''شاید کچھ لوگ ہوں جو درگاہ کو پھر آباد کرنا چاہیں۔''

''بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔ کچھ لوگ آئے تھے۔ مجھ سے وہ کیسے ملتے۔ سکندر کو قابو کرنا چاہتے تھے۔ سکندر شاہ نے کہا کہ آج کے بعد ایسا سوچنا بھی مت۔ پیر سائیں اب نہیں ہیں۔ ان کی کوئی اولاد نرینہ نہیں جو گدی نشین ہو۔ ان کی قبر ہے وہاں جو چاہے آ کے فاتحہ پڑھے یا منت مانے۔ لیکن چادر چڑھانے اور عرس منانے کا سلسلہ ختم۔ میں نے پولیس گارڈ بٹھا دی ہے وہاں اور اپنے سیکیورٹی گارڈ بھی رکھ دیے ہیں۔ کیونکہ ان کی بیٹی میرے گھر میں ہے اس لیے میری ذمے داری ہے کہ جگہ کی حفاظت کروں اور اس کا غلط استعمال نہ ہونے دوں۔ میں نے خود سنا۔ وہ بضد تھے کہ یہ بات خود پیرزادی ان سے کہہ دے۔ میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ وہاں سکندر شاہ نے مجھے کھڑا کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''شاہ صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہاں کوئی مزار یا درگاہ نہیں بنے گی۔'' ان میں ایک خبیث نے کہا کہ ہمیں کیا معلوم سکندر شاہ صاحب یہ بات کس سے کہلوا رہے ہیں۔ میں دروازے کے پیچھے سے نکل کے سامنے آ گئی اور کہا۔ ''تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ عدت میں عورت بات بھی نہیں کرے گی۔ سامنے آنا تو دور کی بات ہے لیکن شریعت میں سختی نہیں ہے۔ عورت ضروری کام سے باہر بھی آ جا سکتی ہے۔ اپنے کام سے جو اس کے سوا کوئی نہ کر سکے۔ اب تم جاؤ اور خبردار جو کسی نے شرانگیزی کی۔ میں سب کو بند کرا دوں گی۔ میں جانتی ہوں پیر سائیں کے مرید کون تھے۔ بس اس کے بعد وہ بھاگ گئے۔''

''تو اب کیا سوچا ہے تم نے؟''

''میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ آدھی زمین بیچ دوں۔ اس سے خاصی رقم ملے گی۔ اس رقم سے میں وہاں ایک گرلز اسکول بنا دوں۔ میرے والد لڑکیوں کی تعلیم کے حامی تھے۔ اسکول انہی کے نام پر ہوگا۔ آگے چل کر یہ کالج بھی بن سکتا ہے اور یہ کام بھی تم ہی کرو گے پھر جب اسکول بن جائے گا تو میں سنبھال لوں گی۔ مالک اور پرنسپل بن کر.... کیا خیال ہے؟''

''اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ایک صدقہ جاریہ ہوگا تمہارے والد کے لیے۔''

رات کو سونے سے پہلے میں سوچتا رہا کہ آخر جو میں چاہتا ہوں وہ کیوں نہیں ہوتا۔ کوئی نادیدہ قوت ہے جو میرے عزائم کی راہ میں دیوار کھڑی کر دیتی ہے۔

اب نادر شاہ سے انتقام کی آگ جو میرے دل میں الاؤ کی طرح بھڑکتی تھی مدھم ہو کے چراغ کی لو بن گئی تھی۔ کیا میں اسے بھی بجھا دوں؟ اسے بھڑکا کے ملتا بھی کیا۔ نادر شاہ کا قتل میرے بھائی کی بخشش کا سبب تو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ مُنّا! بدلہ لے میرا خواہ تجھے پھانسی ہو جائے۔ نہیں مجھے ان کی خوشی کا خیال ہے تو میں کامیاب ہو کے دکھاؤں..... دوسری بار خودکشی کی کوشش نہ کروں....

نورین کا خیال میرے دل سے نکلا نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ اس پر ناامیدی کی گرد بیٹھ رہی تھی۔ اگر موقع ملتا اور میری شادی شاہینہ سے ہو جاتی تو پھر نورین مجھے کہاں یاد رہتی۔ میں کوشش ضرور کروں گا کہ وہ مل جائے اور نہ جانے کیوں دل کہتا ہے کہ وہ ملے گی۔

صبح مجھے پھر رات والا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اس وقت میں خاموشی سے نکل جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ ایسے چوروں کی طرح بھاگنے کی ضرورت کیا ہے۔ میں بتا کے جاؤں تاکہ کسی غیر متوقع حادثے کی صورت میں کوئی میرا

بھی سراغ لگائے۔ میں نے سکندر کی بیوی کو نماز میں مصروف دیکھا۔ وہ فارغ ہوئیں تو میں ان کے پاس گیا اور سلام کرکے بیٹھ گیا۔ وہ بے حد کمزور ہو گئی تھیں۔ ان کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ کھال بس ہڈیوں پر چپکی رہ گئی تھی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟“ انہوں نے سلام پھیرنے اور دعا ختم کرنے کے بعد پوچھا۔

”دیکھ رہا ہوں آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔“

”میں نے کیا بنا رکھی ہے۔“ وہ مایوسی سے بولیں۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کو اسپتال میں داخل کرا دیا جائے، کچھ دن کے لیے۔۔۔ ریشم رہے گی آپ کے پاس۔“

”میں نے سنا ہے ریشم کو انور بیاہ کے لے جائے گا، چودھرائن کیسے مان گئی؟“

”ریشم بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دن بعد وہ یہیں رہنے کے لیے آجائیں۔“

”یہاں؟ اس گھر میں۔“ وہ ایک دم بھڑک اٹھیں۔ ”میرے ہوتے یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی ماں نے قدم رکھا اس حویلی میں تو میں زہر کھا لوں گی۔“

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ ”آپ کو کیا شکایت ہے اس سے؟“

”شکایت، اس نے تو بڑی کوشش کی تھی کہ سکندر سے شادی ہو جائے..... مجھے بدنام کیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”بھول جائیں پرانی باتوں کو۔“

”کیسے بھول جاؤں۔ ہمارے بڑے سب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر دیا ورنہ وہ بھاگ جاتی۔ جیسے اس کے بھائی کی بیٹی گھر سے میرے بیٹے کو لے گئی اور مار دیا اسے.... سب پر قبضے کے خواب دیکھ رہی ہے وہ۔“

”اس کا کوئی ارادہ نہیں ایسا۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں کیا معلوم، سکندر نے کہا کہ وہ فضلی کے بیٹے کو.... فضلی نام ہے انور کی ماں کا۔۔۔ اسے کاروبار میں شریک کر رہا ہے تو میں نے کہہ دیا کہ بڑی بے وقوفی کر رہا ہے وہ.... اس دن پتا چلے گا جب وہ سکندر شاہ کو نکال باہر کرے گا اور خود قابض ہو جائے گا سب پر.... وہ ہنسنے لگا مگر یہ ہنسنے کی نہیں رونے کی بات ہے۔“

میں نے انور کا دفاع کیا۔ ”اس کے پاس ڈگری ہے اس کام کی جو وہ باہر سے لایا ہے۔“

میں جب بھی ایسے مکمل مرد سے ملی ہوں جو کھانا پکانا، صفائی کرنا اور کپڑے دھونا جانتا ہو تو وہ بدقسمتی سے شادی شدہ نکلا

”ڈگری کیا کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ فضلی کا بیٹا ہی رہ گیا ہے ساری دنیا میں۔“

میں نے سوچا کہ جب بات چل نکلی ہے تو چلنے دی جائے۔ ”سکندر شاہ تو مجھے بھی شامل کر رہا ہے۔“

”اس کا جو دل چاہے کرے۔ میری پہلے بھی کب سنتا تھا وہ۔ سنتا تو آج مراد زندہ ہوتا۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

صورت حال اس حد تک خراب ہو گی۔ اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ سکندر شاہ جتنا فراخ دل تھا اس کی بیوی اتنی ہی انور کے، روزینہ کے اور میرے خلاف تھی۔ ”پھر تو آپ کو ریشم کی انور سے شادی بھی پسند نہیں ہو گی؟“

”میری پسند کون پوچھتا ہے۔ انور چاہتا ہے اور اس کی ماں چاہتی ہے تو میں کیوں کہوں کہ اس کم ذات لڑکی میں کیا ہے؟ انور کو کوئی کمی ہے خاندانی لڑکیوں کی لیکن لگتا ہے اب ایسا ہی ہو گا۔ کم نسل دوغلی، نیچ ذات، کمی کمینوں کی بیٹیاں ہماری چھاتی پر مونگ دلنے آجائیں گی اور ہم پر راج کریں گی۔ مراد کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی تھی میں، اب مراد تو ہے نہیں۔ یہ بیٹھی ہے اپنی کوکھ میں اس کی نشانی لیے اور سکندر پھر رہا ہے اس کے آگے پیچھے۔“

میرے سامنے سکندر ایک کھڑکی میں نمودار ہوا اس کی طرف بیوی کی پیٹھ تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے بلایا اور کھڑکی سے ہٹ گیا۔

اس کی بیوی نے فوراً پلٹ کے دیکھا۔ ”کون تھا؟“

وہ مشکوک لہجے میں بولی۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”کوئی نہیں۔“

”تم اپنے بارے میں بتاؤ.... کس گاؤں کے ہو؟ خاندان والے کیا کرتے ہیں۔ ماں باپ اور بھائی بہن ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ابھی سب بتاتا ہوں۔ چائے لے آؤں اندر سے۔“

لیکن یہ بھاگنے کا بہانہ تھا ورنہ میں کسی مشکل میں پڑ جاتا۔ اندر سکندر شاہ بے چینی سے میرے انتظار میں تھا۔

”تمہاری تو چائے بھی ٹھنڈی ہوگئی۔“ پھر میرا جواب سنے بغیر اس نے کسی کو آواز دی۔ ”یہ چائے گرم کرکے لا اور ناشتا بھی لے آ۔“

ایک ادھیڑ عمر عورت چائے کا کپ اٹھا کے خاموشی سے لوٹ گئی۔

”وہ کیا کہہ رہی تھی تم سے....“ سکندر شاہ نے بیوی کے بارے میں پوچھا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔“

”میں تمہارا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جھوٹ مت بولو۔“

میں نے کہا۔ ”وہ سب کے خلاف ہیں۔ ہم سب کے... جو ہورہا ہے اس کے۔“

”یہ ابھی دو چار دن سے شروع ہوا ہے۔ مجھ سے بھی اس نے بہت جھگڑا کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کا اپنے دماغ پر کوئی کنٹرول نہیں رہا۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوگا لیکن اس میں بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ مجھ سے ڈرتی تھی۔ اب ڈر نکل گیا ہے۔ یہ نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے میرے لیے۔ کیا اس نے تمہیں فضیلت کے بارے میں بتایا؟“

”فضیلت؟ وہ فضلی کہہ رہی تھی اسے۔“ میں نے کہا۔

”یہ کیا چکر ہے؟“

”چکر تھا جوانی کا۔ وہ پسند کرتی تھی مجھے۔“

”اور تم....؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فضیلت کی وہ دشمن ہے حالانکہ تیس سال پہلے کی بات ہے۔“

”پھر اب کیا ہوگا؟ انور کی ماں کیسے آئے گی یہاں ... ریشم کی رخصتی کے لیے.... کسی کے یہاں سے جانا کیا سوال۔ اس کو روزینہ سے کوئی ہمدردی نہیں۔“

”ہمدردی؟ میرے سامنے اس نے کیا نہیں کہا اسے؟ آوارہ بے حیا، میرے بیٹے کو لے کر بھاگ گئی اور مروا دیا، کچھ کھلا دیا ہوگا اسے گاڑی پر کنٹرول نہیں رہا۔ بے غیرت خود بچ گئی۔“

”ان کا خیال ہے کہ ہم سب مل کے تمہیں کنگال کر دیں گے۔ روزینہ کے ساتھ مل کر۔“

وہی خادمہ پھر آئی اور ٹرالی کو ہمارے درمیان کھڑی کر کے واپس چلی گئی۔ ”یہ اس کی جاسوس ہے۔“ سکندر بولا۔ ”سب سنتی ہے اور اس تک پہنچا دیتی ہے۔“

”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”اگر کوئی پاگل سڑک پر جھاڑیاں، کانٹے ڈال دے تو تم واپس ہو جاؤ گے اور وہ روز ایسا کرے پھر؟“

”میں وہ راستہ چھوڑ دوں گا۔“

”میں اس پاگل کو چھوڑ دوں گا.... پاگل خانے میں۔“

میں چونکا۔ ”پاگل خانے میں؟“

”اسے نفسیاتی علاج گاہ کہتے ہیں۔ صاف ستھرا کمرا، ڈاکٹر، نرسیں، اچھا کھانا اور علاج۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں۔“

”وہ ٹھیک ہو جائیں گی؟“ میں نے کہا۔

”ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں۔ اچھا ہے اس کے دماغ کا خنّور نکل جائے۔ ورنہ اسے وہیں گزارنی پڑے گی زندگی۔ دنیا کے کام تو نہیں روکے جا سکتے۔ روزینہ نے مجھ سے کہا کہ تمہاری بات مان لوں۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”روزینہ نے کہا؟ کب؟“

”کل رات کو جب میں سونے لیٹ گیا تھا۔ اس نے مجھے بلایا اپنے کمرے میں اور کہا کہ تمہاری بات مان لوں۔ جیسے حکم دے رہی ہو۔ لیکن میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ انور کی اور تمہاری شرط مجھے منظور ہے۔“

ہم نے ہاتھ ملایا۔ ”اس پر عمل درآمد کب سے ہوگا؟“

”یکم اگست سے۔ جولائی کے آخری ہفتے میں مراد کا چہلم ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ روزینہ کو بھی اس کا حصہ دے دوں۔ میری جگہ پچاس فیصد کی پارٹنر بن جائے مگر اس نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک کہا اس نے۔ تم کیا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاتے؟“

”میں.... میں نے کچھ اور سوچا تھا۔ حج بیت اللہ پر چلے جائیں ہم دونوں.... لیکن ابھی اس کی حالت

ایسی نہیں، کام مجھے ہی کرنا پڑتا۔ یہ روزینہ کے بس کی بات نہیں تھی۔"

"وہ تو ویسے بھی اپنے پلان رکھتی ہے۔"

"کیسے پلان؟"

میں نے بتادیا۔ وراثت میں ملنے والی آدھی زمین بیچ کے آدمی پر اسکول قائم کرنا چاہتی ہے وہ۔"

وہ سر ہلانے لگا۔ "اسی لیے ان مریدانِ خاص کو بے عزت کر کے رخصت کر دیا تھا اس نے۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ اتنے لمبے چوڑے، برسوں میں قائم ہونے والے کاروبار سے دستبردار ہونے کا ایک جذباتی ردِعمل ہے جو وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہر شخص کتنی ہی کامیابی کیوں نہ حاصل کرلے کچھ بھی بے مقصد نہیں ہوتا اور ننانوے فیصد صورتوں میں اس کے پیشِ نظر اپنے بعد آنے والوں کی خوش حالی ہوتا ہے۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی محنت کا ثمر ان کے بچوں کو محنت کے بغیر مل جائے۔ دیکھا جائے تو یہ ایک منفی رجحان ہے۔ ایسے لوگ اگلی نسل کو نکما اور حرام خور بنا دیتے ہیں۔ پھر وہ عیاشی کے سوا کوئی کام نہیں کرتے۔ محنت کیے بغیر سب کچھ ملتا ہو تو محنت کیوں کی جائے۔ مگر اولاد کے پیار میں کسی کو پیار کا منفی پہلو نظر نہیں آتا۔

ایسا ہی سکندر شاہ نے سوچا تھا کہ بس اب مراد اور اس کے بعد آنے والی نسلوں کو غریبی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ امیری ان کے مقدر میں خود میں نے ڈال دی ہے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ خدا نے تقدیر کے معاملے میں اس کی دخل اندازی کو پسند نہیں کیا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ ساری پلاننگ اور محنت دھری رہ گئی جب وارث کوئی نہ رہا۔ اس بارے میں تو سکندر شاہ نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی شکست کے بعد وہ اپنے مقصد سے بھی پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے عمر کو شدت کے ساتھ خود پر سوار کرلیا حالانکہ ساٹھ سال کوئی زیادہ عمر نہ تھی۔

اس کے قانونی مشیروں کی فرم نے تمام دستاویزات بنائیں۔ اچانک مالک وہ نہیں رہا۔ مالک ہم تین ہو گئے۔ میں، انور اور روزینہ۔ یوں مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ یہ محل نما گھر، گاڑیاں اور اس کے اپنے بینک اکاؤنٹ کی رقم بہت تھی۔ قانوناً روزینہ کی حیثیت ایم ڈی یا چیئرمین کی بنتی تھی۔ کنٹرولنگ شیئرز اس کے تھے اور بدل نہیں سکتے تھے۔ پچاس فیصد کو قانونی ماہرین نے اکیاون فیصد کر دیا۔ میں اور انور دونوں ہی اپنے حصے میں سے ایک فیصد کی قربانی دینے کو تیار تھے۔ قانونی ماہرین نے وجہ بتائی اور دونوں کے حصے میں سے نصف فیصد کم کر دیے۔ ساڑھے چوبیس فیصد کا مالک میں بنا اور اتنے ہی انور کے حصے میں رہے۔

میرے سوال پر وکیل نے کہا۔ "اب فیصلہ سازی میں آپ دونوں برابر ہوں گے۔ کوئی کسی پر دباؤ نہیں ڈال سکتا۔ ورنہ چوبیس فیصد والا سب سے کم رہتا۔ اکیاون فیصد پر انتظامی امور کا اختیار روزینہ مراد کا رہے گا۔ دوسرے شیئر ہولڈر انچاس فیصد ایک طرف ہوں تب بھی وہ سب کے فیصلے کو مسترد کرنے کا قانونی اختیار رکھتی ہے۔"

یہ دستاویزات عدالت میں جمع کرا دی گئیں۔ فیصلہ محض ایک رسمی کارروائی تھی۔ اس سے پہلے مراد کا چہلم آ گیا۔ باہر فاتحہ خوانی ہوتی رہی اور پلاؤ زردہ کھانے والے مراد کی مغفرت کی دعا کے ساتھ سکندر شاہ کے لیے صبرِ جمیل کی دعا مانگ کر جاتے رہے۔ سکندر شاہ سب سے بے نیاز اپنے کمرے میں سوتا رہا۔ وہ مراد کے غم کو بھولا رہا نہ فاتحہ خوانی میں شریک ہوا، نہ اس کی قبر پر پھول چڑھانے گیا۔ مراد کی بیوہ روزینہ دن بھر روتی رہی۔ ریشم اسے تسلی دینے کے چکر میں خود بھی روئی۔ مراد کی ماں پر اس دن پاگل پن کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی بہو کو گالیاں دے رہی تھی۔ بے حیا، بے شرم اسے بھگا کے لے گئی۔ ماں باپ تو مر گئے، ہم زندہ ہیں زمانے کو اپنا کالا منہ دکھانے کے لیے.... مار دیا میرے بیٹے کو.... اس سے اچھا مل گیا ہوگا کوئی.... اگرچہ وہ کمرے میں بند تھی مگر اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اسے کھانا پانی دینے والے نوکر چاکر تنگ دکھی تھے۔

اگلا دن طلوع ہوا تو ایسا تھا جیسے طوفانی رات کی پُرسکون صبح۔

"تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ انور کہاں ہے؟" سکندر شاہ نمودار ہوا۔

"انور؟ آ جائے گا۔ کیا کام ہے؟" میں نے کہا۔

"کام مجھے نہیں، تمہیں کرنا ہے۔ سب بتا دیا سمجھا دیا۔" اس نے مختلف پروجیکٹس کے نام لیے جو رک گئے تھے اور بتایا کہ ہمیں کس سے فوراً ملنا چاہیے۔

"میں انور کو بلاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اندر سکندر کی بیوی چلّانے لگی۔ "فضلی آ گئی، بے غیرت اس گھر میں۔"

"اس کی حالت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔"

"آگے بہت مشکلات پیدا ہوں گی شاہ جی۔"

"فکر نہیں کرو۔ اس کا علاج بھی آج شروع ہو جائے

گا۔ میری بات ہوگئی ہے ڈاکٹر مبین سے۔''

''آپ اسے مبین کے نفسیاتی کلینک میں داخل کرائیں گے؟''

''ہاں، کیا خرابی ہے اس میں؟'' وہ بولا۔

''اس کی شہرت بہت خراب ہے۔ وہ جعلی ماہر نفسیات ہے۔ زیادہ کیس منشیات کی عادت چھڑانے کے لیتا ہے۔''

اس نے جاتے جاتے کہا۔ ''تم فکر مت کرو، میں نے سب معلوم کرلیا ہے۔ مراد کی ماں کا معمولی ہسٹریا ہے۔ وہ ٹھیک ہوجائے گی۔''

گھر میں شور سے بچنے کے لیے میں باہر نکلا اور دائیں طرف بنے ہوئے آفس بلاک میں چلا گیا۔ یہ کمروں کی طویل قطار تھی جن کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔ پہلا کمرا سکندر شاہ کا تھا۔ جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پہلا سیکریٹری کا جس میں ایک سیکریٹری بیٹھتی تھی۔ وہ ایک ذمّے دار سنجیدہ عورت تھی جو دس سال سے اہم ذمّے داریاں نبھا رہی تھی۔ اس کے کمرے میں مہمانوں کے انتظار کے لیے صوفے لگے ہوئے تھے۔ سکندر شاہ کے کمرے میں جانے والا دروازہ اس کے پیچھے تھا۔ برآمدے میں اگلے دو کمرے مجھے اور انور کو دیے گئے تھے۔

اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب میں آفس چیئر پہ بیٹھا تو نہ جانے کہاں سے چار افراد نمودار ہوئے۔ وہ عملے کے لوگ تھے جو آخری کمرے میں بیٹھتے تھے۔ انہوں نے بڑے ادب سے ہاتھ ملا کے اپنا تعارف کرایا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ کیا فرائض سرانجام دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک ڈائریکٹر تسلیم کرلیا تھا جس کے سپرد مالی اور انتظامی معاملات تھے۔ وہ پرانے لوگ تھے اور شاید اندازہ کرنا چاہتے تھے کہ نیا باس کیسا ہے اور وہ ہمیں چلائے گا یا ہم اسے۔ پھر میں انور کی طرف نکل گیا اور اسے تازہ ترین صورتِ حالات سے آگاہ کیا۔

استاد گامارستم کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ انور کو اپنا فون نمبر بتا دے گا۔ اس کے بعد میں اس سے مل بھی سکتا تھا مگر اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے ابھی تک وہ لاپتا تھا۔ میں نے انور کو سکندر شاہ کی خفگی سے آگاہ کیا۔

''اپنی ماں سے بات کی تو نے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں بڑی مصیبت ہے۔ وہ متفکر ہوگئی تھیں میری بات پر کہ ریشم کے لیے ان کو وہاں جانا پڑے گا۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں کہ بیٹا اور کتنا ذلیل کراؤ گے مجھے آخر.... میں نے کہا کہ آپ جانا نہیں چاہتیں تو رہنے دیں۔ میں کسی ہوٹل میں انتظام کرلیتا ہوں ملتان کے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ ریشم اسی گھر میں ہوتی جو اَب اس کا ہے مگر اس کے ساتھ کون رہے گا؟ کلثوم بھابی چلی گئی۔ روزینہ عدت میں بیٹھی ہے۔ خیر، دیکھی جائے گی وقت آنے پر، سکندر شاہ کا خیال ہے بیوی کو پاگل خانے میں چھوڑ آئے۔''

''پاگل خانے میں؟ ایسی حالت تو نہیں ہے ان کی۔ وہ علاج کراسکتا ہے۔''

''وہ ڈاکٹر مبین کے اسپتال کی بات کررہا تھا۔ پاگل خانہ ہی ہے وہ۔''

''تو جانتا ہے کوئی بہتر جگہ تو بتا۔''

''میرا مطلب تھا۔ جب وہ نہیں ہوں گی تو کیا ماں جی چلی جائیں گی۔ صرف ایک دن کی بات ہے۔''

''ابھی سے میں کیا بتاؤں لیکن سلیم! حالات نے کیسی کروٹ لی ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے ہمارا بھی۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ روزینہ وہاں مالک ہوگی اور ہم اس کے معاون۔''

میں نے کہا۔ ''یقین کر، آج میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے آفس میں بیٹھا تو مجھے لگا جیسے یہ سب خواب ہے۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور سب ختم ہوجائے گا۔ کیا ٹھاٹ باٹ والا کمرا ہے۔ آگے پیچھے نوکر، گارڈ، گاڑیاں، ساڑھے چوبیس فیصد پر بھی میرے حصے میں ساڑھے چوبیس لاکھ سے زیادہ آتے ہیں۔ چوتھائی کروڑ اور ماہانہ پچاس ہزار۔ رہائش، گاڑی، پیٹرول سب فری۔ کیا تھا میرے پاس جب ریشم نے مجھے نہر سے نکالا تھا۔ وہ نوٹ جو میں نے بعد میں نکال کے سکھائے۔ وہ بھی سلونی لے گئی۔ کتنا فاصلہ ہے پھانسی کے تختے سے ڈائریکٹر کی کرسی تک۔ بعض اوقات تو خواب میں بھی وہ ممکن نہیں ہوتا جو حقیقت میں ہوا۔ تقدیر مجھے کہاں سے کہاں لیے پھری اور کہاں پہنچا دیا۔ اب میں کیسے یقین کے ساتھ سمجھوں کہ بس اس کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔''

''ہوگا تو اچھا ہی ہوگا نا پُتر۔''

''کیا پتا انور، بازی پلٹ جائے۔ زندگی کی گاڑی ریورس گیئر میں چلنے لگے اور یہ ظالم تقدیر مجھے پھر وہیں پہنچا دے جہاں سے چلا تھا۔''

''اگر تو خود نہیں بھولے گا اور جائے گا نادر شاہ سے بدلہ لینے یا نورین کے چکر میں تو کچھ نہیں ہوگا۔'' انور بولا۔

''ایک بات بتاؤں تجھے..... نادر شاہ سے بدلے کا خیال چھوڑ دیا ہے میں نے بھائی کے کہنے پر۔''

وہ مسکرا کے مجھے دیکھنے لگا۔''انہوں نے فون کیا تھا عالمِ بالا سے کہ لیٹر بھیجا ہے؟''

''تو مذاق سمجھے گا اسے۔ وہ آئے تھے میرے پاس۔ خواب ہی ہوگا جو میں نے دیکھا مگر مجھے حقیقت لگا۔ انہوں نے منع کیا مجھے۔ اپنی قسم دی۔ تو پاگل سمجھ سکتا ہے مجھے۔''

''پاگل تو ہے تو ملک مگر فیصلہ عقل مندی والا کیا ہے۔ اس نورین سے بھی جان چھڑا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''ایک بار میں اسے تلاش کرنے جاؤں گا۔ وہ نہیں ملی تو واپس آجاؤں گا۔''

''مشکل ہے۔ تو نکل جائے گا پہاڑوں جنگلوں اور صحراؤں میں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔''میرا خیال ہے کہ یہاں تک آیا ہوں تو رمضان کو دیکھ لوں۔ استاد نے کہا تھا کہ وہ ملنا چاہتا ہے۔''

کسی دشواری کے بغیر میں نے نہر کے پل پر سے کار کو گزارا اور اس گاؤں میں لے گیا جہاں رمضان تھا۔ لگتا تھا کہ میں اپنے خواب سے گزر رہا ہوں۔ اس کا ایک کمرے والا مکان وہی تھا۔ خواب بڑا دہشت ناک تھا۔ میرے پیچھے رمضان کا بھانجا پولیس لے آیا تھا کیونکہ میری گرفتاری کرا کے یا مجھے زندہ یا مردہ پیش کر کے کوئی بھی ایک لاکھ کا انعام وصول کر سکتا تھا۔ ابھی تک میں اشتہاری مجرم تھا۔

اتنے کم وقت میں تو شہر کی وسعت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس گاؤں میں کیا بدلتا۔ میں اس راستے سے بارہا گزرا تھا۔ سب کچھ وہی تھا۔ سوائے اس نہر کے گدلے پانی کے جس پانی سے ریشم نے مجھے نکالا تھا، وہ نہ جانے آگے کہاں جا کے کسی پیاسی کھیتی والی زمین میں جذب ہو چکا تھا۔

وہ بھی اسی نہر کا پانی تھا جس میں سے نورین کو رمضان نے نکالا تھا۔ یہ بات تجھے کسی اور نے بتائی تھی۔ خود رمضان نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ جو لڑکی درگاہ پر نظر آئی تھی نورین نہیں، فاطمہ تھی۔ اس کی کہانی الگ تھی اور اب دونوں کہانیاں اتنی الجھ گئی تھیں جیسے ایک رنگ کے دو دھاگوں کی ریل۔ میں پل سے اتر کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ نورین کا چہرہ میرے تصور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہوا میں تیرتی اس کی شبیہ مجھ سے آگے چل رہی تھی۔ کبھی وہ مسکراتی تو نورین بن جاتی اور اداس ہوتی تو فاطمہ۔ اگر ان میں فرق تھا تو بس اتنا ہی تھا۔

گاڑی کو میں نے رمضان کے گھر سے کچھ فاصلے پر روک دیا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک خوف تھا۔ جیسے وہ خواب نہیں تھا جس میں میری رمضان سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے جو کہانی سنائی، سچ تھی۔ خواب سچے بھی ہوتے ہیں۔ ایسا بہت لوگوں کا یقین تھا۔ وہ بھی خواب ہی تھے جن میں نورین یوں آئی کہ میں نے حقیقت سمجھا مگر آنکھ کھلی تو حقیقت کھل گئی۔

کسی دشواری کے بغیر میں نے اس گھر کے دروازے کو پہچان لیا۔ میں نے باہر لگی کنڈی کو ہلایا تو اندر سے کمزور سی آواز آئی۔''کون ہے؟ آجاؤ' دروازہ کھلا ہے۔''

میں نے دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا۔ اندر تاریکی تھی۔ میری آنکھوں کو ماحول سے آشنا ہونے میں کچھ دیر لگی۔

رمضان کے کمرے کا منظر تمام تفصیلات کے ساتھ وہی تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین بات تھی جس پر مجھے پلک جھپکتے میں اعتبار آگیا، میرا خواب سچا تھا۔ پیش آنے سے پہلے کے واقعات میں نے خواب میں کیسے دیکھ لیے تھے۔ اس کی وضاحت عقل نہیں کر سکتی تھی۔

اندر چارپائی پر رمضان لیٹا ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے دیکھا تھا۔ نیچے کھانے کے وہی برتن رکھے تھے جو مجھے خواب میں نظر آئے تھے۔ یہاں تک کہ رمضان کے کمرے کی ہوا میں جو بیمار گھٹن تھی اسے بھی میں نے محسوس کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اندر سے میری چھٹی حس نے چلانا شروع کیا بھاگ فرید بھاگ ورنہ آگے بھی وہی ہوگا جو تو نے خواب میں دیکھ لیا تھا۔ ابھی رمضان کا بھانجا تیری گرفتاری کے لیے تھانے دار کے ساتھ نمودار ہو جائے گا اور ایک لاکھ کے انعام کا مطالبہ کرے گا۔ وہ مجھے گن پوائنٹ پر گاڑی میں ڈال کے لے جائیں گے۔ اس خیال نے جیسے مجھے دھکا دیا۔ میں پلٹ کے بھاگ نکلا۔

کیسا پاگل پن کا مظاہرہ تھا یہ۔ بھلا کوئی یوں ہونی کو انہونی کر سکتا ہے؟ یہ تو اسی شخص کی بے وقوفی کی کہانی ہے جو موت سے بھاگ کر کسی پہاڑی کی چوٹی پر جا بیٹھا تھا۔ وہاں فرشتۂ اجل پہلے سے موجود تھا۔ اس نے کہا کہ اچھا ہوا تم خود ہی آگئے۔ میں تو حیران تھا کہ تمہاری جان اس پہاڑ کی چوٹی پر کیسے قبض کروں جبکہ تم سیکڑوں میل دور ایک شہر میں موجود ہو۔ آہستہ آہستہ چھپ کر میں نے واپس رمضان کے گھر کی

طرف چلنا شروع کیا۔ میں اس طرح درختوں کی اوٹ میں آگے بڑھ رہا تھا کہ وہاں سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

جس راستے سے رمضان کا بھانجا پولیس کو لا سکتا تھا۔ اب وہ میرے سامنے تھا۔ خود میں پل عبور کر کے اسی راستے سے آیا تھا۔ میں ایک درخت پر چڑھ گیا اور اس کی شاخوں میں چھپ کر یاد کرنے لگا کہ خواب میں میری گرفتاری کیسے ہوئی تھی۔ ہاں، پہلے رمضان نے مجھے ساری بات بتائی تھی کہ نورین مر گئی تھی اور وہ فاطمہ ہی تھی۔ وہ کسی اور کی بیٹی تھی جسے وہ پال رہا تھا۔ اس کو کہانی سنانے میں کافی وقت لگا تھا۔ شاید آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ خواب اگر سچ تھا تو پولیس کو آجانا چاہیے۔

میں بیٹھا رہا اور گھڑی کی سوئیوں کو آگے بڑھتا دیکھتا رہا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنے پاگل پن کا یقین آنے لگا۔ ایک گھنٹا گزرا۔ پھر دو گھنٹے بیت گئے۔ خواب کا سچ میرے سامنے نہیں آیا۔ رمضان کا بھانجا ایک لاکھ انعام کے لالچ میں پولیس کی نفری لے کر نہیں آیا۔ اب مجھے اپنی حرکت پر شرم آنے لگی تھی۔ میں نوشتۂ تقدیر سے بھاگا تھا۔ اسی بے وقوف کی طرح جو موت سے بھاگا تھا۔ بھلا یہ انسان کے اختیار میں ہے؟ وہ محض اتفاق تھا۔ عام سا اتفاق کہ رمضان کے کمرے کا منظر وہی تھا۔ کوئی اس کے لیے کھانا لاتا ہوگا۔ برتن تو سب جگہ ایسے ہی ہوتے ہیں المونیم کی پلیٹ..... چنگیر، چینی مٹی کا بوسیدہ پیالہ.... شاید ہر گھر میں ہوگا۔

دو گھنٹے بعد میں درخت سے اترا اور مخالف سمت سے رمضان کے گھر گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن وہ اندر نہیں تھا۔ اس کی چارپائی خالی تھی۔ ان برتنوں کے سوا جو فرش پر رکھے ہوئے تھے کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ رمضان نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اب شام ہو رہی تھی۔ کھیتوں سے مرد، عورتیں گھر لوٹ رہے تھے۔ گائے، بھینسوں کو چرانے والے جانوروں کو ہانک کے واپس لا رہے تھے۔ میں نے ایک نوجوان کو روک کے اس سے رمضان کے بارے میں پوچھا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ”وہ جیل میں تھا۔ دونوں ماموں بھانجا۔ ماموں شاید چھوٹ گیا تھا اور واپس آگیا ہے۔ بھانجا ابھی اندر ہی ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”مجھے رمضان سے ملنا تھا۔“ میں نے کہا۔

وہ جواب دیے بغیر مجھے گھورتا چلا گیا۔ عجیب ہونق آدمی تھا۔ شاید وہ بھی مجھے ایسا ہی سمجھ رہا ہوگا۔ میں مایوس ہو کے واپس گاڑی کی طرف جانے کا سوچ رہا تھا کہ ایک بچے نے مجھے اس کے بارے میں مفید معلومات فراہم کر دیں۔

”وہ ادھر قبر میں لیٹا ہوا ہے۔“

میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”قبر میں؟ کیوں لیٹا ہوا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ وہ آٹھ دس سال کا شریر سا بچہ تھا۔

”تم مجھے لے جا سکتے ہو وہاں؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور آگے آگے چل پڑا۔

مجھے زیادہ نہیں چلنا پڑا۔ گاؤں کے چھوٹے سے قبرستان میں کیکر اُگے ہوئے تھے۔ قبریں دور دور اور کچی تھیں۔ بچہ دو تین قبروں کے پاس سے گزرا اور پھر ایک جگہ رک گیا۔ وہاں بظاہر دھنستی ہوئی قبر تھی۔ تازہ کھدی ہوئی قبر نہیں تھی کہ کوئی اس میں سیدھا لیٹ جائے۔ بچے نے اندر دیکھا اور سر ہلایا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے کہا اور خالی قبر میں دیکھا۔ اس میں مٹی بھر گئی تھی۔ ”اس میں تو کوئی نہیں۔“

”وہ میں بھول گیا۔“ اس نے کہا اور اپنے پیچھے دیکھا۔

مجھے شک ہوا کہ وہ شرارت نہ کر رہا ہو اور مجھے بے وقوف بنا کے یہاں لے آیا ہو۔ میں کیا کر سکتا ہوں، ڈانٹا تو وہ ہنستا ہوا بھاگ جائے گا۔

”ادھر، ہاں وہ جو بیری کا پیڑ ہے۔“ وہ میری پروا کیے بغیر دوسری طرف دوڑا۔

میں اس کے پیچھے گیا۔ یہ واقعی تازہ کھدی ہوئی قبر تھی جس کے کناروں پر مٹی کے ڈھیر تھے۔ کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اس قبر کا استعمال نہیں ہوا تھا اور مٹی بارش پڑنے سے جم گئی تھی۔

بچہ فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ ”یہ دیکھو، یہاں لیٹا ہوا ہے وہ۔“

میں نے بے یقینی سے دیکھا مگر قبر میں رمضان سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے میں نے اسے اپنے گھر میں زندہ سلامت دیکھا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ ”رمضان!“

اس کے ساکت جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

لاحاصل

بابر نعیم

معلوم سے نامعلوم کا سفر بے حد کٹھن اور مشکل ہوتا ہے... سفر کرنے والا اس سے لاعلم ہی رہتا ہے کہ اس سفر میں مصائب اور المیے بھی جنم لے سکتے ہیں... ایک ایسے ہی خودغرض... مفاد پرست کی روداد... جو تمام مراحل نہایت چالاکی اور منصوبہ بندی سے عبور کررہا تھا...

دریافت کی نئی منزلوں کی جانب محوِ سفر کی کوشش لاحاصل

مائیکل پہیوں والی اپنی بڑی سی ٹوکری کو دھکیلتا ہوا شاپنگ مال کے اس حصے کی جانب بڑھنے لگا جہاں خریدے ہوئے سامان کی ادائی کی جاتی تھی۔ جیسے ہی وہ ایک خالی چیک آؤٹ لین پر پہنچا اور اپنا سامان کنویئر بیلٹ پر رکھنا شروع کیا تو بزنس سوٹ میں ملبوس ایک دراز قامت شخص تیزی سے اس کے قریب سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا اور کیشیئر کو دودھ کا ایک جگ تھما دیا۔

اس شخص نے پلٹ کر مائیکل کی طرف دیکھا اور بولا۔

''میرا صرف بھی ایک آئٹم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم برا نہیں مناؤ گے۔''

''بھلا میں کیوں برا مناؤں۔'' مائیکل نے سوچا۔

''آخر کار تم سفید فام ہو اور تم دن بھر کسی عمدہ سے دفتر میں کام کرتے ہو گے جہاں ٹنوں کے حساب سے پیسا کمایا جاتا ہے اور تمہارے خیال میں شاید میں غیر قانونی طور پر یہاں مقیم ہوں دوست۔'' مائیکل نے یہ سب بلند آواز سے کہنا چاہا لیکن اس وقت تک وہ شخص کیشیئر کو ادائی کر چکا تھا اور تیزی سے باہر دروازے کی جانب جا رہا تھا۔

جب مائیکل شاپنگ مال سے باہر نکلا تو اس نے اسی شخص کو سلور کلر کی لیکسس اسپورٹس میں بیٹھے ہوئے پایا۔

''یہ شخص ابھی تک یہاں کیوں موجود ہے؟ میں تو سمجھا تھا کہ یہ بہت عجلت میں ہوگا گھامڑ۔''

اس شخص کی نظریں بھی مائیکل پر جمی ہوئی تھیں جو پارکنگ لاٹ میں دوسری جانب کھڑے بوسیدہ سے فورڈ ٹرک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب مائیکل ٹرک کے نزدیک پہنچا اور اس کے ڈرائیور سائڈ کا دروازہ کھولنے جا ہی رہا تھا کہ اس شخص نے اپنی فرنٹ پسنجر کھڑکی کا شیشہ نیچے گرایا اور چیخ کر بولا۔

''اے رک جاؤ۔''

مائیکل حیران ہوا کہ مسٹر بگ شاٹ اسے چیخ کر کیوں پکار رہا ہے۔ شاید اسے شاپنگ مال میں قطار توڑنے کی غلطی کا احساس ہو گیا ہو اور وہ اس کی معذرت کرنا چاہتا ہو۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' مائیکل اپنے ٹرک میں سوار ہو گیا اور اپنے سامان کے بھرے دونوں پلاسٹک بیگ پسنجر فلور بورڈ پر رکھ دیے پھر ٹرک اسٹارٹ کرتے ہی وہاں سے چل دیا۔

جب وہ پارکنگ لاٹ سے نکل رہا تھا تو اس نے اپنے ٹرک کے عقبی آئینے میں دیکھا کہ وہ شخص لاٹ کے درمیان میں کھڑا چیخنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی لہرا رہا تھا۔

مائیکل کو مین روڈ پر پہنچے ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے عقب میں ہیڈ لائٹس دکھائی دیں جو تیزی سے نزدیک آ رہی تھیں۔ وہ شخص اس کے ٹرک کے بمپر کے نزدیک آ گیا اور اس کا پیچھے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اس بات کی قطعی پروا نہیں تھی کہ مائیکل اپنے ٹرک کی رفتار بڑھا رہا تھا یا کم کر رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چپک کر چل رہا تھا۔ سڑک پر اور کوئی دوسری کار بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

مائیکل نے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارتے ہوئے اس شخص کو اپنی کار آگے نکال لے جانے کا اشارہ کیا لیکن اس شخص نے تو جیسے تمام راستے اس کے ٹرک کے پیچھے چلنے کا تہیہ کیا ہوا تھا پھر اس شخص نے اپنی کار کی ہیڈ لائٹس فلیش کرنا شروع کر دیں۔

''کیا یہ شخص پاگل ہے۔'' مائیکل نے سوچا۔ اگر وہ اپنے ٹرک کے بریک پر ہلکا سا دباؤ بھی ڈالتا ہے تو ان کے درمیان تصادم لازمی تھا۔

وہ شخص اب پاگلوں کی طرح اپنی کار کی ہیڈ لائٹس فلیش کر رہا تھا۔

تب مائیکل نے اپنا ٹرک ایک تاریک دورویہ بتلی سڑک پر گھما دیا۔ لیکسس بدستور اس کے تعاقب میں تھی۔ مائیکل نے ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

لیکسس کی رفتار بھی تیز ہو گئی اور اس کے ٹرک کے عین عقب میں چل رہی تھی۔

''بس بہت ہو گیا۔'' مائیکل نے سوچا اس نے اپنے فورڈ ٹرک کی رفتار دھیمی کر دی اور اسے سڑک کے کنارے روک لیا۔

لیکسس کار بھی سڑک کے کنارے اس کے پیچھے آ کر رک گئی۔

مائیکل چھلانگ مار کر اپنے فورڈ ٹرک سے نیچے اتر آیا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے نہ تو اپنے ٹرک کا انجن بند کیا اور نہ ہی دروازہ بند کرنے کی زحمت کی۔ وہ پیر پٹختے ہوئے اس شخص کی کار کی کھڑکی کے پاس پہنچا اور چیختے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے، مین؟''

اس شخص نے اپنی کار کی کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا دیا۔ مائیکل اب پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا باوجود اس کے کہ اسے وہ شخص کچھ بھی... اپ سیٹ دکھائی دے رہا تھا۔

''اپنی کار سے باہر نکل آؤ تا کہ ابھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔'' مائیکل نے کہا۔

''لیکن...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں تمہارے اس رویے سے بے زار اور اکتا چکا ہوں۔ تم سمجھتے ہو میں غیر قانونی طور پر یہاں مقیم ہوں۔ یہی بات ہے نا؟''

اس شخص نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن مائیکل نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی اور بولنے کا موقع نہیں دیا۔

''ویل، تم غلط ہو مین۔ میں بھی اس ملک کا ویسا ہی شہری ہوں جیسے کہ تم ہو اور میں دن بھر مزدوری کر کے تم جیسے نا ہنجار امیروں کے لیے مکانات تعمیر کرتا ہوں لیکن تم یہ سمجھے

ہو کہ اس لحاظ سے تم مجھ سے برتر اور بہتر ہو یہی بات ہے ناں؟ صرف اس لیے کہ تم دن بھر ایک قیمتی سوٹ زیب تن کیے ایک صاف ستھرے عمدہ دفتر میں کام کرتے ہو اور تمہارا تعلق ایک اعلیٰ طبقے سے ہے اور میں نچلے درجے سے تعلق رکھتا ہوں لیکن میں تمہیں ابھی بتا رہا ہوں اگر ہم جیسے لوگ نہ ہوتے جو کڑی دھوپ میں دن بھر کام کرتے اور اپنے ہاتھ گندے کرتے ہیں تو تمہارے پاس کام کرنے کے لیے کوئی فینسی آفس بلڈنگ کبھی نہ ہوتی۔"

مائیکل نے دیکھا کہ اس شخص کا داہنا ہاتھ حرکت میں آ گیا ہے۔ یہ سب پلک جھپکتے میں ہوا تھا لیکن یوں لگا جیسے اس میں خاصا وقت لگ گیا ہو۔ بالکل سلوموشن کی طرح۔ کار کے پینل کی روشنی میں اس شخص کے بازو کی حرکت بہ مشکل دکھائی دی تھی جو تیزی سے بلند ہوا تھا۔

کیا اس نے اس شخص کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا؟ کیا اس شخص کے داہنے ہاتھ میں... ایک گن ہے؟ مائیکل کو احساس تھا کہ وہ تیزی سے... اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اگر وہ شخص اسے ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اسے مرنے میں دو سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے۔

تب اس نے دیکھا کہ اس شخص کے ہاتھ میں کیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور اس میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس خالی ہاتھ سے مائیکل کے فورڈ ٹرک کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

مائیکل نے بروقت سر گھما کر دیکھا تو اس کا ٹرک آگے کی جانب سرکنا شروع ہو گیا تھا۔

"کیا اس نے ٹرک کو گیئر میں چھوڑ دیا تھا؟" تب اس نے ایک ہاتھ دیکھا جو ٹرک کا کھلا ہوا دروازہ بند کر رہا تھا پھر ٹرک تیز رفتاری سے آگے نکل گیا۔ مائیکل الجھی ہوئی نگاہوں سے اس شخص کو دیکھنے لگا۔

"یہی میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں شاپنگ مال سے باہر آیا تو میں نے ایک شخص کو تمہارے ٹرک کی عقبی نشست پر سوار ہوتے دیکھا۔ وہ شخص مجھے مشتبہ دکھائی دیا تو میں نے سوچا کہ ٹرک کے مالک کو متنبہ کر دوں لیکن مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ اس ٹرک کے مالک تم ہو پھر جب میں نے تمہیں اس ٹرک کے پاس پہنچتے ہوئے دیکھا تو تمہاری توجہ مبذول کروانے کے لیے چیخ کر تمہیں پکارا لیکن تم نے میری پکار کو نظر انداز کر دیا سو میں نے تمہارا تعاقب شروع کر دیا۔"

"آئی ایم سوری، مین۔ میں سمجھا کہ تم..."

شگوفے

"تم نے شادی کی انگوٹھی غلط انگلی میں پہنی ہوئی ہے۔"

دوست: "ہاں میں نے شادی بھی تو غلط آدمی سے کی ہے۔"

☆☆☆

ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا: "قواعد کی رو سے وقت کے تین درجے ہوتے ہیں۔"

بیوی نے پوچھا "کون کون سے؟"

شوہر نے کہا: "اچھا، بہتر، بہترین اور تم ایک بہترین عورت ہو۔"

یہ سن کر وہ غصے سے بولی۔ "اور باقی دو عورتیں کون تھیں؟"

☆☆☆

میاں بیوی اتفاق سے دونوں غیر حاضر دماغ تھے۔ ایک دن گھر میں دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اپنی جوانی کی شادی کی۔ اتنے میں باہر سے کسی نے دستک دی تو بیوی نے گھبرا کر کہا۔

"اف میرے شوہر آ گئے۔"

یہ سنتے ہی اس کے شوہر کھڑکی سے باہر "اچھا" کہہ کر کود گئے۔

ملک محمد عثمان غنی کھوکھر، کھیوڑا

"تم یہ سمجھے کہ میں پاگل ہوں۔ میں جانتا ہوں شاید اس کی وجہ شاپنگ مال میں میرا وہ ناشائستہ رویہ رہا ہو۔ میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"

"او کے، کوئی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میری کار میں آ جاؤ۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتا ہوں یا پھر تم جہاں جانا چاہتے ہو وہاں لے جاتا ہوں۔"

"شکریہ، مین۔" مائیکل گھوم کر پسنجر سائڈ پر آ گیا اور دروازہ کھول کر لیکسس میں سوار ہو گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مائیکل۔"

"تم سے مل کر خوشی ہوئی، مائیکل۔ میرا نام جیک ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو میں اس شخص کا پیچھا کر سکتا ہوں جو تمہارا ٹرک لے کر بھاگا ہے۔ شاید ہم اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

''نہیں، ٹھیک ہے۔ ویسے بھی میں اس پرانے ٹرک کو بدلنے کے لیے خود کو رضامند کر چکا تھا۔ وہ فضول کاٹھ کباڑ ہی تھا۔'' مائیکل نے جواب دیا۔

جیک یہ سن کر مسکرا دیا۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بزنس کارڈ نکالا اور مائیکل کی جانب بڑھا دیا۔

''استعمال شدہ گاڑیوں کی خرید و فروخت میرا کاروبار ہے۔ میں ایک عمدہ استعمال شدہ کار کے لیے تمہاری خاطر ایک عمدہ سودا کرنے کے لیے تیار ہوں، مائیکل۔''

''کیا تم مذاق کر رہے ہو؟''

''نہیں، قطعی نہیں۔ تم کتنی رقم خرچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ تم ہر ماہ کتنی قسط ادا کر سکتے ہو؟'' جیک نے پوچھا۔

''گیٹ آؤٹ!''

''کیا؟''

''تم نے سنا نہیں؟ میں نے کہا گیٹ آؤٹ۔'' مائیکل نے اپنی شرٹ کے اندر سے ایک پستول نکال لیا۔ ''ابھی اور اسی وقت۔''

''تم یہ کیوں کر رہے ہو؟''

''اس لیے کہ مجھے تمہارا یہ طور طریقہ پسند نہیں آیا، جیک۔''

''کیا؟ میں تو بس تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''فائن، تم نے میری مدد کر دی، کار کار شکریہ۔ اب نیچے اتر جاؤ۔''

اب معاملہ جیک کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

''وہ شخص جس نے تمہارا ٹرک چوری کیا ہے وہ تمہارا ہی ساتھی تھا... ایسا ہی ہے ناں؟''

''یہ اچھا ہوا جیک کہ تم نے خود صحیح اندازہ لگا لیا۔ تم ایک اسمارٹ شخص ہو یا تھے کیونکہ اب سے پانچ سیکنڈ بعد تم مرنے والے ہو۔''

جیک نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ''اوکے، اوکے۔'' اس نے دروازہ کھولا اور نیچے اترنے لگا۔

''رک جاؤ۔'' مائیکل نے کہا۔ جیک اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

''مجھے سائرن کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کیا تم نے پولیس کو فون کیا تھا؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''ہاں میں سمجھا کہ شاید وہ شخص تمہیں قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے سو میں نے نائن ون ون پر فون کر دیا۔''

''واپس اندر آ جاؤ۔''

''واقعی؟''

''میں نے کہا نا کہ واپس اندر آ جاؤ۔''

مائیکل نے اپنی جانب کا دروازہ کھولا اور کار سے نیچے اتر گیا۔ سائرن کی بڑھتی ہوئی آوازیں ان کے عقب سے آ رہی تھیں۔

''روانہ ہو جاؤ اور جتنی تیز رفتاری سے ممکن ہو ڈرائیو کرنا۔'' مائیکل نے کہا۔ جیک نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔

''چل پڑو۔'' مائیکل نے پستول تانتے ہوئے کہا۔ ''یا میں گولیاں برسانا شروع کر دوں، گو۔''

جیک نے فوراً اپنی لیکسس کا انجن اسٹارٹ کیا اور نہایت تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مائیکل قریبی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اسی اثنا میں دو پولیس کاریں تیز رفتاری سے اس کے سامنے سے گزر گئیں پھر وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور دور جاتی پولیس کاروں کو دیکھنے لگا۔ ان کاروں کی فلیش کرتی ہوئی روشنیاں چھوٹی ہوتے ہوتے بالآخر غائب ہو گئیں۔

''احمق کہیں کے۔'' مائیکل نے سوچا۔

اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملاتے ہوئے بولا۔

''اے، واپس آ جاؤ اور مجھے بھی لے لو... ہاں، اس نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ بات نہیں بن سکی، مین لیکن ہمیں کوئی اور سادہ لوح کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ بس اب تم جلدی سے واپس آ جاؤ۔ اس سے قبل کہ پولیس واپس ادھر آ جائے۔''

جیک کی نائن ون ون کال کے جواب میں صرف دو پولیس پٹرول کاریں گزری تھیں۔ مائیکل حیران تھا کہ مزید کوئی کار کیوں نہیں آئی لیکن یہ مائیکل کا خیال تھا۔ ایک تیسری کار بھی ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ اس پولیس پٹرول کار کا ڈرائیور اگلی دو کاروں تک پہنچنے کے لیے اس سڑک پر ایک سو پچیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا علاوہ نہ تو سائرن بجا رہا تھا اور نہ ہی اس کی لائٹس فلیش کر رہی تھیں۔

مائیکل بدستور سڑک کے درمیان کھڑا تھا اور اس کی نظریں مخالف سمت میں تھیں جب وہ تیسری برق رفتار پولیس کار اس کے عین سر پر پہنچ گئی۔

اس سے قبل کہ وہ سڑک کے درمیان سے ہٹ کر خود کو اس تیز رفتار پولیس کار کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر کرتا، اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔

اور پھر...!

نادر علی اپنے آفس میں آکر تھکا تھکا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ آج صبح سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ نزلے کی وجہ سے اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ نزلے سے اس کی جان جاتی تھی۔ بخار اگر ایک سو دو ڈگری بھی ہوتا تو اسے پروا نہیں ہوتی تھی لیکن یہ نزلہ...

اس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بُلایا اور کہا۔ ''نور محمد ایک کپ کافی لے آؤ لیکن کافی گرم ہونا چاہیے۔'' اس نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

فراڈ کی دبیز تہوں میں دوڑتی بھاگتی سنسنی خیز کہانی کے پے در پے موڑ...

گردشِ ایام

سلیم فاروقی

جھوٹ شرمناک اور قابلِ نفرت ہوتا ہے... جبکہ سچ صاف شفاف آسمان کی طرح ہوتا ہے... جھوٹ بزدلی کی علامت اور سچ جرأت و ہمت کی... وہ سیدھے سچے راستے پر گامزن تھا... اچانک ہی دولت کی چکا چوند نے اس کی آنکھیں... دھندلا دیں... اور پھر وہ ان دھندلکوں میں ڈوبتا ہی چلا گیا...

نور محمد اس کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ صرف اسی وقت چڑچڑا ہوتا جب اسے نزلہ زکام ہوتا تھا ورنہ عام حالات میں وہ بہت خوش مزاجی سے پیش آتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نور محمد کافی لے آیا۔ وہ ابھی کافی پی رہا تھا کہ انٹرکام کی بیل بجنے لگی۔

اس نے ریوالونگ چیئر گھما کر انٹرکام اٹھالیا اور سرد لہجے میں کہا۔ "یس!"

"ذرا میرے کمرے میں آیئے۔" دوسری طرف فرم کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر ظہیر تھا۔

"او کے!" اس نے جھنجلا کر ریسیور پٹخ دیا۔

ظہیر سے اس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ جب سے اس نے فرم جوائن کی تھی، اسی دن اس نے ظہیر کو مسترد کر دیا تھا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر خواہ مخواہ ہی غصہ آتا ہے۔ ظہیر بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

وہ اطمینان سے کافی پیتا رہا۔ کافی ختم کرنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگائی اور اس کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

انٹرکام ایک دفعہ پھر بجنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسری طرف ظہیر ہوگا لیکن دوسری طرف فرم کے ایم ڈی خاور حسن بھی ہو سکتے تھے۔ اس نے ریسیور اٹھالیا اور بولا۔ "جی!"

"نادر صاحب! میں نے بیس منٹ پہلے آپ کو بلایا تھا؟" دوسری طرف ظہیر ہی تھا۔

اس کا تحکمانہ لہجہ سن کر نادر کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں بھی کام ہی کر رہا تھا۔ ابھی فارغ ہو کر حاضر ہوتا ہوں۔" اس کا انداز طنزیہ تھا۔

پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ظہیر کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

کمرے کے باہر انتہائی خوب صورت حروف میں ظہیر کے نام کی تختی لگی تھی۔ سید ظہیر احمد، اسسٹنٹ ڈائریکٹر۔

نادر بے پروائی سے دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

ظہیر اسے دیکھتے ہی بولا۔ "نادر صاحب! یہ اسٹار گروپ آف کمپنیز کا چیک آپ نے اپنے نام کیوں ایشو کرایا ہے؟"

"میرے نام؟" نادر نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں، آپ کے نام!" ظہیر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ایک کروڑ کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔"

"یہ میری نہیں اسٹار گروپ کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کی غلطی ہے۔ میں نے تو دیکھے بغیر چیک بریف کیس میں رکھ لیا تھا۔"

"گویا آپ نے چیک کو ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی؟" ظہیر نے زہریلے انداز میں کہا۔

"اسٹار گروپ والے ہمارے پرانے کلائنٹ ہیں۔ ان کا کوئی چیک کبھی باؤنس نہیں ہوا۔"

"میں ابھی خاور صاحب سے بات کرتا ہوں۔" اس نے یوں کہا جیسے نادر نے کوئی غبن کیا ہو۔ "آپ کو ایک مرتبہ پھر اسٹار گروپ کے آفس جانا ہوگا اور یہ چیک کینسل کرا کے دوسرا چیک لینا ہوگا۔ آپ بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ظہیر اپنے کمرے سے نکل گیا۔

نادر جانتا تھا کہ ظہیر اب اسے بدنیت ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ خاور صاحب کو یہ یقین دلائے گا کہ نادر نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔

نادر کو یقین تھا کہ خاور صاحب اس کی باتوں میں نہیں آئیں گے۔ وہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ گزشتہ دس سال سے وہ اس کمپنی میں سیلز منیجر کے عہدے پر کام کر رہا تھا اور اپنی محنت، لگن اور پیشہ ورانہ مہارت سے اس نے خاور صاحب کے دل میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔

اس کی توقع کے عین مطابق تھوڑی دیر بعد ظہیر منہ لٹکائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "خاور صاحب کہہ رہے ہیں کہ غلطی اسٹار گروپ کے اکاؤنٹس سیکشن کی ہے۔ اب چیک درست کرانے کا وقت بھی نہیں رہا۔ کل اسٹار گروپ کا آفس بھی بند ہوگا۔ آپ یہ چیک کل اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیں۔ پھر چار دن کی سرکاری تعطیلات ہیں۔ جب یہ چیک کیش ہو جائے گا تو رقم فرم کے اکاؤنٹ میں شفٹ کرا دیں۔"

نادر نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا اور چیک اس سے لے لیا۔ پھر وہ سیٹی بجاتا ہوا اس کے کمرے سے نکل گیا۔

نادر کی کوشش تھی کہ ظہیر کو جلد سے جلد یہاں سے فارغ کرا کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی سیٹ خود ہتھیا لے۔ اسے امید تھی کہ اس سال کے آخر تک ظہیر کی "چھٹی" ہو جائے گی۔

اگلی صبح انتہائی خوش گوار تھی۔ فضا میں ابھی خاصی خنکی تھی۔ نادر انتہائی شان دار موڈ میں بیدار ہوا کیونکہ اب اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔

وہ ایک بہترین بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ یہ بنگلا، جدید ماڈل کی گاڑی اور ایک قیمتی سیل فون اسے کمپنی ہی سے ملا تھا۔

وہ ابھی تک کنوارا تھا اور کسی دولت مند گھرانے میں شادی کرنا چاہتا تھا۔

وہ ہر کام کے لیے ایک ٹارگٹ متعین کرتا تھا۔ پھر اسے پوری محنت اور لگن سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ ہمیشہ کامیاب رہتا تھا۔

جب اس نے فرم میں جاب شروع کی تو اس کے پاس موٹر سائیکل بھی نہیں تھی۔

اس نے ٹارگٹ بنایا کہ آئندہ پانچ سال کے اندر اندر میں اپنی گاڑی لے لوں گا۔

پانچ سال بعد اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لی۔

پھر اس کی محنت اور لگن کو دیکھتے ہوئے فرم نے اسے جدید ماڈل کی ہنڈا سٹی دے دی۔ نہ صرف گاڑی بلکہ بنگلا بھی اپے درپے کمپنی کو چند کلائنٹس دلوانے کے نتیجے میں عام سے فلیٹ میں مقیم نادر علی کہیں سے کہیں جا پہنچا تھا۔

گاڑی کی رقم فرم کو قسطوں میں ادا کرنی تھی جو اس کی تنخواہ سے ہر ماہ کاٹ لی جاتی تھی۔

وہ خوش تھا۔ اس کے کئی خواب پورے ہو چکے تھے۔

آج صبح وہ جلدی جلدی تیار ہو کر آفس کے بجائے سیدھا اپنے بینک پہنچا اور منیجر کو چیک پکڑا دیا۔

''ایک کروڑ کا چیک ہے؟'' منیجر نے چیک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد پُرخیال انداز میں کہا۔ ''رقم تو خیر مسئلہ نہیں ہے لیکن یہ کراس چیک ہے اور اسے کیش ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔''

''جی سر، میں جانتا ہوں کہ اسے کیش ہونے میں چند دن لگیں گے اسی لیے میں آج تعطیلات شروع ہونے سے پہلے آگیا ہوں تاکہ بینک دوبارہ کھلتے ہی چیک کیش ہو جائے۔''

نادر علی نے تحمل کے ساتھ اپنا مدعا سمجھانا چاہا تو منیجر قدرے جھلا کر بولا۔ ''اجی کہاں صاحب۔ یہ جس بینک کا چیک ہے آج تو اس میں نہیں جاسکے گا۔ کل سے چار دن کی تعطیلات ہیں۔ پانچویں دن یہ جائے گا اور پھر دو تین دن بعد آپ کے اکاؤنٹ میں یہ رقم آسکے گی۔''

''اوہ!'' نادر نے پہلی بار فکرمندی سے ہونٹ سکیڑے۔ کچھ سوچا اور پھر سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ میں یہ چیک جمع کیے دیتا ہوں۔ اب آپ ایک فکس تاریخ بتا دیں تاکہ میں اونر کو وہ تاریخ بتا سکوں۔''

منیجر نے ایک دو فون کیے اور پھر عجلت سے بولا۔ ''آج 23 فروری ہے، آپ کو پہلی تاریخ کو یہ رقم مل جائے گی کیونکہ بینک چار دن بند رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' نادر علی نے کہتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

منیجر کو کام نمٹانے کی جلدی تھی، اس نے سرعت سے بس اس کا دل رکھنے کو ہاتھ چھوا اور قلم اٹھا کر اندراجات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نادر علی نے اس چیز کا نوٹس نہیں لیا، پھر وہ آج کے شیڈول کا ذہنی اعادہ کرتے ہوئے بینک سے باہر آگیا۔

☆☆☆

وہ شیطانی خیال اس کے ذہن میں کار اسٹارٹ کرتے ہوئے آیا۔

''کیا یہ ایک کروڑ روپے میرے ہو سکتے ہیں!'' اس نے ریورس گیئر لگا کر ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے سوچا۔ سوچوں کی گاڑی بھی کار کے ساتھ ساتھ منصوبے کی شاہراہ پر دوڑ پڑی تھی۔

''یہ تو ممکن نہیں ہے کہ آفس میں رہتے ہوئے یہ رقم ہضم کر سکوں۔ بنگلے کا ایڈریس خاور صاحب سمیت چند دیگر لوگوں کے علم میں بھی ہے۔ اور پھر ٹھہرا!'' نادر علی نے کار ٹاپ گیئر میں ڈال دی۔

اب اس کی سوچ دوسرے زاویے سے حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کی ماہانہ تنخواہ ٹی اے ڈی اے سمیت کل چالیس ہزار تھی۔ بنگلے میں ڈالے گئے فرنیچر کی قسط، اپنے روزمرہ کے اخراجات، سگریٹ، چائے اور لباس پہ خرچ کرنے کے بعد اس کے پاس بہ مشکل چند ہزار بچتے تھے۔ انہی غیر معمولی اخراجات کی بنا پر اس کے اکاؤنٹ میں کل سات ہزار روپے کی رقم تھی۔

اب اکٹھے ایک کروڑ۔

نادر کے منہ میں پانی آگیا۔ نیکی کو عموماً راہیں محدود ملتی ہیں لیکن برائی اپنے راستے خود تلاش کر لیتی ہے۔

''کیوں نا میں شہر ہی سے بھاگ جاؤں اور بائی روڈ جاؤں تاکہ ایک کروڑ کے ساتھ ساتھ یہ پندرہ لاکھ کی کار بھی میری ہو جائے۔'' اس نے سوچا۔

وہ سوچ میں غلطاں تھا۔ سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار نے اسے بریک لگانے پر مجبور کر دیا۔ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا لیکن حصولِ زر کی خواہش نے اس علامتی تنبیہ سے سبق نہ لیا۔ وہ اپنی سوچوں پر بریک نہ لگا سکا جو تاحال بے قابو تھیں۔

''میں اگر کمپنی کو اتنا بڑا مالی نقصان پہنچا کر دوسرے

شہر بھاگا تو شاید خاور صاحب صبر کر کے بیٹھ جائیں مگر ظہیر جیسا خبیث میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ وہ دوسرے شہر تک میرا پیچھا کرے گا۔ وہ بھی اس طرح کہ یہیں بیٹھا رہے گا اور اپنے وسائل بروئے کار لا کر مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔''

سوچ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ حائل ہوگئی تھی۔ اب وہ خاصے مضطرب انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ آفس بھی زیادہ دور نہ تھا۔ اب بہ مشکل صرف پندرہ منٹ کی ڈرائیو باقی رہ گئی تھی۔

نادر ابھی تک اضطراب کے خلا میں معلق تھا کہ ایک حل سوجھ گیا۔

''کیوں نا میں ملک ہی سے فرار ہو جاؤں۔ بیرونِ ملک مجھے ظہیر تو کیا اس کا باپ بھی تلاش نہیں کر سکے گا۔''

نادر یوں خوش ہوا جیسے وہ ایک کروڑ روپے اس کی جیب میں پڑے ہوں۔ اس نے سوچا کہ اگر ایک کامیاب منصوبہ بندی کی جائے تو یہ روپیا جیب میں آنے میں دیر نہ لگے گی۔ اب اسے دور سے کلفٹن کی تین تلواریں دکھائی دے رہی تھیں، وہاں تک پہنچتے ہی اسے دائیں جانب مڑنا تھا۔

''ملک سے باہر جاؤں اور صرف اتنا سا پیسا لے کر جاؤں۔'' نادر علی نے اپنی ہی تضحیک اڑاتے ہوئے گردن جھٹکی۔ ''اونہہ... بنگلا کون سا میرے باپ کا ہے۔ بنگلا فروخت کرنے پر جو رقم ملے گی وہ بھی حاصل شدہ آمدنی کا حصہ ہوگی۔'' اس نے تخمینہ لگایا۔ ''اگر میں نے ایمرجنسی میں بھی بنگلا فروخت کیا تو بھی دو کروڑ سے کم نہیں ملیں گے اور پھر...'' لالچ کے سلسلے دراز ہی ہوتے جا رہے تھے۔ ''اور پھر اس کے اندر رکھا ہوا لاکھوں روپے کا فرنیچر، فریج، ٹی وی، اے سی اونے پونے بھی بیچا تب بھی تین لاکھ ضرور مل جائیں گے۔'' اس کے بعد جب ذہن کے کیلکولیٹر نے کل آمدنی کا مجموعہ نکالا تو اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

محض ایک کامیاب پلاننگ، محض ایک جست اسے کہاں سے کہاں پہنچا سکتی تھی۔

اگلے ہی لمحے نادر نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی کیونکہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دل بدن کی ہر نس میں دھڑکنے لگا ہے۔ خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ رگیں ستار کے تاروں جیسی تنی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

اگر یہ کیفیت کسی صدمے کے نتیجے میں ہوتی تو وہ یقیناً ڈپریشن کی زد میں آ کر اپنی کار تین تلواروں سے ٹکرا بیٹھتا لیکن یہ شادیٔ مرگ کی سی کیفیت تھی۔ اس نے اپنی بے انتہا خوشی پر ضبط کے بند باندھے اور دائیں جانب گاڑی موڑ لی۔ آفس کی پُرشکوہ عمارت اس کے سامنے تھی۔

☆☆☆

ٹوئیل مارٹن امریکی ریاست ورجینیا کا رہنے والا تھا۔ وہ پاکستان مستقل طور پر شفٹ ہوگیا تھا۔ ورجینیا سے وہ ایک لمبا فراڈ کر کے بھاگا تھا اور تھرڈ ورلڈ کے کسی ملک میں روپوش ہونا چاہتا تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس نے پاکستان منتخب کیا۔

وہ گزشتہ پندرہ روز سے ڈیفنس کے سینٹرل لین 8 میں نادر کے بنگلے کے دائیں طرف والے بنگلے میں مقیم تھا۔

تقریباً دس دن پیشتر ایک شام کو چہل قدمی کے دوران میں نادر علی کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ انگریزی اچھی جاننے کی بنا پر نادر ٹوئیل مارٹن سے خاصی دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ اسی روز اس نے نادر کو بتایا تھا کہ وہ کرائے پر مقیم ہے اور چاہتا ہے کہ یہیں کہیں کوئی بنگلا خرید لے۔

نادر علی نے یہ بات سننے کے بعد دوبارہ اس بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ اس کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا لیکن آج زندگی کا سارا انداز ہی تبدیل ہوگیا تھا۔

آج آفس سے واپس آ کر اس نے سیدھا ٹوئیل مارٹن کے بنگلے کا رخ کیا۔

''ویل مسٹر نادر! کیسا ہے تم؟'' مارٹن نے مصافحہ کرتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں اسے اردو میں مخاطب کیا۔

نادر اس سے باقی گفتگو بھی اردو میں کرنے لگا۔

وہ بے چارگی سے شانے اچکا کر بولا۔ ''اردو نا ہمیں چلے گا۔''

اس کے بعد کی گفتگو انگریزی میں ہوئی۔ نادر نے اسے اپنی آمد کا مدعا بتانے کے بعد کہا۔ ''کچھ ایسی ضرورت آن پڑی ہے کہ میں بنگلا فوری طور پر فروخت کرنا چاہتا ہوں۔''

''دو کروڑ اور ففٹی لاکھ۔'' مارٹن نے بے چارگی سے کہا ''بس اس سے زیادہ میری گنجائش نہیں ہے۔''

نادر کو ایسا لگا جیسے بیک وقت کئی تیز رفتار طیارے اس کے دماغ سے نکل کر زن سے فضا میں پرواز کر گئے ہوں۔

''چلیں، ٹھیک ہے۔'' اس نے مصنوعی بے بسی سے کہا۔ ''لیکن میری ایک چھوٹی سی مجبوری ہے۔''

''وہ کیا...!''

''بنگلے کے کاغذات ڈکیتی کی واردات میں چوری ہو

گئے ہیں۔ نئے کاغذات بنانے میں کچھ وقت لگے گا۔"

"لیکن میں کاغذات کے بغیر کیسے جائداد خرید سکتا ہوں۔" مارٹن پریشان دکھائی دینے لگا۔

"نہیں، میں نئے کاغذات بنوا کر آپ کو دوں گا۔ مجسٹریٹ کے سامنے ایگریمنٹ ہوگا مگر بس کیش مجھے نقد چاہیے۔"

"اتنی بڑی رقم کیش نہیں مل سکتی۔ سٹی بینک میں میرا اکاؤنٹ ہے، میں وہیں کا چیک آپ کو دے سکتا ہوں۔"

اس کے بعد نادر نے بہت چاہا کہ کسی طرح نوئیل مارٹن کچھ نہ کچھ دے دے مگر وہ بڑی خوبصورتی سے بات ٹالتا اور عذر تلاش کرتا رہا۔

☆☆☆

آج پہلا ہی دن تھا۔ نادر علی نے ہمت نہیں ہاری۔ اس کی سب سے بڑی جیت یہ تھی کہ تعطیلات سرکاری تھیں۔ سرکاری، نیم سرکاری اور بڑے ادارے بند تھے۔ نجی چھوٹے سرمایہ دار اور ذاتی دکانیں رکھنے والوں نے کاروبار جاری رکھا تھا۔

ان چار دنوں میں نادر علی نے سب سے پہلے فرنیچر کو ٹھکانے لگایا۔ قسطوں پر لیا ہوا قیمتی فرنیچر اور الیکٹرانک کا سامان اونے پونے فروخت کرنے پر بھی تقریباً تین لاکھ روپے ملے۔ فرنیچر اس نے رات کی تاریکی میں اٹھوایا تھا۔ دن دہاڑے اٹھواتا تب بھی کوئی نوٹس نہ لیتا۔ وہ علاقہ ہی ایسا تھا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ ہوتی تھی۔ ان عالیشان بنگلوں میں رہنے والے انسان بڑے پھاٹکوں سے نکلتی یا داخل ہوتی گاڑیوں میں کبھی کبھی ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں اور بس...

☆☆☆

علاقے کی کچھ اسٹیٹ ایجنسیاں بھی کاروبار جاری رکھے ہوئے تھیں۔ ان ایجنسیز کے بہت سے چکر لگا کر نادر علی نے اپنے "مطلب" کا ایک شخص ڈھونڈ ہی نکالا۔

یہ برکت اللہ تھا۔ اس نے جعلی کاغذات بنانے کے پچیس ہزار لیے اور اسی "فیس" میں مجسٹریٹ بھی بن گیا۔ مجسٹریٹ کا ایک جعلی دفتر بنایا گیا تھا۔ نوئیل مارٹن غیر ملکی تھا۔ شاہراہوں، گزرگاہوں اور مقامات سے ناواقف۔

چوتھے روز تعطیلات ختم ہوئیں تو نادر علی مارٹن کو اسی جعلی آفس لے گیا۔ مارٹن کے سامنے برکت اللہ نے کاغذات کی مصنوعی چھان بین کی۔ سخت لہجے میں سوالات کیے اور آخر کار کاغذات اصل ہونے کی گواہی دے دی۔

کاغذات حاصل کرنے کے بعد نوئیل مارٹن نے نادر علی کو مطلوبہ رقم کا چیک دے دیا۔

تمام مراحل طے ہونے کے بعد اس نے لجاجت سے کہا۔ "میں پہلی تک گھر خالی کر پاؤں گا۔ دراصل میرے پاس اور کوئی جگہ رہنے کی نہیں ہے اور جو گھر میں نے لیا ہے اس کا قبضہ پہلی تاریخ ہی کو مل رہا ہے۔" پوری بات سن کر نوئیل مارٹن خوش خلقی سے کہنے لگا۔

"ڈونٹ میٹر۔ ہمارا مہینا چھ تاریخ کو ختم ہوتا ہے۔ میں بھی اس دوران میں اپنے بنگلے کے مالک سے بات کر کے اس سے اپنا دیا ہوا ایڈوانس واپس مانگوں گا۔ کرایہ چھ تاریخ تک پورا ہوگا، اس سے قبل وہ مجھے بنگلا خالی کرنے کے لیے نہیں کہہ سکتا۔"

"میں اس تعاون پر آپ کا شکر گزار ہوں۔" اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں میں رسمی مکالمات کی ادائیگی ہوئی اور پھر نادر علی واپس اس بے سروسامان بنگلے میں آ گیا۔ فراڈ کرنا اتنا سہل ہوتا ہے، اسے اندازہ نہ تھا۔

اب وہ دعا کر رہا تھا کہ بنگلے کے مالک یا فرنیچر مارٹ والے کو وہ یاد نہ آ جائے یا ان دونوں میں سے کوئی ادھر نہ آ نکلے۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ دھڑکنوں کی غیر معمولی رفتار کے ساتھ چیک لے کر بینک پہنچا۔ منیجر نے ڈھائی کروڑ کا چیک لے کر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"میرا نہیں ہے۔ یہ بھی کسی اور کا چیک ہے جو میرے نام ایشو ہوا ہے۔" نادر نے سرعت سے توضیح پیش کی۔ حالانکہ منیجر نے کچھ نہ پوچھا تھا مگر یہ اس کے اندر کا چور تھا۔ خود کو مجرم محسوس کرے تو آدمی بلا وجہ ہی دلیل پیش کرنے لگتا ہے۔

"رقم بڑی ہے۔ ہیڈ آفس سے آئے گی۔ اس رقم کے لیے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔" منیجر نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

"آخر کتنا...!" نادر علی نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

جواب میں منیجر نے پھر کئی فون ادھر ادھر کیے اور اسے مختصر بتایا۔ "بس یوں سمجھیں کہ یہ چیک بھی آپ کے پچھلے چیک کے ساتھ پہلی تاریخ ہی کو کیش ہو جائے گا۔"

"ایک گزارش کرنا چاہتا تھا...!"

''فرمایئے۔''

''کوئی بھی شخص اگر آپ سے میرے اکاؤنٹ کا بیلنس معلوم کرنا چاہے تو پلیز...''

منیجر نے اس کا جملہ درمیان سے ہی اچک لیا۔ اس نے خاصے ناگوار انداز میں کہا۔ ''کمال کرتے ہیں نادر صاحب۔ ہم اپنے کلائنٹس کے اکاؤنٹس مکمل طور پر صیغۂ راز میں رکھتے ہیں۔''

''بے حد شکریہ۔'' اس نے چہرے پر عاجزانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔

اس کے بعد ضروری کارروائی سے فارغ ہو کر وہ بینک سے باہر نکل آیا۔

وہ ان دنوں مسلسل حواس باختگی کے سے عالم میں تھا۔ کسی کام میں دھیان نہ لگ رہا تھا۔ دماغ میں سائیں سائیں ہوتی رہتی۔ ایک ہلکی سی آہٹ پر بھی دل دھڑک اٹھتا۔ اسے ہر وقت ایک ہی خدشہ لاحق تھا۔ اس کا فراڈ پکڑا نہ لیا جائے۔

یہ بھی شکر تھا کہ یہ فروری یعنی 28 دن کا مہینا تھا ورنہ مزید دو تین دن گزارنے دوبھر ہو جاتے۔ آج 27 تاریخ تھی۔ بنگلا فروخت ہو چکا تھا۔ فرنیچر کی فروخت سے حاصل شدہ رقم سے پچیس ہزار اس نے برکت اللہ کو ادا کیے تھے اور ایک ہوائی ٹکٹ بھی خرید لیا تھا۔

نادر علی نے پناہ حاصل کرنے کے لیے اٹلی کا انتخاب کیا تھا۔ کیونکہ اسے اٹلی کا ویزا بہت آسانی سے مل گیا تھا۔ ویسے بھی وہ کئی مرتبہ بیرونِ ملک جا چکا تھا۔ اس کے پاسپورٹ پر کئی ممالک کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ پہلی تاریخ کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے کی فلائٹ تھی۔

گویا اب صرف کل کا دن درمیان میں تھا۔ اگر کل کا یہ ایک دن خیریت سے گزر جاتا ہے تو پھر نادر اور اس کی خوبصورت زندگی کے درمیان کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، نادر کا برا حال ہوا جا رہا تھا۔

گاڑی اس نے اب تک معلوماً نہیں بیچی تھی۔ بھاگ دوڑ کرنے کے لیے اسے سواری کی ضرورت تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کار بیچنے کے خیال کو ذہن سے نکال چکا تھا۔ دراصل وہ اسے عین وقت پر فروخت کرنا چاہتا تھا۔

ایسا ہرگز نہ تھا کہ اس نے کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ برکت اللہ کے توسط سے وہ ایک ایسے کار ڈیلر سے مل چکا تھا جو چوری کی کاریں خریدا کرتا تھا۔ بات طے ہو چکی تھی۔ اس نے خود ہی کہا تھا کہ وہ اٹھائیس تاریخ کی رات کو آ کر کار اس کے حوالے کر کے سات لاکھ روپے لے جائے گا۔

مگر اضطراب نے اس کی رگ رگ میں عجیب سا انتشار بھر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ ہو، جلدی سے ہو جائے لہٰذا وہ 27 کی ہی رات کار ڈیلر کے پاس پہنچ گیا۔

اس کے کاغذات جو اصل میں فرم کے نام تھے اور چابیاں ڈیلر کے حوالے کیں اور اس سے سات لاکھ کا چیک حاصل کر لیا۔

ملک سے فرار ہونے کے بارے میں نہ تو اس نے برکت اللہ کو بتایا تھا نہ کار ڈیلر کو۔ اس قسم کے لوگ اس قسم کے معاملات خود بھی بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

جب وہ چیک لے کر، مصافحہ کر کے رخصت ہونے لگا تھا، تب ہی عقب سے ڈیلر نے اسے پکارا۔ ''ارے بھائی! بات سنیو!''

نادر کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے گرد فکر و تردد کی جھریاں سی پڑ گئیں۔ اس نے مڑ کر کار ڈیلر کو دیکھا اور تھوک نگل کر کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''ارے، تو، تو جا ہی رہا ہے... اپنے موبائل کا کیا کرے گا؟'' ڈیلر کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے خریدار کو تذبذب میں دیکھ کر دکاندار کے چہرے پر ہوتے ہیں۔

نادر علی نے اب تک اس سلسلے میں کچھ نہ سوچا تھا۔ لائن اور سیٹ فرم نے لے کر دیے تھے۔ اس کے باپ کا اس سلسلے میں بھی کچھ نہ گیا تھا۔ وہ دھڑکنوں کی رفتار کو بحال کرتا ہوا واپس اسی کرسی پر آ بیٹھا۔

''میں جا تو کہیں نہیں رہا، بس ذرا پیسوں کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا ''لیکن موبائل فرم کا ہے۔ فون کر کے آپ سے بات...''

''لائن کس کمپنی کا ہے؟'' جواب میں نادر نے ایک معروف سیلولر کمپنی کا نام بتا دیا۔

''کمپنی فون کر کے لائن عارضی طور پر نمبر بند کروا دے۔ ادھر فرم والوں کو بول دیجیو کہ چوری ہو گیا۔''

''اوہ... ہاں!'' نادر نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی رگڑی پھر پوچھا۔ ''آپ کیا دیں گے سیٹ کا۔''

''میں اس کے پندرہ ہزار روپے دے سکتا ہوں۔'' کار ڈیلر نے کہا۔

''لیکن یہ تو ساٹھ ہزار کا ہے۔''

''سوچ لے۔'' ڈیلر نے بے اعتنائی سے کہہ کر رخ پھیر لیا۔ اب وہ قطعاً اجنبی نظر آ رہا تھا۔

نادر علی نے لمحے بھر کو سوچا۔ وہ بھاگ رہا تھا، چور تھا، اس صورت میں اگر بھاگتے چور کی لنگوٹی ہاتھ آ رہی تھی تو کیا حرج تھا۔ اس نے ڈیلر سے کچھ نہ کہا۔ ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملا کر اپنا نمبر بند کروانے کی درخواست کی اور سیٹ آف کر کے ڈیلر کے آگے رکھ دیا۔

اس نے سیٹ اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور دراز میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار کے پندرہ نوٹ گن کر اس کے آگے پھینک دیے۔

نادر علی گہرے شش و پنج میں مبتلا نوٹ اٹھا کر بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل آیا۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر الجھا ہوا تھا کہ بے خیالی میں اپنی کار تک آکر دروازہ کھولنے کے لیے چابیاں تلاش کرنے لگا۔

اگلے ہی لمحے وہ خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ''اوہ... کار تو میں نے بیچ دی۔ چابی کار ڈیلر کے پاس ہے۔'' اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور پھر سر جھٹک کر ٹیکسی کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔

کار ڈیلر اپنے شیشے کے شوروم میں بیٹھا اسے کار کی طرف بڑھتے اور چابی جیبوں میں ٹٹولتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر غصے اور فکر کے بل نمودار ہو چلے تھے۔ پھر جب نادر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تب وہ مطمئن ہو کر واپس کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک اطمینان کا سانس خارج ہوا اور وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہوتا ہے، ہوتا ہے۔''

☆☆☆

جس روز سے خاور حسن کی فرم نے نادر کو کار خرید کر دی تھی اور بنگلے کا ایڈوانس دیا تھا، وہ ظہیر کی آنکھوں میں گری پلک کی طرح چبھ رہا تھا اور مسلسل نادر پر نظر رکھے ہوا تھا۔ وہ اس کی خوبیاں نظر انداز کر دیتا، خامیاں خوب اچھالتا۔ ذرا ذرا سی غلطی پکڑ کر خاور حسن تک پہنچاتا۔ یہ حرکت اس کی گویا عادت سی بنتی جا رہی تھی اور یہی عادت خاور حسن کی نظروں میں نادر کا مقام پیدا کر رہی تھی جبکہ ظہیر اس کی نگاہ سے گر رہا تھا۔

ایسے میں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ظہیر کی نظر سے نادر علی کی موجودہ کیفیت چھپی رہتی۔ وہ دو روز سے اسے گم صم دیکھ رہا تھا۔ مخاطب کیا جاتا تو چونک پڑتا۔ اکثر اتنی گہری سوچ میں غلطاں ہوتا کہ ظہیر کا طنز نہ سن پاتا، نہ سمجھ پاتا۔ اس کے چہرے پر تردد ہوتا اور سوچتے ہوئے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو جاتیں۔

ظہیر سیانا آدمی تھا۔ اندازہ لگا لیا کہ وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ آدمی پریشان ہو تو اس کی پیشانی عرق ریز اسی وقت ہوتی ہے جب ضمیر کے ناگ اسے ڈس رہے ہوں۔ ظہیر نے خود ہی نتیجہ اخذ کر لیا کہ نادر علی کی پریشانی کا تعلق یقیناً اسٹار گروپ کے ایک کروڑ والے چیک سے ہے۔

اس کے قدم خاور حسن کے کمرے کی طرف بڑھنے لگے تھے کہ کچھ سوچ کر خود کو روک لیا۔

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے کافی دیر سوچا اور پھر اچانک ہی نادر علی بن کر بینک فون کر ڈالا۔ اور پھر جب اس نے صرف اتنا پوچھا کہ ''کیش پہلی تاریخ کو مل جائے گا نا؟''

تب منیجر نے حیرت سے جو کچھ کہا اسے سن کر ظہیر کی کھوپڑی میں گویا دھماکا سا ہوا۔

''آپ صبح جب سات لاکھ کا چیک لے کر آئے تھے، تب میں نے آپ کو بتایا تو تھا!''

اس نے بہ مشکل اپنی حیرت پر قابو پایا اور پھر بڑے محتاط الفاظ میں کہا۔ ''دراصل مجھے اپنے اکاؤنٹ کا سارا بیلنس فرسٹ ہی کو نکالنا ہے، اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آپ فرسٹ کو کتنا بیلنس دے سکیں گے۔''

دوسری جانب منیجر جھلاہٹ کا شکار ہو گیا کیونکہ اس کی آواز میں ترش روئی سی آگئی تھی۔ بھئی آپ کا وہ ڈھائی کروڑ والا چیک بھی فرسٹ کو مل جائے گا اور وہ جو آپ نے ایک کروڑ کا چیک جمع کروایا تھا وہ بھی۔ صبح تو آپ جو سات لاکھ کا چیک لائے تھے، وہ ہمارے ہی بینک کا تھا اور میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ رقم آدھے گھنٹے میں مل جائے گی لیکن آپ نے خود ہی کہہ دیا کہ فرسٹ کو ہی لیں گے۔''

''گویا آپ مجھے فرسٹ کو تین کروڑ ستاون لاکھ روپے ادا کر رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''کب تک۔''

''اُفوہ! صبح آپ یہ ساری تفصیلات طے کر کے تو گئے ہیں۔ آپ مسٹر نادر ہی ہیں نا؟'' اس بار منیجر کے لہجے میں شک ابھر آیا تھا۔

ظہیر سنبھل گیا۔ اس نے پھر محتاط انداز میں کہا۔ ''دراصل میں چاہ رہا تھا کہ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی آپ مجھے یہ سارا کیش دے دیتے۔''

''میں نے آپ سے کہا تو تھا کہ پہلی فرصت میں آپ ہی کو ادائیگی ہو گی۔''

''چلیے ٹھیک ہے۔ زحمت کی معافی چاہتا ہوں۔'' ظہیر نے یہ کہہ کر رسمی کلمات ادا کیے بغیر ہی فون بند کر دیا۔

اتنی بڑی رقم کا سن کر خود ظہیر کا دل بھی دھڑک اٹھا تھا۔ فون کریڈل پر رکھ کر وہ دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ بار بار خیال آرہا تھا کہ جا کر خاور کو بتا دے مگر اس نے بمشکل خود کو روکا۔ سوچا، اس بار پکے ثبوت کے ساتھ ہاتھ ڈالے گا۔

''اس دو ٹکے کے چھوکرے کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟'' ظہیر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''لو، میں تو ایک کروڑ کو رو رہا تھا۔ یہ تو کروڑوں لے کر بھاگ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے نادر کے ماتھے پر چمکنے والی پسینے کی بوندیں لہرا گئیں۔ ''اچھا بیٹا نادر علی! اب آیا ہے نا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔'' ظہیر کے پیٹ میں ایک گدگدی سی اٹھی اور مسکراہٹ لبوں پر ابھر آئی۔ اس نے بالکل نادر کے سے انداز میں میز پر طبلہ بجایا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ اپنے ایک دوست سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کا یہ دوست اسی علاقے میں ایس ایس پی تھا۔

☆☆☆

حالات کا غیر معمولی حد تک موافق ہونا ہی نادر علی کی گھبراہٹ کا سبب تھا۔ ہر گزرنے والا خاموش لمحہ اس کی گھبراہٹ میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ تین کروڑ ستاون لاکھ روپیا کل اس کا ہونے والا تھا۔ اس وقت جیب میں پاسپورٹ، اٹلی کا ہوائی ٹکٹ اور موبائل کی فروخت سے حاصل ہونے والے پندرہ ہزار روپے کے علاوہ فرنیچر اور الیکٹرانک کا سامان بیچ کر ملنے والی رقم بھی موجود تھی۔

آج اٹھائیس تاریخ تھی۔ کل اسے ایک سنہرے مستقبل کی طرف اڑ جانا تھا۔ وہ اس وقت آفس ہی میں موجود تھا۔ صبح کار ڈیلر کا دیا چیک جمع کرا کے سیدھا دفتر ہی پہنچا تھا اور اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا تانے بانے بن رہا تھا۔ اچانک ہی دستک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''یس!'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور ظہیر کا خشونت بھرا چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ اس نے آتے ہی تنے ہوئے ابرو کے ساتھ کہا۔ ''مسٹر نادر! ذرا اپنا موبائل دیجیے گا، میرا موبائل خراب ہے اور مجھے ایک ضروری کال کرنا ہے۔''

''آفس کے سیٹ سے کر لیجیے۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔ لہجے میں پہلے کی طرح طنز کے بجائے مصالحت آمیزی تھی۔

''حیدر آباد کال کرنی ہے۔ موبائل پر لوکل کال پڑے گی۔''

''دراصل میرا موبائل کل کہیں مس ہو گیا ہے۔''

''جی؟'' ظہیر نے آنکھیں پھاڑیں۔ صاف لگ رہا تھا اسے یقین نہیں آیا ہے۔

''آپ میرے نمبر پر ڈائل کر کے دیکھ لیں، آپ کو ٹمپریری ڈس کنکٹڈ کی ریکارڈنگ سنائی دے گی۔''

''مائی گاڈ! مجھے چوکیدار نے بتایا ہے کہ آپ صبح ٹیکسی سے آئے تھے۔ کیا کار بھی چوری ہو گئی ہے!'' ظہیر نے طنزیہ حیرت سے کہا۔

''ن... نہیں تو۔ وہ تو میں نے ورکشاپ میں دی

ہوئی ہے۔ شام کو مل جائے گی۔"

"آئی سی۔" ظہیر نے سرہلایا، پھر کہا" بائی دا وے، آپ فرسٹ کو فرم کے ایک کروڑ روپے لا کر دے رہے ہیں نا؟"

اس اثنا میں نادر کا وقتی اضطراب ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کا اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہو رہا تھا۔ وہ سپاٹ سے لہجے میں رکھائی سے بولا۔

"کیا آپ کو میری نیت پر شبہ ہے۔ اگر میں نے کہا ہے تو پہلی تاریخ کو یقیناً فرم کا پیسا فرم کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دوں گا۔"

"آپ تو بگڑ گئے۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔" ظہیر ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح قوسِ قزح کی طرح خوشیوں کے تمام رنگ لیے ہوئے تھی۔ نادر نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ خدا خدا کر کے اٹھائیس فروری ختم ہوئی تھی۔ تیئس سے اٹھائیس تک کے چھ دن اس نے شدید بھاگ دوڑ میں گزارے تھے۔ اندیشے اور خدشوں کے انگاروں پر لوٹتے ہوئے کاٹے تھے لیکن قسمت اس کے ساتھ تھی اس لیے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

آج نادر علی خود کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ سوچتے سوچتے دماغ دکھ چکا تھا۔ اس وقت اس نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنی جسمانی اور دماغی حالت کا اندازہ کرنا چاہا۔

اس کے ذہن میں بالکل ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے شدید طوفان گزرنے کے بعد سکوت چھا جاتا ہے۔ اس نے مسکرا کر دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے۔

وہ پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے دس بجے بینک سے تین کروڑ ستاون لاکھ روپے نکلوانے تھے۔ پھر منی چینجر کے پاس ساڑھے دس تک پہنچنا تھا، روپے سے تبدیل شدہ ڈالرز رات کو خریدے گئے بیگ کے خفیہ خانوں میں چھپانے تھے۔ اس کے بعد ٹھیک گیارہ بجے ائرپورٹ پہنچ جانا تھا۔ ساڑھے گیارہ کی فلائٹ تھی۔

سامان تو کچھ ساتھ تھا نہیں جسے کلیئر کروانے میں وقت درکار ہوتا۔ بس ایک سفری بیگ تھا۔

"میں فلائٹ کا اناؤنسمنٹ ہونے کے بعد ظہیر کو فون کروں گا اور کہوں گا کہ کتے کے بچے، میں فرم کا ایک کروڑ روپیا لے کر بھاگ رہا ہوں، پکڑ سکتا ہے تو پکڑ کر دکھا۔" اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا پھر وہ مسکرانے لگا۔

مانگ

ایک کمپنی نے ملازمت کے لیے اخبار میں اشتہار دیا۔ اشتہار دیکھ کر ایک فارغ شخص بھی انٹرویو کے لیے دفتر پہنچ گیا جب اس کا نمبر آیا تو مالک نے اس کی درخواست دیکھ کر کہا۔

"تم اس سے پہلے بارہ جگہ ملازمت کر چکے ہو۔"

امیدوار نے کہا۔ "جی ہاں، آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دفتروں میں میری کس قدر مانگ ہے۔"

اس نے غسل کرنے میں دیر لگائی نہ لباس تبدیل کرنے میں۔ پرانا لباس وہیں چھوڑ دیا۔ ضرورت ہی کیا تھی پرانا لباس یا پرانا کوئی حوالہ ساتھ رکھنے کی۔ وہ آخری بار آج گھر سے نکلتا اور پھر واپس کبھی نہ آتا۔ ایک حسین زندگی اس کی منتظر تھی۔

جلدی جلدی تیار ہو کر اس نے لباس پر خوشبو چھڑکی اور بنگلے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

خطرے کی پہلی گھنٹی اس وقت بجی جب وہ صدر دروازے سے نکل کر ٹیکسی کی تلاش میں سڑک کی جانب بڑھا۔

اسے سامنے سے ہانپتا کانپتا برکت اللہ آتا دکھائی دیا اور بولا۔ "غضب ہو گیا نادر صاحب!"

"کیا ہوا؟" اس کا مطمئن دل دھڑک اٹھا۔ اس نے عجلت میں دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دس بجنے میں آٹھ منٹ تھے۔

"اس بنگلے کے مالک کو پتا چل گیا تمہارے فراڈ کا۔"

"کیسے؟" وہ حیران رہ گیا۔

"اس کار ڈیلر کے بچے نے دوسرے ہی دن فون کمپنی ہیڈ آفس فون کر کے نمبر پھر کھلوا لیا کیونکہ تمہارے کارڈ کے ابھی بہت سے یونٹ باقی تھے۔" برکت اللہ تیز تیز بول رہا تھا۔ "یہ بھی اچھا ہی ہوا، ورنہ بروقت پتا نہ چلتا اور خطرہ سر پر آ پہنچتا!"

"جلدی بات کرو برکت اللہ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"ہاں ہاں۔" برکت اللہ نے سر ہلایا اور پھر کہا۔ "بنگلے کے مالک نے تمہارے نمبر پر رنگ کیا تو ڈیلر نے ریسیو کیا۔ مالک نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ ڈیلر نے کہا کہ وہ باتھ روم میں ہے، مجھے میسج دے دیں۔ تب اس

نے بتایا کہ وہ آج بارہ بجے تک پہنچ رہا ہے بنگلے پر۔ کسی نے اسے اطلاع دی ہے کہ آپ ذرا اپنے بنگلے کی خیر خبر لیجیے کیونکہ اسے شبہ ہے کہ آپ کے کرائے دار نے کچھ گڑبڑ کی ہے۔"

اسی اثنا میں ایک ٹیکسی آتی دکھائی دی اور اس نے پھرتی سے اسے رکنے کا اشارہ کردیا۔

"بارہ بجے تک آنے کا کہا ہے نا۔"

"ہاں۔ کار ڈیلر نے فوراً ہی مجھے فون کرکے یہ ساری بات بتائی کہ تم تک یہ پیغام پہنچا دوں۔"

"تم گھبراؤ مت۔ بارہ بجے تک تو میں دبئی کے آسمانوں پر پرواز کررہا ہوں گا۔"

"کیا؟ تم ملک چھوڑ کر جارہے ہو؟"

"ہاں، اور یہ لو!" نادر نے والٹ نکالا اور پانچ ہزار کا نوٹ برکت اللہ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولا۔ "تم بھی چند دن کے لیے ادھر ادھر ہوجاؤ۔"

نادر نے یہ عجلت کہا اور اپنا سفری بیگ اٹھا کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔

اسی وقت خطرے کی دوسری گھنٹی بجی۔

نوئیل مارٹن چہل قدمی یا پھر کسی کام سے باہر نکل رہا تھا۔ نادر نے گھبرانے کے بجائے حواس بحال رکھے۔ اب اسے گھبرانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ سب کام بہ خیر و خوبی انجام پاچکا تھا۔ مقفل بنگلے کی چابیاں اس کی جیب میں تھیں۔

اس نے دوستانہ انداز میں مارٹن کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کہا۔ "ہم دونوں آپ ہی کی طرف آرہے تھے۔"

"گڈ... چلیے پھر۔"

"نہیں نہیں، مجسٹریٹ صاحب کو دیر ہورہی ہے، میں نے انہیں اسی لیے بلایا تھا کہ آپ کو ان کے سامنے چابیاں دے سکوں۔"

نوئیل مارٹن پاکستانیوں کی ایمانداری سے بے حد متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے عقیدت بھرے انداز میں پہلے نادر اور پھر برکت اللہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اتنا بڑا مجسٹریٹ اتنے سے کام کے لیے خود آگیا۔"

"یہ لیجیے مجسٹریٹ صاحب، آپ خود ہی چابیاں مسٹر مارٹن کے سپرد کردیں۔" نادر نے گھڑی دیکھتے ہوئے چابیاں برکت اللہ کو دیں۔

"مبارک ہو مسٹر مارٹن۔ یہ لیجیے اور آج ہی اپنا سامان شفٹ کرلیجیے۔"

تھینک یو، تھینک یو۔" مارٹن نے جلدی سے چابیاں تھام لیں۔ اس کے بعد بہت جلدی جلدی میں رسمی گفتگو ہوئی اور مصافحہ کرکے برکت اللہ اور نادر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"اس الو کے پٹھے ظہیر نے آخر اپنا کام دکھا ہی دیا۔" نادر نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا، بس مجھے ڈر رہے گا کہ مارٹن مجھے پہچان گیا ہے۔"

"اس وقت بھی خوب بہانہ ذہن میں آیا۔" نادر ہنس پڑا۔ "اب بنگلے کا مالک جانے اور مارٹن جانے۔"

دونوں اس قسم کی باتیں کرتے رہے اور پھر بینک سے کچھ دور اس نے برکت اللہ کو ایک چوراہے پر اتار دیا۔ دس بج کر تیرہ منٹ ہوچکے تھے۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے رفتار تیز کرنے کو کہا اور نشست کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

ذہن کے اسکرین پر ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔ ظہیر نے یقیناً کسی سرے کے ہاتھ میں آجانے کے بعد ہی بنگلے کے مالک کو فون کیا ہوگا۔ اس کے پولیس سے اچھے تعلقات ہیں۔ اس نے یقیناً کار اور موبائل کی فروخت کا راز پالیا ہوگا۔ کل اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کار اور موبائل کی طرف سے مشکوک ہوگیا ہے۔

اس کا خون کھول رہا تھا۔ جوں جوں وہ ظہیر کے بارے میں سوچتا رہا، غصہ بڑھتا رہا۔ اس نے سوچا۔ میں بھی فلائٹ ٹیک آف کرنے سے پہلے فون کرکے اسے ایسی بے نقط سناؤں گا کہ یاد کرے گا۔

ظہیر کا خشونت بھرا چہرہ اس کی نگاہ میں گھوم گیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ وہ اس پر ہنس رہا ہے۔ مذاق اڑا رہا ہے۔ پولیس سامنے کھڑی ہے اور وہ بڑے فخریہ انداز میں خاور حسن سے ہنس ہنس کر اس کے بارے میں بتا رہا ہے۔

غصے میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گھڑی دیکھی، دس بج کر بائیس منٹ ہوئے تھے۔ اب فلائٹ میں کل ایک گھنٹا، آٹھ منٹ باقی رہ گئے تھے۔

اس نے سوچا کہ اگر ظہیر ایڑی چوٹی کا زور بھی لگادے تب بھی ایک گھنٹے میں اسے کیسے رکوا سکتا ہے۔ اسے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ وہ ہوائی راستے سے ملک سے فرار ہورہا ہے۔ کیوں نا میں ابھی اسے فون کردوں۔

جیب میں کریڈٹ کارڈز تھے۔ قومی کارڈ بھی تھا۔ بینک بھی آچکا تھا۔ اس نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور ادھر ادھر نظریں دوڑا دیں۔

سامنے ہی ایک نیلی کار زوبتھ نظر آ گیا۔

ظہیر گیارہ ساڑھے گیارہ تک دفتر پہنچتا۔ ابھی وہ گھر پر ہی ہوگا۔ میرے متعلق سنتے ہی وہ ادھر ادھر فون کرنا شروع کر دے گا۔ اسے یہ علم نہیں ہوگا کہ میں اتنی بڑی رقم لے کر بھاگ رہا ہوں۔ وہ تو صرف کار، موبائل اور ایک کروڑ ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ دوسری طرف بیل جاری تھی۔ نادر نے شدید اضطرابی حالت میں بوتھ پر مکے مارنے شروع کر دیے۔ تب ہی فون ریسیو کر لیا گیا۔

”ہیلو!“ خلاف توقع ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

”جی مجھے ظہیر صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”وہ تو نہیں ہیں۔“

”کیا آفس چلے گئے؟ اتنی صبح! وہ تو گیارہ ساڑھے گیارہ تک جاتے ہیں!“

”مگر آج وہ ایس ایس پی افتخار درانی کے ساتھ پولیس کی موبائل لے کر نکلے ہیں۔“

اسے لگا کہ اس کا سانس حلق میں اٹک گیا ہے۔

اس نے اپنی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ پر قابو پایا اور دھیرے سے پوچھا۔ ”کس سلسلے میں؟“

”پتا نہیں جی۔ رات میرے سامنے فون پر باتیں کر رہے تھے۔ ان کی کمپنی کا کوئی شخص فراڈ میں ملوث ہے۔ اسی کے بنگلے پر گئے ہیں۔“

اس نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔ دل پھر اسی پہلی سی رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔

”کوئی بات نہیں، بنگلے سے سیدھا وہ بینک آئے گا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ آج پہلی تاریخ ہے اور میں اگر گھر میں نہیں تو کیش لینے بینک ہی گیا ہوں گا۔“ اس نے سوچا۔

پھر اس نے منی چینجر والوں کا نمبر ڈائل کر دیا۔ جس نام سے ٹکٹ بنوایا تھا اسی حیثیت سے منی چینجر والوں سے ملا تھا۔

فون ریسیو کیا گیا تو وہ نارمل آواز میں بولا۔ ”ہیلو میں نعمان شیخ بول رہا ہوں۔“

”جی نعمان صاحب؟“

”میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے ڈالرز میں ایک بڑی رقم...“

”جی جی... مجھے یاد ہے اور میں نے انتظام بھی کر کے رکھا ہے۔“ خوش خلقی سے کہا گیا۔

”ٹھیک ہے آپ رقم تیار رکھیے، میں آ رہا ہوں۔“

”آج ہی؟“ حیرت سے کہا گیا۔

”ہاں، ہاں۔ میں نے کہا تھا نا کہ پہلی کو ڈالرز چاہیے ہوں گے۔ بس میں پاکستانی روپے لے کر پہنچ رہا ہوں۔“ نادر نے کہا اور بغیر جواب سنے فون رکھ دیا۔

وہ نہایت عجلت میں تھا۔ اس نے کارڈ بھی واپس نہ نکالا۔ تیز تیز قدموں سے بینک کی طرف بڑھنے لگا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ بینک میں قدم رکھا اور پھر استقبالیہ کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر جیب سے چیک بک نکال لی۔

اس نے تین کروڑ ستاون لاکھ روپے کا چیک لکھا اور منیجر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

ظہیر وہیں سے بینک فون بھی کر سکتا تھا۔ رسک ہی رسک تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کیش دینے سے منع کرے گا بھی تو صرف ایک کروڑ روپے روک سکے گا۔ باقی رقم کا تو اسے علم ہی نہیں ہے۔

منیجر کے رویے میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے کسی ”ٹیلی فون“ کا اندازہ ہوتا، تاہم اس نے جھلاہٹ آمیز حیرانی سے مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔

”جی؟“ اس نے اخلاق کے تقاضے نبھاتے ہوئے نادر سے سوال کیا۔

”کیش لینے آیا تھا۔ ذرا جلدی کیجیے۔ میرے فرم کے مالک کا کیش ہے اور وہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔“

”لیکن آج کیسے دے دوں کیش۔ آپ نے تو پریشان کر دیا۔ آپ سے کہا تھا نا کہ فرسٹ مارچ تک ادائیگی ہوگی۔“

”ہاں، تو آج فرسٹ مارچ ہی ہے۔ کل اٹھائیس فروری تھی۔“ اس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

”بے شک، کل اٹھائیس فروری تھی لیکن آج یکم نہیں، 29 فروری ہے۔“

”جی... 29 فروری؟“

”آپ کو یاد نہیں، یہ لیپ کا سال ہے۔“

منیجر نے کہا اور دوبارہ اندراجات میں منہمک ہو گیا۔

پولیس کی موبائل کا پرشور سائرن کہیں قریب ہی سنائی دے رہا تھا۔ اس کا یقینا یہی مطلب تھا کہ ظہیر نے اس کے کیش نکالنے کا خیال کر کے بینک ہی کا رخ کیا ہے۔

کاش اسے یاد رہتا کہ لیپ کے سال میں فروری 29 دنوں کا ہوتا ہے... جو بھی ہونے والا تھا، وہ اس کے حق میں بہت برا ہونے والا تھا۔

معاوضہ

عکس فاطمہ

معاشی بدحالی انسان سے زندگی کی ہر خوشی اور مسرت چھین لیتی ہے... سرمایہ دار ہمیشہ اپنے نفع کی خاطر غریب کے کندھوں کا استعمال کرتا ہے... ان کی شان و شوکت و تعیشات غریب کی بدحالی سے جڑے ہوتے ہیں... استحصالی قوتوں کے سیاہ کارناموں کو اجاگر کرتی ایک دل گداز تحریر...

معمولی معاوضوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی یکجائی کا معرکہ

دو سال تک فرانس کی خندقوں میں مشقت کرنا بہت زیادہ ہیجان خیز تھا۔ اس کے بعد میں ایک سال تک آوارہ گردی کرتا رہا پھر واپس اپنے گھر چلا آیا اور بوسٹن پولیس میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہ میرے لیے نسبتاً آسان کام تھا۔ یہ ملازمت دو سال جاری رہی پھر اچانک ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ سپاہیوں کو دی جانے والی تنخواہ بہت کم ہے گوکہ اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی اور مجھے صرف اپنا ہی پیٹ بھرنا ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود میری دیگر ضروریات تھیں۔ اس تنخواہ میں، میں زندگی میں آگے بڑھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

ایک دن میں گشت پر تھا کہ میری نظر ہورن ڈیٹکٹیو ایجنسی کے بورڈ پر پڑی۔ انہیں زیرِ تربیت سراغ رسانوں کی ضرورت تھی۔ مجھے یہ آئیڈیا پسند آیا۔ دوسرے دن میں نے اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا اور صبح سویرے ایجنسی کے دفتر پہنچ گیا۔ بھرتی کرنے والے کلرک نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور میرا نام پوچھنے کے بعد بولا۔

''کوئی تجربہ ہے؟''

''فرانس کی جنگ میں حصہ لے چکا ہوں اور گزشتہ ستائیس ماہ سے پولیس میں خدمات سرانجام دے رہا ہوں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

''تمہارا ہڑتالی ملازمین سے کوئی تعلق تو نہیں؟''

''نہیں، مجھے انتہا پسندوں یا کمیونسٹوں سے کوئی محبت نہیں ہے۔''

اس نے سر ہلایا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھنے کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے، تمہیں ملازمت مل سکتی ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی اور سوٹ ہے؟''

''میں اس کا انتظام کرلوں گا۔''

''تمہیں پولیس کی ملازمت سے علیحدہ ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''کیا میں اس کا یہ مطلب سمجھوں کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے؟''

''ہمیں تم جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ یہاں تمہارے لیے بہت کام ہے اور میرا خیال ہے کہ تمہیں تنخواہ بھی اچھی ملے گی۔''

میں ایک پولیس والے کی حیثیت سے دفتر میں داخل ہوا تھا لیکن جب باہر نکلا تو پرائیویٹ سراغ رساں بن چکا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے بدعنوان لوگوں کی تحقیقات پر مامور کیا جائے گا لیکن اس کے بجائے مجھے ایک ایسے دستے میں شامل کردیا گیا جو ہڑتالوں کو ناکام بنانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ روسی انقلاب کے بعد ایسا لگتا تھا کہ ہر گلی کوچے میں کمیونسٹ پھیل گئے ہیں۔ اسی لیے ہر فیکٹری اور کارخانے میں ہڑتالوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ ایسے کئی تاجروں اور صنعت کاروں نے ہورن ایجنسی کی خدمات حاصل کرلی تھیں جنہیں خطرہ تھا کہ ان کے کارکنوں میں مزدوروں کی بین الاقوامی تنظیم کے کارندے یا بائیں بازو کے عناصر گھس آئے ہیں اور ہمیں ان کا سراغ لگانا تھا۔

پہلے ہفتے ہم نے شکاگو اسٹاک یارڈ میں ہونے والے مزدوروں کے جلسے کو ناکام بنایا اور اگلے ہفتے ٹرین کے ذریعے کینٹکی روانہ ہوگئے تاکہ ان لوگوں کا سراغ لگا سکیں جو کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کو

بھڑکا رہے تھے۔ جہاں کہیں ہمیں کوئی سرمایہ داروں کا دشمن نظر آتا ہم اس کا قلع قمع کرنے پہنچ جاتے۔ ہورن ایجنسی کا مقصد سرخ خطرے کو کچلنا تھا اس سے پہلے کہ وہ پورے ملک پر چھا جائے۔ ہمارا دستہ بھی اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے کارروائیاں کر رہا تھا۔

اس دستے میں میرے علاوہ ایوریٹ سلوپ اور وارن جونز شامل تھے۔ ہم تینوں کنساس سٹی آفس میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ کب باہر نکلنے کا موقع ملے اور ہم اپنے لیے ایک ٹھنڈی بیئر کی بوتل خرید سکیں۔ اسی اثنا میں ہمارا کمانڈر جیس کولٹر کمرے میں داخل ہوا اور ہمیں ناراضی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم لوگ تیار ہو؟''

''ہم کہیں اور جا رہے ہیں۔'' جونز نے کہا۔

''تمہیں کینٹکی میں واقع رالنگو جانا ہے۔''

''فی الحال ہم اس بارے میں نہیں سوچ رہے۔'' سلوپ نے کہا۔

''دروازہ کھلا ہوا ہے۔'' کولٹر غصے سے بولا۔ ''کسی نے تمہارا ہاتھ نہیں پکڑا، تم جا سکتے ہو۔'' یہ سن کر سلوپ کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور اس کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی۔

''رالنگو میں کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں ایک ریلوے یارڈ ہے جس میں ٹرینوں کے لیے مسافر بوگیاں تیار کی جاتی ہیں۔ کچھ بائیں بازو کے لوگ گزشتہ دو سال سے وہاں کام کرنے والے کارکنوں کو منظم کر رہے ہیں۔ انہوں نے ریل ورکرز کی ایک نام نہاد بین الاقوامی تنظیم بنائی ہے جو صرف کہنے کی حد تک بین الاقوامی ہے دراصل یہ چند بدمعاشوں اور کام چوروں کا گروہ ہے جو مزدوروں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ انہوں نے ریل یارڈ کے مالک اسٹینلے مارکوس سے اوقات کار میں کمی اور اجرتوں میں اضافے کا مطالبہ کیا ہے۔ اپنے مطالبات منوانے کے لیے وہ آئے دن وقفے وقفے سے کام بند کرتے رہتے ہیں۔ جب مارکوس نے سختی کی تو وہ ہڑتال پر چلے گئے حالانکہ مارکوس کے پاس ایسے کئی مزدور ہیں جو ہڑتال کے مخالف ہیں اور کام پر واپس آنا

چاہتے ہیں لیکن اس نام نہاد مزدور تنظیم نے فیکٹری کے مرکزی گیٹ پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

''گویا وہ چاہتے ہیں کہ مرکزی گیٹ پر سے ان کا قبضہ ختم ہو جائے۔''

''ہاں، تم تینوں اپنی تیاری کرلو، مزید کچھ افراد بھی تمہارے ساتھ شامل ہونے کے لیے آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کام کے لیے یہ نفری کافی ہوگی۔ تمہیں کل صبح روانہ ہونا ہے۔''

ہم رانکو پہنچے تو وہاں حالات کافی کشیدہ تھے۔ شورش پسندوں کے ایک گروپ نے گیٹ پر قبضہ کر کے ان ایمان دار کارکنوں کا راستہ روک دیا تھا جو ایک دن کی مزدوری کی خاطر کام پر جانے کے لیے تیار تھے۔ فیکٹری کا مالک اسٹینلے مارکوس، مقامی میئر بھی تھا اور جج نے اس کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے ہڑتالی کارکنوں کو منتشر ہونے کا حکم دینے کے ساتھ اسے متبادل کارکن بھرتی کرنے کا اختیار بھی دے دیا تھا۔ مقامی شیرف میک ہورٹر سے ہماری ملاقات فیکٹری کے گیٹ سے ایک بلاک کے فاصلے پر ہوئی جو چند کاغذات سمیت وہاں موجود تھا۔

''میں گیٹ پر موجود لوگوں کو عدالت کا یہ حکم دینے جا رہا ہوں۔ تم لوگ میرے ساتھ رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی گستاخ مجھ پر حملہ... کر دے۔ ایسی صورت میں تم بہتر سمجھتے ہو کہ کیا کرنا ہے۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم شکاگو میں بھی ایسی صورتِ حال سے نمٹ چکے ہیں۔''

جیسے ہی میک ہورٹر گیٹ پر موجود لوگوں کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس کے گرد ایک نیم دائرہ بنا لیا۔ میں اس کی تدبیر پہلے ہی کر چکا تھا لہٰذا میں نے اپنے ساتھیوں کو تھوڑا سا پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

جیسا کہ مجھے امید تھی۔ ہورٹر کے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے اس کے گرد گھیرا بنا لیا پھر میں نے دیکھا کہ کسی نے اس کے سر پر بوتل دے ماری۔ اسے شاید اندازہ ہو گیا تھا لہٰذا آخری لمحے میں اس نے اپنے آپ کو اس وار سے بچا لیا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن پھر اس سے ایک غلطی سرزد ہوگئی اور اس نے ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی، فوراً ہی جونز، سلوپ اور میں مجمع میں گھس گئے اور ہڑتالی کارکنوں کو دائیں بائیں دھکیلتے ہوئے میک ہورٹر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ شیرف کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے گیٹ کی جانب بڑھنے کی کوشش کی

اور دھینگا مشتی میں اس کا ہیٹ زمین پر گر گیا۔ اس نے اپنا ریوالور فضا میں لہرایا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی احمقانہ حرکت کرتا میں نے آگے بڑھ کر اس سے ریوالور چھین لیا۔

''تم پاگل ہو گئے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس ایک ریوالور ہے اور چھ گولیاں ہیں جبکہ اتنی سے زیادہ افراد تمہاری بوٹیاں نوچنے کو تیار ہیں۔''

میں اور جونز اسے کھینچتے ہوئے گیٹ سے دور لے گئے جبکہ سلوپ ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ تقریباً نصف بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم رک گئے۔

''تم کس قسم کے بزدل شخص ہو۔'' وہ غصے سے بولا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے لگا کہ کہیں اس پر فالج کا حملہ نہ ہو جائے۔

''ہم حقیقت پسند ہیں۔'' سلوپ نے کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شیرف۔ ابھی ہم نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ فی الحال محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم اپنے کاغذات سنبھالو، ہم ابھی آتے ہیں۔''

میں شیرف کے پاس ہی رک گیا اور میرے دونوں ساتھی ان لوگوں کو دیکھنے کے لیے ارگرد کا جائزہ لینے لگے جو ہماری مدد کے لیے آنے والے تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہماری تعداد بیس ہوگئی اور ہم نے ایک بار پھر شیرف کی معیت میں گیٹ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس بار ہم نے اپنے ہتھیار چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ ہم چاہتے تھے کہ ہڑتالی کارکن ہمیں دور سے ہی آتے ہوئے دیکھ لیں تاکہ انہیں فیصلہ کرنے کے لیے ایک دو منٹ مل جائیں۔ ہم سب سخت جان اور مضبوط جسم کے لوگ تھے اور ہمیں جنگیں لڑنے کا تجربہ بھی تھا۔ اس کے برعکس ہڑتالی سخت زندگی کے عادی نہیں تھے۔ ہمیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ منتشر ہونے لگے۔ جب ہم گیٹ پر پہنچے تو وہاں بمشکل پندرہ افراد رہ گئے تھے۔ والٹران کے درمیان کھڑا خطرناک انداز میں ہمیں گھور رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر نعرے لگانے لگے لیکن ان کا زور ٹوٹ چکا تھا اور شیرف کے لیے یہ ممکن ہو گیا تھا کہ وہ عدالتی احکامات پر عمل کرواتے ہوئے فیکٹری کا گیٹ کھول دے۔

یہ سلسلہ چند روز تک جاری رہا۔ ہڑتالی کارکن رات میں جمع ہو کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے لیکن دوسری صبح وہ ہمیں دیکھتے ہی منتشر ہو جاتے۔ اس طرح کام پر جانے کے خواہش مند کارکنوں کو فیکٹری کے اندر جانے کا موقع مل جاتا اور وہ معمول کے مطابق اپنا کام شروع

کردیتے۔

ہم نے فیکٹری سے تین بلاک کے فاصلے پر ایک کرائے کی عمارت میں اپنا عارضی دفتر بنایا تھا۔ ہڑتال کا پانچواں دن تھا اور ہم لوگ ناشتا کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک مارکوس وہاں آ گیا۔ اسے وہاں دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ سلوپ بولا۔

’’مسٹر میئر، ہم تمہاری کیا خدمت کرسکتے ہیں؟‘‘

’’تم لوگ بہت اچھا کام کررہے ہو۔‘‘ مارکوس نے کہا۔ ’’لیکن یہ کافی نہیں ہے۔‘‘

’’یہ مت سمجھنا کہ ہماری ایجنسی مزید لوگوں کو بھیج سکتی ہے۔ اس کے لیے تمہیں دگنا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔‘‘

’’یہ بات نہیں ہے، تم نے ہڑتالی کارکنوں کو تو قابو کرلیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے فیکٹری کو پوری استعداد کے مطابق چلانے کے لیے مناسب تعداد میں لوگ نہیں مل رہے۔ اس وقت ہم پینتالیس فی صد پیداوار دے رہے ہیں جبکہ ہمیں آرڈرز پورے کرنے کے لیے اس میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف گیٹ کلیئر کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ مجھے مزید کارکن چاہئیں۔‘‘

’’ہم اس معاملے میں کیا کرسکتے ہیں؟‘‘ جونز نے پوچھا۔

’’میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔‘‘ مارکوس نے کہا۔ ’’مائلز کورکورن اور اس کے ساتھیوں کے اس قصبے میں آنے سے پہلے میرے مزدور بالکل مطمئن تھے لیکن اس نے ان کے دماغ میں زہر بھر دیا اور یہی اس ہڑتال کا سرغنہ ہے اگر ہم کسی طرح اسے قابو کرلیں تو یہ ہڑتال منٹوں میں ختم ہوجائے گی۔‘‘

’’تم اس بارے میں کیا تجویز کرتے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ ایک مرتبہ کورکورن اور اس کے پارٹنر نورس ہیلکس سے ملاقات کرو۔ انہوں نے فیکٹری سے نصف میل کے فاصلے پر پل اسٹریٹ پر ایک دفتر کرائے پر لے رکھا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں شیرف سے بھی بات کی ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر ان کے دفتر پر چھاپا مارا جائے تو اس سے ان کا کافی نقصان ہوگا۔‘‘

’’تم یہ کہہ رہے ہو کہ اگر اس دفتر کو تباہ کردیا جائے تو تم اسے نظرانداز کردو گے۔‘‘ سلوپ نے کہا۔

’’یہ لوگ اس قصبے کو تباہ کررہے ہیں۔‘‘ مارکوس بولا۔ ’’اگر کوئی ان کے دفتر کو آگ لگادے اور انہیں شہر چھوڑنے پر مجبور کردے تو کوئی ان کے لیے پریشان نہیں ہوگا۔‘‘

’’ہم اندھیرا ہونے کا انتظار کریں گے۔‘‘ سلوپ نے کہا۔ ’’تاکہ کورکورن اور اس کے ساتھیوں کے لیے ہمیں شناخت کرنا مشکل ہوجائے۔‘‘

وہ یکم ستمبر کا دن تھا اور اس موسم میں سورج آٹھ بجے سے پہلے غروب نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے گزشتہ ہفتے کی طرح اس روز بھی صبح کے وقت فیکٹری کے گیٹ کلیئر کروا دیے تھے۔ پھر میں پل اسٹریٹ پر واقع انٹرنیشنل ریلوے ورکرز کے دفتر کے سامنے پڑی ہوئی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا تاکہ دفتر میں آنے جانے والوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکوں۔ پورے دن میں دفتر سے ایک شخص دو مرتبہ باہر نکلا اور قریبی ہوٹل سے کھانا لے کر آیا۔ ڈبوں کے سائز سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ دفتر میں موجود دو یا تین افراد کے لیے کھانا لے جارہا تھا۔ وہ یقیناً نورس ہوگا جس کا مطلب تھا کہ کورکورن دفتر میں ہی موجود ہے۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک اندھیرا اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ تبھی ایوریٹ سلوپ چلتا ہوا میری بینچ کی جانب آیا اور عین اسی وقت میں نے وارن جونز اور ہماری مدد کے لیے آنے والے ایک نوجوان فیرس کو سڑک کی دوسری جانب سے دفتر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

’’تم اس لڑکے فیرس کو جانتے ہو؟‘‘ میں نے سلوپ سے پوچھا۔

’’ہاں، یہ لڑکا ہمارے کام کا ہے۔ میں نے اس سے آج رات ہماری مدد کرنے کے لیے کہا ہے۔ امید ہے کہ یہ بخوبی اپنا کام سرانجام دے گا۔‘‘

ایک مجمع کو منتشر کرنا آسان تھا بہ نسبت رات کی تاریکی میں کسی دفتر پر حملہ کرنے کے جبکہ اندر کی صورت حال کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ ہم اپنے طور پر مسلح ہوکر آئے تھے۔ سب نے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جونز نے سڑک کے پار سے ہماری طرف دیکھا اور میں نے سر ہلا کر بتادیا کہ ہم تیار ہیں۔ سلوپ اور میں نے سڑک پار کرنا شروع کی۔ ابھی ہم آدھے راستے پر تھے کہ جونز اور فیرس نے سامنے والے دروازے پر ہلہ بول دیا۔ ہم دوڑتے ہوئے جونز کے پیچھے گئے لیکن فوراً ہی منتشر ہونا پڑا جب ہم نے اندر سے فائر کے علاوہ کسی کے چلانے کی آواز بھی سنی۔

’’مجھے گولی لگی ہے۔‘‘ کوئی زور سے چلایا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے پھر جونز کی دونالی بندوق سے

لگاتار فائر ہوئے۔ اس سے پہلے میں نے پستول کے چلنے کی آواز بھی سنی تھی، پھر میں نے کچھ دبی دبی آوازیں سنیں جو شاید دفتر کے عقب سے آرہی تھیں۔

"پچھلے دروازے کی طرف۔" میں نے چلاتے ہوئے سلوپ سے کہا لیکن وہ پہلے ہی کسی کونے میں دبک چکا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا مرکزی دروازے تک گیا اور کواڑ کی اوٹ سے اندر جھانکا۔ کمرے کے عقب میں ایک لیمپ جل رہا تھا۔ میری نظر فرش پر گئی جہاں وارن جونز اور فیرس بے سدھ پڑے تھے اور ایک اندھا بھی بتا سکتا تھا کہ وہ اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ میں نے الٹی کر کے اس تیزاب کو باہر نکال دیا جو ناک کے راستے میرے حلق میں جا رہا تھا۔

ہمارا پہلا حملہ بہت بری طرح ناکام ہوا تھا۔ جونز اور فیرس کی موت بہت بڑا حادثہ تھی۔ ایجنسی نے مجھے اور سلوپ کو اس واقعے کا ذمے دار ٹھہرایا لیکن اس موقع پر مارکوس نے ہماری مدد کی اور فون کر کے وضاحت کی کہ ہم اس کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے کیونکہ وہ ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ ہورن ایجنسی کا کلائنٹ بھی ہے لیکن میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں ان اموات کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ میں اور سلوپ سینئر ممبر تھے اور اس لحاظ سے ہم دونوں کو حملہ کرنے میں پہل کرنا چاہیے تھی۔ جو کچھ وارن جونز اور فیرس کے ساتھ ہوا اس کے بعد یہی کہا جاسکتا تھا کہ ہم نے اپنے پتے غلط استعمال کیے۔

اس واقعے کے کئی روز بعد میں ایجنسی کے عارضی دفتر میں بیٹھا پولیس گزٹ کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک دبلا پتلا شخص اندر داخل ہوا اور اس نے اپنا تعارف جیتھر وشین کے نام سے کروایا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک حیرانی سے دیکھا اور بولا۔

"میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں مسٹر شین؟"

"میں مائلز کورکورن اور تورس ہیکس کا وکیل ہوں اور تم سے ان کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"ٹھیک طرح سے نہیں بتا سکتا۔ وہ رابطے میں ہیں لیکن انہوں نے اپنے موجودہ مقام کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی۔"

"یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ پھانسی چڑھنے سے پہلے میں ان سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

"میں جانتا ہوں اور اسی لیے خاص طور پر یہاں آیا ہوں۔ وہ بے گناہ ہیں اور جب ان کے دفتر پر حملہ کیا گیا تو انہوں نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔"

"تمہیں یہ وضاحت جونز کی ماں سے کرنا چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اس ہفتے کے آخر میں اس کی لاش لینے آرہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہ سننے میں ضرور دلچسپی ہوگی کہ کس طرح تمہارے موکلوں کے حقوق مجروح ہوئے اور کس طرح انہوں نے قانون کی پاس داری کرتے ہوئے اس کے بیٹے کو مار ڈالا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس سے ملوا سکتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ تم یہ سوچنے کے لیے تیار ہو کہ میرے موکلوں نے تمہارے دوست کو نہیں مارا۔"

"وہ ان کا دفتر ہے اور میں تقریباً سارا دن اس کے سامنے بینچ پر بیٹھا نگرانی کر رہا تھا اور میں نے تمہارے آدمی تورس کو دو مرتبہ دفتر سے باہر آتے اور جاتے دیکھا۔"

"لیکن تم نے مائلز کورکورن کو تو نہیں دیکھا۔"

"لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ صبح کے وقت دفتر میں داخل ہوا تھا لیکن کسی نے اسے باہر آتے نہیں دیکھا۔"

"اور تمہارے حملہ کرنے کے بعد میرے موکل کہاں تھے؟"

"وہ میرے ساتھیوں کو مارنے کے بعد پچھلے دروازے سے فرار ہوگئے۔"

"اور تم سارا دن پچھلے دروازے کو بھی دیکھتے رہے؟"

اس جملے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جونز اور سلوپ فیکٹری کے گیٹ پر تعینات تھے جبکہ میں دفتر کے سامنے بینچ پر بیٹھا دفتر کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔

"ہمارے پاس اتنے لوگ نہیں تھے کہ دونوں دروازوں کی نگرانی کی جاسکتی۔"

"اس کے باوجود بھی تمہیں یقین ہے کہ جب تم نے حملہ کیا تو میرے موکل دفتر میں موجود تھے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا لیکن میں اپنی آواز میں بے یقینی محسوس کرسکتا تھا۔

"میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ اگر میرے موکلوں پر مقدمہ چلایا گیا تو میں تمہیں صفائی کے گواہ کے طور پر طلب کروں گا اور مجھے امید ہے کہ تم جیوری کو وہی کچھ

بتاؤ گے جو ابھی مجھے بتایا ہے کہ کوئی بھی شخص عقبی دروازے کی نگرانی نہیں کررہا تھا اور تم نے مائلز کورکورن کو دفتر میں جاتے یا باہر آتے نہیں دیکھا۔“

”میرا خیال ہے کہ اب ہمارے پاس باتیں کرنے کے لیے کچھ اور نہیں ہے۔“ میں نے بےزاری سے کہا۔

اس نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور اپنا ہیٹ اٹھا کر دفتر سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک اس سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں سوچتا رہا پھر میں بھی اپنا ہیٹ اٹھا کر باہر آ گیا۔

قصبے کے ڈاکٹر کول مین فرنچ کا کلینک ہمارے دفتر سے آدھے فرلانگ کے فاصلے پر تھا جب میں وہاں پہنچا تو وہ ایک لڑکے کے بازو پر پٹی باندھ رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اپنا کارڈ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے ان لڑکوں کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں جنہیں گولی لگنے کے بعد تمہارے کلینک میں لایا گیا تھا۔“

”میرے دفتر میں آجاؤ۔“

دفتر میں پہنچنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔”میں ان کے جسم سے نکلنے والی گولیوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”میں ایک ڈاکٹر ہوں مسٹر کرین اور مجھے گولیوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

”یہ تو بتا سکتے ہو کہ وہ بڑی گولیاں تھیں یا چھوٹی؟“

”ٹھہرو، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے کرسی گھمائی اور عقب میں رکھے کیبنٹ سے ایک بوتل نکال کر مجھے پکڑاتے ہوئے بولا۔”اگر مجرموں کے خلاف مقدمہ چلایا جاتا ہے تو تم انہیں ثبوت کے طور پر پیش کر سکتے ہو۔“

میں نے اس کی پوری بات سنے بغیر بوتل کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس میں سات گولیوں کے خول تھے اور میں بہ آسانی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ اعشاریہ تین آٹھ اور اعشاریہ چار پانچ کے ریوالوروں سے چلائے گئے تھے۔

”یہ پیشہ ور قاتل معلوم ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”حملے کے بعد میں نے دفتر کا معائنہ کیا تھا۔ صرف اس جگہ کے علاوہ جہاں لاشیں پڑی ہوئی تھیں کسی جگہ خون کا ایک قطرہ نظر نہیں آیا۔“ انہوں نے عقبی دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

جب میں ہورن ایجنسی کے دفتر واپس پہنچا تو اسٹینلے مارکوس باہر پڑی بینچ پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دفتر کا تالا کھولا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے اندر آ گیا اور کرسی پر گرتے ہوئے بولا۔

”تمہارے لیے ایک کام ہے۔“

”میں جیس کولٹر سے احکامات لیتا ہوں۔“

”یہ اچھی بات ہے۔ میں پہلے ہی اس سے بات کر چکا ہوں۔ ہمیں مائلز کورکورن اور نورس ہیکس کے بارے میں ایک اطلاع ملی ہے کہ دونوں کنکناتی کے ایک ہوٹل میں چھپے ہوئے ہیں۔ میں نے ہوٹل کا پتا اور کمرا نمبر بھی معلوم کر لیا ہے۔“

”یہ تمہیں کہاں سے معلوم ہوا؟“

”ایک بہت ہی معتبر ذریعے سے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے، میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں مقامی پولیس کی مدد لی جا سکتی ہے؟“

”نہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم یہ کام کرو۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ تم اس معاملے میں شامل ہو۔ تمہارا ایک ساتھی ان کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔“

”وہاں سے آتے ہوئے عملے کا ایک فرد فیرس بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میرا خیال ہے کہ ان مجرموں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے وہیں کے لوگ بہتر ہوں گے۔“

”کولٹر چاہتا ہے کہ اس کام کے لیے تمہیں وہاں بھیجا جائے۔“

”کیا اس نے وجہ بتائی کہ وہ مجھے ہی کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟“

”نہیں لیکن اس نے صاف صاف کہا کہ کرین کو بھیجو۔ اس نے یہ بات زور دے کر کہی۔“

”گویا تم چاہتے ہو کہ میں ٹرین کے ذریعے وہاں جاؤں، تمہارے مطلوبہ لوگوں کو پکڑوں اور انہیں یہاں لے آؤں اس کے لیے کسی کاغذ کی ضرورت نہیں جبکہ مجرمان کی تحویل کے لیے یہ ایک ضروری کارروائی ہوتی ہے۔“

”میں تمہیں سمجھاتا ہوں، اوہائیو بھی امریکی ریاست ہے اور ان کمیونسٹوں نے چالیس سال پہلے وہاں اس تنظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لیے وہاں کی پولیس ان مجرموں کو ہماری تحویل میں دینا پسند نہیں کرے گی۔“

”تم چاہتے ہو کہ میں انہیں اغوا کر لوں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں یہاں واپس لے آؤ تاکہ انہیں انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکے۔ تمہیں

معلوم ہونا چاہیے کہ ہورن ایجنسی میرے لیے کام کرتی ہے اور تم اس کے ملازم ہو۔ اس لیے تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا ان لوگوں کو واپس لے کر آؤ۔''

''ٹھیک ہے، تم ضروری کاغذات اور شناختی بیج بنوادو۔ میں کل ہی روانہ ہو جاتا ہوں۔''

دوسرے دن شام کے وقت میں مارکوس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ وہ ہوٹل اسٹیشن سے دس بلاک کے فاصلے پر تھا۔ مارکوس کی دی ہوئی اطلاعات درست تھیں۔ وہ دونوں یعنی کورکورن اور نورس چوتھے فلور پر ایک کونے کے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نورس کو تو شکل سے پہچانتا تھا لیکن کورکورن کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے مارکوس نے یونین کے اخبار میں شائع ہونے والی تصویر کاٹ کر میرے حوالے کر دی تھی۔ یہ زیادہ واضح تو نہیں تھی لیکن اس کے ذریعے کم از کم میں کورکورن کی شناخت کر سکتا تھا۔

میں ان کے کمرے کے دروازے کے باہر کئی منٹ تک کان لگائے کھڑا رہا لیکن کوئی آواز سننے میں نہیں آئی۔ گو کہ رات بہت زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن لگتا تھا کہ وہ دونوں جلدی سو گئے تھے۔ میں نے دروازے پر دو مرتبہ دستک دی۔ اندر تھوڑی سی سرسراہٹ ہوئی پھر چند سیکنڈ بعد کسی نے کہا۔ ''کون ہے؟''

''استقبالیہ سے آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مسٹر کورکورن کا ٹیلی گرام ہے۔''

دروازہ تھوڑا سا کھلا اور ایک شخص چندھیائی ہوئی آنکھوں سے باہر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں ہی کورکورن ہوں۔''

میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اسے باہر کھینچ لیا پھر میں نے تیزی سے اپنا ریوالور نکالا اور اس کے رخسار کی ہڈی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''نورس، کیا وہ اندر ہے؟''

''وہ آج صبح چلا گیا۔'' کورکورن گھگیاتے ہوئے بولا۔

''بہتر ہوگا کہ مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔'' میں نے ریوالور کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا نا کہ وہ جا چکا ہے۔''

میں نے اسے زمین سے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور منہ کے بل فرش پر گرا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ شور و غل کرتا میں نے عقب سے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور اسے پتلون کی پیٹی سے پکڑ کر کمرے میں دھکیل دیا۔ وہاں

مشہوری

عالم سکرات میں شیخ صاحب نے وصیت لکھوائی۔ ''جس ملازم نے بھی میری 20 سال سے زیادہ خدمت کی ہے۔ اسے میرے ترکے میں سے 50 ہزار روپیا دیا جائے۔''

''لیکن جناب والا، 20 سال تو آپ کو بزنس کرتے نہیں ہوئے۔'' وکیل نے جواب دیا۔

''مجھے علم ہے لیکن مشہوری تو ہو جائے گی۔'' شیخ نے مرتے مرتے کہا۔

محمد منشا، جلالپور بھٹیاں

کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ سچ بول رہا ہے تو میں نے کہا۔

''میں تمہیں واپس رالنگو لے جا رہا ہوں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ مجھے پھانسی دے دیں گے۔''

''تمہیں یہ بات میرے ساتھیوں کو قتل کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔''

''تمہیں ایسا کوئی اختیار نہیں۔''

میں نے اپنی جیکٹ کھولی اور اسے سینے پر لگا ہوا رالنگو کے ڈپٹی شیرف کا بیج دکھایا۔

''اوہ خدا۔'' وہ بلبلاتے ہوئے بولا۔ ''اب تو میں یقیناً مارا جاؤں گا۔''

اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے وہ کسی حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ میں نے اسے ٹرین میں سوار کروایا اور اس کے ایک ہاتھ کی ہتھکڑی کے دوسرے سرے کو برتھ کی سلاخ سے باندھتے ہوئے کہا کہ یہ سفر بہت مختصر ہے اور اسے برتھ پر لیٹنے یا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن جب ٹرین چل پڑی تو اس نے کافی دیر بعد اپنی زبان کھولی اور بولا۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ ٹرین کار رالنگو کے ریل یارڈ میں بنی ہے اور میں جن لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہوں تمہیں معلوم ہے کہ انہیں کیا معاوضہ ملتا ہے؟''

''نہیں۔''

''پچاس سینٹ فی گھنٹا اگر وہ بہت زیادہ خوش قسمت

ہوں اور انہیں مسلسل کام ملتا رہے تو وہ سال میں بمشکل ایک ہزار ڈالر ہی کما پائیں گے جبکہ امریکی حکومت کا کہنا ہے کہ چار افراد کے خاندان کے لیے کم از کم بائیس سو ڈالرز درکار ہیں۔ اس لیے ریل یارڈ کے مزدور بھی مناسب معاوضے کے حق دار ہیں۔ بیماری یا معذوری کی صورت میں بھی انہیں کچھ نہیں ملتا اور نہ ہی بڑھاپے میں انہیں کوئی پنشن ملتی ہے۔"

"واقعی یہ ایک مشکل زندگی ہے لیکن تم اپنی باتوں سے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ میں یہ سب کئی بار سن چکا ہوں۔"

"ایجنسی تمہیں کیا دیتی ہے؟ لباس سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہارا معاوضہ پچاس سینٹ فی گھنٹا سے کہیں زیادہ ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کہ تم سال میں پانچ چھ ہزار ڈالر ضرور کما لیتے ہوگے اور یہ ان مزدوروں کی آمدنی سے کہیں زیادہ ہے جو صرف اپنے گھر والوں کے لیے دو وقت کی روٹی چاہتے ہیں۔"

"پھر تو انہیں ہڑتال پر جانے کے بجائے کام کرنا چاہیے۔" میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"وہ یہ سب بہتر معاوضوں کے لیے کر رہے ہیں۔ اکیلے آدمی کی کوئی طاقت نہیں ہوتی بلکہ اگر چار پانچ لوگ بھی احتجاج کریں تو انہیں نوکری سے نکال کر دوسرے لوگ بھرتی کر لیے جائیں گے۔ لیکن جب تمام ملازمین ہڑتال پر چلے جائیں اور فیکٹری میں کام بند ہو جائے تو مارکوس کے پاس بات چیت کے سوا کوئی راستہ نہ ہوگا اگر وہ اس پر آمادہ ہو جاتا ہے تو بہت بڑے نقصان سے بچ سکتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ہڑتال ختم کروانے کے لیے تم جیسے لوگوں کی خدمات حاصل کرے۔"

"تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے کہ ہڑتال شروع ہونے کے بعد اس کی فیکٹری کی پیداوار میں ستر فی صد کمی واقع ہوگئی ہے لہٰذا اس نے تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو یونین کے دفتر بھیجا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ لیڈروں پر قابو پا کر ہڑتال ختم کروائی جا سکتی ہے۔ بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں خاموش رہا تو وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جب تمہارے آدمی دفتر میں داخل ہوئے تو میں اور نورس وہاں نہیں تھے۔ ہم دونوں پہلے ہی وہاں سے نکل گئے تھے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ کسی نے چند منٹ پہلے فون کر کے تمہارے حملے کی اطلاع دے دی تھی لہٰذا ہم پچھلے دروازے سے نکل کر آدھے بلاک کے فاصلے پر ایک مکان میں چھپ گئے اور جب گولیاں چلنے اور دھماکوں کی آواز سنی تو ہم سمجھ گئے کہ اس کا الزام کس کے سر آئے گا لہٰذا ہم پہلی ٹرین کے ذریعے کنکتاتی آ گئے۔"

"میں اس کہانی پر کیسے یقین کر لوں؟"

"تم آپریٹر سے اس ٹیلی فون کال کے بارے میں تصدیق کر سکتے ہو۔"

اگلی صبح ہم راتھو پہنچے اور میں کورکورن کو لے کر سیدھا جیل گیا۔ میں نے مارکوس کو اپنی آمد کے بارے میں پہلے ہی ٹیلی گرام دے دیا تھا لہٰذا مجھے جیل میں شین کو دیکھ کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ میک ہوورڈ بھی وہاں موجود تھا۔

"میں مسٹر کورکورن کی ضمانت قبل از گرفتاری کروانا چاہتا ہوں۔" وکیل نے کہا۔

"یہ ممکن نہیں۔" میک ہوورڈ نے کہا۔ "یہ اختیار صرف جج کے پاس ہے جو اگلے ہفتے سے پہلے یہاں نہیں آئے گا لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم اس کا پورا خیال رکھیں گے۔"

شین غصے سے شیرف کو گھورتا ہوا جیل سے باہر چلا گیا۔ شیرف نے کورکورن کو جیل کی کوٹھری میں بند کر دیا تو وہ سلاخوں کے پیچھے سے چلاتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "تمہیں یاد ہے میں نے کیا کہا تھا، بھول مت جانا۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد میں میک ہوورڈ کے دفتر چلا گیا وہاں اس کا ایک نائب رائفل موجود تھا۔ میں نے اس سے کورکورن کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔ "مزے مزے میں ہے، ہم اسے بادشاہوں جیسی خوراک دے رہے ہیں تاکہ جج کے سامنے صحت مند حالت میں پیش ہو۔ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"تمہارے پاس میرے ساتھی جونز کی شارٹ گن ہے۔ میں وہی لینے آیا ہوں کیونکہ وہ ہورن ایجنسی کی ملکیت ہے۔"

"ایک منٹ ٹھہرو، میں لے کر آتا ہوں۔"

وہ کمرے کے عقبی حصے میں گیا اور چند لمحوں بعد ہی شارٹ گن لے کر واپس آ گیا۔ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں تو بھول ہی گیا اس کے ساتھی فیرن کے پاس بھی ریوالور تھا۔ مجھے اس کی بھی ضرورت

ہوں اور انہیں مسلسل کام ملتا رہے تو وہ سال میں بمشکل ایک ہزار ڈالر ہی کما پائیں گے جبکہ امریکی حکومت کا کہنا ہے کہ چار افراد کے خاندان کے لیے کم از کم بائیس سو ڈالرز درکار ہیں۔ اس لیے ریل یارڈ کے مزدور بھی مناسب معاوضے کے حق دار ہیں۔ بیماری یا معذوری کی صورت میں بھی انہیں کچھ نہیں ملتا اور نہ ہی بڑھاپے میں انہیں کوئی پینشن ملتی ہے۔"

"واقعی یہ ایک مشکل زندگی ہے لیکن تم اپنی باتوں سے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ میں یہ سب کئی بار سن چکا ہوں۔"

"ایجنسی تمہیں کیا دیتی ہے؟ لباس سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہارا معاوضہ پچاس سینٹ فی گھنٹا سے کہیں زیادہ ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کہ تم سال میں پانچ چھ ہزار ڈالر ضرور کما لیتے ہو گے اور یہ ان مزدوروں کی آمدنی سے کہیں زیادہ ہے جو صرف اپنے گھر والوں کے لیے دو وقت کی روٹی چاہتے ہیں۔"

"پھر تو انہیں ہڑتال پر جانے کے بجائے کام کرنا چاہیے۔" میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"وہ یہ سب بہتر معاوضوں کے لیے کر رہے ہیں۔ اکیلے آدمی کی کوئی طاقت نہیں ہوتی بلکہ اگر چار پانچ لوگ بھی احتجاج کریں تو انہیں نوکری سے نکال کر دوسرے لوگ بھرتی کر لیے جائیں گے۔ لیکن جب تمام ملازمین ہڑتال پر چلے جائیں اور فیکٹری میں کام بند ہو جائے تو مارکوس کے پاس بات چیت کے سوا کوئی راستہ نہ ہوگا اگر وہ اس پر آمادہ ہو جاتا ہے تو بہت بڑے نقصان سے بچ سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہڑتال ختم کروانے کے لیے تم جیسے لوگوں کی خدمات حاصل کرے۔"

"تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے کہ ہڑتال شروع ہونے کے بعد اس کی فیکٹری کی پیداوار میں ستر فی صد کمی واقع ہوگئی ہے لہٰذا اس نے تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو یونین کے دفتر بھیجا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ لیڈروں پر قابو پا کر ہڑتال ختم کروائی جا سکتی ہے۔ بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں خاموش رہا تو وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جب تمہارے آدمی دفتر میں داخل ہوئے تو میں اور نورس وہاں نہیں تھے۔ ہم دونوں پہلے ہی وہاں سے نکل گئے تھے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ کسی نے پندرہ منٹ پہلے فون کر کے تمہارے حملے کی اطلاع دے دی تھی لہٰذا ہم عقبی دروازے سے نکل کر آدھے بلاک کے فاصلے پر ایک مکان میں چھپ گئے اور جب گولیاں چلنے اور دھماکوں کی آوازیں سنی تو ہم سمجھ گئے کہ اس کا الزام کس کے سر آئے گا لہٰذا ہم پہلی ٹرین کے ذریعے کنکناتی آ گئے۔"

"میں اس کہانی پر کیسے یقین کرلوں؟"

"تم آپریٹر سے اس ٹیلی فون کال کے بارے میں تصدیق کر سکتے ہو۔"

اگلی صبح ہم رانگو پہنچے اور میں کورکورن کو لے کر سیدھا جیل گیا۔ میں نے مارکوس کو اپنی آمد کے بارے میں پہلے ہی ٹیلی گرام دے دیا تھا لہٰذا مجھے جیل میں..... شین کو دیکھ کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ میک ہورٹر بھی وہاں موجود تھا۔

"میں مسٹر کورکورن کی ضمانت قبل از گرفتاری کروانا چاہتا ہوں۔" وکیل نے کہا۔

"یہ ممکن نہیں۔" میک ہورٹر نے کہا۔ "یہ اختیار صرف جج کے پاس ہے جو اگلے ہفتے سے پہلے یہاں نہیں آئے گا لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم اس کا پورا خیال رکھیں گے۔"

شین غصے سے شیرف کو گھورتا ہوا جیل سے باہر چلا گیا۔ شیرف نے کورکورن کو جیل کی کوٹھری میں بند کر دیا تو وہ سلاخوں کے پیچھے سے چلاتے ہوئے مجھ سے بولا۔ "تمہیں یاد ہے میں نے کیا کہا تھا، بھول مت جانا۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد میں میک ہورٹر کے دفتر چلا گیا وہاں اس کا ایک نائب رائفل موجود تھا۔ میں نے اس سے کورکورن کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔ "بڑے مزے میں ہے، ہم اسے بادشاہوں جیسی خوراک دے رہے ہیں تاکہ جج کے سامنے صحت مند حالت میں پیش ہو۔ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"تمہارے پاس میرے ساتھی جونز کی شارٹ گن ہے۔ میں وہی لینے آیا ہوں کیونکہ وہ ہورن ایجنسی کی ملکیت ہے۔"

"ایک منٹ ٹھہرو، میں لے کر آتا ہوں۔"

وہ کمرے کے عقبی حصے میں گیا اور چند لمحوں بعد ہی شارٹ گن لے کر واپس آ گیا۔ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں تو بھول ہی گیا اس کے ساتھی فیرس کے پاس بھی ریوالور تھا۔ مجھے اس کی بھی ضرورت

ہوگی۔"

اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "پہلے ہی بول دیتے۔ اب مجھے دوبارہ جانا ہوگا۔" پھر وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور ریوالور لا کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چیمبر میں پانچ خانے تھے۔ جس سے چار فائر کیے گئے تھے جبکہ ایک بغیر چلا ہوا کارتوس چیمبر میں موجود تھا جو کہ ایک حیران کن بات تھی اور وہ بھی اعشاریہ تین آٹھ کی تھی جبکہ جورج کو بھی اعشاریہ تین چار ہی کی چار گولیاں لگی تھیں تو کیا فیرس نے حادثاتی طور پر میرے ساتھی پر گولی چلائی تھی اور اگر یہ حادثہ نہیں تھا تو...

اس سے زیادہ سوچنے کی مجھ میں سکت نہیں تھی۔ میں نے دونوں ہتھیار اٹھائے اور ڈپٹی کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح اطلاع ملی کہ مائکل کورکورن نے رات کسی وقت جیل کی کوٹھری میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ شیرف نے اس کی کمر سے بیلٹ نہیں نکالی تھی۔ اس نے اس کا پھندا بنا کر سلاخوں میں ڈالا اور بستر پر کھڑے ہو کر اس نے وہ پھندا گلے میں ڈال لیا اور جب اس نے پاؤں سے بستر ہٹایا تو اس کا جسم پھندے میں جھول کر رہ گیا۔ بظاہر اس خودکشی کی کوئی وجہ سامنے نہیں آئی۔ عام طور پر جیل میں وہ لوگ خودکشی کرتے ہیں جنہیں اپنے بچنے کا یقین نہیں ہوتا۔ کورکورن کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا پھر مجھے اس کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے ٹرین کے سفر کے دوران مجھ سے کہے تھے۔

"اگر انہوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا تو میں ہفتے کے اختتام تک زندہ نہیں رہوں گا۔ مارکوس مجھے خاموش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میئر اسے کیوں خاموش رکھنا چاہتا ہے۔ کورکورن کو ایسی کیا بات معلوم تھی جو وہ بتانا چاہ رہا تھا لیکن وہ بات اب کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ اس دنیا سے جا چکا تھا۔ اگر شیرف اس کی بیلٹ اتار لیتا تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ اس کا مطلب ہے کہ مارکوس اور میک ہورٹر نے اسے مارنے کی سازش کی تھی۔ خودکشی والی کہانی مجھ سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ کورکورن شدت سے اس موقع کا انتظار کر رہا تھا جب وہ عدالت میں پیش ہو کر اپنی صفائی پیش کر سکے جہاں اسے انصاف ملنے کی توقع تھی لیکن اسے یہ موقع نصیب نہیں ہوا۔

کورکورن کی موت نے میرے ذہن میں کئی شبہات کو جنم دیا لیکن یہ میرا کام نہیں تھا کہ اس معاملے کی تحقیقات کروں۔ مجھے تو ہڑتال ختم کروانے کے لیے بھیجا جاتا اور اس کے بعد میرا کام ختم ہو جاتا۔ میں اور سلوپ کسی نئی مہم پر نکل جاتے اور شاید دوبارہ کبھی راڈلو آنے کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن ایک چیز مجھے شدت سے بے چین کیے دے رہی تھی کہ کورکورن کی بے وقت موت سے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے اور اس بے چینی سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں سچ جاننے کی کوشش کروں۔

ٹیلی فون آپریٹر سے میری ملاقات مین مائن ہوٹل کی لابی میں ہوئی۔ اس کا نام جولیا ٹرمبل تھا۔ وہ ایک خوش مزاج قدرے فربہ درمیانی عمر کی عورت تھی اور میرے خیال میں اس کام کے لیے بالکل مناسب تھی کیونکہ میں نے پہلی ملاقات میں ہی اندازہ لگا لیا کہ اسے بولنے کا مرض تھا۔ میں نے اسے ڈنر کی دعوت دی۔ پہلے تو وہ تھوڑا سا ہچکچائی لیکن جب میں نے آمد کا مقصد بتایا تو اس نے مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

اس سے رخصت ہو کر میں اس عمارت کی طرف آیا جہاں عدالت لگا کرتی تھی۔ باہر احاطے میں چند بینچیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں وہاں بیٹھ کر سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آٹھ بجے وکیل شین اپنے دفتر سے برآمد ہوا اور اپنے گھر کی جانب پیدل ہی چل پڑا۔ میں اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور بولا۔

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کچھ دور تمہارے ساتھ چلوں؟"

"ہاں، ہاں ضرور۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

"مجھے تمہارے مؤکل کی موت پر بہت افسوس ہے۔"

"ہاں۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ خودکشی کر سکتا ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھتا ہوں، ٹرین کے سفر کے دوران اس نے ایک مرتبہ بھی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اپنی جان لے لے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ عدالت کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔"

"گویا تمہیں امید تھی کہ اسے مجرم گردانا جائے گا۔"

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں اسے بچانے کے لیے پوری کوشش کرتا لیکن مجھے خدشہ ہے کہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ سرکٹ جج عام طور پر یونین کے لیڈروں کے لیے نرم گوشہ نہیں رکھتے۔''

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟''

وہ چلتے چلتے رک گیا اور بولا۔ ''یہ تم نے کیوں پوچھا؟''

''بظاہر تمہیں کورکورن کو بچانے کی بہت جلدی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں اسے واپس لے کر آیا تو تم فوراً ہی اس کی ضمانت کروانے کے لیے پہنچ گئے۔ اس سے میں نے یہ تاثر لیا کہ تمہارے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''جانے دو، اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ کورکورن کے مرنے کے بعد یہ ہڑتال زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکتی۔''

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''اب میں تمہیں ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دورانِ سفر کورکورن نے مجھے بتایا کہ جب ہم نے حملہ کیا تو وہ اور نورس دفتر میں موجود نہیں تھے۔''

''واقعی؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ سارا دن دفتر کی نگرانی کرتا رہا لیکن میں نے کورکورن کو باہر آتے نہیں دیکھا البتہ ہیکس ایک دو مرتبہ باہر آیا۔ اس کے علاوہ کوئی شخص عمارت میں داخل ہوا اور نہ ہی کسی کو باہر نکلتے دیکھا گیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ عقبی دروازے سے باہر نکل گئے ہوں گے۔''

''میرے مؤکل کے دفاع میں بنیادی نکتہ یہی تھا۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''کورکورن نے ٹرین میں مجھے بتایا کہ کسی نے ہمارے حملہ کرنے سے پندرہ منٹ پہلے فون کر کے اسے اور نورس کو خبردار کر دیا اور انہیں وہاں سے نکل جانے کے لیے کہا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہو۔ اگر اس کی بات پر یقین کر لیا جائے تو فون کرنے والے شخص کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم یونین کے دفتر پر حملہ کرنے والے ہیں جبکہ میرے اندازے کے مطابق اس کے بارے میں صرف میرے ساتھیوں، مسٹر مارکوس اور شیرف کو ہی علم تھا۔ اگر واقعی کسی شخص نے کورکورن اور ہیکس کو حملے کے بارے میں اطلاع دی تھی اور وہ دونوں عقبی دروازے سے باہر نکل گئے تھے تب بھی یہ بات وضاحت طلب ہے کہ جب ہم نے حملہ کیا تو دفتر میں کوئی شخص موجود تھا جس نے میرے پارٹنر اور اوہائیو سے آئے ہوئے نوجوان سپاہی فیرس کو مار ڈالا اور میری نظر میں یہ ایک معما ہے۔''

''یقیناً۔'' اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا، مسٹر شین، میرا دفتر آ گیا۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ساتھ شام گزار کر خوشی ہوئی۔''

اس کے جانے کے بعد میں اپنے دفتر میں کھڑا کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پلٹ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ جب اس نے کافی فاصلہ طے کر لیا تو میں بھی دفتر سے نکل کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں مجھے دیکھ نہ لے۔ اس لیے سڑک چھوڑ کر ملحقہ گلیوں میں دوڑنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ اس سے آگے نکل جاؤں۔ بالآخر میں ایک ایسے چوراہے پر پہنچ گیا جہاں سے وہ نظر نہیں آ رہا تھا اور میرے سامنے مکانوں کی ایک قطار تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ان میں سے کسی ایک مکان میں داخل ہوا ہوگا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک اسٹور کے برآمدے میں چھپا لیا جہاں بالکل اندھیرا تھا اور اس کا انتظار کرنے لگا اگر میرا اندازہ درست تھا تو شین زیادہ دیر یہاں نہیں رکتا۔

تقریباً آدھا گھنٹا بعد وہ ایک مکان سے برآمد ہوا اور مرکزی دروازے کو تالا لگا کر اسی سڑک پر واپس چل دیا جہاں سے ہم آئے تھے۔ اسے شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں چنانچہ میں مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔ تین بلاک چلنے کے بعد وہ ایک سنگل اسٹوری دفتر میں داخل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد دفتر میں روشنی ہو گئی اور میں سانس روکے آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔

پندرہ منٹ بعد میں نے ایک کار کے انجن کی آواز سنی جو دفتر کے مرکزی دروازے پر آ کر رک گئی۔ چند سیکنڈ بعد اس میں سے اسٹینلے مارکوس اور شیرف میک ہورٹر

باہر آئے اور دفتر کی عمارت میں داخل ہوگئے۔ میں سڑک پار کر کے اس جانب آ گیا اور رینگتا ہوا دفتر کے برابر والی گلی میں گھس گیا۔ ستمبر کا مہینا تھا لیکن گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی لیے گلی کی جانب کئی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے گلی میں پڑے ہوئے دودھ کی بوتلوں کے ایک خالی کریٹ پر پاؤں رکھا اور ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔

شین خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ میئر نے میز کے قریب رکھی ہوئی کرسی سنبھالی جبکہ میک ہورٹر دروازے پر کسی محافظ کی طرح کھڑا رہا۔

''وہ سب جانتا ہے۔'' شین نے کہا۔ ''اس نے اشارتاً مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے ہی کورکورن کو حملے کے بارے میں اطلاع دی تھی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' مارکوس نے کہا۔ ''تم ان کے وکیل تھے اور انہیں بچانا چاہ رہے تھے۔''

''لیکن مجھے حملے کے بارے میں کیسے علم ہوا، کرین کا کہنا ہے کہ صرف وہ، اس کے ساتھی، تم اور میک ہورٹر اس حملے کے بارے میں جانتے تھے اور مجھے یہ بات اسی صورت میں معلوم ہو سکتی تھی جب تم یا شیرف کچھ بتاتے۔''

''وہ صرف ہڑتال ختم کروانے کے لیے آیا ہے۔'' میک ہورٹر نے کہا۔ ''اور اس کی حیثیت کرائے کے ایک سپاہی سے زیادہ نہیں ہے، تم اسے غیر ضروری اہمیت دے رہے ہو۔''

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔'' مارکوس نے شین سے کہا۔ ''ہمیں کورکورن اور نورس سے جان چھڑانی تھی۔ جونز بہت کچھ جانتا تھا، اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہم تمہیں ان کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس حملے کی ضرورت تھی۔''

اچانک میں نے اپنی پشت پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ میں تیزی سے گھوما تو سلوب مجھے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا تھا پھر اس نے سرگوشی کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''مجھے اس حملے کے دوران پیش آنے والے واقعات کی حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ یہ وکیل شین، مارکوس اور شیرف کے لیے کام کر رہا ہے۔ انہوں نے وارن جونز کو اس لیے مار دیا کہ وہ بہت کچھ جان گیا تھا۔''

اسی وقت میں نے شین کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ ''ہمیں

خود غرضی

ایک شخص کی دو بیٹیاں تھیں، وہ انہیں بے حد پیار کرتا تھا۔ اس نے ایک کی شادی مالی سے اور دوسری کی کمہار سے کر دی۔ دونوں سکون سے زندگی بسر کرنے لگیں۔ ایک دن وہ مالی کے گھر گیا اور بیٹی سے پوچھا۔ اسے کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔

لڑکی نے جواب دیا۔ ''اللہ کا شکر ہے بس بارش کے لیے دعا کیجیے تاکہ ہمارے پودے خوب پھلیں پھولیں۔''

پھر اس نے دوسری بیٹی کے ہاں جا کر حال پوچھا۔ جواب میں وہ کہنے لگی۔

''دعا کیجیے کہ ابھی چند روز تک بارش نہ ہو تاکہ ہمارے بنائے ہوئے برتن اچھی طرح سوکھ جائیں۔''

ملک امیر خان اعجازی، نرگسی، تلہ گنگ

عزت

گاہک: ''آج کے بعد میرا کتا بھی دکان پر آئے تو تمہیں اس کی بھی عزت کرنی ہوگی۔''

دکاندار: ''بہت بہتر جناب آپ کا کتا آئے گا تو میں سمجھوں گا آپ ہی آئے ہیں۔''

شگوفہ

ایک دن استاد محترم نے کلاس میں بچوں کو یہ ہدایت کی کہ اگلے روز ہر بچہ انگریزی کے تین لفظ یاد کر کے آئے گا۔ کلاس میں سے ایک لڑکے نے مندرجہ ذیل لفظ یاد کر لیے اسے ان لفظوں کے معنی کا بالکل علم نہ تھا۔

نو سر (No Sir) شٹ اپ اور سکس ملین ڈالر مین۔

اگلے روز جب کلاس لگی تو استاد نے اس لڑکے کو کھڑا کیا اور کہا۔

استاد: ''حامد کیا تم نے وہ تین لفظ یاد کیے ہیں؟''

حامد.... (خوشی سے): ''نو سر (No Sir)''۔

استاد (غصے سے) ''آخر تم نے وہ لفظ کیوں نہیں یاد کیے؟''

حامد: ''شٹ اپ''۔

استاد (غصے میں گرجتے ہوئے): آخر تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟''

حامد (معصومیت سے): ''سکس ملین ڈالر مین سر''۔

جہانگیر حسین قیصر، ہیڈ مرالہ ڈھلے والی سے

سلوپ کا کیا کرنا ہے؟"

"اس نے کیا کر دیا؟" مارکوس نے پوچھا۔

"اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو وہ پولیس والوں کو بتا سکتا ہے۔"

"ایسی صورت میں وہ خود پھنس جائے گا۔" مارکوس نے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی ردِعمل ظاہر کرتا۔ میں نے اپنی پسلیوں پر کسی سخت چیز کا دباؤ محسوس کیا۔ یہ سلوپ کا ریوالور تھا۔ اس نے کمر میں ہاتھ ڈال کر ہولسٹر سے میرا ریوالور بھی نکال لیا۔

"میری خواہش تھی کہ تم یہ سب کچھ نہ سن پاتے۔" اس نے کہا۔ "اب مجھے اس بارے میں کچھ کرنا ہوگا۔"

"اب میری سمجھ میں ساری بات آگئی۔" میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں یونین آفس کے عقب میں جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا لیکن تم نے بتایا کہ وہاں کسی کو نہیں دیکھا جبکہ تم جھوٹ بول رہے تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ باتیں اندر چل کر کرنی چاہئیں۔" اس نے ریوالور کی نال میری پسلی میں چبھوتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے دروازے کی طرف لے گیا اور اندر دھکیلتے ہوئے مجھ پر گن تان لی۔

"یہ سب کیا ہے؟" شین ہمیں دیکھ کر کتے کی طرح بھونکنے لگا۔ "یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"اس نے سب سن لیا ہے۔" سلوپ نے کہا۔ "اور اس نے حملے کے بارے میں بھی جان لیا ہے۔"

"یہ تو مسئلہ ہو گیا۔" مارکوس بولا۔

"اب مجھے ساری حقیقت معلوم ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم بہت ہوشیار ہو۔" مارکوس طنز کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے خیال میں تم کیا جانتے ہو؟"

"کورکورن اور نورس کو یقین تھا کہ شین ان کے لیے کام کر رہا ہے جبکہ تم اور شیرف اسے خرید چکے تھے تاکہ وہ یونین کی جاسوسی کرنے کے علاوہ ان کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرے۔ وارن جونز کو یہ بات معلوم ہو گئی اس لیے اس کو راستے سے ہٹانا ضروری ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے یونین آفس پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ سلوپ نے فیرس کو ورغلایا کہ وہ وارن کے ساتھ اندر جائے اور لڑائی کے دوران اسے مار دے۔ تم نے اسے کام کے لیے کتنے پیسے دیے تھے سلوپ؟"

"اب اس کی کوئی اہمیت نہیں۔" سلوپ نے کہا۔

"وہ ایک پیسا بھی وصول نہیں کر سکا۔"

"کیونکہ شین نے پہلے ہی فون کر کے کورکورن اور نورس کو اس حملے کے بارے میں مطلع کر دیا تھا اور وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی نکل گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان کے نکلتے ہی شیرف عقبی دروازے سے اندر داخل ہوا اور وہاں چھپ کر بیٹھ گیا۔"

"یہ اندازہ تم نے کس طرح لگایا؟" ہورٹر نے پوچھا۔

"فیرس کو جو گولیاں لگیں وہ اعشاریہ چار پانچ کے ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ میں نے ان کے خول ڈاکٹر کے پاس دیکھے تھے۔ تم وہ جھگڑا یاد کرو جو فیکٹری کے مرکزی دروازے پر ہوا تھا اور جہاں تم نے غصے میں آکر اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ وہ بھی کولٹ اعشاریہ چار پانچ کا تھا۔ ہمارے کسی آدمی کے پاس یہ ریوالور نہیں ہے۔ جب فیرس نے وارن کو مار دیا تو تم نے سوچا کہ اسے بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینا چاہیے۔ یہ فائرنگ کا تیسرا راؤنڈ تھا جو میں نے باہر سے سنا۔ مرتے وقت وارن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے لگنے والی گولی کہاں سے آئی چنانچہ اس نے مرتے مرتے اپنی بارہ بور کی گن سے فائرنگ کر دی۔ جیسے ہی تمہیں معلوم ہوا کہ وہ مر چکا ہے، تم اپنی پناہ گاہ سے باہر آئے اور فیرس کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد تم عقبی دروازے سے فرار ہو گئے۔ سلوپ نے تمہیں جاتے ہوئے دیکھا لیکن وہ اس کھیل کا حصہ تھا اس لیے تم محفوظ رہے۔ ان ہلاکتوں کا الزام کورکورن اور نورس پر آیا۔ مجھے ان دونوں کو گرفتار کر کے واپس لانے کے لیے بھیجا گیا تاکہ انہیں پھانسی کے تختے پر چڑھا کر خاموش کر دیا جائے۔"

"اس طرح یونین کی کمر ٹوٹ جاتی۔" مارکوس بولا۔ "ہم نے ایک ہی پتھر سے دو پرندوں کو مارنے کا راستہ نکالا تھا۔"

"پھر تم نے کورکورن کو جیل کی کوٹھری میں کیوں مار ڈالا؟"

"وہ بہت بول رہا تھا۔" میک ہورٹر نے کہا۔ "اس نے شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ اسے یونین آفس پر حملے کی اطلاع پہلے مل گئی تھی اور وہ وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے وارن اور فیرس کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا لہٰذا اسے خاموش کروانا ضروری ہو گیا جب نورس مل جاتا تو ہم اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے۔"

''لیکن وہ تو بے گناہ تھے۔'' میں نے اعتراض کیا۔
''وہ کمیونسٹ ہیں۔'' سلوپ چلاتے ہوئے بولا۔
''تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ تم کس کے ساتھ ہو۔ میں نے جو کچھ کیا، اس کا مارکوس نے بہت اچھا معاوضہ دیا...''
وہ اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ اس چیخ و پکار کی وجہ سے ہم نے گلی میں ابھرنے والے قدموں کی آواز پر توجہ نہیں دی لیکن وہ آوازیں لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔
مارکوس بے چین ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ شور کیسا ہے؟''
میک ہورٹر نے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ''بہت سارے لوگ ایک ہجوم کی شکل میں اس طرف آ رہے ہیں۔''
''کیا مصیبت ہے؟'' مارکوس نے کہا اور وہ بھی دروازے سے جھانکنے لگا۔ ''یہ تو ریلوے یارڈ کے ہڑتالی مزدور ہیں اور فیکٹری کا گیٹ چھوڑ کر اس طرف آ رہے ہیں۔''
اس موقع پر سلوپ کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا حالانکہ وہ میرا آٹومیٹک ریوالور پہلے ہی اپنے قبضے میں لے چکا تھا لیکن اس نے میری جیکٹ کی اندرونی جیب کی تلاشی لینے کی زحمت نہیں کی جہاں فیرس کا اعشاریہ تین آٹھ کا پستول رکھا ہوا تھا۔
جیسے ہی اس کا سر دروازے کی طرف گھوما، میں نے جلدی سے وہ پستول نکالا اور اس کے کان کے قریب رکھتے ہوئے بولا۔ ''اپنے ہتھیار مجھے دے دو۔''
''یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔
''اگر ہتھیار نہیں دو گے تو یہ اس سے بھی زیادہ بری بات ہوگی۔''
اس نے مجبوری کے عالم میں دونوں ریوالور میرے حوالے کر دیے۔ میں نے اس کا ریوالور اپنی جیب میں رکھا۔ ایک ہاتھ میں اپنا اور دوسرے ہاتھ میں فیرس کا ریوالور تھامتے ہوئے شیرف کو حکم دیا۔ ''اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔''
وہ مجھ پر فائر کرنے کے لیے ایڑیوں کے بل گھوما لیکن میرے ہاتھ میں دو ریوالور دیکھ کر اس نے اپنا اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور فرش پر پھینک دیا۔
مجمع اب بالکل قریب آ چکا تھا۔ میں نے میک ہورٹر، شین، مارکوس اور سلوپ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ لوگ جیسے ہی پورچ تک پہنچے، مجمع عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس جلوس کی قیادت نورس ہنکس کر رہا تھا۔
''میرا خیال تھا کہ شاید تمہیں مدد کی ضرورت ہو۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''لیکن میرا اندازہ غلط نکلا تم اکیلے ہی ان پر بھاری ہو۔''
''گویا تم میرا تعاقب کر رہے تھے؟''
''میں تو کنکناکی سے ہی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں، تم جب کورکورن کو پکڑنے آئے۔ ہم سے شین کو سمجھنے میں غلطی ہوئی جب اس نے ہمیں تمہارے حملے کے بارے میں غلط اطلاع دی تو اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا کہ مارکوس سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ ورنہ اسے حملے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ میں ٹرین میں بھی تمہارے ساتھ تھا اور کچھ فاصلے پر رہ کر تعاقب کر رہا تھا۔ جب میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہیں اس دفتر میں داخل ہوتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ تمہیں مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''
''تمہارا بہت بہت شکریہ۔''
''میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا، تم اس کے بارے میں وضاحت سے بتا سکتے ہو۔''
میں نے مجمع کو تفصیل سے بتایا کہ کس طرح شین نے یونین کے مفادات کا سودا کیا اور جب وارن جونز نے اسے روکنے کی کوشش کی تو کس طرح اسے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے اور یہ کہ کورکورن کیوں مارا گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ ہجوم یہ سب کچھ سننے کے بعد مشتعل نہ ہو جائے لیکن نورس نے انہیں قابو میں رکھا۔ وہ میرے برابر آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ان لوگوں کے سامنے ایک مؤثر تقریر کی جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا۔
''ہم مارکوس اور شیرف جیسے نہیں بن سکتے۔ ہم قانون کے دائرے میں رہ کر زندگی بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ اس وقت یہ لوگ زیر حراست ہیں۔ ہم انہیں جیل لے کر جائیں گے جہاں جج کے آنے تک ان کی مناسب دیکھ بھال ہوگی۔''
پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ اس مقدمے کی سماعت کے دوران اور بعد میں اس قصبے میں کس طرح امن و امان قائم کیا جائے گا۔ مسٹر کرین! کیا تم عارضی طور پر ایکٹنگ شیرف کے فرائض انجام دینے کے لیے تیار ہو۔ جب تک اس قصبے کو نیا شیرف نہیں مل جاتا۔''
بہرحال میں ایک فرض شناس اور دیانت دار سپاہی تھا اس لیے خاموش رہا البتہ مجھے اپنے اوپر اتنا اعتماد ضرور تھا کہ ایک بار قائم مقام شیرف کے طور پر کام شروع کر دوں تو انہیں کسی نئے شیرف کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے رضامندی میں سر ہلا دیا کیونکہ ایسے مواقع قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔

بے ضمیر

اسما قادری

فریب دینا... جھوٹ بولنا... نہ کوئی اضطراری غلطی ہے... نہ اتفاقی حادثہ... یہ کردار کی ایک خاصیت ہوتی ہے... جس کی جڑیں وقت کے ساتھ گہری ہوتی چلی جاتی ہیں... ایک ایسے ہی بے ضمیر شخص کی داستان... جو بڑی آسانی سے... جھوٹ بولتا تھا... ہر شخص اس کی طلسماتی شخصیت کے سحر میں اس قدر گم ہو جاتا کہ کسی کو شک تک کا احساس نہ ہوتا... تیکھے... پتھریلے اور خطرناک راستوں سے نہ ڈرنے والے بھی سانپ کی طرح بل کھاتے شخص کے فریب و جھوٹ میں الجھتے چلے گئے... اس کے زہر نے ہر اس شخص کو ڈسا... جو اس کے لیے بے پناہ محبت... عنایت اور چاہت رکھتا تھا... دلوں کی بستیاں تاراج کر دینے والے کی حقیقت کھلی تو جیسے دبستاں کھلتا چلا گیا...

بے ضمیر... بے صداقت اور احساسات سے عاری...

نہ ختم ہونے والے جھوٹ کی سنگین فریب کاری...

لڑکے کی لاش بستر پر موجود تھی... یوں لگتا تھا کہ سوتے ہوئے ہی وہ قیدِ حیات سے نجات پا گیا ہے۔ وہ چوبیس پچیس سال کا خوش شکل لڑکا تھا جس کے سنہری بال اس کی فراخ پیشانی پر بکھرے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہا ہو لیکن انسپکٹر شاہد سلیم سمیت کمرے میں موجود باقی نفوس بھی جانتے تھے کہ وہ ابدی نیند سو چکا ہے۔ اس کی موت کی وجہ بھی واضح تھی۔ سرہانے رکھی میز پر موجود سلیپنگ پلز کی خالی بوتل اور اس کے ساتھ ہی رکھا مشروب کا گلاس یہ ظاہر کر رہے تھے کہ لڑکے نے خودکشی کی ہے۔

"آیئے ہم دوسرے کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔" کمرے کا جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر شاہد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہاں موجود جوڑے سے کہا تو دونوں میاں بیوی کے چہروں پر واضح طور پر اطمینان جھلکا۔ ظاہر ہے ایک ایسے

کمرے میں جہاں ایک عدد لاش موجود ہو ان کے لیے اعصاب شکن تھا۔ پرانی واقفیت کی بنا پر وہ ان دونوں کے مزاج سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ دونوں ہی بڑے نرم مزاج کے شریف شہری تھے۔ شاہد زمانۂ طالب علمی سے ان سے واقف تھا کیونکہ کھچڑی بالوں والا پچاس سالہ مرد اس کا پروفیسر اور لگ بھگ تیس سال کی وہ عورت اس کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ پروفیسر کامران اور اس کی بیوی رافعہ کی عمروں میں واضح فرق تھا۔ پروفیسر اور رافعہ کی شادی پسند بلکہ زوردار عشق کا نتیجہ تھی اور اس عشق کی ابتدا رافعہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ خود سے عمر میں بڑے عام سے نین نقش کے پروفیسر کامران کے عشق میں وہ کچھ اس طرح مبتلا ہوئی تھی کہ انہیں بھی اپنے دامِ الفت میں جکڑ لیا۔ شکل وصورت سے ہٹ کر پروفیسر کی شخصیت تھی بھی بہت سحر انگیز۔ ان کے بات کرنے کا مدبرانہ انداز اور دنیا جہاں کی معلومات انہیں طلبا کے لیے پُرکشش بنادیتی تھی۔ شاہد خود بھی انہیں بطور استاد بہت پسند کرتا تھا لیکن رافعہ جیسی حسین وجمیل لڑکی کو ان کے عشق میں مبتلا دیکھ کر اسے بے حد حیرت ہوئی تھی۔ رافعہ تھی بھی کمال کی لڑکی۔ لڑکیوں کے عمومی مزاج کے برعکس اس نے کبھی بھی اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ پروفیسر کامران کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ وہ ببانگِ دہل ان سے اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ اس کے اس رویے پر پروفیسر کامران تھوڑے گھبرائے ہوئے رہتے تھے لیکن رافعہ نے ان سے خود کو اور اپنی محبت کو منوا کر چھوڑا اور تجرد کی زندگی گزارتے پروفیسر کو بالآخر اس سے شادی کرتے ہی بنی۔ اس شادی کے انجام پاتے وقت سب کا یہی اندازہ تھا کہ رافعہ کا یہ وقتی ابال جلد ہی بیٹھ جائے گا اور اسے اندازہ ہو جائے گا کہ اس قسم کی بے جوڑ شادی کو نبھانا کتنا مشکل ہے لیکن چھ سال گزر جانے کے باوجود نہ صرف یہ شادی سلامت تھی بلکہ ان کے درمیان تعلق کی شدت بھی وہی ہے۔ وہ پروفیسر کامران کے ساتھ خوش ہے اور اب بھی ان سے پہلے کی طرح والہانہ محبت کرتی ہے کیونکہ اس گمبھیر صورتِ حال میں بھی اس نے ان کا ہاتھ یوں مضبوطی سے تھاما ہوا تھا جیسے انہیں تسلی دے رہی ہو۔ پروفیسر کے مقابلے میں وہ خاصی سنبھلی ہوئی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی نے پون گھنٹے قبل فون کر کے شاہد سے اپنے گھر آنے کی درخواست کی تھی اور اس کی آواز کی گمبھیرتا نے ہی شاہد کو ناشتے کی میز سے اٹھ کر سیدھے یہاں پہنچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گھنے بالوں والا شاہد گول شیشوں کی عینک استعمال کرتا تھا۔ اس نے درمیانے سائز کی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جو اس کے چہرے پر بھلی لگتی تھیں۔ چار سال قبل شاہد کی اپنی کزن سے شادی ہوئی تھی لیکن پہلے بچے کی ڈلیوری کے وقت کچھ ایسی پیچیدگی ہوئی کہ اس کی بیوی اور بچے دونوں کی جان چلی گئی۔ اس المیے کے بعد وہ اپنی والدہ کے اصرار کے باوجود دوسری شادی پر آمادہ نہیں ہوا اور اب تک تنہا تھا۔ وہ پروفیسر کے گھر پولیس یونیفارم کے بجائے سادہ لباس میں آیا تھا کہ آس پاس والے چونک نہ جائیں لیکن یہاں کی صورتِ حال سے ظاہر تھا کہ اسے اپنے محکمے کے دیگر لوگوں کو بلانا پڑے گا اور اس صورت میں محلے داروں کا متوجہ ہونا لازمی تھا۔

''لڑکے کا نام کیا ہے؟'' دونوں میاں بیوی کے ہمراہ سٹنگ روم میں بیٹھنے کے بعد شاہد نے پہلا سوال کیا۔ اس سے قبل وہ اپنے ایک اسسٹنٹ کو فون کر کے ضروری عملے کو لے کر پروفیسر کے گھر پہنچنے کا کہنا نہیں بھولا تھا۔

''ضمیر شاہ۔'' جواب پروفیسر نے دیا۔

''وہ کتنے عرصے سے آپ کے کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہا تھا؟''

''ڈیڑھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اصل میں پروفیسر صاحب کے ایک جاننے والے نے سفارش کی تھی کہ ہم اسے اپنے ہاں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رکھ لیں۔ ہمارے پاس اوپر کی منزل پر ایک کمرا خالی پڑا ہوا تھا اس لیے ہم راضی ہو گئے۔'' اس بار رافعہ نے بتایا۔

''عادت و اطوار کے لحاظ سے ضمیر کیسا لڑکا تھا؟'' شاہد نے ایک اور سوال داغا۔

''خاصا خوش مزاج اور شوخ وشنگ لڑکا تھا۔ پولیٹیکل سائنس میں ماسٹر کر رہا تھا۔ پارٹ ٹائم ایک دفتر میں ملازمت بھی کرتا تھا۔ اس کے باوجود اگر میں گھر کا سودا سلف وغیرہ منگواؤں تو خوش دلی سے میرا کام کر دیتا تھا۔ اس کے یہاں رہنے سے پروفیسر صاحب کو بھی دوسراہٹ مل گئی تھی اور فرصت ملنے پر دونوں کبھی کبھی شطرنج کی بازی کھیل لیتے تھے۔'' رافعہ نے قدرے تفصیل سے جواب دیا جبکہ پروفیسر کامران درمیان میں یوں سر ہلاتے رہے جیسے اس کی بات کی تائید کر رہے ہوں۔

''آپ دونوں میں سے صبح کس نے پہلے اس کی لاش دیکھی؟''

''میں نے۔'' جواب دیتے ہوئے پروفیسر کی آواز کانپ گئی۔ ''ضمیر ناشتا ہمارے ساتھ ہی کرتا تھا جبکہ دوپہر اور رات کا کھانا، اس کی گھر میں موجودگی سے مشروط تھا۔

آج صبح رافعہ نے ناشتا تیار کرنے کے بعد میز پر لگا دیا اور حسب معمول ضمیر ناشتا کرنے نہ پہنچا تو پہلے میں نے اسے آواز دی پھر یہ خیال آنے پر کہ کہیں رات کو دیر سے سونے کے باعث اس کی آنکھ نہ کھلی ہو اسے جگانے خود ہی اوپر چلا گیا۔ وہ روزانہ میرے ساتھ ہی یونیورسٹی جاتا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے میں بھی لیٹ ہو جاؤں۔ اوپر پہنچ کر پہلے میں نے اس کے کمرے کا دروازہ ناک کیا لیکن کوئی رسپانس نہ ملنے پر دروازہ دھکیل کر اندر چلا گیا۔ ضمیر بستر پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ کم از کم اس وقت تک میرا یہی خیال تھا کہ وہ سو رہا ہے لیکن جب میں نے اسے جگانے کے لیے ہاتھ لگایا تو احساس ہوا کہ اس کا جسم ٹھنڈا اور اکڑا ہوا ہے۔ میں نے گھبرا کر رافعہ کو آواز دی، اس کے آنے کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ یہ پولیس کیس ہے اس لیے اپنی مدد کے لیے تمہیں بلا لینا چاہیے۔'' کلاس روم میں گھنٹوں کے حساب سے لیکچرز دینے والے پروفیسر کامران اتنی تفصیل بتاتے ہوئے ہانپ گئے تھے۔ رافعہ نے جلدی سے پانی کا گلاس بھر کر دیا اور تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

''پروفیسر صاحب اتنا پریشان نہ ہوں شاہد ہے نا یہاں۔ یہ سب سنبھال لے گا۔''

''مجھے شاہد پر پورا اعتماد ہے لیکن میں اپنے ذہن سے یہ بات جھٹک نہیں پا رہا ہوں کہ ایک زندگی سے بھرپور لڑکے نے اپنے ہاتھوں اپنی جان کیسے لے لی؟ وہ اتنے کمزور اعصاب کا مالک لگتا تو نہیں تھا۔''

''آدمی بڑی پیچیدہ چیز کا نام ہے پروفیسر صاحب اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ بظاہر مضبوط دکھائی دیتے کسی شخص کے اعصاب کب جواب دے جائیں۔'' رافعہ نے نہایت سنجیدگی سے انہیں سمجھایا تو شاہد نے بھی اس کی تائید کی۔

''رافعہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے سر۔ میں اپنی پانچ سالہ سروس میں ایسے کئی واقعات دیکھ چکا ہوں۔''

''ہاں۔ تم تو اس سب کے عادی ہو گے لیکن میرے اعصاب پر بڑا بوجھ آ گیا ہے۔'' انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''بہتر ہوگا کہ تم انہیں کوئی ٹرینکولائزر دے کر سلا دو۔ یہاں کی ساری کارروائی میں اپنے اسٹاف کے ساتھ مل کر خود ہی نمٹا لوں گا۔'' ان کی حالت دیکھتے ہوئے شاہد نے رافعہ کو مشورہ دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایک آخری سوال رافعہ.....'' وہ وہاں سے اٹھنے لگی تو کہ شاہد نے اسے روکا۔

''ضمیر کے دائیں رخسار پر مندمل ہوتے ایک زخم کا نشان ہے۔ اس نشان کے بارے میں تم کچھ جانتی ہو؟''

''وہ زخم اسے دو تین دن پہلے لگا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ دفتر سے واپس آتے ہوئے بس میں اس کا چند لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اسی لڑائی میں اسے وہ زخم لگا تھا۔'' رافعہ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا ہی تھا کہ کال بیل کی آواز گونجی۔

''میں دیکھتا ہوں، میرا اسٹاف ہوگا۔ تم سر کو اندر لے جاؤ اور اطمینان سے ان کا خیال رکھو، سارے معاملات میں خود نمٹا لوں گا۔'' شاہد نے بہ یک وقت حقِ شاگردی اور دوستی ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور خود بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر شاہد سلیم نے قدرے حیرت سے اس ملاقاتی لڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ درمیانی قامت کی دبلی پتلی پُرکشش لڑکی تھی جس کی بھوری آنکھیں قدرے اداس نظر آتی تھیں۔ اس نے سفید اور سیاہ امتزاج کا ڈاٹس والا جدید تراش خراش کا شلوار قمیص زیب تن کر رکھا تھا اور دوپٹا کچھ بے پروائی سے اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ شاہد اپنے تجربے کی بنیاد پر اندازہ لگا سکتا تھا کہ لڑکی کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور جسم پر موجود لباس سے لے کر شانے سے لٹکے سیاہ بیگ تک ہر شے کے حصول کے لیے اس نے خود جدوجہد کی ہے۔ وہ یہ بات بھی دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ لڑکی شریف اور اچھے کردار کی مالک ہے اور اسی وجہ سے اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کیونکہ اس کا تجربہ تھا کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی شریف خواتین تھانے کا رخ کرنے سے گریز کرتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر بھی کم از کم اکیلی وہاں آنا پسند نہیں کرتیں لیکن یہ لڑکی نا صرف یہاں آئی تھی بلکہ اس نے بطور خاص انسپکٹر شاہد سلیم سے ملاقات کی خواہش کی تھی۔

''انسپکٹر شاہد سلیم......؟'' اسے اپنے جائزے میں مصروف پا کر لڑکی نے سوالیہ لہجے میں مخاطب کیا۔

''جی ہاں، میں ہی ہوں۔ آپ تشریف رکھیں۔'' شاہد نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا نام نوشین اختر ہے اور میں ضمیر شاہ کے کیس کے سلسلے میں آپ سے ملنے آئی ہوں کیونکہ میری معلومات کے مطابق آپ نے ہی اس کیس کو ہینڈل کیا تھا۔'' لڑکی کا لہجہ اداس مگر پُراعتماد تھا۔

"آپ کی معلومات درست ہیں۔ وہ خودکشی کا ایک افسوس ناک کیس تھا۔ لڑکے نے مشروب میں خواب آور گولیوں کی بڑی مقدار ملا کر پی لی تھی۔ میں نے ضروری کارروائی کے بعد اس کی لاش کو اس کے گاؤں بھجوا دیا تھا۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کی اس کیس میں کیا دلچسپی ہے؟" مہذب انداز میں کیس کے متعلق مختصراً بتانے کے بعد اس نے نوشین اختر نامی لڑکی سے دریافت کیا۔

"میں ضمیر شاہ کی دوست ہوں اور اسی دفتر میں ملازمت کرتی ہوں جہاں ضمیر پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ اس کی موت کے وقت اتفاقاً میں دفتر سے چھٹی لے کر اپنی بہن سے ملنے نواب شاہ گئی ہوئی تھی۔ واپس آنے پر مجھے ضمیر کی خودکشی کی اطلاع ملی تو مجھے کسی طور یقین نہیں آیا اور میں نے آپ سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔" اپنے بارے میں یہ سب بتاتے ہوئے نوشین کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی تھی جس سے شاہد کو اندازہ ہوا کہ اس کا اور ضمیر شاہ کا تعلق دوستوں سے کچھ آگے کا تھا۔ اس نے لڑکی کے لیے اپنے دل میں دکھ محسوس کیا، وہ نرمی سے بولا۔

"میں آپ کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ جب کوئی قریبی ساتھی اس طرح خودکشی کر کے زندگی جیسی نعمت کو ٹھکرا دے تو واقعی بڑی بے یقینی کا عالم ہوتا ہے اور ہمارا دل کسی طور اسے مردہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔"

"میں ایک حقیقت پسند لڑکی ہوں انسپکٹر صاحب۔ میں نے ضمیر کی موت کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا ہے لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اس کی موت کا سبب خودکشی ہے۔" نوشین.... کے مضبوط لہجے نے شاہد کو چونکا دیا۔

"کیا مطلب؟ آپ اتنے یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتی ہیں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"میری ضمیر سے کافی زیادہ دوستی تھی اور میں اسے اس کے کردار کی خوبیوں اور خامیوں سمیت جانتی تھی۔ وہ کسی طور بھی خودکشی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ زندگی سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ مستقبل کے لیے اس کی خاصی لمبی چوڑی پلاننگ تھی اور ایسے شخص کے بارے میں یہ ماننا کہ وہ خودکشی کر سکتا ہے کسی طور ممکن نہیں۔" نوشین.... نے اپنے دلائل دیے تو شاہد نے ایک گہرا سانس لیا اور تحمل سے بولا۔

"آپ اپنی جگہ درست سہی لیکن اپنی ملازمت کے دوران یہ بات میرے تجربے میں آئی ہے کہ اچھا بھلا زندگی سے بھرپور آدمی بعض اوقات احساس پر شدید چوٹ پڑنے کی صورت میں خودکشی کر بیٹھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ضمیر شاہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو۔"

"یہی تو سب سے اہم پوائنٹ ہے۔" اس کی بات سن کر نوشین قدرے جوش سے بولی۔ "ضمیر شاہ کسی طور حساس مزاج کا نہیں تھا بلکہ میں صاف گوئی سے کام لوں تو وہ خاصی حد تک خودغرض آدمی تھا جو اپنی ذات کی خوشی کے لیے دھوکا دہی سے بھی کام لے سکتا تھا۔ ایسے لوگ خودکشی نہیں کیا کرتے اور اگر کریں تو پھر اس کے پیچھے کوئی بہت ہی بڑی وجہ ہوتی ہے۔ کیا آپ نے وہ وجہ معلوم کی؟" نوشین کے سوال نے شاہد کو گڑبڑا دیا۔ حقیقتاً اس کیس پر اس نے کچھ خاص محنت نہیں کی تھی۔ جائے وقوعہ کے معائنے اور گلاس میں موجود مشروب کی معمولی مقدار میں خواب آور دوا کی آمیزش کے علاوہ گلاس پر موجود ضمیر شاہ کے فنگر پرنٹس کی موجودگی کو اس نے اس کیس کو خودکشی کا کیس قرار دینے کے لیے کافی سمجھا تھا۔ ضمیر شاہ کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ اس کی موت بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں استعمال کرنے کے باعث واقع ہوئی ہے۔ ان حالات میں اسے کسی اور زاویے سے تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے یہ زحمت گوارا کی کہ ایک پردیسی جوان جو اس شہر میں تقریباً لاوارث تھا، اس کی خودکشی کی وجوہات ڈھونڈتا۔ اس کے حساب سے ورثا کو اس حادثے کی اطلاع دے کر لاش کو اس کے گاؤں پہنچا دینے سے اس کا فرض ادا ہو گیا تھا لیکن اب نوشین نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کیس میں درحقیقت اس کی دلچسپی اتنی تھی کہ جلد از جلد اس معاملے کو نمٹا کر پروفیسر کامران اور رافعہ کو ذہنی اذیت سے نجات دلا سکے۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ نے وجہ جاننے میں دلچسپی نہیں لی ہوگی۔ عام طور پر ہماری پولیس اسی انداز سے کام کرتی ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ضمیر جیسے شخص کی خودکشی عام واقعہ نہیں ہے۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ خودکشی نہیں کر سکتا۔" شاہد کی کیفیات سے بے خبر وہ اپنی ہی بولتی جا رہی تھی۔

"آپ کے اس یقین کو دیکھتے ہوئے کیا میں آپ سے کچھ سوالات کر سکتا ہوں؟" شاہد نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل۔ میں آپ کے ہر سوال کا پوری سچائی سے

جواب دینے کی کوشش کروں گی۔'' نوشین نے صاف لہجے میں جواب دیا۔

''کیا آپ کے اور ضمیر کے درمیان ایک دفتری دوست سے کچھ آگے کے تعلقات تھے؟'' اسے اندازہ تھا کہ اس کا پہلا ہی سوال خاصا نازک اور چبھتا ہوا ہے۔

''میں ضمیر کے اپنے دفتر میں ملازمت کے چند ماہ بعد ہی اس کی محبت میں مبتلا ہوگئی تھی بلکہ آپ یوں سمجھ لیں کہ اس کی مجھ پر حد سے زیادہ توجہ نے مجھے اس سے محبت کرنے پر مجبور کردیا تھا۔'' نوشین نے بلاجھجک اعتراف کیا۔

''کیا بعد میں کبھی آپ کو احساس ہوا کہ ضمیر سے محبت کرنا آپ کی غلطی تھی؟'' نوشین نے ضمیر کو ایک خودغرض آدمی قرار دیا تھا اسی لیے اس نے یہ سوال کیا۔

''جی ہاں۔ لیکن اس کے باوجود میں خود کو اس سے محبت کرنے سے نہیں روک سکی اور بدستور اس سے تعلق قائم رکھا۔'' اس بار بھی نوشین نے بہت آسانی سے اعتراف کرلیا۔

''ضمیر کے کردار کی وہ کونسی خامیاں تھیں جن کی بنیاد پر آپ کے ذہن میں اس کے لیے منفی جذبات پیدا ہوئے؟'' شاہد کی اس معاملے میں دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔

''ضمیر کی فطرت کا ''میں پن'' مجھے سب سے پہلے کھٹکا۔ وہ جب اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا تھا تو اس میں اس کے گھر والوں سمیت کسی کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ نہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے بارے میں سوچتا تھا نہ اس بڑے بھائی کے لیے جس نے دن رات کھیتوں میں مزدوری کرکے اسے تعلیم دلائی تھی اور اسے اچھے مستقبل کے لیے شہر بھجوایا تھا۔''

''کیا اس منصوبہ بندی میں تمہارا بھی کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا؟''

''ہوتا تھا لیکن بہت ثانوی حیثیت سے بلکہ بعض اوقات تو مجھے یہ لگتا تھا کہ اگر اسے کوئی اچھا چانس ملا اور کامیابی کی شرط مجھ سے جدائی ٹھہری تو وہ یہ بھی کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔''

''کمال ہے اس کے باوجود تم اس شخص سے محبت کرتی رہیں۔'' شاہد حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ نوشین کے بے حد تعاون کی وجہ سے ان کے درمیان اتنی بے تکلفانہ گفتگو ہورہی تھی کہ شاہد کو خود بھی احساس نہ ہوسکا تھا کہ وہ کب آپ جناب سے ''تم'' پر اتر آیا ہے۔

''محبت شاید اسی چیز کا نام ہے انسپکٹر صاحب۔ سب کچھ دکھائی دینے کے باوجود آپ کچھ نہیں دیکھنا چاہتے۔ میں سچائی سے کام لیتے ہوئے کہوں تو حقیقتاً محبت میں دھوکا دوسرا فریق بعد میں کرتا ہے پہلے ہم خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔'' وہ کچھ فلسفیانہ موڈ میں آگئی تھی۔

''کیا ضمیر کی دیگر لڑکیوں سے بھی دوستی تھی؟''

''ہاں۔'' نوشین نے تسلیم کیا۔ ''میں جانتی تھی کہ اس کی دوسری لڑکیوں سے بھی دوستی ہے۔ اس کے سیل فون پر ان لڑکیوں کی کالز آتی رہتی تھیں لیکن اس کا کہنا تھا کہ یہ ساری وقتی دوستیاں ہیں اور وہ انہیں اس لیے نبھا رہا ہے کہ اسے ان سے کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ الٹا فائدہ ہی ہوتا ہے اور استعمال کے لیے کپڑوں سے لے کر قیمتی پرفیومز، کف لنکس، ٹائیاں اور دیگر چیزیں تحفتاً ہی مل جاتی ہیں۔''

''کیا تم سے بھی اس نے اسی مقصد کے تحت دوستی کر رکھی تھی؟'' انسپکٹر شاہد کو مجبوراً یہ تلخ سوال کرنا پڑا۔

''شاید نہیں۔ میرے خیال میں وہ سچ مچ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ میں اپنے گھر کو سپورٹ کرنے کے لیے یہ ملازمت کررہی ہوں۔ چند ایک خاص مواقع کے سوا میں نے اسے کبھی تحائف نہیں دیے بلکہ وہی اکثر اوقات مجھے تحائف دیتا تھا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کی خامیوں سے واقف ہونے کے باوجود میں اس سے بندھی رہی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ دیگر افراد اور رشتوں کے مقابلے میں مجھے کچھ اہمیت دیتا ہے اور سچ مچ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس کی اسی محبت کا حق ادا کرنے کے لیے میں آپ کے پاس آئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ آپ اس کی خودکشی کی گتھی کو سلجھا کر میری تسلی کا ساماں کردیں۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے تھے۔ ان آنسوؤں کو صاف کرنے کے لیے اس نے شاہد کی میز پر رکھے اپنے شولڈر بیگ سے رومال نکالنے کے لیے حرکت کی تو گلے میں پڑا اس کا دوپٹا ڈھلک گیا اور شاہد کی نظر اس لاکٹ پر پڑی جو ایک باریک سونے کی چین میں موجود تھا۔ چین کی لمبائی بس اتنی تھی کہ لاکٹ کالربون تک ہی آرہا تھا اور اسی وجہ سے اب تک دوپٹے میں چھپا رہا تھا۔ بڑے سے شفاف نگینے کے گرد موجود سونے کے حلقے والا یہ لاکٹ شاہد کو شناسا سا محسوس ہوا۔

''یہ لاکٹ ابھی تین ماہ قبل ہی ضمیر نے مجھے میری سالگرہ پر دیا تھا۔'' اس کی توجہ کو محسوس کرکے نوشین نے خود ہی اسے بتادیا اور اسی وقت شاہد کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

''کیا تم یہ لاکٹ کچھ عرصے کے لیے مجھے دے سکتی ہو۔ میرے خیال میں اس کی مدد سے مجھے تفتیش کرنے میں کچھ آسانی رہے گی۔ میں تمہیں اس کی رسید دے دوں گا۔''

اس نے اضطرابی کیفیت میں نوشین سے فرمائش کی۔ نوشین کی بہت سی باتیں اور اصرار سننے کے باوجود ابھی تک وہ خود کو اس بات پر قائل نہیں کر سکا تھا کہ ضمیر شاہ کے خودکشی کے کیس پر مزید کوئی کام کرے لیکن اس لاکٹ نے اس سے اچانک ہی فیصلہ کروالیا تھا۔

''رسید کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جب تک چاہیں یہ لاکٹ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔'' اس نے اپنی چین کا لاک کھول کر اسے گلے سے اتارا اور پھر اس میں سے لاکٹ نکال کر شاہد کی طرف بڑھایا۔

''ضمیر نے مجھے صرف یہ لاکٹ گفٹ کیا تھا۔ چین میری اپنی ملکیت ہے لیکن اگر آپ چاہیں تو میں یہ بھی آپ کے حوالے کر سکتی ہوں۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ لاکٹ ہی کافی ہوگا۔'' شاہد نے لاکٹ اپنے ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا۔ اس لاکٹ کے لیے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے شناسائی کے احساس پر اب اسے کوئی شبہ نہ رہا تھا۔

''پھر میں امید رکھوں کہ آپ اس سلسلے میں کچھ کریں گے؟'' اس کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے نوشین نے بے چینی سے دریافت کیا۔

''تم مجھے اپنا ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر دے دو۔ کوئی پیش رفت ہوئی تو میں تمہیں آگاہ کردوں گا۔'' شاہد نے کہا تو اس نے جلدی جلدی ایک کاغذ پر اپنا ایڈریس اور سیل نمبر لکھ کر اس کے حوالے کر دیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں بہت شدت سے آپ کی طرف سے رابطے کا انتظار کروں گی سر۔'' باہر نکلنے سے قبل اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے جاتے ہی شاہد کو یکدم کمرا خالی خالی سا لگنے لگا اور احساس ہوا کہ ملازمت کے عرصے میں شاید پہلی بار اس نے کسی ملاقاتی کو، جو بنا سفارش اس کے پاس آیا ہوا تنا طویل وقت دیا تھا۔

☆☆☆

''کھانا کھالیں پروفیسر صاحب۔'' غائب دماغی سے کتاب پر نظریں جمائے پروفیسر کامران کو رافعہ کی مترنم آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں ہمیشہ کی طرح بنی سنوری ان کے سامنے کھڑی تھی۔

شادی کے ان چھ سالوں میں انہوں نے ہمیشہ اسے اسی طرح نک سک سے تیار اور تازہ دم ہی دیکھا تھا۔ وہ صاف لفظوں میں کہتی کہ میں ہمیشہ اتنی خوب صورت نظر آنا چاہتی ہوں کہ آپ کی نظر مجھ سے ہٹ کر کسی دوسرے پر نہ پڑ سکے۔ اس کی اس طرح کی باتیں سن کر پروفیسر کامران ہنس پڑتے اور کہتے۔

''یہ اندیشہ تو مجھے ہونا چاہیے اور.... گھبرانا چاہیے کہ کب تم جیسی جوان اور خوب صورت لڑکی کا دل مجھ بڈھے سے اوب جائے اور تم اپنے لیے اپنے جوڑ کا ساتھی چن لو۔''

رافعہ ان کی یہ بات سن کر زور سے نفی میں سر ہلاتی اور بڑے یقین سے کہتی۔

''ایسا ہونا ناممکن ہے۔ میں آپ سے اتنی شدید محبت کرتی ہوں کہ آپ سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی البتہ ڈرتی اس بات سے ہوں کہ کہیں میری جیسی کوئی اور سرپھری آپ سے نہ ٹکرا جائے۔ میں نے آپ کو بڑی مشکلوں سے پایا ہے اور آپ میں کسی کی شراکت داری برداشت نہیں کر سکتی اس لیے کوشش کرتی ہوں کہ آپ کو خود سے ایسے باندھ کر رکھوں کہ آپ کی نظر کسی اور پر جا ہی نہ سکے۔''

اس کے خدشات اور اندیشے اس کی بے تحاشا محبت کا ثبوت تھے۔ اس کی اتنی محبت کو پا کر پروفیسر کامران کو خود پہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ وہ علم دوست انسان تھے اور ہمیشہ کتابوں کی دنیا میں اس طرح گم رہے کہ کبھی اپنا گھر بسانے کا خیال تک نہیں آیا۔ صنفِ مخالف میں سے کئی نے ان کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا لیکن انہوں نے کسی کے لیے اپنے دل اور گھر کے در وا نہیں کیے لیکن رافعہ نے ان کی زندگی میں ہلچل مچا کر رکھ دی اور اپنی استقامت اور جذبوں کی شدت سے انہیں جیت کر ہی رہی۔ رافعہ نے ہر طرح سے خود کو ایک اچھی بیوی ثابت کیا تھا اور آج بھی ان سے پہلے کی طرح والہانہ محبت کرتی تھی۔ انہیں اس کا یہ اندیشہ قطعی بے بنیاد لگتا تھا کہ کبھی کوئی دوسری عورت ان کی زندگی میں اس کی جگہ لے سکتی ہے کیونکہ خود رافعہ کی شخصیت کے اتنے رنگ تھے کہ انہیں ہر روز اس پر ایک نئی اور تر و تازہ عورت کا گمان ہوتا۔ ایسے میں ان جیسا سادہ مزاج آدمی کسی اور طرف کیونکر دھیان بھٹکاتا۔ وہ تو الٹا ڈرتے تھے کہ کہیں ان سے یہ بیش بہا خزانہ چھن نہ جائے۔ خصوصاً اولاد سے محرومی نے انہیں اندر سے بہت ڈرا رکھا تھا۔ کیونکہ رافعہ کو بچوں سے بہت پیار ہے اور وہ بے ساختہ ہی بچوں کی طرف کھنچی چلی

جاتی تھی، البتہ اس نے ان کے سامنے کبھی اپنی اس خواہش کا بہت زیادہ شدت سے اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید ان کی دل آزاری سے ڈرتی تھی لیکن انہوں نے خود ہی فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے شادی کے تین سال بعد ہی اپنا مکمل چیک اپ مع ضروری ٹیسٹ کروالیا تھا اور مطمئن تھے کہ کم از کم ان کی ذات میں ایسی کوئی کمی نہیں ہے جو اولاد سے محرومی کا سبب ہو۔ آگے سارا معاملہ اللہ کی مرضی پر منحصر تھا اور اب چھ سال بعد اللہ ان پر مہربان ہوا تھا۔ اب زیادہ وقت نہیں رہا تھا جب رافعہ اور وہ والدین بن جاتے اور ان کا گھر مکمل ہو جاتا۔

''اس طرح سے کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے آپ کو کھانے کے لیے بلایا ہے۔'' پروفیسر کی نظریں مسلسل خود پر جمی دیکھ کر رافعہ نے انہیں ٹوکا۔

''ہاں آرہا ہوں بس ایسے ہی کچھ سوچنے لگا تھا۔'' انہوں نے کتاب واپس رکھ کر کرسی چھوڑی۔

''کیا سوچ رہے تھے؟ ڈاکٹر نے آپ کو زیادہ سوچنے سے منع کیا ہے نا۔ فضول کی ٹینشن لے کر اپنا بی پی ہائی کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟'' رافعہ نے خفگی کا اظہار کیا۔ ضمیر شاہ کی خودکشی کا پروفیسر کامران نے خاصا اثر لیا تھا اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے ان کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا تھا حالانکہ اس سے قبل انہیں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور وہ جسمانی طور پر مکمل فٹ تھے۔

''تم فکر مت کرو۔ میں کوئی ٹینشن نہیں لے رہا تھا بس یہ سوچ رہا تھا کہ تمہاری ڈلیوری کے دن قریب آرہے ہیں اور ایسا کوئی قریبی رشتے دار موجود نہیں جو ایسے وقت میں تمہارے پاس رہ سکے۔ ظاہر ہے یہ ایسا موقع ہے کہ تمہیں کسی خاتون کی ضرورت ہوگی۔'' وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کھانے کی میز تک پہنچ چکے تھے۔

''آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جس اسپتال میں اپنا نام لکھوایا ہے وہ بہت اچھا ہے اور اس کا نرسنگ اسٹاف بھی بہت کیئرنگ ہے۔ میں نے اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے مہنگا ہونے کے باوجود اس اسپتال کا انتخاب اسی لیے کیا تھا۔ باقی رہی گھر واپس آنے کے بعد کی بات تو اس سلسلے میں بھی میں نے اپنی کام والی ماسی سے بات کرلی ہے۔ بہت صاف ستھری اور ذمے دار عورت ہے اور اس بات پر راضی ہوگئی ہے کہ ہمارے ہاں کل وقتی کام سنبھال لے گی۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ بچے کی دیکھ بھال کے سلسلے میں بھی مدد کردے گی۔'' رافعہ نے انہیں تسلی دی۔

''حالات کے مطابق تمہارا بندوبست بالکل ٹھیک ہے لیکن سابقہ ماسی کے تجربے نے بہت جھٹکا لگایا ہے۔ وہ اتنے عرصے سے ہمارے ہاں کام کر رہی تھی اس کے باوجود اس نے ہمیں دھوکا دیا۔ اب اس نئی عورت پر بھروسا کرتے ہوئے ڈر سا لگ رہا ہے۔''

''بھروسا تو کرنا پڑے گا۔ انسان معاشرتی حیوان ہے اور انسان سے دھوکا کھانے کے باوجود مجبور ہوتا ہے کہ انسانوں پر بھروسا کرے کیونکہ ہمارے روزمرہ کے معاملات کا انحصار ہی اسی پر ہے۔ ہاں البتہ یہ ہے کہ اب میں پہلے کے مقابلے میں بہت محتاط ہوگئی ہوں اس لیے اس بات کا امکان کم ہے کہ کوئی آسانی سے دھوکا کرسکے۔'' اس بار رافعہ کے لہجے میں ہلکی سی اداسی تھی۔ اصل میں وہ خود بھی موجودہ حالات میں خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے والدین حیات نہیں تھے اور شادی شدہ دونوں بہنیں اور اکلوتا بھائی بیرونِ ملک ہوتے تھے یوں وہ پاکستان میں اکیلی ہی تھی۔ پروفیسر کامران کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ ان کے والدین بھی حیات نہیں تھے اور اکلوتی بڑی بہن کا بھی ان کی شادی کے چند ماہ بعد ہی انتقال ہوگیا تھا۔ دوسرے بہت سے رشتے دار اگرچہ موجود تھے لیکن اپنی مصروفیات میں گم پروفیسر نے ان سے کوئی خاص میل جول ہی نہ رکھا تھا کہ اس ضرورت کے وقت کسی سے مدد کی درخواست کرتے۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اللہ نے چاہا تو یہ نئی ماسی ہمارے حق میں اچھی ثابت ہوگی۔ فی الحال تو میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ تم خیروعافیت کے ساتھ اس مرحلے سے گزر جاؤ۔ مال و زر کا کیا ہے آنی جانی چیز ہے اور اس کے نقصان کو دل سے لگانا بھی نہیں چاہیے۔'' اس کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے پروفیسر نے اپنے لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے اسے تسلی دی اور پھر دونوں ہی ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے پوری طرح کھانے میں منہمک ہوگئے۔

ان کی کامیاب ازدواجی زندگی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ دونوں بہت خلوص سے ایک دوسرے کی فکریں بانٹ لیتے تھے اور کسی پریشان کن بات کو زیادہ دیر موضوعِ گفتگو بنائے رکھنے سے گریز کرتے تھے۔

☆☆☆

یہ نوشین کی شاہد کے دفتر میں آمد کا تیسرا دن تھا۔ شاہد

نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی خواہش کے مطابق ضمیر شاہ کی خودکشی کے کیس پر ضرور کام کرے گا لیکن نوشین کی آمد والے روز ہی سہ پہر سے شہر کے حالات کچھ اس طرح سے بگڑے کے قابو پاتے پاتے بھی اڑتالیس گھنٹے گزر گئے۔ ظاہر ہے دیگر پولیس والوں کی طرح شاہد کی توجہ بھی امن وامان کے مسئلے پر مبذول رہی اور اس کا دھیان نوشین کی خواہش پر سے بالکل ہٹ گیا۔ یاد آیا تو اس وقت جب اس نے تھانے میں اپنے لیے آنے والی ایک کال وصول کی۔

”میں نوشین اختر بات کر رہی ہوں انسپکٹر صاحب۔ میں نے ضمیر شاہ کی خودکشی کے کیس کے سلسلے میں آپ سے تحقیقات کی درخواست کی تھی۔“ اس کی ہیلو کے جواب میں نوشین نے پورے سیاق وسباق کے ساتھ اپنا تعارف کروا ڈالا۔

”آئی ایم ویری سوری نوشین۔ اصل میں شہر کے حالات ایسے تھے کہ کسی اور طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملی لیکن اب انشاء اللہ میں اس سلسلے میں ضرور کام کا آغاز کر دوں گا۔“ نوشین میں جانے کیا بات تھی کہ شاہد پولیس والوں کے عمومی مزاج کے خلاف اس سے بہت تہذیب سے پیش آنے پر مجبور تھا۔ ویسے وہ فطرتاً بھی مہذب آدمی تھا لیکن پولیس کے محکمے کی اپنی بھی ایک تربیت ہوتی ہے جو آدمی کو اس کے ذاتی مزاج سے ہٹ کر کچھ کچھ اکھڑ اور بدتہذیب بنا دیتی ہے۔

”مجھے آپ کی مصروفیات کا اندازہ تھا اسی لیے یاد دہانی کروانا مناسب سمجھا۔“ اس کا جواب سن کر وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

”یاددہانی کا شکریہ۔ آئندہ بھی مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت رہے گی اس لیے بہتر ہے کہ تم میرا سیل نمبر نوٹ کر لو۔“ لاشعوری طور پر وہ خود نوشین سے رابطے میں رہنے کی خواہش محسوس کر رہا تھا۔

”سیل نمبر دینے کا شکریہ۔ میں ایک دو دن بعد کال کر کے آپ سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کروں گی۔“ اس نے ایک طرح سے شاہد کو ٹائم لسٹ دے دیا۔ شاہد نے فون بند کیا تو وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ نوشین بہت تیزی سے اس پر حاوی ہونے لگی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ شام کے وقت پروفیسر کامران کے گھر چکر لگائے گا۔

ساڑھے چھ بجے وہ پروفیسر کامران کے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجا رہا تھا۔ حسبِ توقع دروازہ پروفیسر نے ہی کھولا۔

”انسپکٹر شاہد سلیم۔ آؤ بھئی اندر آجاؤ۔“ پروفیسر نے اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا لیکن شاہد محسوس کر رہا تھا کہ اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر وہ قدرے الجھن کا شکار ہیں۔ شاہد ان کے اچھے شاگردوں میں ضرور شمار ہوتا تھا اور اسے رافعہ کے کلاس فیلو ہونے کا بھی اعزاز حاصل تھا لیکن وہ کبھی ملاقات کی غرض سے ان کے گھر نہیں آیا تھا۔ زمانۂ طالب علمی کے بعد ان کا تعلق اتفاقاً ہو جانے والی ملاقاتوں اور کبھی کبھار کی ٹیلیفونک گفتگو تک ہی محدود تھا ایسے میں پروفیسر کی الجھن بجا تھی اور یقیناً وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ضمیر شاہ کی خودکشی کا کیس نمٹنے کے باوجود شاہد کس سلسلے میں ان کے گھر آیا ہے۔

”رافعہ! شاہد آیا ہے۔ اس کے لیے اچھی سی چائے تو بنا لاؤ۔“ اسے اپنے ساتھ لیے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے پروفیسر نے بلند آواز میں رافعہ کو پکارتے ہوئے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر وہ بہت تیزی سے نمودار ہوئی۔

”ہیلو رافعہ! ہاؤ آر یو؟“ شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”فائن! تم کہو کیسے ہو؟“ اس نے اس انداز میں کہا جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہاں کیسے آنا ہوا؟

”میں ٹھیک ہوں۔ ایک کام کے سلسلے میں اس علاقے کی طرف آنا ہوا تھا سوچا تم لوگوں سے بھی ملاقات کرتا چلوں۔“ شاہد نے نارمل سے انداز میں اپنی یہاں آمد کی وضاحت کی۔

”بہت اچھا کیا۔ تم بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“ وہ مطمئن نظر آنے لگی۔

”ایسا کرو کہ چائے کے بجائے کچھ ٹھنڈا لے آؤ۔ دفتر میں سارا دن چائے ہی چلتی رہتی ہے۔ اس وقت چائے کا موڈ نہیں ہو رہا۔“ شاہد نے بے تکلفی سے اپنی فرمائش بیان کی تو وہ مسکرا دی۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لیے اسکوائش بنا کر لے آتی ہوں۔“ وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

”پچھلے دنوں شہر کے حالات بہت خراب رہے، تم تو یقیناً کافی مصروف رہے ہوگے۔“ پروفیسر نے ایک اچھے میزبان کی طرح اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ہم پولیس والوں کے ساتھ تو یہ معاملات چلتے ہی رہتے ہیں۔ خون خرابا اور لاشیں اس کے سوا ہمیں دیکھنے کو ملتا ہی کیا ہے۔“

”واقعی یہ تم لوگوں کا ہی حوصلہ ہے کہ دن رات ایسے

معاملات سے نمٹتے رہتے ہو۔ میں تو اتنے دن گزر جانے کے باوجود ضمیر کی خودکشی کو فراموش نہیں کرسکا ہوں۔ جب بھی یہ خیال آتا ہے کہ اچھے بھلے لڑکے نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لے لی تو کانپ اٹھتا ہوں۔'' پروفیسر نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا تو شاہد کو اپنے من چاہے موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع مل گیا اور پہلو بدلتے ہوئے بظاہر عام سے انداز میں بولا۔

''واقعی آپ جیسے کتابوں کی دنیا میں رہنے والے آدمی کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ کیا آپ ایسی کوئی وجہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوسکے جس سے ضمیر کی خودکشی پر روشنی پڑ سکے؟''

''نہیں۔'' پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ میرے گھر میں رہتا ضرور تھا لیکن میں اس کی نجی زندگی سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں دوسروں کی ذات میں زیادہ دلچسپی لینے والا آدمی نہیں ہوں اور بس اپنی دنیا تک محدود رہنا پسند کرتا ہوں۔ ضمیر کو اپنے گھر پے انگ گیسٹ کے طور پر رہنے کی اجازت بھی میں نے اس لیے دے دی تھی کہ ایک تو میرے دوست نے اس کے لیے سفارش کی تھی دوسرے میں نے سوچا تھا کہ میری وجہ سے گاؤں کے رہنے والے اس لڑکے کو حصولِ تعلیم میں اگر کچھ آسانی ہوجاتی ہے تو یہ ایک نیکی ہوگی۔ یہاں رہائش اور کھانے پینے کے عوض میں اس سے بہت قلیل رقم لیتا تھا وہ بھی صرف اس لیے کہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو ورنہ مجھے رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔''

''وہ مزاجاً کیسا لڑکا تھا؟'' شاہد نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

''بہت اچھا۔ میں نے اسے بہت شریف اور شگفتہ مزاج پایا تھا۔ ڈیڑھ سال کے اس عرصے میں، میں اس پر خاصا اعتماد کرنے لگا تھا۔''

پروفیسر کا جواب سن کر شاہد کو اندازہ ہوا کہ ایک اچھی رہائش گاہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے ضمیر نے بڑی مہارت سے اپنا مثبت تاثر قائم کر رکھا تھا اور اپنی ذات کے ان منفی پہلوؤں کو سامنے نہیں آنے دیا تھا جن کے متعلق اسے لوسین نے آگاہ کیا تھا۔

''سوچتا ہوں ایسے ہونہار لڑکے کی ڈیڈ باڈی اس کے گھر پہنچی ہوگی تو اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہوگی؟'' پروفیسر کو حقیقتاً ضمیر کی موت کا رنج تھا۔

''آپ پھر اس موضوع کو لے کر بیٹھ گئے۔'' ڈاکٹر نے آپ کو اسٹریس لینے سے منع کیا ہے نا۔'' مشروب کے گلاس ٹرے میں سجائے اندر آتی رافعہ نے ان کا جملہ سن لیا تھا اس لیے فوراً انہیں ٹوکا پھر شاہد سے مخاطب ہوئی۔

''تم ہی انہیں سمجھاؤ شاہد۔ ٹھیک ہے ضمیر کی موت ایک الم ناک حادثہ تھی لیکن اس پر اتنا سوچ کر خود کو بیمار کر لینے کی کیا تک بنتی ہے۔ اس واقعے کے بعد سے مسلسل ان کا بلڈ پریشر ہائی رہ رہا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔'' وہ بہ حیثیت بیوی ان کے لیے بجا طور پر فکرمند تھی۔

''رافعہ ٹھیک کہہ رہی ہے سر، زندگی میں غیر متوقع حادثات تو کبھی بھی پیش آسکتے ہیں۔ ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے کہ انہیں ذہن سے جھٹک دیں ورنہ نقصان ہمارا اپنا ہی ہوتا ہے۔'' رافعہ کی تائید کرتے ہوئے مشروب کے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا۔ یہ پیچ فلیور تھا۔ شاہد کو یاد آیا کہ ضمیر شاہ نے بھی اسی فلیور کے شربت میں نیند کی گولیاں ملا کر خودکشی کی تھی۔

''کیا ضمیر کا کھانا پینا مکمل طور پر آپ لوگوں کے ساتھ ہی تھا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''زیادہ تر، لیکن کبھی کبھار موڈ ہونے پر وہ باہر سے بھی اپنے کھانے پینے کے لیے کچھ لے آتا تھا۔ تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟'' رافعہ نے کہا۔

''بس مجھے یونہی خیال آگیا تھا کہ ضمیر کے سامان میں، میں نے کسی مشروف کا جار وغیرہ نہیں دیکھا تھا جبکہ اس نے خواب آور گولیاں شربت میں ملا کر ہی استعمال کی تھیں۔''

''ہوسکتا ہے وہ ساشے وغیرہ لے کر آیا ہو۔'' پروفیسر نے خیال آرائی کی تو شاہد خاموش ہوگیا۔ اس نے جائے وقوعہ پر کسی ساشے کا ریپر نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ گلاس کے ساتھ کوئی چمچہ وغیرہ بھی رکھا نظر نہیں آیا تھا جسے ضمیر نے مشروب کی تیاری اور اس کے بعد خواب آور گولیوں کو گھولنے کے لیے استعمال کیا ہو۔ ہوسکتا تھا کہ ریپر ضمیر نے ڈسٹ بن میں پھینک دیا ہو اور چمچہ بھی استعمال کے بعد دھو کر رکھ دیا ہو۔ اس کے کمرے کی ترتیب اور صفائی کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک نفاست پسند لڑکا تھا۔ شاہد سے اس معاملے میں خاصی کوتاہی ہوئی تھی، اس نے خودکشی کے علاوہ اس کیس کو کسی اور نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا اور سارا زور اس بات پر تھا کہ جلد از جلد اس معاملے کو نمٹا کر پروفیسر اور رافعہ کو ذہنی اذیت سے نجات دلا دے اسی لیے اس نے جائے وقوعہ کا باریک بینی سے جائزہ بھی نہیں لیا تھا اور اب

جبکہ ضمیر شاہ کے لواحقین اس کا سامان یہاں سے لے جا چکے تھے وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ کچھ جھنجلاہٹ کے عالم میں اس نے خود کو سرزنش بھی کی کہ کیا ضرورت پڑی ہے ایک بند ہو جانے والے کیس پر مغز ماری کرنے کی؟ لیکن پھر اس کے ذہن میں نوشین اختر کا خیال آ گیا۔ وہ ضمیر کی خودکشی کے معمے کو حل کروانے کی خواہش مند تھی اور شاہد اس کی بات رد کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ پتا نہیں کیا خاص بات تھی اس لڑکی میں۔ نوشین کا خیال آتے ہی اسے وہ لاکٹ بھی یاد آ گیا جو اس نے نوشین کے گلے سے اتروایا تھا اور تھانے سے نکلتے ہوئے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔

''کیا آپ لوگ اس لاکٹ کو پہچانتے ہیں؟'' اس نے جیب سے لاکٹ نکال کر سینٹرل ٹیبل پر رکھا۔

''ارے یہ تو رافعہ کا گم شدہ لاکٹ ہے۔ تمہیں یہ کہاں سے ملا؟'' لاکٹ پر نظر پڑتے ہی پروفیسر کی تحیر زدہ آواز کمرے میں گونجی۔ رافعہ خاموش تھی لیکن اس کی آنکھوں کی حیرت بھی یہی سوال کر رہی تھی۔ اس نے آج بھی کانوں میں شفاف نگوں والے وہی بندے پہن رکھے تھے جو ضمیر کی موت والے دن شاہد نے اس کے کانوں میں دیکھے تھے اور جن کی وجہ سے اسے نوشین کے گلے میں موجود لاکٹ کے لیے شناسائی کا احساس ہوا تھا۔

''یہ لاکٹ سیٹ میں نے دو برس قبل رافعہ کو اس کی برتھ ڈے پر گفٹ کیا تھا۔ لاکٹ کے ساتھ سونے کی بھاری زنجیر بھی تھی۔ اس کے ساتھ کے بُندے تم اب بھی رافعہ کے کانوں میں دیکھ سکتے ہو۔'' پروفیسر کامران لاکٹ کو دیکھ کر خاصے پُرجوش تھے۔

''یہ لاکٹ کس طرح گم ہوا تھا؟'' شاہد نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بس ایسے ہی گھر میں سے ہی غائب ہو گیا تھا۔ رافعہ گھر میں عموماً گلے میں پہنے جانے والے زیورات استعمال نہیں کرتی۔ البتہ کانوں کے زیور بدل بدل کر پہنتی رہتی ہے۔ چند ماہ قبل اس نے اس سیٹ کے بُندے پہننے کے لیے نکالے تو لاکٹ زنجیر سمیت ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ہی رکھ چھوڑا۔ وہاں سے یہ غائب ہو گیا۔'' اس بار پھر پروفیسر نے جواب دیا۔

''اس طرح لاکٹ غائب ہونے پر آپ لوگوں کو چوری کا شک نہیں ہوا تھا؟'' شاہد نے انہیں کریدا۔

''ہوا تھا۔ کیسے نہ ہوتا، یہ واحد زیور تھوڑی تھا جو گھر سے غائب ہوا ہو۔ کئی چھوٹی موٹی چیزیں وقتاً فوقتاً غائب ہوئیں لیکن ہر چیز کے بارے میں رافعہ کو فوری طور پر علم بھی نہ ہو سکا۔ پچھلے مہینے جب اس کی ڈائمنڈ نوز پن غائب ہوئی تو ہم سنجیدگی سے نوٹس لینے پر مجبور ہوئے۔'' پروفیسر کامران خاصا چونکا دینے والا انکشاف کر رہے تھے۔

''آپ لوگوں کو کچھ معلوم ہوا کہ یہ سب کون کر رہا تھا؟'' شاہد نے تجسس سے پوچھا۔

''ہمیں اوپری کاموں کے لیے گھر آنے والی ملازمہ پر شک تھا اسی لیے ہم نے بہانے سے اسے ملازمت سے نکال دیا تھا۔''

''کیا مطلب؟ آپ نے اس کے خلاف کوئی باقاعدہ ایکشن نہیں لیا؟'' شاہد حیران ہوا۔

''نہیں۔'' پروفیسر نے گہرا سانس لیا۔ ''وہ بہت پرانی ملازمہ تھی اور بہت ایمانداری سے کام کرتی رہی تھی۔ گھر میں ہونے والی چوریوں کا شک ہونے پر جب ہم نے اطمینان سے حالات کا تجزیہ کیا تو یہ سمجھ آیا کہ اس غریب عورت نے مجبوری کی حالت میں یہ حرکت کی تھی۔ اصل میں اس کی دو بچیوں کی شادی ہونے والی تھی اور ظاہر ہے اسے انتظامات کے لیے رقم کی ضرورت ہو گی اس لیے مجبوری نے اسے غلط راہ پر چلا دیا۔ ان حالات میں اگر ہم اس کے خلاف ایکشن لیتے اور پولیس وغیرہ کو بلاتے تو وہ غریب عورت مزید مشکل میں پڑ جاتی۔ ممکن تھا کہ بدنامی کے باعث اس کی بچیوں کے رشتے ہی ختم ہو جاتے اس لیے ہم نے اسے صرف ملازمت سے نکالنے پر ہی اکتفا کیا۔ ویسے بھی ہم کچھ کچھ احساسِ ندامت کا شکار تھے۔ اگر ہم حقوق العباد کی ادائیگی کرتے ہوئے پہلے ہی اسے یہ امید دلا دیتے کہ بچیوں کی شادی کے سلسلے میں ہر ممکن مدد کریں گے تو وہ ایسی حرکت کرتی ہی نہیں۔ ہم نے اپنا جرم تسلیم کر لیا تھا اس لیے اس کے جرم کو بھی معاف کر دیا۔'' پروفیسر کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ سوچ کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے، وہ آج تک ناواقف رہا تھا۔

''تم بتاؤ، تمہیں یہ لاکٹ کہاں سے ملا؟'' اس کے ہر سوال کا جواب دینے کے بعد پروفیسر نے اپنے تجسس کو الفاظ میں ڈھالا۔

''ضمیر شاہ کی ایک آفس کولیگ کے گلے سے لیکن اس نے یہ لاکٹ کسی بھاری یا قیمتی زنجیر کے بجائے بہت ہلکی سی زنجیر میں پہن رکھا تھا۔'' اس بار شاہد نے ان لوگوں کو حیران کیا۔

''ضمیر شاہ کی کولیگ کے گلے میں یہ لاکٹ کیسے

پہنچا؟'' پروفیسر کامران حیرت سے بڑبڑائے۔

''ممکن ہے کہ آپ ملازمہ کو چور سمجھتے رہے جبکہ چور اس کے بجائے ضمیر شاہ ہو۔'' شاہد نے اپنا اندازہ بیان کیا۔

''ناقابلِ یقین، میں نے اسے کبھی ایسا لڑکا نہیں سمجھا۔'' پروفیسر کامران صدمے کا شکار تھے۔

''دنیا میں ناقابلِ یقین کچھ نہیں ہوتا پروفیسر صاحب، ہوسکتا ہے شاہد کا اندازہ ٹھیک ہو اور ہم ضمیر کی ظاہری شخصیت کی وجہ سے اس پر شک نہ کرسکے ہوں۔'' بہت دیر بعد رافعہ نے لب کشائی کی تو شاہد نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

''رافعہ ٹھیک کہہ رہی ہے سر۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ بعض جرائم پیشہ افراد خود کو نہایت عیاری سے شرافت کے نقاب میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ضمیر شاہ کا تعلق بھی شاید اسی کیٹیگری سے تھا۔ مجھے اس کی کولیگ سے اس کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان میں سے کئی ایسی بھی ہیں جو ضمیر کے کردار کے منفی پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہیں جبکہ آپ تو اس کے کسی منفی پہلو سے آگاہ ہی نہیں تھے۔'' شاہد نے دلیل دی۔

''کیسے منفی پہلو؟ کیا اس کا کسی کرمنل گینگ سے تعلق تھا؟'' رافعہ نے بے چینی سے پوچھا جبکہ شاکڈ بیٹھے پروفیسر کے پاس تو شاید سوال کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

''اتنے بھی خوفناک حالات نہیں تھے۔'' رافعہ کے سوال پر شاہد دھیرے سے ہنسا۔ ''بس مجھے اس کے کردار کے بارے میں کچھ منفی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ وہ لڑکیوں کے چکر میں پڑنے والا لڑکا تھا اور ایسے لڑکوں کو روپے پیسے کی ضرورت تو رہتی ہی ہے نا۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''ضمیر کی کولیگ سے تم کیوں ملے تھے؟ کیا تم اب بھی اس کے کیس پر کام کررہے ہو؟'' اس کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے رافعہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں تو اپنے طور پر اس کیس کو کلوز کرچکا تھا لیکن وہ لڑکی خود مجھ سے آکر ملی اور کہنے لگی کہ ضمیر اتنی آسانی سے خودکشی کرنے والا بندہ نہیں ہے اس لیے مجھے بھی اتنے آرام سے یہ کیس بند نہیں کردینا چاہیے۔ میں شاید اس کی خواہش کو نظر انداز کردیتا لیکن اس کے گلے میں یہ لاکٹ دیکھ کر ٹھٹک گیا اور سوچا کہ تم لوگوں سے کچھ معلومات لے لینی چاہئیں۔'' شاہد نے جواب دیا۔

''ہماری معلومات تو تم نے دیکھ ہی لیں۔ ہم تو ضمیر کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں تھے کہ وہ اتنی چالاکی سے ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔ بہرحال تمہارا شکریہ کہ تم نے میری اتنی عزیز شے مجھ تک پہنچادی۔ پروفیسر صاحب کا تحفہ ہونے کی وجہ سے یہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ اس کے ملنے کی خوشی میں، میں باقی گمشدہ چیزوں کو آسانی سے بھلا سکتی ہوں۔'' رافعہ نے میز پر رکھے لاکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''پلیز نہیں، ابھی تم یہ لاکٹ نہیں لے سکتیں۔ فی الحال یہ پولیس کسٹڈی میں رہے گا۔ بعد میں ضروری کارروائی کے بعد تمہارے حوالے کردیا جائے گا۔'' شاہد نے اس سے پہلے لاکٹ اپنے قبضے میں لے لیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''اوکے سر، میں چلتا ہوں۔ آپ لوگوں کا بہت زیادہ وقت لے لیا لیکن امید کرتا ہوں کہ اس کیس کے سلسلے میں اگر میں دوبارہ آپ کو زحمت دوں تو آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔'' اس نے مصافحے کے لیے پروفیسر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''بالکل، قانون سے تعاون کرنا میرا فرض ہے۔'' مصافحہ کرتے ہوئے پروفیسر نے اسے یقین دہانی کروائی۔

☆☆☆

شاہد پروفیسر کے گھر سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ اس کی نظر کونے والے گھر سے باہر نکلتی ایک عورت پر پڑی۔ وہ تقریباً پینتالیس سال کی ہوگی۔ لباس اور چہرے پر یکساں شکنیں اس کی غربت کا پتا دے رہی تھیں اور شاہد یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ اس محلے کی رہائشی نہیں ہو سکتی۔ یہ ملازمت پیشہ لیکن خوش حال افراد کا محلہ تھا جہاں کے مکین بھی ظاہر ہے اپنی حیثیت کے اعتبار سے ہی پہنتے اوڑھتے تھے۔ اس نے جو پہلا اندازہ لگایا وہ یہی تھا کہ وہ کوئی گھریلو ملازمہ ہے جو یقیناً اپنا کام نمٹا کر شام ڈھلے واپس جارہی تھی۔ عورت کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک شاپر بھی تھا جس میں شاہد کو چاولوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔ شاہد کو گمان ہوا کہ ممکن ہے یہی عورت رافعہ کی سابقہ ملازمہ ہو۔ اگر وہ نہیں بھی تھی تو اس سے معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ شاہد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہلکی رفتار سے چلاتا ہوا گلی سے باہر لے گیا۔ عورت اس سے پہلے ہی گلی سے نکل چکی تھی اور تیز تیز قدموں سے ایک طرف جارہی تھی۔ شاہد گاڑی اس کے قریب لے گیا اور ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی تو اس کے چہرے پر معمولی سی گھبراہٹ

تھی۔

''ایک منٹ رکو بی بی، تم سے ایک کام ہے۔'' شاہد نے اسے بارعب لہجے میں مخاطب کیا تو وہ کچھ اور بھی سراسیمہ نظر آنے لگی۔

''کیا کام ہے صاحب؟'' اس نے گھبراہٹ اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

''تم یہاں گھروں میں کام کرتی ہو نا؟'' شاہد نے دریافت کیا۔

''جی صاحب، کیا آپ کو بھی کسی کام والی کی ضرورت ہے؟'' اس نے قدرے مطمئن انداز میں دریافت کیا۔

''ہاں، تم میری گاڑی میں بیٹھو۔ میں تمہیں اپنی بیوی سے ملوا دیتا ہوں۔ وہی اس سلسلے میں تم سے بات چیت کرے گی۔'' عورت پہلے ذرا جھجکی لیکن پھر شاہد کو شریف آدمی محسوس کر کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''آپ کا گھر کدھر ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہیں قریب ہی ہے گھر۔ تمہارا زیادہ وقت نہیں لگے گا۔'' شاہد نے اسے اطمینان دلایا۔

''کیا اس علاقے میں نئے آئے ہیں؟'' عورت نے نیا سوال داغا۔

''ہاں، ابھی کل ہی شفٹ ہوئے ہیں اور میری بیوی کو ہاتھ بٹانے کے لیے ایک محنتی عورت کی ضرورت ہے۔'' اس نے دروغ گوئی سے کام لیا اور عورت کو مزید سوال کرنے کا موقع دینے کے بجائے خود سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''جی نام تو رضیہ ہے پر سب رجو رجو کہتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''تم وہی تو نہیں جو کچھ عرصے پہلے تک پروفیسر کامران کے ہاں ملازمت کرتی تھیں؟'' شاہد نے ہوا میں تیر چلایا جو نشانے پر بیٹھا۔

''آپ جانتے ہیں پروفیسر صاحب کو؟ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ میں نے ان کے گھر کئی سال کام کیا ہے۔'' رجو نے فخر سے بتایا پھر بولی۔ ''آپ رافعہ بی بی سے پوچھو گے تو وہ آپ کو بتائیں گی کہ میں کتنی محنتی اور ایمان دار عورت ہوں۔ انہیں میرے ہاتھ کا کام بہت پسند تھا۔''

''کمال ہے انہوں نے تم جیسی پرانی اور اچھی ملازمہ کو کام سے نکال کر دوسری ملازمہ کیوں رکھ لی؟'' شاہد، رجو کے لہجے میں موجود سچائی کو محسوس کر رہا تھا اس لیے حقیقی تعجب سے پوچھا۔

''نکالا تو نہیں، بس ہمارے درمیان نئے معاملات طے نہیں ہو سکے اس لیے مجھے ان کی نوکری چھوڑنی پڑی۔'' رجو کے لہجے میں ہلکی سی اداسی تھی۔

''کیا مطلب؟'' شاہد نے وضاحت چاہی۔ وہ دھیمی رفتار سے ادھر ادھر گلیوں میں گاڑی گھما رہا تھا لیکن گفتگو میں منہمک ہونے کی وجہ سے رجو کی توجہ نہیں تھی۔

''رافعہ بی بی کے بچہ ہونے والا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں دوسرے گھروں کا کام چھوڑ کر پورا دن ان کے گھر گزاروں۔ میں اس کے لیے راضی تھی پر رافعہ بی بی تنخواہ بہت تھوڑی دے رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ یا تو آپ مجھے اتنی تنخواہ دیں جتنے پیسے مجھے سب گھروں کا کام کرنے پر ملتے ہیں یا مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کے گھر رہنے کے ساتھ موقع ملنے پر دو چار اور گھروں کا کام نمٹا آیا کروں، مگر وہ نہیں مانیں۔ بولیں کہ مجھے تو اس سے بھی کم پیسوں میں پورے دن کی ملازمہ مل رہی ہے۔ میں صرف پرانی ہونے کی وجہ سے تمہیں رکھنے کی بات کر رہی تھی۔ میں نے کہا کہ پھر خیر ہے باجی، نہ آپ اپنا نقصان کرو نا میں اپنا کرتی ہوں۔ بس پھر میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ باجی رافعہ کا کام چھوڑنے کی وجہ سے میرے پاس ایک گھر کی گنجائش ہے اس لیے میں آپ کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی ہوں۔'' رجو نے اسے تفصیلی جواب دیا پھر ذرا چونکی۔

''آپ کا گھر کدھر ہے جی، ابھی تک آیا نہیں؟'' ساتھ ہی وہ نظریں گھما کر ادھر ادھر بھی دیکھ رہی تھی۔ جانا پہچانا علاقہ دیکھ کر یقیناً اسے تھوڑی تسلی ہوئی تھی۔

''اس لاکٹ کو پہچانتی ہو تم؟'' شاہد نے اس کے سوال اور پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے رافعہ کا لاکٹ نکال کر اس کے سامنے کیا۔ رجو نے آنکھیں سکیڑ کر لاکٹ کی طرف دیکھا اور بے ساختہ بولی۔

''ارے، یہ تو باجی رافعہ کا لاکٹ ہے۔ بڑی موٹی سی زنجیر میں پڑا ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھار آنے جانے میں اسے پہنتی تھیں۔'' وہ بڑا سچا اور خالص لہجہ تھا جس میں ذرا بھی بناوٹ نہیں تھی۔ شاہد کے تجربے کے مطابق اگر اس نے یہ لاکٹ چرایا ہوتا تو اس وقت سامنے پا کر متوحش ہو جاتی۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ کچھ عرصے سے رافعہ کے زیورات گھر سے غائب ہونے لگے تھے اور یہ لاکٹ بھی انہی گمشدہ زیورات میں سے ایک ہے؟'' شاہد نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس بار فوری طور پر جواب

دینے کے بجائے رجو نے اسے تھکی ہوئی نظروں سے دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''آپ کون ہو صاحب؟ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ بہانے سے مجھے اپنے ساتھ لائے ہو ورنہ آپ کو کسی کام والی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ایک پختہ عمر کی عورت تھی جو اپنے تجربے کی بنیاد پر اتنا اندازہ تو لگا ہی سکتی تھی۔

''تم ٹھیک سمجھی ہو۔ اب سیدھی طرح میرے سوالوں کا جواب دو، ورنہ میں تھانے لے جا کر تم سے پوچھ گچھ کروں گا۔'' شاہد نے اسے دھمکی دی جس پر اس کے چہرے پر خوف نظر آنے لگا اور روہانسی ہو کر بولی۔

''مجھ غریب کا کیا قصور ہے مائی باپ۔ میں غریب پر ایمان داری سے اپنا کام کرنے والی عورت ہوں۔''

''میں نے تم سے پوچھا ہے کہ تم زیورات کی چوری کے سلسلے میں کیا جانتی ہو؟'' شاہد کو اس کی حالت پر رحم آیا لیکن اس نے اپنا لہجہ بدستور سخت رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ایک آدھ بار سننے میں آیا تھا کہ باجی رافعہ کا کوئی زیور غائب ہو گیا ہے لیکن مجھے تفصیل معلوم نہیں۔ باجی نے بھی میرے سامنے ذکر نہیں کیا کہ ان کی کیا کیا چیزیں چوری ہوئی ہیں۔'' اس کا جواب سن کر شاہد نے ایک گہرا سانس لیا۔

''کیا کبھی رافعہ کے انداز سے تمہیں نہیں لگا کہ وہ تمہیں چور سمجھتی ہے اور اس نے اسی شک کی وجہ سے بہانے سے تمہیں کام سے نکال دیا تھا؟''

''بالکل نہیں جی، میں تو باجی رافعہ کی شادی سے بھی پہلے سے پروفیسر صاحب کے ہاں کام کر رہی ہوں، اتنے سالوں میں کبھی میں نے بغیر اجازت کے ان کے گھر سے تنکا بھی نہیں اٹھایا تو اب بھلا مجھے چوری کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ باجی رافعہ کبھی مجھ پر ایسا شک نہیں کر سکتیں۔'' رجو نے تڑپ کر اس کی تردید کی تو اس کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔ ایسا اعتماد کسی سچے شخص کے لہجے میں ہی ہو سکتا ہے پھر بھی شاہد کوئی کسر باقی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اس لیے معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ضرورت تو تمہیں تھی رجو۔ آخر تم دو دو بیٹیوں کا بیاہ کرنے جا رہی ہو۔ ان کی شادی کی تیاری کے لیے تمہیں رقم کی ضرورت تو ہو گی نا؟''

''اللہ میری توبہ۔'' رجو نے اپنے دونوں گال پیٹ ڈالے۔ ''میں کیا چوری کے مال پر اپنی بیٹیاں بیاہوں گی۔ اللہ کا کرم ہے میری ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ میرے دونوں داماد گھر ہی کے لڑکے ہیں۔ ایک میرے بھائی کا بیٹا ہے تو دوسرا میرے شوہر کی بہن کا بیٹا۔ میری دونوں بیٹیوں کے سسرالیوں کو ہماری حیثیت معلوم ہے۔ میں شربت کے گلاس پر دونوں بیٹیوں کا نکاح کر دوں گی۔ جہیز بھی کوئی لمبا چوڑا نہیں دینا ہے میں نے۔ تھوڑے بہت جمع جتھے اور برادری کی مدد سے دو چار جوڑے اور برتن بھانڈے ہی دینے ہیں میں نے بیٹیوں کو۔ اس کے لیے بھلا چوری کیوں کروں گی؟ اگلے ہفتے کی براتیں ہیں دونوں کی۔ آپ میرے گھر آ کر دیکھ لینا کہ کیسی شادی ہو رہی ہے رجو کی بیٹیوں کی۔'' وہ واضح طور پر صدمے کا شکار تھی۔ اب اس کو مزید کچھ کہنا زیادتی کے مترادف تھا چنانچہ شاہد نے اپنا لہجہ نرم کر لیا اور بولا۔

''تم دل پر مت لو رجو۔ میں اس معاملے کی چھان بین کر رہا ہوں اس لیے تم سے بھی چند سوال جواب کرنے پڑے۔ پروفیسر صاحب یا رافعہ کو اس سلسلے میں کچھ علم نہیں ہے اس لیے ان سے بدگمان مت ہونا۔''

''آپ یقیناً پولیس والے ہو جی۔ پولیس والے ہی ہر ایک پر شک کرتے ہیں۔'' رجو کے سادگی سے لگائے گئے اندازے پر شاہد کو ہنسی آ گئی۔ بہرحال اس کی تصدیق یا تردید کیے بغیر وہ ہنس کر بولا۔

''چلو تمہارے گھر اتار دوں تمہیں کافی دیر ہو گئی ہے۔''

رجو نے ذرا سے تامل کے بعد اس کی یہ پیشکش قبول کر لی۔

''بات سنو۔'' جب وہ گاڑی سے اتری تو شاہد نے کہا۔ ''یہ رکھ لو۔'' اس نے چند سرخ نوٹ رجو کے ہاتھ میں تھمائے اور تیزی سے گاڑی آگے نکال لے گیا۔ رجو کا یقیناً زندگی میں پہلی بار ایسے پولیس والے سے واسطہ پڑا تھا جو کچھ لینے کے بجائے دے کر گیا تھا چنانچہ وہ سخت حیران تھی۔

☆☆☆

''میں نے اب تک اس کیس کے سلسلے میں جو بھی کارروائی کی ہے اس سے ضمیر شاہ کی خودکشی پر تو روشنی نہیں پڑی لیکن اس پر یہ شک ضرور ہوا ہے کہ تمہاری بتائی گئی خامیوں کے علاوہ وہ چوری کی لت میں بھی مبتلا تھا اور اپنے مالک مکان کی بیوی کے زیورات موقع پا کر اڑاتا رہا تھا۔ تمہیں تحفتاً دیا جانے والا یہ لاکٹ بھی ان ہی چوری شدہ زیورات میں شامل ہے۔'' رجو سے ملاقات کے دو دن بعد

اس نے نوشین اختر کو اس کے دفتر سے قریب ایک ریستوران میں بلایا اور پُرتکلف چائے کا آرڈر دینے کے بعد اسے یہ سب بتا رہا تھا۔

''وہ چور بھی ہے اس سلسلے میں مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ میں نے تو اس کو چھوٹا موٹا فلرٹ بندہ سمجھ کر اس کی خامیوں کے ساتھ سمجھوتا کرلیا تھا۔'' اس کے انکشاف نے نوشین کو صدمہ پہنچایا اور وہ کچھ بھرائی ہوئی آواز میں بولی لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور آنسو بہانے سے گریز کیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ مجھے تمہیں ایسی بات بتانی پڑی لیکن میں تمہاری خواہش پر ہی اس کیس پر کام کررہا ہوں اور کام کو آگے بڑھانے کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہوگی۔'' شاہد کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''میں اس سلسلے میں آپ کی شکر گزار ہوں لیکن اب مجھے بھی احساس ہونے لگا ہے کہ میں نے آپ سے ایک احمقانہ مطالبہ کیا تھا۔ اگر ضمیر جیسے بندے نے خودکشی کرلی ہے تو مجھے اس حقیقت کو قبول کرلینا چاہیے اور اس سلسلے میں تحقیق کا مطالبہ کرکے آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' ایسا لگتا تھا کہ ضمیر کے بارے میں ہونے والے ایک اور منفی انکشاف نے اسے توڑ دیا ہو اور وہ نہ چاہتی ہو کہ اس معاملے کے آگے بڑھنے کی صورت میں اس کے محبوب کی مزید خامیاں سامنے آئیں۔

''اب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اس کیس پر باقاعدہ کام شروع کرچکا ہوں اور اپنے تجسس کے ختم ہونے تک اس پر کام نہیں چھوڑ سکتا اس لیے تمہیں مجھ سے تعاون تو بہرحال کرنا پڑے گا۔'' شاہد کی سنجیدگی سے کہی بات پر اس کا چہرہ اُتر گیا، وہ ذرا نیم دلی سے بولی۔

''آپ مجھ سے کس قسم کے تعاون کے خواہش مند ہیں؟''

''تم نے بتایا تھا کہ دفتر میں تمہارے سامنے بھی ضمیر کے پاس کئی لڑکیوں کے فون آتے رہتے تھے اور ضمیر نے تم سے اعتراف کیا تھا کہ وہ صرف تحفے بٹورنے کے لیے ان لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کرتا ہے، کیا تم مجھے ان لڑکیوں کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرسکتی ہو؟''

''میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ لڑکیاں اس کی کلاس فیلوز تھیں اور وہ ایک ہی وقت میں دو تین کو آرام سے بے وقوف بنا رہا تھا۔'' نوشین نے ذرا سوچتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تمہیں ان لڑکیوں کے نام معلوم ہیں؟''

''سب کے تو نہیں۔ ہاں دو تین بار فون پر بات کرتے ہوئے میں نے اس کے منہ سے کسی سونی کا نام ضرور سنا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کا اصل نام سونیا وغیرہ ہو اور ضمیر اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے نک نیم سے پکارتا ہو۔'' نوشین نے خیال آرائی کی۔

''اوکے، میں چیک کرلوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ریلیکس رہو اور خود کو اس معاملے سے نکالنے کی کوشش کرو۔ زندگی کسی فضول شخص کے لیے اپنا وقت برباد کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ تم بس یہ سوچو کہ تمہیں ایک غلط شخص ٹکرا گیا تھا اور خوش قسمتی سے تمہاری خود ہی اس سے جان چھوٹ گئی۔ اس مرحلے پر جان چھوٹ جانا تمہاری خوش قسمتی ہے۔ اگر تمہاری ضمیر سے شادی ہوجاتی اور بعد میں اس کی دیگر خامیاں سامنے آتیں تو تمہیں زیادہ مشکل پیش آسکتی تھی۔ ویسے ایمان داری کی بات ہے جن خامیوں کو تم نے نظرانداز کر رکھا تھا انہیں بھی نظرانداز کرنا تمہاری حماقت تھی۔ کسی فلرٹ بندے سے شادی کرکے کوئی عورت بھی خوش نہیں رہ سکتی۔ جس بات کو ابھی تم نظرانداز کررہی تھیں شادی ہوجانے کی صورت میں وہی تمہارے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی۔'' شاہد نے اچانک ہی پولیس انسپکٹر سے ایک ناصح اور دوست کا چولا بدل لیا تھا۔ نوشین کو مایوس اور اُداس دیکھنا اسے بہت بُرا لگ رہا تھا اسی لیے اپنی عادت اور پیشے کے خلاف اس طرح کی گفتگو کررہا تھا۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ہم جیسی لڑکیاں جنہوں نے اپنے نازک شانوں پر اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ اٹھا رکھا ہو کسی کی ہمدردی اور توجہ پاکر بہت جلد موم ہوجاتی ہیں۔ ضمیر بھی وہ واحد شخص تھا جس نے مجھ پر بے حد توجہ دی اور مجھے سراہا کہ میں ایک نازک لڑکی ہوکر اپنے گھر والوں کے لیے اتنا کچھ کررہی ہوں۔ وہ اگرچہ مجھ سے صرف زبانی ہمدردی کرتا تھا لیکن پھر بھی مجھے یہی اچھا لگتا تھا کیونکہ گھر میں مجھے اس طرح سراہنے والا کوئی نہیں۔ میری بہنوں کا خیال ہے کہ میں روزانہ سج سنور کر دفتر میں آبیٹھتی ہوں تو مزے میں رہتی ہوں اور مجھے ان کی طرح گھر کے کام کاج میں اپنی جان نہیں کھپانی پڑتی۔ امی، ابو کا خیال ہے کہ انہوں نے اگر اپنی محدود آمدنی میں سے میری تعلیم پر خرچ کیا ہے تو اب میرا بھی فرض بنتا ہے کہ جواب میں، میں ان کا بوجھ بانٹوں جبکہ اکلوتا بھائی یہ سوچ کر مگن رہتا ہے کہ

میں نے تو صرف چند سال کے لیے یہ ذمے داریاں اپنے شانوں پر اٹھائی ہیں جبکہ اسے آنے والے وقت میں تازندگی یہ بوجھ اٹھانا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جہاں میں خون کے رشتوں کے ایسے رویے سہتی تھی وہاں میرے لیے ضمیر شاہ جیسے ہمدرد کی خامیوں سے سمجھوتا کرنا کیا بڑی بات تھی بس اسی لیے یہ تعلق چلتا رہا۔" اس نے نم آنکھوں سے مختصراً اپنے حالات بتائے تو شاہد کو اندازہ ہوا کہ کتنی دکھی لڑکی ہے۔ وہ اس کا دھیان بٹانے کے لیے اس سے اِدھر اُدھر کی دیگر باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہی شاہد پر یادوں کے در کھل گئے۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے چار نہایت یادگار برس گزارے تھے۔ زندگی کا وہ دور بہت بے فکری اور سرخوشی کا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد اس نے اپنی شادی کے بعد کے مختصر عرصے کو بھی انجوائے کیا تھا لیکن بیوی کے بہت جلد ساتھ چھوڑ جانے کے باعث وہ اندر سے کچھ مرجھا سا گیا تھا اور بس کسی مشین کی طرح اپنے معمولات انجام دیتا رہتا تھا لیکن ضمیر شاہ کی خودکشی کے کیس پر کام کرتے ہوئے ایک بار پھر اس میں نامحسوس سی تبدیلیاں پیدا ہونے لگی تھیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر تھا یا یونیورسٹی کے خوش گوار دنوں کی یادوں کی دستک کہ وہ اپنے دل میں عجیب سی ترنگ محسوس کر رہا تھا۔ وہاں وہی جانا پہچانا ماحول تھا۔ کچھ طلبہ تیز تیز قدموں سے چلتے اپنے کلاس رومز کی طرف جا رہے تھے۔ کہیں طلبہ کی ٹولیاں گھاس پر پھسکڑا مارے بیٹھی کمبائن اسٹڈی اور گپ شپ کی رسم نبھا رہی تھیں تو کہیں زور و شور سے مباحثوں اور قہقہوں کا مقابلہ جاری تھا۔ ان سب کے بیچ وہ جوڑے بھی تھے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر سر جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ مگن مستقبل کے لیے ایسے خواب بُننے اور عہد کرنے میں مصروف تھے جن کی تکمیل شاذ و نادر ہی کسی کے حصے میں آتی تھی۔

"ایکسکیوز می! کیا آپ فائنل ایئر کی مس سونیا تک میری راہنمائی کر سکتی ہیں؟" اس نے قریب سے گزرتی دو لڑکیوں کو مخاطب کر کے ان سے مدعا بیان کیا۔

"سونیا...." لڑکیاں سوچ میں پڑ گئیں۔ "ہم بھی فائنل ایئر کی ہی اسٹوڈنٹس ہیں لیکن ہمارے بیچ میں سونیا نام کی کوئی لڑکی موجود نہیں۔" آخر ایک لڑکی نے اسے جواب دیا۔

"اسے سونی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں خودکشی کرنے والے ضمیر شاہ کی دوست تھی وہ۔" شاہد نے مزید تفصیلات بیان کیں۔

"اوہ، آپ ثنا سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھیں وہ وہاں جو پیڑ کے نیچے گروپ بیٹھا ہے اس میں بلیو جینز اور ریڈ ٹی شرٹ والی لڑکی ثنا عرف سونی ہے۔" لڑکی نے انگلی کے اشارے سے اس کی راہنمائی کی۔

"تھینکس آلاٹ۔" لڑکیوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ اس گروپ کی طرف بڑھ گیا۔ ثنا نامی الٹرا ماڈرن لڑکی اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔ وہ گوری رنگت کے ساتھ کسی قدر چپٹے نقوش کی مالک تھی لیکن اہتمام سے کی گئی تیاری کی وجہ سے خاصی خوش شکل لگ رہی تھی۔ اس کے ریڈش براؤن بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور وہ جس جوش و خروش سے گفتگو کر رہی تھی اس کی پونی ٹیل بھی اسی زور و شور سے دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے یہ اندازہ ہو کہ ماضی قریب میں اس نے اپنے محبوب کو کھونے کا صدمہ سہا ہو۔ وہ بالکل نارمل لگ رہی تھی۔

"ایکسکیوز می مس ثنا....." شاہد سلیم نے اس گروپ کے قریب پہنچ کر براہِ راست ثنا کو مخاطب کیا تو وہ چونکی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" شاہد نے براہِ راست اپنے مطلب کی بات کی۔

"وہ کس لیے؟" اس بے تکلفی پر قدرے حیران ثنا نے سرد لہجے میں پوچھا۔ گروپ میں موجود لڑکے بھی کچھ تناؤ کا شکار نظر آنے لگے۔ کسی اجنبی کا اپنے گروپ کی لڑکی کو اس طرح مخاطب کرنا یقیناً ان کی غیرت کا مسئلہ تھا۔

"فی الحال آپ میرا کارڈ دیکھ لیں۔ مقصد میں آپ کو بتا دوں گا۔" تناؤ زدہ لڑکوں اور الجھی ہوئی لڑکیوں کو نظرانداز کر کے اس نے ثنا کی طرف اپنا کارڈ بڑھایا۔ اس نے کارڈ کے مندرجات پڑھے تو اس کا رویہ بدل گیا۔

"او کے، آئی ایم ریڈی۔ تم لوگ یہیں رکو، میں ذرا ان صاحب سے بات کر کے ابھی آتی ہوں۔" اس نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے متعاون انداز کے باوجود وہ پُراعتماد تھی اور کسی قسم کی گھبراہٹ کا شکار نہیں لگتی تھی۔ اپنے حلیے اور انداز سے وہ جس کلاس کی نمائندہ محسوس ہو رہی تھی، اسے شاہد سلیم سے گھبرانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایک معمولی انسپکٹر اس کی کلاس سے تعلق رکھنے والوں کا کچھ بگاڑنے کی بھلا اوقات ہی کہاں رکھتا تھا کہ وہ اس سے

گھبراتی۔ وہ دونوں شانہ بشانہ چلتے کیفے ٹیریا تک پہنچ گئے۔

''میں آپ سے ضمیر شاہ کے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں۔'' وہ دونوں کوک کی بوتلیں لے کر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تو شاہد نے اس سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''ایک نمبر کا فلرٹ اور چالو بندہ تھا وہ۔'' ثنا عرف سونی نے بڑی بے ساختگی سے جواب دیا۔

''اس کے باوجود سنا ہے تم دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی؟'' شاہد نے اسے کھوجتی نظروں سے گھورا۔

''وہ تو میری بے شمار لڑکوں سے ہے۔'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور کوک کا ایک گھونٹ بھرا۔

''لیکن میری معلومات کے مطابق ضمیر شاہ سے تمہارا تعلق دوستی سے کچھ آگے کا تھا؟'' شاہد نے اس کی بے نیازی کے خول کو توڑنا چاہا۔

''ہم ایک دوسرے سے فلرٹ کررہے تھے۔'' ثنا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''کیا میں پوچھ سکتی ہوں انسپکٹر کہ آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' بوتل کی سطح پر ابھرنے والی نمی کو اپنی مخروطی انگلیوں سے چھوتے ہوئے اس نے شاہد سے دوٹوک لہجے میں پوچھا۔

''میں ضمیر شاہ کی خودکشی کیس پر کام کررہا ہوں۔ اس کے ایک قریبی عزیز نے شک ظاہر کیا ہے کہ یہ خودکشی کا معاملہ نہیں ہے چنانچہ میں ان تمام افراد سے ملاقات کررہا ہوں جن کا ضمیر شاہ سے قریبی تعلق رہا ہو۔'' اس لڑکی کی پُراعتماد شخصیت نے شاہد کو مجبور کردیا کہ اس سے کھل کر بات کی جائے۔ اس کی بات سن کر ثنا کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ پھر وہ بولی۔

''میں نے سنا تھا کہ ضمیر نے اپنی رہائش گاہ پر خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی ہے اگر وہ کسی اور انداز سے مارا جاتا تو میں سمجھتی کہ اس کی موت میں نایاب کا ہاتھ ہے لیکن ظاہر ہے وہ جہاں رہ رہا تھا نایاب تو وہاں جا کر اسے نیند کی گولیاں نہیں کھلا سکتی تھی۔ وہ پروفیسر کامران کا پے انگ گیسٹ تھا نا؟'' پُرسوچ انداز میں بولتے بولتے اس نے آخر میں تصدیق چاہی۔ جواب میں شاہد نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ زبان کو جنبش دی تو اس کا سوال نایاب کے بارے میں تھا۔

''نایاب......'' ثنا نے ہنکارا سا بھرا۔ ''وہ ایک احمق اور جذباتی مڈل کلاس لڑکی ہے جس نے ضمیر شاہ جیسے فلرٹ سے محبت کرنے کی غلطی کی اور گہری چوٹ کھائی۔''

''ذرا تفصیل سے بتاؤ۔'' شاہد بے چین ہوا۔

''وہ ہمارے ہی ڈپارٹمنٹ کی اسٹوڈنٹ ہے۔ والد کسی محکمے میں کلرک ہیں اس لیے اسے اپنے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کے لیے یونیورسٹی کے بعد کئی ٹیوشنز بھی پڑھانی پڑتی ہیں اس کے باوجود وہ ایک ذہین طالبہ ہے اور ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کرتی رہی ہے، اسی خوبی کی وجہ سے ضمیر نے اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسایا اور عرصے سے بغیر محنت کے اس کے تیار کردہ نوٹس اور اسائمنٹس پر ہاتھ صاف کرتا رہا۔ بات صرف یہیں تک نہیں تھی بلکہ نایاب موقع بے موقع اسے اپنی محنت کی کمائی سے اچھے گفٹس بھی دیتی رہتی تھی۔ اس کی اس دیوانگی اور سادگی کو دیکھ کر ضمیر جیسے بے ضمیر آدمی کو مزید حوصلہ ملا اور یونیورسٹی سے باہر ہونے والی ملاقاتوں میں سے کسی ملاقات میں اس نے نایاب کو جسمانی طور پر بھی حاصل کرلیا۔ نایاب کی بدقسمتی کہ اس کی یہ لغزش رنگ دکھا گئی اور جب اس نے اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے ضمیر سے شادی کا مطالبہ کیا تو اپنی مجبوریوں کی داستان سنا کر اس نے شادی سے انکار کرتے ہوئے نایاب کو ابارشن کا مشورہ دے ڈالا۔ نایاب اپنی محبت کی نشانی کو مٹانا نہیں چاہتی تھی لیکن عزت بچانے کے لیے اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی ایک شادی شدہ کزن جو کہ اس کی بہت گہری دوست بھی تھی کو اعتماد میں لیا اور یوں وہ اس کے تعاون سے ابارشن کروانے میں کامیاب ہوگئی لیکن ٹائم ذرا زیادہ ہوگیا تھا اس لیے یہ کام بہت مشکل ثابت ہوا اور نایاب کی صحت کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کی کزن نے نایاب کے والدین سے اجازت لے کر کئی روز تک اسے اپنے گھر ہی رکھا۔ اتفاق سے ان دنوں اس کے شوہر اپنے آفس کی طرف سے لاہور گئے ہوئے تھے اس لیے ہر کام خودبخود ہوتا چلا گیا۔ تقریباً دس دن کزن کے گھر رہنے کے بعد نایاب اپنے گھر واپس آگئی تو چلنے پھرنے کے لائق تو ہوچکی تھی لیکن ذہنی اور جسمانی حالت ایسی نہیں تھی کہ یونیورسٹی جوائن کرپاتی۔ گھر والوں سے اس نے یہ بہانہ بنایا کہ کزن کے گھر رہتے ہوئے اسے ٹائیفائڈ بخار ہوگیا تھا اس لیے صحت خراب ہوگئی ہے۔ ٹائیفائڈ کے علاج کے نام پر وہ ان دواؤں کو استعمال کرتی رہی جو اسے لیڈی ڈاکٹر نے دی تھیں۔ ضمیر کو اس نے فون پر سب بتادیا تھا۔ کبھی کبھار دونوں کی مختصر بات چیت ہوجاتی تھی۔ ضمیر نے اسے دلاسا دیا تھا کہ وہ اپنی صحت مکمل بحال ہونے تک گھر پر آرام کرے۔ یونیورسٹی کی چھٹیوں

کے نتیجے میں ہونے والا نقصان وہ پورا کر دے گا۔ نایاب کو تھوڑی تسلی ہوگئی لیکن وہ ان ٹیوشنز کو نہیں بچا سکی جو اتنی چھٹیوں کی وجہ سے چھوٹ گئی تھیں۔ بدقسمتی سے اس کے ساتھ کچھ پیچیدگی ہوگئی تھی اس لیے ذرا زیادہ عرصہ گھر پر گزارنا پڑا۔ کزن اس کے ساتھ برابر تعاون کرتی رہی اس لیے گھر والوں سے بات چھپ گئی۔ بہرحال وہ دن آگیا جب نایاب یونیورسٹی آنے کے قابل ہوئی لیکن اس دوران یہاں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ ضمیر نے اس کی جگہ ایک اور ذہین لڑکی سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ نایاب اس کے لیے بیکار ہو چکی تھی کیونکہ طویل غیر حاضری کی وجہ سے اس کا ایک سمسٹر ڈراپ ہوگیا تھا اور ظاہر ہے ضمیر شاہ اس کے ساتھ پیچھے نہیں رہ سکتا تھا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس صورتِ حال میں نایاب کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ممکن تھا کہ وہ خودکشی کر لیتی لیکن کسی نے اسے ذہنی طور پر سہارا دیا اور سمجھایا کہ اس کی زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ وہ کسی بے وفا کی خاطر اسے کھو بیٹھے۔ شکر ہے کہ نایاب کو یہ بات سمجھ آگئی اور اس نے ایک بار پھر زندگی کی دوڑ میں حصہ لے لیا۔ اب وہ بظاہر پُرسکون لگتی ہے لیکن اس بات کا اندازہ تو آپ کو بھی ہوگا کہ وہ ضمیر شاہ سے کتنی نفرت کرتی ہوگی۔ یقیناً اسے قتل کر ڈالنے کی خواہش کی حد تک لیکن میرے خیال میں اس کے پاس اس کام کی ہمت اور مواقع دونوں ہی نہیں تھے۔'' اس پوری داستان کو سناتے ہوئے ثنا کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے، اب وہ ایلیٹ کلاس کی بے فکری و کھلنڈری حسینہ سے زیادہ ایک دردمند لڑکی نظر آرہی تھی۔

''تمہیں اس بارے میں اتنی تفصیلات کیسے معلوم ہیں؟ کیا نایاب تمہاری بہت قریبی دوست ہے؟'' شاہد کے دونوں سوالات فطری تھے کیونکہ ایک ایسی بات جو نایاب نے اپنے گھر والوں تک سے چھپائی تھی کسی عام کلاس فیلو کے علم میں بھلا کیسے ہوسکتی تھی۔

''ایک اتفاق کی وجہ سے مجھے یہ سب معلوم ہوا۔ اصل میں میری بڑی بہن ایک گائنا کولوجسٹ ہیں۔ نایاب اپنی کزن کے ساتھ پہلی بار ان کے کلینک پر آئی تو میں وہیں موجود تھی۔ میں نے اسے دیکھ لیا لیکن خود سامنے نہیں آئی۔ بعد میں مجھے باجی سے اس کی آمد کا مقصد معلوم ہوا تو میں جو اس کی ضمیر شاہ سے دوستی سے واقف تھی سارا معاملہ سمجھ گئی۔ باجی اس کیس کو لینے پر تیار نہیں تھیں لیکن میں نے ان سے سفارش کی۔ باجی کے ذریعے ہی مجھے دیگر تفصیلات بھی معلوم ہوتی رہیں۔ ادھر میں نایاب کی غیر موجودگی میں ضمیر کے رنگ ڈھنگ بھی دیکھ رہی تھی چنانچہ مجھے معلوم تھا کہ جب نایاب یونیورسٹی آئے گی تو اسے ایک اور دھچکا لگے گا۔ اس موقع پر میں نے اسے سنبھالنے کا فیصلہ کیا اور الحمدللہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہی۔ مجھے خوشی ہے کہ آج نایاب پہلے ہی کی طرح اپنا کیریئر بنانے پر توجہ دے رہی ہے اور اس نے ضمیر کے دیے زخم کو روگ نہیں بنایا۔''

''ان حالات کی روشنی میں تو تمہاری اور ضمیر کی دوستی بھی کچھ مشکوک لگتی ہے۔ آخر تم نے کیا سوچ کر اس شخص سے دوستی کی؟'' شاہد نے اسے کریدا۔

''اس دوستی کی وہی وجہ تھی جو آپ کی سمجھ میں آرہی ہو گی۔ میں ضمیر شاہ کی کمزوریوں کو سمجھ چکی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ جیسی دولت مند لڑکی کے جال میں پھنسے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ میری خاطر اس نے اس لڑکی سے بھی دوستی ترک کر دی جسے وہ نایاب کے بعد اپنے مطلب کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ یہ میری ایک بڑی کامیابی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ضمیر جیسا بھونرا صفت آدمی کسی اور کی مدد کے بغیر صرف اپنی محنت کے بل بوتے پر بھی اچھے نمبروں سے پاس نہیں ہوسکتا۔ میں اسے پابندی سے کلاسز بھی نہیں لینے دیتی تھی اس لیے اس کی کامیابی کے امکانات اور بھی کم ہوگئے تھے۔ میں نے اسے اطمینان دلا رکھا تھا کہ ماسٹرز کی ڈگری کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہے اور میں بغیر کسی ڈگری کے بھی اسے اپنے پاپا کے بزنس میں ایڈجسٹ کر سکتی ہوں۔ اس جیسے شخص کے لیے یہ آسرا بہت تھا اور مستقبل کے بڑے بڑے خواب دیکھتے ہوئے وہ اس بات کا پورا خیال رکھتا تھا کہ مجھے ہر طرح سے خوش رکھے۔ اس عرصے میں اس نے مجھے کئی قیمتی تحائف بھی دیے۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ پوری طرح میری گرفت میں ہے اور جب میں اسے جھٹکا دوں گی تو بہت زور کی چوٹ کھائے گا لیکن مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ میرا ارادہ فائنل ایگزام کے بعد یہ سب کرنے کا تھا تاکہ ڈگری حاصل نہ کر سکنے کی صورت میں وہ بالکل خالی ہاتھ ہو اور نایاب ہی کی طرح اسے شدید صدمہ سہنا پڑے۔ میں اس سے لڑکیوں کو اس طرح بے وقوف بنانے پر سبق چکھانا چاہتی تھی لیکن مجھے موقع ہی نہیں ملا اور وہ بے ضمیر نہ جانے کس وجہ سے اپنی جان دے بیٹھا۔ میرا آپ کو مشورہ ہے کہ ایسے بے غیرت آدمی کی موت کی تحقیقات کرنے کے بجائے معاشرے کو ایک ناسور سے نجات ملنے پر سکھ کا سانس لیں۔ ایسے لوگوں کا دنیا میں نہ ہونا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' ثنا کی آنکھوں میں ضمیر کے لیے نفرت تھی۔

”سوری مس ثنا! میں آپ کے مشورے پر عمل نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی ڈیوٹی انجام دینی ہوگی۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ جہاں آپ نے مجھ سے اتنا تعاون کیا وہاں تھوڑا تعاون اور کریں اور نایاب کے ساتھ ساتھ کسی ایسے لڑکے سے بھی ملاقات کروادیں جس سے ضمیر کی دوستی رہی ہو۔ آخر وہ لڑکوں سے بھی تو دوستی کرتا ہوگا۔“ شاہد نے نہایت سنجیدگی سے کہا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

”میری خواہش تو یہی تھی کہ آپ نایاب کو نہ چھیڑیں لیکن اگر یہ آپ کی مجبوری ہے تو میں اسے آپ سے ملوا دیتی ہوں بس اتنی درخواست ہے کہ ذرا احتیاط سے کام لیجیے گا۔ اس کے زخم ابھی پوری طرح بھرے نہیں ہیں، آپ کے زیادہ کریدنے پر مزید ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔ رہی ضمیر کے کسی میل فرینڈ کی بات تو اس سلسلے میں آپ اسد سے مل لیں۔ پورے ڈپارٹمنٹ میں وہی ضمیر کے سب سے زیادہ قریب تھا۔“

”تھینکیو۔“ شاہد نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی دیر بعد اداس آنکھوں والی نایاب اس کے سامنے بیٹھی تھی جبکہ ثنا کو اس نے اس ملاقات میں شامل نہیں رکھا تھا کہ اس کی موجودگی کے باعث نایاب کوئی اہم بات بتانے سے گریز کرے۔ نایاب سے اس نے تقریباً گھنٹا بھر گفتگو کی لیکن ان ساری باتوں کے سوا جو اسے ثنا سے معلوم ہوئی تھیں کچھ بھی معلوم کرنے میں ناکام رہا۔ اب اسے اگلی ملاقات اسد سے کرنی تھی لیکن اس ملاقات کے لیے اس نے یونیورسٹی کے بجائے تھانے کو زیادہ مناسب سمجھا اور اسد کو وہاں بلوا بھیجا۔ یہ ملاقات اسے اگلے دن کرنی تھی۔ البتہ اس نے نوشین سے اسی روز رابطہ کرنا ضروری سمجھا۔ کسی پیشہ ورانہ ضرورت کے تحت نہیں بلکہ بات کرنے کا بہانہ میسر آجانے پر اپنے دل کے اکسانے پر۔

”ضمیر میں خامیاں ہیں یہ تو میں بھی جانتی تھی لیکن وہ اس حد تک گرا ہوا انسان ہوگا اس بات کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ نایاب والا قصہ شاہد کی زبانی سننے کے بعد نوشین نے دل گرفتگی سے تبصرہ کیا۔ ظاہر ہے وہ ضمیر سے محبت کی دعوے دار تھی اور اس کے بارے میں ایسی بات سن کر اسے صدمہ پہنچا تھا۔

”میں تمہیں تکلیف سے بچانے کے لیے شاید یہ سب کچھ نہ بتاتا لیکن پھر یہ سوچ کر بتانے کا فیصلہ کرلیا کہ تم ضمیر شاہ کی موت کے غم میں مبتلا رہنے کے بجائے اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم ایک ایسے شخص کے جال میں پھنسی ہونے کے باوجود جس کا کردار بے حد گھناؤنا تھا محفوظ رہیں۔“ شاہد نے اسے دل گرفتگی سے نکالنے کی کوشش کی۔ پتا نہیں کیوں فون پر سنائی دیتی نوشین کی اداس آواز اسے تکلیف دے رہی تھی۔

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے محفوظ رہنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں نایاب کی طرح کوئی نادان طالبہ نہیں بلکہ مردوں کے درمیان نوکری کرنے والی ایک تجربہ کار لڑکی ہوں جس نے کبھی ضمیر کو ایسا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ بہر حال میں اللہ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے محفوظ رکھا۔“ اس بار وہ خاصی سنبھلی ہوئی تھی۔

”میں نے ضمیر کے کیس پر کام جاری رکھا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں مزید انکشافات سامنے آئے تو تمہارے علم میں ضرور لاؤں گا۔“ شاہد نے اگلے رابطے کی داغ بیل ڈالی۔

”نہیں، میں اس کے بارے میں اب مزید کچھ نہیں جاننا چاہتی اور آپ کو بھی اس پابندی سے آزاد کرتی ہوں۔ آپ میرے کہنے پر اس کیس پر کام کر رہے تھے چنانچہ اب چاہیں تو پہلے ہی کی طرح اسے بند کر سکتے ہیں۔“ موجودہ حالات میں نوشین ایسی ہی بات کہہ سکتی تھی۔ ایک بدکردار آدمی سے محبت کی غلطی کر بیٹھنے والی لڑکی کے پاس کہنے کو اب رہ بھی کیا گیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن کبھی کبھار تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے تو فون کر سکتا ہوں نا؟“ شاہد کے دل کی بات کسی طور اس کی زبان پر آہی گئی۔

”کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ضمیر کی حقیقت پوری طرح کھل جانے پر میں مایوسیوں میں ڈوب جاؤں گی؟ ایسا بالکل نہیں ہے شاہد صاحب۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ میں اپنی زندگی کے اس بُرے تجربے کو بھی اپنے لیے ایک سبق سمجھ کر پوری ہمت سے آگے کا سفر جاری رکھوں گی۔“ نوشین اس کی دلی کیفیت کو سمجھ نہیں سکی تھی چنانچہ اسے اپنی طرف سے تسلی دے رہی تھی۔

”میں تم سے صرف اس لیے رابطے میں رہنا چاہتا ہوں نوشین کہ تم زندگی میں بُرے تجربات کے ساتھ کچھ خوش گوار تجربات بھی حاصل کر سکو۔ کیا تمہیں اس بات پر اعتراض ہے؟“ شاہد کا لہجہ یکسر بدل گیا تھا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ نوشین کی آواز ذرا سی لرزی۔ مرد کے بدلتے لہجے کو پہچاننے کی عورت خوب صلاحیت رکھتی ہے۔

"دھیرے دھیرے مطلب بھی سمجھ آجائے گا، پہلے رابطے میں رہنے کی ہامی تو بھرو۔" وہ ذرا شوخ ہوا۔

"پولیس والوں کو انکار کرنے کی جرأت کون کرسکتا ہے۔ آپ تو ہمیں زبردستی گرفتار بھی کرسکتے ہیں۔" اس بار نوشین کا لہجہ بھی ہلکا پھلکا تھا۔ اس کے جملے کے اختتام پر اس کی اور شاہد کی ایک ساتھ ابھرنے والی ہنسی کی آواز نے اعلان کیا کہ ایک اور کہانی جنم لینے کو ہے۔

☆☆☆

"وہ مجھ سے کافی قریب تھا۔ آپ مجھے اس کا اچھا دوست بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یقین جانیے کہ میں ایسی کسی بات سے واقف نہیں جسے اس کی خودکشی کی وجہ قرار دیا جا سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ ہمیشہ سے زیادہ خوش اور ہشاش بشاش رہنے لگا تھا اور اسے جاننے والا کوئی شخص تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ یوں اچانک خودکشی کرلے گا۔ میں تو ابھی تک غیر یقینی کی کیفیت کا شکار ہوں کہ اس کی خودکشی کی کیا وجہ ہے؟" ضمیر شاہ کا کلاس فیلو اسد اس کے سامنے بیٹھا بتا رہا تھا۔ اسے ایک سپاہی بھیج کر تھانے بلوایا گیا تھا اور وہ اپنے اس بلاوے پر کچھ پریشان بھی نظر آرہا تھا۔ وہ ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد واپڈا میں ملازم تھے اور وہ اپنے چار بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس طرح کے فیملی بیک گراؤنڈ رکھنے والے نوجوان کو اگر اچانک تھانے بلایا جائے تو اس کا پریشان ہونا ایک فطری سی بات تھی۔

"کردار کے حوالے سے ضمیر شاہ کیسا شخص تھا؟" اس سوال کے جواب میں اسد کے چہرے پر تذبذب کے آثار دکھائی دیے۔

"دیکھیں سر، لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے کی برائی نہیں کرنی چاہیے اور میرا تو وہ دوست تھا اس لیے مجھے اس کے کردار کے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے اچھا نہیں لگے گا۔"

"اخلاقیات کو چھوڑو، تم سے جو پوچھا گیا ہے اس کا صاف صاف جواب دو۔" شاہد نے لہجے میں سختی سموئی۔

"وہ بہت خوش مزاج، گفتگو کے فن میں ماہر اور خوش پوش لڑکا تھا لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے دوسروں کو استعمال کرنے یا شارٹ کٹ کو برا نہیں سمجھتا تھا۔ خاص طور پر وہ لڑکیوں کو بہت آسانی سے بے وقوف بنا لیتا تھا اور لڑکیاں اس کی محبت کے جال میں پھنس کر اس کی ہر جائز و ناجائز بات ماننے کے لیے تیار ہو جاتی تھیں۔" اسد نے اب بھی خاصے مہذب انداز میں ضمیر شاہ کے کردار کو بیان کیا تھا۔ تفصیلات سے شاہد پہلے ہی واقف تھا اس لیے مزید کریدنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"تم نے بتایا کہ اپنے آخری دنوں میں ضمیر بہت خوش رہنے لگا تھا اس کی کیا وجہ تھی؟"

"اس کی وجہ بھی ایک لڑکی ہی تھی سر۔ اس دولت مند لڑکی سے دوستی ہونے کے بعد وہ سوچا کرتا تھا کہ اسے دولت کے حصول کا شارٹ کٹ مل گیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق اس نے اس لڑکی کو پوری طرح اپنی محبت کے جال میں پھانس لیا تھا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس سے شادی کر کے بہت امیر بننے والا تھا۔" اس نے جھکی نظروں سے بتایا۔

"وہ دولت مند لڑکی کہیں ثنا سراج تو نہیں تھی؟" شاہد نے تصدیق چاہی تو وہ حیران رہ گیا۔

"جی سر، بالکل ٹھیک نام لیا آپ نے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ اگر ثنا کسی وجہ سے اسے دھتکار دیتی تو کیا وہ اس صدمے سے خودکشی کرسکتا تھا؟" شاہد نے ایک نیا اندازہ قائم کرنا چاہا۔

"بالکل نہیں سر۔ اول تو وہ خودکشی کرنے والا آدمی ہی نہیں تھا۔ دوسرے ثنا کے دھتکار دینے سے اسے صرف اتنا فرق پڑتا کہ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ کسی اور دولت مند لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کرتا۔ ثنا سے اسے سچ مچ محبت تو تھی نہیں کہ اس کی بے وفائی کو دل سے لگا لیتا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ایسا کوئی مسئلہ ہے بھی نہیں۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے وہ ثنا سے ملا تھا اور معمول کے مطابق ان دونوں نے تقریباً سارا دن ساتھ ہی گزارا تھا۔ یونیورسٹی سے نکلتے وقت میری ضمیر سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا رخصت ہوا تھا اور اس کے تاثرات میں کسی قسم کی ناخوش گواریت نہیں تھی۔"

اسد نے فوراً ہی اس کے اندازے کی تردید کردی۔

"کیا تم ایسے کسی شخص سے واقف ہو جس سے ضمیر شاہ کی دشمنی یا کسی قسم کا جھگڑا ہو؟" اس کیس میں شاہد کو ابھی تک کچھ حاصل نہیں ہوا تھا اور وہ ہنوز یہ جاننے میں ناکام تھا کہ ضمیر شاہ نے خودکشی کی تھی تو آخر اس کی کیا وجہ تھی۔ خودکشی کرنے والے..... اتنے پُراسرار طریقے سے موت کو گلے نہیں لگاتے۔ عموماً تو ایسا ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے کوئی خط وغیرہ لکھ کر مرتے ہیں تاکہ دنیا کو معلوم ہوسکے کہ وہ اس دنیا

کو کیوں ٹھکرا کر جا رہے ہیں۔ بالفرض اگر ایسا نہ بھی ہو تو ان کے متعلقین کو خودکشی کی وجہ کا کچھ نہ کچھ علم ضرور ہوتا ہے لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ ہر شخص بے یقینی کا شکار تھا اور یہی کہتا تھا کہ ضمیر شاہ خودکشی کرنے والا بندہ نہیں ہے۔ اسے اس کیس پر کام کرنے کے لیے آمادہ کرنے والی نوشین نے بھی یہی کہا تھا۔ بعد میں نوشین نے اسے اس کیس پر کام کرنے سے منع کر دیا تھا لیکن بطور پولیس انسپکٹر شاہد کی رگِ تجسس پھڑک اٹھی تھی اور اب وہ اپنے تجسس کو دور کیے بغیر اس کیس کو بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسد سے ایک ایسا سوال کیا جو اس سے پہلے کسی اور سے نہیں کیا تھا۔

''دشمنی تو نہیں کہہ سکتے۔'' اسد نے ذرا سوچنے والے انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ ''البتہ رقم کے سلسلے میں اس کا یونیورسٹی کے ہی ہاشم نامی ایک لڑکے سے کچھ مسئلہ چل رہا تھا۔ ہاشم ان لڑکوں میں سے ہے جو پڑھنے لکھنے سے زیادہ ہلڑبازی میں وقت گزارتے ہیں۔ اس کا ایک سیاسی جماعت سے بھی تعلق ہے اس لیے دوسرے لڑکوں سے ذرا غنڈہ گردی سے پیش آتا ہے۔ ضمیر کا اس سے ملنا جلنا تھا اور کچھ عرصہ پہلے اس نے ہاشم سے کچھ رقم ادھار لی تھی۔ ہاشم اس سے رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا لیکن ضمیر بڑی خوب صورتی سے بہانے بنا کر اسے ٹال دیتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق ابھی تک ہاشم نے رقم کی واپسی کے سلسلے میں ایسا کوئی سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا جس سے ضمیر کے ذہن پر بوجھ پڑتا اور وہ خودکشی کے متعلق سوچتا۔''

''تمہیں کچھ معلوم ہے کہ ضمیر نے ہاشم سے کتنی رقم قرض لی تھی؟'' شاہد نے اس نئے پہلو میں دلچسپی لی۔

''صحیح فگر تو یاد نہیں لیکن جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے دس پندرہ ہزار سے زیادہ کی رقم نہیں تھی۔''

اس کے جواب نے واضح کر دیا کہ خودکشی کا سبب قرض نہیں ہو سکتا۔ اتنی معمولی رقم کے لیے ضمیر کو خودکشی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا اور اس کی کئی ایسی دوستیں تھیں جن کی مدد سے وہ یہ معمولی رقم آسانی سے ادا کر سکتا تھا۔

''اوکے مسٹر اسد! آپ کے تعاون کا شکریہ۔ ویسے تو ضرورت نہیں لیکن میں امید کرتا ہوں کہ اگر مجھے دوبارہ آپ کی ضرورت پڑی تو آپ اسی طرح تعاون کریں گے۔''

شاہد نے اسد کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے بہت انکساری سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی پولیس والا اتنے اخلاق سے بھی پیش آ سکتا ہے اور وہ تھانے میں آنے کے بعد بھی بہ خیروعافیت واپس جا رہا ہے۔

اسد کو رخصت کرنے کے بعد شاہد ایک بار پھر اس کیس کی کڑیاں جوڑنے لگا۔ ایک جوان لڑکے نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کر لی تھی اور کہیں سے اس کی خودکشی کی وجہ معلوم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جن لوگوں کے ساتھ رہتا تھا ان پر اس نے اپنی شخصیت کا اچھا تاثر قائم کر رکھا تھا شاید اس لیے کہ کہیں اس کے ہاتھ سے یہ اچھا اور سستا ٹھکانا نکل نہ جائے۔ البتہ اس کی کولیگ اور کلاس فیلوز نے اس کی شخصیت کے کمزور پہلو ضرور بیان کیے تھے جن کے مطابق وہ اچھے کردار کا مالک نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی اچھی شخصیت اور چرب زبانی کی بنا پر لوگوں میں مقبول تھا۔ نوشین سے ملنے والے لاکٹ نے اسے کسی حد تک چور بھی ثابت کیا تھا لیکن اس پر اس چوری کا شک نہیں کیا گیا تھا اور بے چاری غریب ملازمہ رجو شک کی زد میں آ گئی تھی۔ اسد سے بات کر کے اسے ایک نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ ضمیر، ہاشم نامی ایک غنڈے طالب علم کا مقروض تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی شاہد کو یاد آیا کہ اس نے ضمیر کے دائیں رخسار پر مندمل ہوتے ایک زخم کا نشانہ دیکھا تھا جس کے متعلق اس نے رافعہ اور پروفیسر کو بتایا تھا کہ اس کا بس میں چند لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ چوٹ آئی تھی۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ اس سے جھگڑا کرنے والے لڑکے ہاشم اور اس کے ساتھی رہے ہوں اور ہاشم نے اپنی رقم واپس نہ ملنے پر اسے یہ زک پہنچائی ہو۔ جھگڑا یونیورسٹی سے باہر ہوا تھا۔ اس لیے اسد لاعلم رہا۔ اس زاویے سے سوچنے پر اسے ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ہاشم سے بھی ایک ملاقات کر لی جائے۔

وہ اس سلسلے میں اے ایس آئی کو بلا کر ہدایات دے رہا تھا کہ ایک سپاہی درمیانے سائز کا ایک پیکٹ لے کر اس کے کمرے میں آیا۔ اے ایس آئی کو فارغ کر کے وہ سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ پیکٹ کسی ثنا سراج کا ڈرائیور لے کر آیا ہے۔ ڈرائیور کو ہم نے باہر روکا ہوا ہے اگر آپ کہیں تو اسے اندر بلایا جائے؟'' پیکٹ اس کی میز پر رکھ کر سپاہی نے دریافت کیا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈرائیور کو جانے دو۔'' اس نے سپاہی کو حکم دیا تو وہ باہر نکل گیا۔ خود شاہد پیکٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پیکٹ میں سے ایک لیڈیز پرفیوم، نگینے جڑی خوب صورت سی رسٹ واچ، مہنگی میک اپ کٹ کے علاوہ دو سونے کی چیزیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے ایک تو چھوٹے سائز کی لیکن بھاری بالیوں کی جوڑی تھی جبکہ

دوسری موٹی سی سونے کی زنجیر۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ رافعہ کا جو لاکٹ اسے نوشین کے پاس سے ملا تھا اس کے بارے میں رافعہ اور پروفیسر کامران کا دعویٰ تھا کہ لاکٹ سونے کی ایک بھاری زنجیر میں ڈلا ہوا تھا اور اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ضمیر نے لاکٹ نوشین کو جبکہ زنجیر شنا کو گفٹ کر دی تھی۔ اصل میں پیکٹ میں سے برآمد ہونے والی اشیا وہ گفٹس تھے جو ضمیر نے وقتاً فوقتاً شنا کو دیے تھے اور شنا نے اس کے کہنے پر اپنے ڈرائیور کے ذریعے تھانے بھجوا دیے تھے۔ شاہد کو مناسب معلوم ہوا کہ سونے کی اشیا کے بارے میں پروفیسر اور رافعہ سے تصدیق کر لے۔ یہ سوچتے ہوئے ہی اس نے پروفیسر کا نمبر ڈائل کیا۔

''اوہو انسپکٹر شاہد! بڑے خاص موقع پر فون کیا تم نے۔ میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔'' پروفیسر کامران بہت خوش معلوم ہوتے تھے چنانچہ اس کے فون کرنے کا مقصد پوچھے بغیر اپنی ہی کہنے لگے۔

''خوش خبری ہے تو جلدی سے سنا ڈالیے سر۔ ہم پولیس والوں کو اچھی خبریں ذرا کم ہی ملتی ہیں۔'' شاہد کو کچھ کچھ اندازہ تھا چنانچہ خود بھی خوش گوار لہجے میں بولا۔

''ارے بھئی، ہم ایک عدد برخوردار کے والد بن گئے ہیں۔'' پروفیسر نے کھلکھلاتی آواز میں جو خبر سنائی وہ شاہد کے اندازے کے مطابق ہی تھی۔ وہ رافعہ کی کنڈیشن دیکھ چکا تھا اس لیے اسی قسم کی خبر کی امید کر رہا تھا۔

''بہت بہت مبارک ہو سر، اس خبر پر تو مٹھائی پکی ہے۔'' اس نے پروفیسر کی خوشی میں حصہ لیا۔

''مٹھائی کیا بھئی، زبردست دعوت کریں گے۔ ذرا رافعہ اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آ جائے۔'' ان کا جوش و خروش عروج پر تھا۔

''یہ تو اور بھی اچھا رہے گا۔ اس بہانے مجھے آپ کی خوشی میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے پرانے جاننے والوں سے بھی ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ بس آپ دعوت دینا مت بھول لیے گا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یار، تم جیسے تعاون کرنے والے شخص کو بھلا کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔'' پروفیسر کامران نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا پھر خیال آنے پر بولے۔ ''ارے مجھے تو پوچھنے کا خیال ہی نہیں رہا کہ تم نے کس لیے فون کیا تھا۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''جی سر! سب خیریت ہے۔ مجھے گولڈ کی کچھ چیزیں ملی تھیں تو سوچ رہا تھا کہ ایک نظر آپ کو اور رافعہ کو دکھا لوں کہ کہیں یہ اشیا بھی تو رافعہ کی گمشدہ زیورات میں شامل نہیں ہیں۔'' موقع ملنے پر شاہد نے فوراً اپنا مدعا بیان کیا۔

''اچھا.... !'' پروفیسر نے ایک پُرسوچ ہنکارا بھرا اور بولے۔ ''رافعہ تو اسپتال میں ایڈمٹ ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں تھانے آ کر وہ چیزیں دیکھ لوں۔ رافعہ جس اسپتال میں ایڈمٹ ہے تمہارا تھانہ اس کے قریب ہی ہے۔ میں کچھ دیر بعد اسپتال کے لیے نکلنے والا ہوں چنانچہ تمہارے پاس بھی آ جاؤں گا۔''

''بہت شکریہ سر، میں آپ کا ممنون ہوں گا۔'' شاہد نے ان سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ آج اس کی ایسی کوئی مصروفیت نہیں تھی اس لیے وہ اطمینان سے پروفیسر کا انتظار کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے لیے چائے منگوائی اور ایک دوسرے کیس کی فائل دیکھنے لگا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد اسے پروفیسر کی آمد کی اطلاع ملی۔

''آیئے سر! تشریف رکھیے۔'' شاہد نے اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور ایک بار پھر بیٹے کی مبارک باد دیتے ہوئے رافعہ کی خیریت پوچھی۔

''رافعہ بھی ٹھیک ہے۔ تھوڑی کمزوری ہے، وہ تو وقت کے ساتھ ساتھ دور ہو جائے گی۔'' پروفیسر کامران نے اسے آگاہ کیا۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک الوہی سی چمک تھی اور شاہد کو ان کا یہ روپ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''آپ کو خوش دیکھ کر بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے سر۔ اگر میرے علم میں پہلے سے ہوتا تو آپ کو اس موقع پر ڈسٹرب نہ کرتا۔'' شاہد نے ان سے رسمی معذرت کی۔

''ارے نہیں بھائی کوئی زحمت وحمت نہیں ہوئی۔ تم بھی تو اپنا فرض ہی ادا کر رہے ہو اور سچ پوچھو تو اس وقت میں اتنا خوش ہوں کہ کوئی بھی کام مشکل نہیں لگ رہا۔ خود کو کسی بیس سالہ جوان کی طرح فٹ محسوس کر رہا ہوں۔ میری مانو تو تم بھی گزرے ہوئے حادثے کو بھول کر دوبارہ گھر بسا لو۔ اچھی بیوی مل جائے تو آدمی کی زندگی سنور جاتی ہے اور باپ بننے کے بعد تو ایسی مسرت ملتی ہے جس کا کوئی بدل ہی نہیں ہے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ شادی شدہ زندگی کی الجھنوں اور ذمے داریوں میں گھر جانے کے ڈر سے ایک عرصہ تجرد کی زندگی میں گزارا لیکن سچ کہوں کہ رافعہ سے شادی کے بعد ان چھ سالوں میں اتنا سکھ پایا ہے کہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ اسی لیے تم کو بھی مشورہ دے رہا ہوں کہ اب اور دیر مت کرو اور شادی کر لو۔'' وہ بہت خوش گوار موڈ میں اسے مشورہ دے رہے تھے۔

کیا ہم اسی منحوس مینار کی تلاش میں نکلے تھے؟

''آپ کا مشورہ بالکل ٹھیک ہے سر، امی بھی مجھ پر خاصا زور دے رہی ہیں اور میں بھی سوچ رہا ہوں کہ دوبارہ گھر آباد کرلوں۔ بس آپ دعا کیجیے گا کہ مجھے بھی رافعہ کی طرح کسی سکھ پہنچانے والی ساتھی کا ساتھ مل جائے۔'' پروفیسر سے یہ بات کہتے ہوئے شاہد کے سامنے نوشین کی تصویر لہرا رہی تھی۔ اسے وہ ذمے داری مسائل میں گھری لڑکی سچ مچ بہت اچھی لگی تھی۔

''انشاء اللہ ضرور ملے گی میاں، تم ہمت کر کے قدم تو آگے بڑھاؤ۔'' پروفیسر کامران نے اسے حوصلہ دیا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ ''لاؤ بھئی اب وہ کام بھی نمٹا ہی لیں جس کے لیے یہاں تک آئے ہیں۔ یہاں سے گھر جا کر تھوڑی دیر ریسٹ کروں گا پھر رات کو دوبارہ رافعہ سے ملنے اور اسے کچھ ضروری سامان پہنچانے اسپتال آنا ہے۔ اسپتال اچھا ہے لیکن نظم و نسق کافی سخت ہے۔ ملاقات کے اوقات کے علاوہ کسی کو مریض کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے ہیں۔''

''جی سر، ابھی دکھاتا ہوں۔'' شاہد نے اپنی میز کی دراز کھول کر پیکٹ نکالا۔ ''رافعہ کو کب تک ایڈمٹ رہنا ہو گا؟'' پیکٹ کھول کر اس میں سے اپنی مطلوبہ اشیا نکالتے ہوئے اس نے یونہی پوچھ لیا۔

''تین چار دن تو مزید لگیں گے۔ وہاں اس کی اچھی کیئر ہو رہی ہے اس لیے اچھا ہے کہ ابھی وہیں رہے، میرے گھر میں تو تمہیں معلوم ہے کہ کوئی خاتون ہے نہیں جو اس طرح کی ذمے داریاں اٹھا سکے۔ خود میں نے پندرہ دن کی چھٹی لے لی ہے اور ایک مستقل ملازمہ کا بندوبست کر دیا ہے۔'' پروفیسر نے اسے جواب دیا۔

''میں اپنی والدہ کو رافعہ سے ملوانے لاؤں گا۔ وہ دو چار مفید مشورے دے دیں گی۔ آپ مجھے اسپتال میں ملاقات کے اوقات بتا دیں۔'' بالیاں اور زنجیر پروفیسر صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے بڑے خلوص سے کہا لیکن اب ان کی توجہ اس کی باتوں سے زیادہ اپنے سامنے دھری اشیا پر تھی۔

''یہ تو واقعی رافعہ کی جیولری ہے۔ تمہیں یہ کہاں سے ملی؟'' شناخت کا مرحلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے حیرت سے دریافت کیا۔

''پہلے ہی کی طرح ضمیر شاہ کی ایک فیمیل فرینڈ کے پاس سے۔ اس لڑکی کو بھی ضمیر نے یہ چیزیں گفٹ میں دی تھیں۔'' شاہد نے بتایا۔

''اوہ میرے خدایا! اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ ضمیر ہی تھا جو ہمارے گھر سے مسلسل چیزیں چوری کر رہا تھا لیکن ہم اس کی ظاہری شرافت سے دھوکا کھا گئے اور غریب رجو پر خوامخواہ شک کیا۔'' پروفیسر کامران نے افسوس سے اپنا سر تھام لیا۔

''سچ یہی ہے سر، میں نے اب تک ضمیر شاہ کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان سے وہ ایک خودغرض، دھوکے باز اور بدکردار شخص ثابت ہوتا ہے اور میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس نے ایک اچھی اور آرام دہ رہائش گاہ کی خاطر بھی آپ لوگوں پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہونے دی اور بظاہر نیک اور شریف بنا رہا لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ چور چوری سے جاتا ہے پر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ چنانچہ وہ بھی خاموشی سے اپنی فطرت کا رنگ دکھاتا رہا اور اتنی چالاکی سے آپ کے گھر میں نقب لگائی کہ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔'' شاہد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ان ساری باتوں سے اس کی خودکشی کا مسئلہ تو حل نہیں ہوتا۔ یہ سوال تو اب بھی اپنی جگہ ہے کہ اس نے خودکشی کیوں کی؟''

"یہ بھی معلوم ہو ہی جائے گا۔ آپ اس سلسلے میں فکرمند مت ہوں۔ خود کو یہ سوچ کر ریلیکس رکھیں کہ بُرے کام کرنے والوں کا بُرا ہی انجام ہوتا ہے اور ضمیر شاہ اپنے اس بُرے انجام تک پہنچ گیا۔" اسے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں پروفیسر کا بی پی نہ بڑھ جائے اس لیے انہیں سمجھانے لگا۔ رخصت کرنے سے قبل اس نے انہیں فریش جوس بھی منگوا کر پلایا تاکہ ان کی طبیعت بحال رہے۔

"اس کیس کے حل ہو جانے کے بعد میں ضروری کارروائی کر کے رافعہ کی تمام چیزیں آپ کے حوالے کر دوں گا۔ آپ ایسا کیجیے کہ گمشدہ زیورات کی ایک فہرست مجھے دے دیجیے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان میں سے کچھ چیزیں اس نے مارکیٹ میں بیچ کر نقد رقم حاصل کر لی ہوگی۔" پروفیسر کو رخصت کرتے ہوئے اس نے ان سے کہا۔

"فہرست تو رافعہ ہی اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد بنا سکتی ہے۔ ویسے بھی ہمیں ان چیزوں کے ملنے یا نہ ملنے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ اپنی طرف سے تو ہم ان زیورات پر فاتحہ ہی پڑھ چکے تھے۔ اصل چیز ہوتی ہے آدمی کا آدمی پر اعتبار۔ اس معاملے نے اس اعتبار کو بہت دھچکا لگایا ہے۔" پروفیسر نے دل گرفتگی سے جواب دیا اور اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

"تو تمہارا نام ہاشم ہے۔" اس نے اپنے سامنے موجود پچیس چھبیس سالہ لڑکے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز کے اوپر سیاہ رنگ کی ایسی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر بالی وڈ کی ایک اداکارہ کی کچھ بے باک سی تصویر پرنٹ تھی۔ چہرے مہرے سے وہ سخت مزاج لگتا تھا اور اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ اپنی عمر سے بھی زیادہ تجربہ کار ہے۔ تھانے میں اپنی موجودگی کے باوجود قطعی خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا اور بڑے اطمینان سے اپنی بائیں کلائی میں پڑی سلور زنجیر کو دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے گھما رہا تھا۔

"آپ نے نام پتا اچھی طرح معلوم کرنے کے بعد ہی مجھے یہاں بلوایا ہوگا۔" شاہد کے سوال کا سیدھی طرح جواب دینے کے بجائے اس نے سرکش سے لہجے میں جواب دیا۔ جواب میں شاہد کا ہاتھ زور سے گھوما اور ہاشم کے بائیں رخسار پر انگلیوں کے نشانات چھپ گئے۔

"آپ..... میرا جرم بتائے بغیر مجھ پر اس طرح تشدد نہیں کر سکتے۔ میرا وکیل تھانے پہنچ جائے تو پھر آپ مجھ سے بات کیجیے گا۔" اپنے رخسار پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے شاہد کو تنبیہ کی۔ اسے یونیورسٹی سے تھانے بلوایا گیا تھا اس لیے لازم تھا کہ اس کے ساتھیوں کے ذریعے ان لوگوں تک یہ خبر پہنچ گئی ہوگی جو اس کی سرپرستی کرتے تھے اسی لیے وہ اپنے وکیل کے تھانے پہنچنے کے سلسلے میں پُریقین تھا۔

"یہ تھپڑ میں نے تمہیں گستاخ لہجے کی وجہ سے لگایا ہے۔ اب اگر تم مزید اپنی درگت نہیں بنوانا چاہتے تو شرافت سے میرے سوالوں کے جواب دیتے چلے جاؤ۔ فی الحال میں تمہارے کرمنل ریکارڈ کو چھیڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں اور نہ ہی آئے دن یونیورسٹی میں بپا کیے جانے والے دنگا فساد کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ شرافت سے میرے ساتھ تعاون کرو۔" شاہد کے سرد لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ سرکش ہاشم ذرا دبا ہوا نظر آنے لگا۔ یوں بھی اب وہ الجھن کا شکار تھا کہ اگر اسے اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کے حوالے سے یہاں نہیں بلوایا گیا ہے تو اس بُلاوے کا مقصد کیا ہے۔

"ضمیر شاہ نے تم سے کتنی رقم ادھار لی تھی؟" اس کی آنکھوں میں آمادگی پا کر شاہد نے سوال کیا۔

"پندرہ ہزار روپے لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ہاشم نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے پندرہ ہزار کا جس انداز میں ذکر کیا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اس کے لیے ایسی کوئی خاص بڑی رقم نہیں تھی۔

"سنا ہے تم اس رقم کی واپسی کے لیے اس پر دباؤ ڈال رہے تھے؟" شاہد نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

"ایک آدھ بار یاددہانی ضرور کروائی تھی لیکن کوئی خاص زور نہیں دیا تھا۔ اگر میں اپنی رقم واپس لینا چاہتا تو اس کے حلق سے بھی کھینچ کر نکلوا سکتا تھا۔" اس نے ایسی بے نیازی سے جواب دیا جس میں سچائی تھی۔

"پھر اس کی موت سے چند روز قبل اس کے ساتھ مار پیٹ کیوں کی گئی تھی۔ مرتے وقت بھی اس کے گال پر چوٹ کا وہ نشان تھا جو اس مار پیٹ کے نتیجے میں اسے لگی تھی۔" شاہد مستقل اندازوں سے کام لے رہا تھا۔

"کیسی مار پیٹ؟ آپ کو کسی نے غلط انفارمیشن دی ہے۔" ہاشم کے لہجے میں حقیقی حیرت تھی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنی دی ہوئی رقم واپس نہ کرنے کی صورت میں تم اس پر کسی غیرقانونی کام کے لیے زور ڈال رہے ہو اور اس نے دباؤ میں آ کر خودکشی کر لی

بے ضمیر

ہو؟'' اپنے ذہن میں اچانک آنے والے ایک خیال کے مطابق اس نے کڑے لہجے میں ہاشم سے پوچھا جس پر ہاشم نے بے ساختہ ہی ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔

''اس چوہے سے میں کیا غیر قانونی کام کروا سکتا تھا بھلا۔ وہ تو بس لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہنے کے لائق تھا... میں اور میرے ساتھی جو کچھ کرتے ہیں' کھلے عام کرتے ہیں۔ ہمارا کوئی منشیات کا دھندا نہیں ہے جو ضمیر جیسے بندوں سے کام لینے کی ضرورت پڑے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں سامنے آکر دھاک بٹھانے کے لیے کرتے ہیں اور یہ جو آپ نے الزام لگایا ہے نا کہ میرے ساتھیوں کی مار پیٹ سے اس کا ایک گال زخمی ہو گیا تھا تو یہ بھی بالکل بودا ہے۔ میں اور میرے ساتھی جب کسی کی پھینٹی لگاتے ہیں نا تو بات ایک آدھ زخم پر نہیں ٹلتی۔ ہم کم سے کم بھی بندے کی تین چار ہڈیاں توڑ کر چھوڑتے ہیں۔'' وہ ضرورت سے زیادہ بے باک تھا اور اس بے باکی میں ہی اس کی سچائی بھی جھلک رہی تھی۔ شاہد کو محسوس ہونے لگا کہ اس نے بیکار میں ہی اس لڑکے کو بلوایا ہے۔ ضمیر شاہ کے کیس میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی اور یونیورسٹی میں وہ جو بھی غنڈا گردی کرتا تھا اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ اس سلسلے میں اس کے پاس کسی طرف سے کوئی شکایت نہیں آئی تھی۔

''سر! ایڈووکیٹ بابر رانا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ ہاشم سے اگلے سوال کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سنتری نے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر ہاشم کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ شاہد خود بابر رانا سے اچھی طرح واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ اس سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے کیسز پر ہی کام کرتا ہے جس کی طلبا تنظیم سے ہاشم وابستہ تھا۔ اس نے سپاہی کو پہلے ہاشم کو وہاں سے لے جانے کا اشارہ کیا پھر بابر رانا کو اپنے کمرے میں لانے کی اجازت دی۔

''اوہو انسپکٹر شاہد سلیم! مجھے یقین ہے کہ پھر تو ہاشم رضا کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہی گرفتار کیا گیا ہوگا۔'' اسے سامنے دیکھ کر بابر رانا نے ایسا لہجہ اختیار کیا جیسے اسے شاہد کو سامنے پا کر حیرت ہوئی ہو لیکن شاہد جانتا تھا کہ وہ یہاں آنے سے قبل تھانے سے متعلق ساری معلومات کر کے ہی آیا ہوگا۔ بہرحال اسے رانا سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لیے خود بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ کی آمد سے تو یہ لگتا ہے کہ ہم نے کسی خاص ہستی کو اپنے تھانے میں بلوانے کی غلطی کر لی ہے بہرحال آپ بے فکر رہیں لڑکے کو اریسٹ نہیں کیا گیا ہے بلکہ چند معلومات کے حصول کے لیے یہاں بلوایا گیا تھا۔'' ہاتھ کے اشارے سے بابر رانا کو بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے وہ فوراً ہی ایک سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔

''رانا صاحب کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرو بھئی۔ اتنے عرصے بعد تو ان سے ملاقات ہو رہی ہے۔'' رانا کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر ہونے سے قبل ہی سپاہی تیزی سے غائب ہو گیا۔

''اگر مقصد گرفتار کرنا نہیں تھا تو ذرا مختلف طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے تھا۔ مجھے تو یہ معلوم کرنے میں ہی کئی منٹ لگ گئے کہ آخر ہاشم کو لے جایا کس تھانے میں گیا ہے۔ یونیورسٹی تو آپ کے تھانے کی حدود میں آتی بھی نہیں ہے۔'' بابر رانا نے دبے لہجے میں شکوہ کیا، اگر شاہد کا رویہ اس کے ساتھ اتنا دوستانہ نہ ہوتا تو اس وقت وہ بھی بڑے جارحانہ انداز میں بات کر رہا ہوتا۔

''ہم پولیس والوں کا تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کیسے بے ڈھب انداز میں کام کرتے ہیں اور یہ تو تھی بھی بس ایک رسمی سی کارروائی اس لیے فارمیلیٹیز کا خیال رکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی ہوگی۔ آپ بے فکر رہیں آپ کا لڑکا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور آپ بغیر کسی کارروائی کے اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔'' شاہد نے اب بھی اپنا لہجہ دوستانہ ہی رکھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہاشم بعد میں اس کے لگائے گئے تھپڑ کے متعلق بابر رانا کو ضرور بتائے گا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس معمولی بات پر رانا اس کے خلاف کسی ایکشن کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ کیونکہ تھانے میں لائے جانے والے کسی بندے کو ایک آدھ تھپڑ لگ جانا ایسی کوئی غیر معمولی بات تصور بھی نہیں کی جاتی۔

''یعنی میں نے فضول میں دوڑ لگائی۔ اصل میں ہاشم کے دوست اسے اس طرح لائے جانے پر بہت گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئے تھے اس لیے مجھے بھی فوری طور پر حرکت میں آنا پڑا۔''

''جس قسم کی حرکتوں میں ہاشم انوالو ہے اس کے ساتھیوں کی گھبراہٹ غلط نہیں تھی لیکن اس کے حق میں یہ بات اچھی رہی کہ یونیورسٹی میرے تھانے کی حدود میں نہیں آتی اس لیے میں اس کے خلاف کسی کارروائی کا حق دار نہیں۔ البتہ میں آپ کو اتنا مشورہ ضرور دوں گا کہ لڑکے کو ذرا سنبھل کر رہنے کی تاکید کریں۔ مزاج میں سرکشی ضرورت سے زیادہ ہے اور ایسے لوگ بھی کبھی کسی سر پھرے کی رگڑائی میں آ جاتے ہیں۔'' نہ نہ کرتے بھی شاہد اس پر

بہت کچھ جتا گیا۔

''مشورے کا شکریہ لیکن آپ جانتے ہیں کہ سیاسی پارٹیوں کو ایسے ہی سرکشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایسے لوگ رگڑائی میں آ بھی جائیں تو پیچھے ان جیسے ہی کئی موجود ہوتے ہیں اس لیے لیڈرز کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی کہ ایسے سرکش گھوڑوں کو لگام ڈال کر رکھیں۔'' بابر رانا نے ایک کھلی حقیقت بیان کی، اسی دوران میز پر پُرتکلف چائے لگائی جانے لگی۔

''کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے کس سلسلے میں ہاشم کو تھانے بلوایا تھا؟'' چائے اور دیگر لوازمات سے انصاف کرتے ہوئے بابر رانا نے اپنا تجسس دور کرنے کی کوشش کی تو شاہد نے اسے ساری تفصیل بتا ڈالی۔ چھپانے کا فائدہ بھی نہیں تھا بعد میں ہاشم کی زبانی بھی اسے سب معلوم ہو جاتا۔

''ہاشم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں اس کے اسٹائل سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ کھل کر بہانگِ دہل کام کرنے والا لڑکا ہے۔ اس لیے واقعی اس کا اس کیس سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔'' ساری بات سن کر بابر رانا نے ہاشم کی حمایت کی۔

''ہاں، میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ اسی لیے میں نے اس لڑکے کو جانے کی اجازت دے دی ہے۔'' شاہد نے اس کی تائید کی۔ بابر رانا، ہاشم کے ساتھ تھانے سے روانہ ہوا تو خوش گوار موڈ میں تھا البتہ شاہد کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ضمیر کی موت سیدھا سادہ خودکشی کا کیس نہیں ہے لیکن ابھی تک کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اپنی الجھن کو دور کرنے کے لیے وہ ایک بار پھر اس کیس کی فائل لے کر بیٹھ گیا۔ فائل میں ضمیر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ، وقوعہ کا منظر اور دیگر تمام ضروری معلومات درج تھیں۔ ایک نکتے پر آ کر وہ چونک گیا۔ اس سے قبل اس نے اس بات کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ نوٹ کرتے ہی اس کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ فوراً ہی اپنی سیٹ سے اٹھا اور تھانے سے روانہ ہو گیا۔ اس نے اس وقت مکمل پولیس یونیفارم پہن رکھی تھی۔ چنانچہ جب اپنے مطلوبہ اسپتال پہنچا تو اسپتال کی انتظامیہ ملاقات کا وقت نہ ہونے کے باوجود اسے رافعہ کے کمرے میں جانے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئی۔ کمرے میں رافعہ کے ساتھ ایک خوش اندام سی نرس بھی موجود تھی۔

''اوہو شاہد! مجھے پروفیسر صاحب نے بتایا تھا کہ تم اپنی والدہ کے ساتھ ملاقات کے لیے آؤ گے لیکن تم تو اکیلے ہی نظر آ رہے ہو؟'' رافعہ نے اسے دیکھ کر خوش گوار انداز میں کہا۔ شاہد نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر نقاہت کے آثار ہیں لیکن حسبِ معمول وہ اچھے حلیے میں تھی۔

''میں سیدھا تھانے سے یہاں آ گیا۔ اس لیے امی کو نہیں لا سکا۔ پھر کسی دن لے آؤں گا۔'' شاہد نے اسے جواب دیا اور بے بی کاٹ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کاٹ میں سنہری بالوں اور صاف رنگت والا ایک گول گوتھنا سا بچہ بے خبر سو رہا تھا۔

''سسٹر! کیا آپ کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر جا سکتی ہیں۔ مجھے مسز رافعہ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' بچے پر نظریں جمائے ہوئے اس نے نرس سے کہا تو وہ خوش اخلاقی سے ''شیور سر'' کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ البتہ رافعہ کچھ حیران نظر آ رہی تھی۔

''بچہ تم سے اور پروفیسر صاحب سے خاصا مختلف ہے، کس پر گیا ہے؟'' نرس کے باہر جانے کے بعد شاہد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''اچھا! پروفیسر صاحب تو کہہ رہے تھے کہ اس کی آنکھیں اور لب بالکل میری طرح ہیں۔'' رافعہ نے کچھ نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں شاید، لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اسے دیکھ کر ضمیر شاہ کا خیال آ گیا۔'' شاہد نے اتنی اچانک یہ جملہ کہا کہ رافعہ خود کو سنبھال نہ سکی اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' کچھ توقف کے بعد اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''ضمیر شاہ کی خودکشی کے کیس میں کچھ ایسی باتیں ہیں جنھیں میں نے پہلے نظرانداز کر دیا تھا لیکن ہر طرف دوڑ بھاگ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے اس کیس میں چند سامنے کی باتیں نظرانداز کر دی تھیں اور میرا خیال ہے ان باتوں کی تم سے بڑھ کر کوئی وضاحت نہیں کر سکتا۔'' شاہد کاٹ کے پاس سے ہٹ کر رافعہ کے بستر کے ساتھ رکھی کرسی پر آ بیٹھا۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔'' رافعہ کا اضطراب اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔

''ضمیر شاہ نے آڑو کے شربت میں خواب آور گولیاں ملا کر پی تھیں اور تمہارے پاس شربت کا یہ فلیور موجود تھا۔''

''یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ یہ فلیور مارکیٹ میں عام ملتا ہے اور ضمیر خود بھی خرید کر لا سکتا تھا۔'' شاہد کی

بات مکمل ہونے سے قبل رافعہ نے تیز آواز میں اسے ٹوکا۔

''بالکل، لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ضمیر شاہ کے کمرے میں کسی شربت کا جار، پاؤچ یہاں تک کہ ساشے بھی نہیں ملا اور نہ ہی ایسے آثار ملے جن سے محسوس ہو کہ اس نے کمرے میں شربت تیار کیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس مقصد کے لیے تمہارا کچن استعمال کیا گیا ہو؟''

''ہوسکتا ہے۔ ہماری طرف سے ضمیر پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ آزادانہ ہمارا کچن استعمال کرسکتا تھا۔'' رافعہ نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

''ہوں، چلو مان لیا کہ اس نے شربت تمہارے کچن میں تیار کیا تھا لیکن ایک اور بہت عجیب بات یہ تھی کہ شربت میں شامل خواب آور گولیوں کی شیشی ضمیر کے کمرے کی میز پر سے ہی ملی تھی یعنی اس نے وہ گولیاں اپنے کمرے میں ہی شربت میں شامل کی تھیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں شربت کے گلاس پر تو اس کے فنگر پرنٹس ملے لیکن خواب آور گولیوں کی شیشی پر ایک بھی فنگر پرنٹ نہیں تھا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ضمیر مشروب میں گولیاں شامل کرنے کے بعد شیشی پر سے اپنے فنگر پرنٹس مٹا دیتا۔ اسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ کام تو وہی کرسکتا تھا جو اس کے قتل کو خودکشی کا رنگ دیتے ہوئے خود کو چھپانا چاہتا ہو اور یہ کام صرف دو افراد کر سکتے تھے۔ ایک تم اور دوسرے پروفیسر صاحب.... اب تم مجھے بتاؤ گی کہ تم دونوں میں سے یہ کام کس نے کیا تھا؟'' اپنے دفتر میں بیٹھ کر نوٹ کیے جانے والے اہم نکتے کو رافعہ کے سامنے بیان کرتے ہوئے شاہد کا لہجہ بتدریج سخت ہوتا چلا گیا۔ اس کی بات کے اختتام پر رافعہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

''مجھے سچ بتادو رافعہ! سچ جاننے کے بعد ہی میں فیصلہ کرسکوں گا کہ تمہیں کس حد تک رعایت دی جاسکتی ہے۔'' اس بار شاہد نے قدرے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

''کیسے بتاؤں؟ جو کچھ ہوا، وہ اتنا شرمناک ہے کہ میرے لیے زبان پر لانا بھی مشکل ہے۔ سچ یہ ہے کہ اگر مجھے پروفیسر صاحب کی پروا نہ ہوتی تو میں خود موت کو گلے لگا لیتی لیکن میں تو یہ بھی نہیں کرسکتی تھی کیونکہ میری موت ان کی تکلیف اور بدنامی کا باعث بن جاتی۔'' بھرائی ہوئی آواز میں بولتی وہ بے حد ڈسٹرب لگ رہی تھی۔

''خاموش رہنے سے بھی تمہارے دل کا بوجھ بڑھنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ انسان اگر اپنی غلطی کا اعتراف کرلے تو اس کے دل پر سے بوجھ کم ہوجاتا ہے۔'' شاہد نے اسے سمجھایا۔

''پروفیسر صاحب کی بدنامی کے مقابلے میں مجھے ساری زندگی یہ بوجھ اٹھانا منظور ہے۔'' اس کا انداز حتمی تھا۔

''میری سمجھ نہیں آتا کہ جب تم پروفیسر کامران سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہو تو پھر تم سے اتنی بڑی لغزش کیسے ہوئی؟ اتنی محبت کے ہوتے ہوئے بے وفائی کی گنجائش کیسے نکلی؟'' شاہد کا لہجہ جارحانہ ہوگیا جبکہ رافعہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' اس نے کانپتے لبوں سے اس کی تردید کی۔

''کیا غلط سمجھ رہا ہوں؟ کیا یہ غلط ہے کہ یہ بچہ پروفیسر کامران کا نہیں بلکہ ضمیر شاہ کا ہے۔'' کاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہد پھٹ پڑا۔ ''کہو تو اس کا ڈی این اے کروا کر یہ بات ثابت کردوں۔''

''بس کرو شاہد۔ مت کرو ایسی باتیں۔'' رافعہ نے نڈھال سی ہو کر تکیے پر سر رکھ دیا۔

''میں پروفیسر صاحب سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ میں نے ان سے ایک حقیقت ضرور چھپائی ہے لیکن بے وفائی کا الزام لگا کر تم میری اس بے تحاشا محبت کی توہین کررہے ہو جو روزِ اول کی طرح آج بھی صرف اور صرف پروفیسر کے لیے ہے۔'' وہ بہت آہستہ آواز میں بول رہی تھی۔

''تو تم بتاؤ نا کہ سچ کیا ہے۔ تمہارے بتائے بغیر میں حقیقت تک کیسے پہنچوں گا۔'' اس کی کیفیت نے شاہد کو بے بس کردیا۔

''سچ بس اتنا ہے کہ ضمیر شاہ کو پہچاننے میں ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اس کی ظاہری شخصیت سے دھوکا کھا کر ہم نے اسے قابلِ اعتبار سمجھا اور اس نے اس اعتبار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن تنہائی میں مجھے برباد کرڈالا۔ میں اپنی اس بربادی پر خاموش نہ رہتی لیکن مجھے معلوم تھا کہ پروفیسر صاحب اس صدمے سے بالکل ٹوٹ جائیں گے۔ کسی بھی مرد کے لیے ایسی عورت کی رفاقت میں رہنا بہت بڑی ذہنی اذیت ہوتی ہے۔ میں نے اس اذیت کو قبول کرتے ہوئے انہیں اس میں مبتلا ہونے سے بچالیا۔ اس حادثے کے بعد کئی روز تک سخت اذیت میں رہی۔ صدمے نے مجھے بیمار بھی کرڈالا لیکن پروفیسر صاحب کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ البتہ تم اندازہ کرسکتے ہو کہ اس واقعے کے بعد مجھے ضمیر سے کیسی نفرت ہوگئی ہوگی۔

میں نے چاہا کہ اسے اپنے گھر سے نکال دوں۔ دبے الفاظ میں پروفیسر صاحب سے خواہش کا اظہار بھی کیا لیکن ظاہر ہے کہ میرے پاس کوئی واضح وجہ نہیں تھی سو وہ ٹال گئے۔ انہیں اپنے دوست سے تعلقات کے علاوہ ضمیر کے مستقبل کی بھی پروا تھی۔ میں انہیں نہیں بتا سکی کہ ایسا بے ضمیر آدمی کسی رعایت اور ہمدردی کے لائق نہیں سو وہ میرے گھر میں دندناتا رہا۔ اسے دوسرا موقع دینے سے بچنے کے لیے میں بہت محتاط ہوگئی لیکن تقدیر کے کاری وار سے نہ بچ سکی۔ اپنی الجھنوں اور اذیتوں میں گھرے مجھے اپنے اندر آنے والی تبدیلی کا علم ہی نہیں ہوسکا۔ ایک روز پروفیسر صاحب ہی میری طبیعت خراب دیکھ کر زبردستی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو یہ انکشاف ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس خبر کو سن کر میں سکتے میں آگئی اور جان لیا کہ گناہ اپنا رنگ دکھانے کو ہے لیکن پروفیسر صاحب نے اس خبر کو خوش خبری جانا اور بے حد مسرور ہوئے۔ ان کی خوشی نے ایک بار پھر میری زبان پر تالا ڈال دیا۔ اگر یہ بات صرف میرے علم میں ہوتی تو میں گناہ کی اس نشانی کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی مٹا ڈالتی لیکن پروفیسر صاحب کی خوشی نے مجھے ایسا کچھ نہیں کرنے دیا۔ دل پر بے تحاشا بوجھ لیے مجھے ان کی خوشی کا حصے دار بننا پڑا۔ خبیث ضمیر کو جب اس خبر کا علم ہوا تو وہ بھی حقیقت تک پہنچ گیا۔ اور بجائے شرمندہ ہونے کے مجھے بلیک میل کرنے لگا۔ اسے میری پروفیسر صاحب سے بے پناہ محبت کا علم تھا۔ چنانچہ وہ مجھے دھمکانے لگا کہ وہ حقیقت ان کے علم میں لے آئے گا۔ اس کا منہ بند رکھنے کے لیے مجھے کئی بار رقم کے علاوہ اپنے زیورات بھی اسے دینے پڑے لیکن ظاہر ہے میں پریشان تھی کہ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ اپنی اس پریشانی کا حل ڈھونڈنے سے پہلے ہی ضمیر کی دوبارہ دست درازی کی جرأت نے مجھے حتمی فیصلے پر پہنچا دیا۔ تمہیں اس کے دائیں گال پر موجود زخم کا نشان یاد ہے نا؟ میں نے اس سے بچنے کے لیے اسے شیشے کا گلاس دے مارا تھا۔ گلاس ٹوٹنے سے اس کا گال زخمی ہوگیا اور میں موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ اس نے پروفیسر صاحب کے لوٹنے سے قبل ہی ڈاکٹر کے پاس جا کر مرہم پٹی کروالی اور پروفیسر صاحب کے سامنے وہی بہانہ پیش کیا جو تمہیں بتایا جا چکا ہے۔ ضمیر کی دوسری بار کی جرأت نے جہاں مجھ سے ایک مشکل فیصلہ کروایا، وہاں وہ بھی زخمی ناگ کی طرح بل کھاتا مجھ پر پھنکارتا رہا۔ میں نے اپنی پوری جرأت سے کام لے کر اس ناگ کا سر کچلنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ میں کسی صورت حقیقت ظاہر ہونے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی۔ ضمیر کی فرمائش پر اس کے لیے آڑو کا شربت بنا کر اس کے کمرے میں لے جاتے ہوئے میں نے ہی اس میں خواب آور گولیاں ملائی تھیں۔ پروفیسر صاحب اس وقت اپنی اسٹڈی میں مصروف تھے اس لیے انہیں علم نہ ہوسکا۔ ضمیر نے شربت کے بہانے مجھے ایک بار پھر دھمکانے کے لیے بلایا تھا۔ موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے میں اس کے سامنے بھیگی بلی بن گئی اور اس سے التجا کی کہ وہ اپنی زبان بند رکھے تو میں آئندہ اس کا ہر مطالبہ مانوں گی۔ وہ میرے اس طرح زیر ہونے پر خوش ہوگیا اور مزے سے شربت پی گیا۔ گلاس پر سے اپنی انگلیوں کے نشان میں نے پہلے ہی مٹا دیے تھے تاکہ بعد میں جب اس کی موت کے سلسلے میں تحقیقات ہوں تو میرا کوئی تعلق سامنے نہ آئے۔ گلاس میں ایک ٹرے میں لے کر گئی تھی اور وہ ٹرے میں نے بعد میں وہاں سے ہٹا لی تھی۔ سلیپنگ پلز کی شیشی بھی میں نے کچن کے کام کے لیے استعمال ہونے والے ربر کے دستانے پہن کر کھولی تھی اور بعد میں دستانے پہن کر ہی ضمیر کی موت کے بعد اس کے کمرے میں رکھ آئی تھی۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اس قتل کو خودکشی کا رنگ دے سکوں۔ ابتدا میں، میں کامیاب بھی رہی لیکن آخر کار تم حقیقت تک پہنچ ہی گئے اور اب یقیناً قانون کے تقاضے پورے کرنے چاہو گے لیکن یاد رکھو کہ کسی بھی بدنامی سے پہلے میں اپنی جان دینا پسند کروں گی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنا یہ کالک ملا چہرہ لے کر پروفیسر صاحب کا سامنا کرسکوں۔'' وہ مسلسل بولنے سے بے حد تھک گئی تھی۔ چنانچہ آواز میں نقاہت بہت واضح تھی البتہ اس کی ویران آنکھوں میں اس کا ارادہ کسی پختہ عزم کی طرح تحریر تھا اور وہ واقعی وہ سب کر گزرے گی جس کا اس کے سامنے اظہار کر چکی ہے۔ اس وقت وہ ایسی کیفیت میں تھی کہ رونا دھونا بھی ترک کر چکی تھی۔ شاہد کو اس سے خوف بھی محسوس ہوا اور اس کی پروفیسر سے بے حد محبت کا صحیح معنوں میں ادراک بھی۔ یونیورسٹی لائف میں پروفیسر کامران کی محبت میں مبتلا ہونے والی رافعہ اب یوں گوڈے گوڈے ان کے عشق میں ڈوب چکی تھی کہ جان لینا اور دینا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ تو کوئی داسی تھی جو اپنے دیوتا کے چرنوں میں بیٹھی بس اس کی پرستش کرتی رہتی تھی۔ شاہد اس داسی کی پرستش میں مداخلت کی جرأت نہیں کرسکا اور خاموشی سے وہاں سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''آج جلدی گھر واپس آجایئے گا۔'' دفتر کے سامنے گاڑی سے اترتے ہوئے نوشین نے اس سے دوبارہ فرمائش کی۔

''وعدہ نہیں کرسکتا کوشش کروں گا۔'' اس نے بھی اپنا پہلے والا جواب دہرایا۔

''میں کچھ نہیں جانتی بس آج آپ کو جلدی گھر واپس آنا ہوگا۔'' نوشین نے بیویوں والا حق جتایا۔

''سوری بیگم، بے شک میرے گھر کی کوتوال آپ ہیں لیکن مجھ غریب کو کوتوالِ شہر کے احکامات کے مطابق چلنا پڑتا ہے کہ یہ میری نوکری کا سوال ہے۔'' اس نے خوب صورتی سے اپنی مجبوری بیان کی۔

''ایک تو یہ پولیس کی نوکری، ایسی نوکری سے تو......''

نوشین اختر جواب نوشین شاہد بن چکی تھی جھنجلا کر بولنے لگی۔

شاہد نے اسے ٹوک دیا۔ ''اوں ہوں......اس نوکری کو کچھ مت کہنا۔ اسی کے طفیل تو ہم تم ملے ہیں۔''

''ہاں، وہ بھی خوب ملاقات رہی تھی۔ آپ نے خود کو قطعی نااہل پولیس والا ثابت کردیا تھا اس کے باوجود میں نے آپ کا پروپوزل قبول کرلیا۔'' نوشین نے ناک چڑھاتے ہوئے اسے طعنہ دیا۔

''نااہلی کی کیا بات ہے، تم نے خود ہی تو مجھے اس بوگس کیس پر کام کرنے سے روک دیا تھا۔'' شاہد نے اسے یاد دلایا۔ وہ نوشین کو کبھی نہیں بتا سکا کہ ضمیر کی خودکشی کا کیس اس نے حل کرلیا تھا۔ تمام اصول وضوابط کے خلاف اس کے دل نے فیصلہ دیا کہ ایک محبت کرنے والی عورت جو بند گلی میں کھڑی ہونے کی وجہ سے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوگئی تھی، اس کو عیاں کر کے بے عزت کرنے کے بجائے ایک بے ضمیر کی موت پر پردہ پڑا رہنا ہی بہتر تھا۔ اس راز کی اس نے ایسی حفاظت کی تھی کہ نوشین پر بے حد اعتماد کرنے کے باوجود بھی اس میں شریک نہیں کیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس نیکی کے صلے میں ہی اسے نوشین کا ساتھ ملا تھا۔ نوشین سے شادی کوئی اتنا آسان کام ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس کے گھر والوں نے اپنی ''کماؤ'' بیٹی کو گھر سے رخصت کرنے میں بڑی آناکانی سے کام لیا تھا۔ یہ کام نوشین کی طرف سے بغاوت کے اعلان اور شاہد کی کئی یقین دہانیوں کے بعد انجام پایا تھا۔ شاہد نے اپنے سسرالیوں سے وعدہ کیا تھا کہ نوشین کی دوسری بہنوں کی رخصتی اور بھائی کو اچھی ملازمت ملنے تک وہ ان لوگوں کو سپورٹ کرتا رہے گا۔ اس وعدے کے بعد ہی ان لوگوں نے ہامی بھری تھی لیکن نوشین ان کی اس شرط پر بہت شرمندہ ہوئی تھی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنی ملازمت جاری رکھے گی۔ شاہد نے پہلے اسے روکنا چاہا لیکن پھر یہ سمجھنے کے بعد کہ یہ نوشین کے لیے اپنی عزت ووقار کا سوال ہے، ہتھیار ڈال دیے کیونکہ نوشین نے اسے صاف الفاظ میں بتادیا تھا کہ اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں وہ خود شادی سے انکار کردے گی۔ شاہد اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا سو راضی ہوگیا۔ نوشین گھر اور دفتر کے درمیان حسن وخوبی سے توازن رکھتے ہوئے سال بھر سے اس کی رفیقۂ حیات تھی اور اسے وہ سارے سکھ دے رہی تھی جس کی ایک مرد کو طلب ہوتی ہے۔ شاہد جانتا تھا کہ آج ان کی ویڈنگ اینیورسری ہے اسی لیے نوشین بغیر کچھ جتائے اسے شام میں جلد گھر لوٹنے پر زور دے رہی ہے اور وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اس کے اصرار کو نظر انداز کررہا تھا۔

''جس فرمانبرداری کا اس وقت مظاہرہ کیا تھا اب اس سے کیوں گریز کررہے ہیں۔'' ضمیر کے کیس پر پیچھے ہٹنے سے متعلق اس کی توجیہہ سن کر نوشین نے اسے اکسانے کے لیے ایک بار پھر طعنہ زنی سے کام لیا۔

''اس وقت تو تمہیں انسپائر کرنا تھا نا یار۔ اب تو تم پرمننٹ بیوی بن گئی ہو۔'' جواباً وہ مزے سے بولا تو نوشین اسے گھور کر رہ گئی۔

''کب تک یہاں کھڑی ہوکر مجھ پر نظروں کے تیر چلاتی رہوگی۔ دفتر کے اندر چلی بھی جاؤ ورنہ تمہارا وہ کھڑوس باس تمہیں نوکری سے نکال بھی سکتا ہے۔'' شاہد نے اسے چھیڑا۔

''ایسے ہی نکال دے گا۔ پولیس والے کی بیوی ہوں۔ اسے ہی جیل میں بند کروادوں گی۔'' نوشین نے چمک کر جواب دیا اور پھر ناراضی کے اظہار کے لیے پیر پٹختی ہوئی دفتر کی طرف چل پڑی۔ شاہد نے اس کی اس ادا کو مسکرا کر دیکھا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ اس کا رخ تھانے کے بجائے گھر کی طرف تھا۔ آج اس نے چھٹی لے رکھی تھی اور اب گھر جاکر کچھ ایسے انتظامات کرنا چاہتا تھا جنہیں دیکھ کر دفتر سے لوٹنے کے بعد نوشین دنگ رہ جائے۔ آج کے دن اسے تحفہ پیش کرنے کے لیے ایک خوب صورت نیکلس تو وہ پہلے ہی خرید چکا تھا۔ نوشین ایک نعمت کی طرح اسے ملی تھی۔ وہ اس نعمت کی بے قدری کیسے کرتا جو اللہ نے ایک بے ضمیر سے محفوظ رکھ کر اسے عنایت کی تھی۔

قسمت آزما

کاشف زبیر

روشن اور سہانا مستقبل تقریباً ہر شخص کا دیرینہ خواب ہوتا ہے... مگر کچھ لوگ ان خوابوں کو اپنے جسم و جاں... ذہن و دل کا ناگزیر حصہ تصور کر بیٹھتے ہیں... رچ بس جانے والے کرداروں کے گرد گھومتی ایک تیز رفتار تحریر... ان کے نزدیک شاندار حال ہی نہیں... مستقبل بھی شاندار ہونا لازمی تھا... بے بہا امنگوں اور خودسر خواہشوں کے حصول نے انہیں ایک ایسی سمت دھکیل دیا... جہاں سے برائی اور جرم کی راہ پر چلنا ذرا بھی دشوار نہیں رہا... پہلا قدم ڈگمگایا... اس کے بعد ہر قدم آسان ہوتے چلے گئے...

قسمت سے نبرد آزما کھلاڑیوں کا جان لیوا کھیل...

عدیل خوش تھا اور بہت موڈ میں تیاری کر رہا تھا۔ آج اسے پہلی تنخواہ ملنی تھی۔ اسے جاب کرتے ہوئے ایک مہینا ہو گیا تھا۔ وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آیا تو زاہد چچا اخبار پڑھ رہے تھے۔ عدیل نے کہا۔ ”چچا جان آج مجھے پہلی تنخواہ ملے گی۔“

”مبارک ہو۔“ زاہد نے اخبار سے نظر ہٹائے بغیر کہا تو میز پر ناشتا لگاتی مونا نے عدیل کو معذرت خواہ نظروں سے دیکھا۔ مونا نے ناشتا لگایا اور پھر ماں کو ناشتا دینے چلی گئی۔ فالج کے حملے سے صحت یاب ہونے کے بعد ریحانہ عام طور سے کمرے میں ناشتا کرتی تھی۔ مونا، زاہد اور ریحانہ کی اکلوتی بیٹی تھی اور عدیل زاہد کا بھتیجا تھا۔ اس کے ماں باپ اس وقت ایک بم دھماکے میں دنیا سے رخصت ہوئے جب وہ صرف تین سال کا تھا۔ وہ ماں باپ کے ہمراہ عید کی شاپنگ پر گیا تھا جب بھرے بازار میں بم دھماکا ہوا اور مرنے والوں میں شاہد اور اس کی بیوی نسیم بھی شامل تھے۔ عدیل معجزانہ طور پر محفوظ رہا تھا۔ زاہد دنیا میں اس کا سب سے قریبی رشتے دار تھا۔ اس لیے اسے ہی عدیل کی ذمے داری پوری کرنا پڑی۔ وہ وفاق میں سرکاری ملازم تھا اور اس کی ریٹائرمنٹ میں چند سال باقی رہ گئے تھے۔ تنخواہ مناسب تھی اور سرکاری مکان بھی ملا ہوا تھا مگر وہ ابھی سے فکر مند تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا کرے گا۔

عدیل کو زاہد اور ریحانہ نے خوشی سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ کسی لازمی بوجھ کی طرح ان پر آن پڑا تھا۔ بادلِ ناخواستہ سہی لیکن انہوں نے عدیل کی پرورش کی۔ وہ ان کے گھر کے اوپر بنے چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں رہتا تھا جو گرمیوں میں تندور کی طرح گرم اور سردیوں میں انتہائی سرد ہو جاتا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ زیادہ تر اسی کمرے میں رہتا تھا۔ اسے بلاوجہ نیچے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف تین وقت کھانے کے لیے وہ نیچے آتا۔ اس کے لیے موسم کے لحاظ سے معمولی کپڑے بنتے تھے اور باقی چیزیں بھی عام سی ہوتی تھیں۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ انہوں نے اس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا۔ اس سے گھر کا کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا اور نہ ہی اسے مار پیٹ یا بدزبانی کا نشانہ بنایا جاتا۔ اس کے ساتھ چچا چچی کا رویہ بہت سرد ہوتا تھا۔ وہ گھر والوں کے ساتھ کہیں آتا جاتا نہیں تھا اور نہ ہی اسے گھر آئے مہمانوں کے سامنے آنے کی اجازت تھی۔

اس گھر میں اس کی واحد ہمدرد اور غم گسار اس کی کزن مونا تھی۔ مونا اس سے دو سال چھوٹی تھی اور جب وہ اس گھر

میں آیا تو مونا چھوٹی سی گڑیا کی طرح تھی۔ وہ عدیل کو بچپن سے اچھی لگتی تھی۔ ایک بار اسے گود میں اٹھانے کی کوشش میں اس نے گرا ہی دیا تھا، یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب ریحانہ نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ عدیل سہم گیا تھا مگر اس نے مونا کے پاس جانا اور اس سے کھیلنا نہیں چھوڑا تھا۔ جیسے ہی ریحانہ کہیں اور مصروف ہوتی، وہ اس کے پاس پہنچ جاتا اور پھر ڈانٹ کھا کر اس کے پاس سے ہٹتا۔ ذرا بڑے ہوئے اور مونا چلنے پھرنے لگی تو خود عدیل کے پاس آجاتی۔ زاہد نے اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ مونا اس کے انتظار میں دوپہر کو گیٹ کے پاس ہی رہتی۔ شام کو ضد کرکے اس کے ساتھ کھیلتی۔ اگر عدیل ریحانہ کے حکم پر اپنے کمرے میں رہتا تو وہ خود اس کے پاس آجاتی۔

جب ذرا ہوش سنبھالا اور صنفی فرق واضح ہوا تو ان کے درمیان ایک جھجک سی آگئی۔ اب بھی وہ بات کرتے تھے مگر ایک حد میں رہ کر اور کھیلنا تو اس وقت چھوڑ دیا تھا جب مونا دس سال کی ہوئی تھی۔ ریحانہ نے اس پر سختی کی تھی۔ شعور آیا تو احتیاط اور جھجک خود آگئی۔ عدیل کی خواہش تھی کہ وہ ایم بی اے کے لیے بی بی اے آنرز میں داخلہ لے مگر زاہد نے اسے بی کام کا کہا تو اس نے خاموشی سے داخلہ لے لیا۔ یہ تو وہ بچپن میں سمجھ گیا تھا کہ اسے یہاں صرف لحاظ و مروت میں رکھا ہوا ہے اور وہ ایک حد سے بڑھ کر اس کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ ایم بی اے کی تعلیم ویسے ہی بہت مہنگی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ گریجویشن کے بعد جاب کرے گا اور پھر اپنے بل پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا۔ ایک یہی طریقہ تھا کہ وہ معاشرے میں اچھا مقام حاصل کرے اور پھر مونا کا ہاتھ مانگ سکے۔

گریجویشن کا امتحان دیتے ہی اس نے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ نوکری کیسی ملتی ہے؟ وہ بس کام کرنا چاہتا تھا جس میں اسے کچھ رقم مل جائے۔ اسے ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ملازمت مل گئی کیونکہ وہ بی کام تھا اس لیے اسے کیش کاؤنٹر پر جگہ ملی۔ اسے ایک ہفتے صبح اور ایک ہفتے شام کی شفٹ میں کام کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں صبح کی شفٹ تھی۔ آج اسے پہلی تنخواہ ملی تھی اور وہ بہت پُرجوش تھا مگر زاہد کے ردِعمل سے اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ کمانے لگے گا تو ان کا رویہ اچھا ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ مونا ناشتے میں شریک ہوئی تو زاہد نے اچانک پوچھا۔ ”تنخواہ کتنی ہے؟“

”بارہ ہزار۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے تم اب اپنے بل بوتے پر رہ سکتے ہو۔“ زاہد نے کہا تو اس نے اور مونا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”جی چچا جان...“ عدیل... اتنا ہی کہہ سکا۔

”تب تم اس مہینے میں اپنا بندوبست کرلو۔“ زاہد نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ ”تمہارے لحاظ سے مجھ پر جو ذمے داری تھی وہ اب پوری ہوگئی ہے۔“

”ابو آپ عدیل کو یہاں سے جانے کا کہہ رہے ہیں؟“ مونا نے بے یقینی سے کہا۔

”چچا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ عدیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ”انہوں نے اپنی ذمے داری پوری کر دی ہے۔ میں اسی مہینے اپنا بندوبست کرلوں گا۔“

”ابو یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ مونا روہانسی ہوگئی۔ عدیل کھڑا ہو گیا۔ ”میں چلتا ہوں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

اس کے جانے کے بعد مونا نے باپ سے کہا۔ ''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ آپ کا سگا بھتیجا ہے، آپ کے ایک ہی بھائی کا اکلوتا بیٹا۔''

''مونا تم اس معاملے میں دخل مت دو۔'' زاہد کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ''وہ جوان اور تعلیم یافتہ ہے۔ اس کے پاس روزگار بھی ہے وہ اپنی زندگی خود گزار سکتا ہے۔ اس کا اب یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔''

زاہد نے کہتے ہوئے اخبار اٹھالیا اور مونا ناشتا ادھورا چھوڑ کر پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

مونا کالج سے نکلی اور گھر کی طرف پیدل روانہ ہوئی تو عدیل اس کے ساتھ آگیا۔ ''کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' مونا نے جواب دیا۔ ''تم کیسے ہو؟ اس دن کے بعد پلٹ کر نہیں آئے۔''

''مصروف تھا اور پھر ہمت بھی نہیں ہو رہی، مجھے خوف ہے کہ دروازے سے نہ لوٹا دیا جاؤں۔''

''تم میرے کزن اور ابو کے بھتیجے ہو۔ ہم سے خون کا رشتہ ہے۔''

''خون کے رشتے کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔'' عدیل کا لہجہ کسی قدر تلخ ہوگیا۔

''عدیل آج کل گھر میں میری شادی کی بات ہو رہی ہے۔ امی چاہتی ہیں کہ جیسے ہی میں گریجویشن کروں میری شادی کردی جائے۔''

عدیل جانتا تھا کہ اس شادی میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوگا۔ زاہد اور ریحانہ شاید اسے بلانا بھی پسند نہ کریں۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ ''میں کیا کرسکتا ہوں۔ ابھی میں خود کو سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''میں نے تم کو بتادیا ہے۔'' مونا کچھ دیر بعد بولی۔

''اگر چچا چچی نے تمہارا رشتہ کہیں اور کر دیا تو تم احتجاج نہیں کروگی؟''

''کروں گی مگر مجھے معلوم ہے میری کوئی سنے گا نہیں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ زاہد اور ریحانہ نے شروع سے فیصلوں پر اپنا دباؤ رکھا تھا۔ مونا کو اکلوتی اولاد ہونے کا بھی فائدہ نہیں تھا۔ دراصل ریحانہ کے خاندان میں کئی اچھے رشتے تھے۔ اس کے بھانجے اور بھتیجے تھے جو اچھے عہدوں پر جاب کر رہے تھے اور کچھ اپنا بزنس کر رہے تھے۔ فطری طور پر ریحانہ کا میلان ان کی طرف تھا۔ عدیل کے پاس ایک ہی موقع تھا کہ وہ خود کو مالی لحاظ سے اتنا مضبوط کرلے کہ جب چچا سے مونا کے لیے بات کرے تو ان کے پاس انکار کا جواز نہ ہو۔ مگر ایسا ہونا مشکل تھا کیونکہ کسی اچھے مقام تک پہنچنے میں وقت درکار تھا اور یہاں مونا نے بتادیا تھا کہ گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ گریجویشن کے آخری سال میں تھی۔ گھر قریب آنے پر عدیل اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوگیا۔ مونا سر جھکائے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

☆☆☆

کار میں دو افراد تھے، ایک مرد اور ایک لڑکی۔ وہ دونوں کسی سوچ میں گم تھے پھر لڑکی نے کہا۔ ''اب ہمارے پاس مزید کوئی ایکٹو کارڈ نہیں ہے۔''

''بس ایک ہے۔'' مرد نے کہا۔

''ہمیں کسی دوسرے کو تلاش کرنا ہوگا۔ تم نے اسے مارنے میں عجلت سے کام لیا۔''

دو دن پہلے ایک نالے کے پاس ان دونوں کے ہمراہ ایک تیسرا فرد بھی تھا۔ مرد نے اسے گولی ماردی اور اس کی لاش نالے میں پھینک دی جس میں برساتی پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ ان کا ساتھی تھا اور اسی کی مدد سے وہ کام چلاتے تھے۔ مرد نے لڑکی کی بات پر سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ہمیں کسی کو تلاش کرنا ہوگا۔''

''میں نے ایک بندہ دیکھا ہے، بڑی موزوں جگہ کام کرتا ہے۔ اگر تمہیں مناسب لگے تو باقی تم دیکھ لینا۔''

''کہاں کام کرتا ہے؟''

''اسی اسٹور میں۔'' لڑکی نے پارکنگ کے سامنے موجود ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ کیش کاؤنٹر پر کام کرتا ہے اور دیکھنے میں چست لگتا ہے، ہمیں ایسے ہی کسی فرد کی ضرورت ہے۔''

وہ دونوں کار سے اتر کر اسٹور کی طرف بڑھے اور اندر آئے۔ انہوں نے چند چیزیں لیں اور پھر کلیئرنس کی طرف آئے جہاں کیش کاؤنٹر تھے۔ وہیں ایک کاؤنٹر کی طرف لڑکی نے اشارہ کیا تو مرد چونکا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔''

☆☆☆

سردی شدت کی تھی، جیکٹ میں ملبوس عدیل سر جھکائے تیز قدموں سے اس عمارت میں داخل ہوا جس کے ایک فلیٹ میں اس کی رہائش تھی۔ تین کمروں کے اس فلیٹ میں سات افراد رہتے تھے اور یہ سب نوجوان اور ملازمت

پیشہ تھے جو پیسا بچانے کے لیے اس طرح رہ رہے تھے۔ فلیٹ سرفراز خان نامی شخص نے لیا تھا اور اسی نے باقی تمام افراد کو رکھا ہوا تھا۔ ہر فرد پندرہ سو روپے کرایہ اور بلوں میں اپنا شیئر دیتا تھا۔

فلیٹ اچھے تھے مگر یہاں فیملی والا ماحول نہیں تھا۔ بہت کم فیملیز یہاں رہ رہی تھیں۔ اس کے باوجود ماحول برا نہیں تھا کیونکہ تقریباً تمام ہی لڑکے یا پڑھ تعلیم حاصل کر رہے تھے یا ملازمت کر رہے تھے۔ اگر کچھ ہلکی ذہنیت کے لوگ تھے تو ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ یہاں کوئی غلط حرکت کرتے۔ فارغ لوگ بہت کم تھے۔ ان میں ایک شرجیل تھا۔ تقریباً پینتیس برس، متوسط قامت اور جسامت کا مرد تھا۔ عام سے نقوش تھے مگر ہمہ وقت سوٹ بوٹ میں نظر آتا۔ عام طور سے پرانے اسٹائل کا سن گلاسس پہنتا تھا۔ وہ واحد فرد تھا جس کے پاس پورا فلیٹ تھا اور اس کے پاس اسپورٹس کار بھی تھی۔ لباس اور لائف اسٹائل ذرا شاہانہ تھا مگر کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا ذریعۂ آمدنی کیا ہے۔ لہجے اور باتوں سے تعلیم یافتہ لگتا تھا۔ عدیل عمارت میں داخل ہوا تو سامنے ہی شرجیل اپنی کار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اس نے عدیل کو دیکھا تو آواز دی۔ ''ہیلو، یار ذرا دھکا لگا دینا۔''

''ضرور۔'' عدیل نے کہا اور گاڑی کے پیچھے آیا۔ یہ ٹوسیٹر اور چھوٹی گاڑی تھی اس لیے اس نے آرام سے دھکا لگا لیا۔ عمارت کے گیٹ تک آتے آتے گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ شرجیل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور روانہ ہو گیا۔ اس رات عدیل قریبی ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا کہ شرجیل وہاں آ گیا۔ وہ بے تکلفی سے اس کی میز پر آ گیا۔ سلام دعا کے بعد عدیل نے اسے کھانے میں شرکت کی پیشکش کی جو اس نے قبول کر لی۔ عدیل نے اس کے لیے بھی کھانا منگوایا۔ کھانا ختم ہونے تک وہ خاصے بے تکلف ہو گئے۔ شرجیل نے بتایا کہ اس کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے ہے اور وہ یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا مگر اس کا دل تعلیم میں نہیں لگا اس لیے اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور اب کمپیوٹر کے کچھ کورس کر رہا تھا۔ اس نے عدیل کو بھی کمپیوٹر کورس کرنے کا مشورہ دیا۔

''میں نے آئی ٹی کے کچھ کورس کیے ہیں۔ پرائیویٹ ٹھیکے لیتا ہوں اور اپنا خرچ نکال لیتا ہوں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں میں شہزادہ ہوں، کچھ نہیں کرتا۔ میں تو گھر میں کام کرتا ہوں۔''

عدیل کو اس کا خیال اچھا لگا۔ ''لیکن میرے پاس کمپیوٹر نہیں ہے۔''

''اب تو بہت سستا مل جاتا ہے۔ میرے پاس ایک استعمال کیا ہوا لیپ ٹاپ پڑا ہے۔ میں نے دوسرا لے لیا ہے تو وہ ایسے ہی پڑا ہے۔ تم یوز کرو اور اگر اچھا لگے تو لے لو۔''

''میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔''

''یار رقم کی بات کون کر رہا ہے مت دینا یا دینا چاہو تو قسطوں میں دے دینا۔ پہلے اسے استعمال تو کرو۔''

ہوٹل سے واپسی پر شرجیل اسے اپنے فلیٹ لے گیا۔ یہ ون بیڈ لاؤنج والا فلیٹ تھا مگر ایک فرد کے لیے بہت تھا۔ عدیل وہاں موجود سامان اور اشیائے تعیش دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ بہترین فرنیچر سے آراستہ اس چھوٹے سے فلیٹ میں سہولت اور آسائش کی ہر چیز تھی۔ یہ مکمل اے سی تھا اور لاؤنج میں بتیس انچ کا جدید ایل ای ڈی ٹی وی لگا ہوا۔ فریج میں کھانے پینے کی اشیا بھری ہوئی تھیں۔ فرش پر وال ٹو وال دبیز قالین تھا اور لاؤنج میں اعلیٰ درجے کے لیدر صوفے تھے۔ جو لیپ ٹاپ شرجیل استعمال نہیں کر رہا تھا وہ بھی تقریباً نیا اور جدید ترین تھا۔ عدیل اسے لیتے ہوئے ہچکچایا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ اس کی اوقات سے اوپر کی چیز تھی۔ دو مہینے میں اس نے جو کمایا تھا وہ خرچ ہو گیا تھا اور اسے اندازہ ہوا تھا کہ اگر وہ بہت احتیاط سے خرچ کرے تب بھی مہینے میں چار ہزار سے زیادہ نہیں بچا سکتا تھا۔ چار ہزار کا مطلب تھا سال میں پچاس ہزار روپے اور اس نے جن اچھے اداروں سے ایم بی اے کا معلوم کیا تھا وہاں سمسٹر فیس ہی لاکھ سے اوپر تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے دوسری ملازمت کرنی ہوگی یا پھر کمائی کا کوئی دوسرا ذریعۂ تلاش کرنا ہوگا۔ اس لیے جب شرجیل نے اسے کمپیوٹر کورس کا کہا تو اسے یہ خیال اچھا لگا تھا۔ اس نے شرجیل سے کہا۔

''میں شاید یہ لیپ ٹاپ نہیں...''

''میں نے کہا نا قیمت کی بات مت کرو۔'' شرجیل نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''تم اسے یوز کرو اور میں کچھ چیزیں بتا رہا ہوں وہ دیکھو، تمہیں اس کی بیسک آتی ہے نا؟''

''ہاں، میں میٹرک سے کمپیوٹر یوز کر رہا ہوں اور جہاں کام کرتا ہوں وہاں بھی سب کمپیوٹر پر ہی ہے۔''

''گڈ تب تمہارے لیے اور آسان ہوگا۔'' شرجیل نے کہا اور اسے لیپ ٹاپ میں پہلے سے انسٹال کچھ سوفٹ ویئر دکھانے لگا۔ یہ زیادہ تر اسپائی اور ہیکنگ سوفٹ ویئر تھے۔ عدیل کو عجیب تو لگا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ ایک گھنٹے میں شرجیل نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ جب عدیل نے

اسے عملی طور پر کر کے دکھایا تو اس نے پُرتحسین لہجے میں کہا۔
''تم نے تو کمال کر دیا۔ جو کچھ میں نے ایک ہفتے میں سیکھا تھا تم نے ایک گھنٹے میں سیکھ لیا۔ دوست یقین کرو تم اسی فیلڈ کے لیے بنے ہو۔ بس میرے ساتھ ایک مہینا لگاؤ پھر دیکھنا تم کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گے۔''

''لیکن ان سوفٹ ویئرز کو استعمال کہاں کرنا ہوگا؟''

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' شرجیل نے کہا۔

''ابھی تم اس کی پریکٹس کرو۔ تمہارے پاس انٹرنیٹ ہے؟''

''نہیں۔''

''کوئی بات نہیں، میرے انٹرنیٹ کے وائی فائی سے تم نیٹ یوز کر سکتے ہو۔ فلیٹ زیادہ دور نہیں وائی فائی کے سگنل وہاں تک آجائیں گے۔''

عدیل ہچکچایا۔ ''یار ایک مسئلہ اور ہے۔ میں لیپ ٹاپ وہاں رکھ نہیں سکتا۔ قیمتی چیز ہے اور کسی نے غائب کر دیا تو میں کسے الزام دوں گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ جب میں جاب سے آؤں تو لے جاؤں اور صبح یا شام کو جاتے ہوئے تمہیں دے جاؤں۔ جہاں کام کرتا ہوں وہاں بھی نہیں لے جاسکتا ورنہ وہاں لے جاتا۔''

''میں بھی باہر جاتا ہوں۔'' شرجیل نے سوچ کر کہا۔ ''خیر یہ مسئلہ نہیں ہے، تم مجھے کال کر کے بتا دیا کرنا میں فلیٹ پر ہی رہوں گا۔''

عدیل خوش ہوگیا اس کا مسئلہ حل ہوگیا تھا اور اسے اضافی آمدنی کی ایک راہ بھی سجائی دی تھی۔

☆☆☆

زاہد احمد سول سرونٹ تھا اور دارالحکومت میں رہتا تھا مگر اس نے گھر میں وہ ماحول نہیں رکھا تھا جو اب یہاں رہنے والوں کا خاصہ بن گیا ہے اور جو مادر پدر آزاد ماحول کو زندگی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ دین دار شخص تھا۔ بیوروکریسی کا مخصوص کروفر اس کی ذات کا حصہ تھا مگر مواقع ہونے کے باوجود اس نے کبھی حرام کمانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مذہب اور اس سے وابستہ اخلاقیات کو اہمیت دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مونا کی پرورش مشرقی انداز میں ہوئی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے وہ دوپٹا لینے لگی تھی جبکہ آس پاس رہنے والی لڑکیاں بہ مشکل پورا پہنتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زاہد اور ریحانہ کا پاس پڑوس سے میل جول نہیں تھا اور نہ ہی مونا نے کسی لڑکی سے تعلق رکھا تھا۔ اس کی سہیلیاں اسکول اور کالج کی وہ لڑکیاں تھیں جو اسی جیسے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ عدیل کے کزن اور ساتھ رہنے کے باوجود مونا بھی اس سے ایک حد سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوئی۔ آپس میں انسیت اور محبت کا احساس ہونے کے بعد بھی وہ کبھی اکیلے میں نہیں ملے۔

عدیل جانتا تھا کہ اگر زاہد اور ریحانہ نے اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ اس سے انحراف نہیں کر سکے گی۔ جب اسے یہ خیال آتا تو وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرتا تھا اس کا دل چاہتا کہ وہ مونا کو لے کر کہیں دور چلا جائے۔ اس دنیا میں اسے کسی سے محبت تھی اور وہ خود کو کسی کے قریب محسوس کرتا تھا تو مونا تھی۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتا۔ زاہد اور ریحانہ سے وہ پہلے ہی مایوس ہوگیا تھا۔ اب اس کے پاس واحد آسرا یہ تھا کہ وہ خود کو ان کے معیار کے مطابق بنا لے اور پھر مونا کا ہاتھ مانگے۔

اس کے باوجود عدیل اس امید پر کوشش کر رہا تھا۔ وہ آٹھ گھنٹے تک اسٹور کی ڈیوٹی کرتا اور پھر جاب سے آنے کے بعد یا جانے سے پہلے شرجیل کے پاس چلا جاتا اور اس سے بہت کچھ سیکھتا رہا پھر اپنے طور پر بھی انٹرنیٹ پر سیکھتا تھا۔ چند مہینوں میں اس نے بغیر کوئی کورس کیے بہت کچھ سیکھ لیا تھا خاص طور سے ہیکنگ اور پائریسی کے سوفٹ ویئرز کے استعمال میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس طرح سے آدمی کماتا کیسے ہے؟ یہ سوفٹ ویئر دو نمبر کاموں میں استعمال ہوتے تھے۔ ایک دن اس نے شرجیل سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اسی طرح استعمال ہوتے ہیں۔''

عدیل اچھل پڑا۔ ''یعنی چوری...؟ دوسروں کی دولت آن لائن چرانا۔''

''مزے کی بات ہے جس کی دولت آپ چراتے ہیں اسے بھی نقصان نہیں ہوتا ہے۔'' شرجیل نے کہا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی کی دولت چرالیں اور اسے نقصان نہ ہو؟''

''کیونکہ عام طور سے ان کی دولت انشورڈ ہوتی ہے۔ انشورنس کمپنیاں نقصان پورا کر دیتی ہیں اور اگر انشورنس کمپنیاں پورا نہ کریں تو بینک پورا کر دیتے ہیں۔ آدمی نقصان میں نہیں رہتا۔''

''لیکن یہ سب ہوتا کیسے ہے؟''

شرجیل نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔ ''جاننا چاہتے ہو دوست؟ جاننا آسان ہے کرنا مشکل ہے۔''

''کیوں نہیں؟''

"لیکن ایک بات کا خیال رکھنا جو دیکھو اور سنو وہ تمہاری زبان سے آگے نہ جائے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ ایک بار جاننے کے بعد واپسی کا راستہ نہیں ہوگا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ... وہ سمجھ رہا تھا کہ کام ٹھیک نہیں ہے، دو نمبر ہے اور شاید جرم کے زمرے میں آتا ہو لیکن اسے یہ بات اچھی لگ رہی تھی کہ اس میں کسی کو نقصان نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ خود کو آمادہ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے شرجیل سے کہا۔ "میں سوچ کر جواب دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، تم اچھی طرح سوچ لو اس کے بعد جو فیصلہ کرو مجھے بتا دینا۔"

☆☆☆

زاہد احمد دفتر سے نکلا تو سڑک کے پار عدیل کو موجود دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل آ گیا۔ اس نے اپنے کولیگز سے علیک سلیک کی اور ان کے رخصت ہونے کے بعد وہ سڑک پار کر کے عدیل کی طرف آیا۔ عدیل کے سلام کا جواب اس نے سرد مہری سے دیا اور بولا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

عدیل ہچکچایا۔ "چچا جان مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"تو گھر آتے یہاں کیوں آئے؟"

"میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سے باہر بات کر لوں۔"

زاہد کچھ دیر سوچتا رہا۔ عدیل کو لگا کہ وہ اس کی بات سننے سے انکار نہ کر دیں مگر پھر اس نے سر ہلایا اور کچھ دیر بعد وہ نزدیکی پارک میں بیٹھے تھے۔ "بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

عدیل نے ہمت کی اور کہا۔ "چچا جان میں مونا کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

عدیل کا خیال تھا کہ زاہد غصے میں آ جائے گا مگر خلاف توقع وہ سرد رہا اور اس نے پوچھا۔ "کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"شاید آپ جانتے ہیں، میں مونا کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں آپ کی اور چچی کی چوائس نہیں ہوں۔"

"جب تم جانتے ہو تو پھر بات کرنے کا مقصد؟"

"مونا بھی مجھے پسند کرتی ہے اور پھر چچا زاد ہونے کے ناتے میرا حق بھی ہے۔"

"وہ لڑکی ہے اور لڑکیاں ایسی حماقتیں کرتی ہیں۔ حق والی بات بھی حماقت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اس کے قابل نہیں ہو۔"

"اگر آپ کی مراد تعلیم اور حیثیت سے ہے تو آپ مجھے کچھ مہلت دیں اس کے باوجود میں آپ کے معیار پر پورا نہ اتروں تو آپ بے شک مونا کا رشتہ مجھے نہ دیں۔ مگر مجھے موقع تو دیں یہ میرا حق ہے۔" عدیل کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔ "پلیز چچا جان، میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ یہ حق تو مجھ کو دیں۔"

"ٹھیک ہے تمہارے پاس ایک سال کی مہلت ہے۔" زاہد احمد کھڑا ہو گیا۔ "اپنا گھر بنا لو اتنا ہی بڑا جتنا کہ میرا ہے اور کم سے کم اتنی آمدنی ہو جتنی کہ میری ہے تو پھر آ جانا، میں انکار نہیں کروں گا۔"

"ایک سال..." عدیل نے کہنا چاہا۔

"ایک سال بعد اسی جگہ آ جانا۔" زاہد نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ عدیل انہیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا پھر وہ خود بھی کھڑا ہو گیا اور تھکے قدموں سے پارک سے نکل آیا۔ ایک سال کا مطلب تھا کہ زاہد نے اپنے طور پر اس کی ناکامی کا مکمل بندوبست کر لیا تھا۔ ایک سال میں اس کے لیے کہاں ممکن تھا کہ وہ اتنا بڑا گھر بناتا۔ زاہد احمد کی تنخواہ پچاس سے اوپر تھی اور اس کے لیے یہ سنگِ میل حاصل کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ اس رات وہ سوچتا رہا اور بیڈ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز وہ ڈیوٹی جانے سے پہلے شرجیل کے پاس گیا۔ کال بیل کے جواب میں شرجیل آنکھیں ملتا ہوا آیا اور اسے دیکھ کر جماہی لی۔

"اتنی صبح صبح...؟"

"میں تیار ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے، شام کو آنا۔" شرجیل بولا۔

شام کو وہ ایک متوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ شرجیل نے چائے کا آرڈر دیا اور وقت گزاری کرنے لگا ایسا لگا جیسے اسے کسی کا انتظار ہے۔ عدیل نے پوچھا تو اس نے سر ہلایا۔ "ابھی کسی کو آنا ہے پھر ہم شاپنگ پر چلیں گے۔"

"کیا مطلب، تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"ابھی تم دیکھ لوگے۔"

شرجیل کا انداز ٹالنے والا تھا، عدیل خاموش ہو گیا۔ وقت گزاری کے لیے وہ چائے پینے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد ایک لڑکی ان کی طرف آئی اور بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ تقریباً چوبیس پچیس برس کی خوب

صورت لڑکی تھی۔ نقوش کسی قدر کھڑے اور آنکھیں بڑی تھیں۔ اس نے سلیقے سے میک اپ کیا ہوا تھا اور نیلے رنگ کے سوٹ میں اچھی لگ رہی تھی۔ عدیل کے لیے اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی مرد آئے گا جو شرجیل جیسی پکی صورت والا ہوگا۔ یہ لڑکی تو خوب صورت اور کہیں سے بھی غلط کام کرنے والی نہیں لگتی تھی۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائی اور پھر عدیل کے تاثرات بھانپ کر بولی۔

''ہائے، مجھے دیکھ کر حیران ہو؟''

''ہائے۔'' شرجیل نے کہا اور تعارف کرایا۔

''عدیل، یہ سمیرا ہے اور سمیرا یہ عدیل ہے، مے بی ہمارا نیو کولیگ۔''

سمیرا نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے کسی قدر جھجک کے ساتھ ہاتھ ملا لیا۔ وہ بولی۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''مجھے بھی خوشی ہوئی۔'' عدیل نے کہا اور اعتراف کیا۔ ''میں واقعی حیران ہوا ہوں۔''

''میں عدیل کو دکھانا چاہتا ہوں کہ ہم کیا اور کیسے کرتے ہیں؟'' شرجیل نے کہا اور سمیرا نے سر ہلایا تو عدیل نے محسوس کیا کہ شرجیل کی حیثیت باس جیسی تھی۔ کیونکہ سمیرا نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ''کارڈ کہاں ہے؟''

''یہ رہا۔'' سمیرا نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک ڈیبٹ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اس کا پن سترہ سترہ ہے۔''

شرجیل نے کارڈ لے کر اس کا جائزہ لیا۔ ''کم آن تم ساتھ آؤ۔ ہم ابھی واپس آتے ہیں۔''

وہ ہوٹل سے نکلے اور شرجیل کی اسپورٹس کار میں پہلے ایک اے ٹی ایم تک گئے اور پھر ایک اعلیٰ درجے کے شاپنگ سینٹر تک آئے۔ یہ کنزیومرز شاپنگ کے لیے مخصوص تھا اور یہاں برانڈڈ جوتوں سے لے کر الیکٹرانکس تک سب دستیاب تھا۔ مگر سب بہت مہنگا تھا۔ شرجیل نے عدیل سے کہا۔ ''تمہیں کچھ لینا ہے؟''

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''میری اوقات نہیں ہے۔ میں تو یہاں سے رومال بھی نہیں لے سکتا۔''

''کم آن یار۔'' شرجیل نے اسے آگے دھکیلا۔ ''سمجھ لو کہ آج کے دن تمہارے لیے یہاں سب فری ہے جو چاہے لو۔ مگر خریداری کی حد ایک لاکھ سے زیادہ نہ ہو۔''

عدیل نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟''

''اس کا موڈ نہیں ہے۔'' شرجیل نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' سمیرا مسکرائی اور ایک طرف بڑھ گئی۔ آدھے گھنٹے میں اس نے اپنے لیے دو کام والے سوٹ لیے۔ ان سے میچنگ کے ہینڈ بیگ اور جوتے لیے۔ ان سب کا بل تقریباً چالیس ہزار بنا تھا۔ شرجیل نے اپنے لیے نیا آئی فون لیا اور پھر اس نے عدیل کے منع کرنے کے باوجود اس کے لیے نائیک کے جوگرز لے لیے۔ اب بل تقریباً ستانوے ہزار بن گیا تھا۔ شرجیل نے کارڈ نکالا اور وہ تینوں ادائیگی کے لیے کیش کاؤنٹر پر آئے۔ کاؤنٹر گرل نے پوچھا۔ ''سر، کیش پے کریں گے یا کارڈ سے؟''

''کارڈ سے۔'' شرجیل نے کارڈ آگے کیا۔ لڑکی نے کارڈ لے کر مشین میں ڈالا اور عدیل سے پوچھا۔

''نیم پلیز۔''

''امان اللہ خان۔'' اس نے جواب دیا۔

عدیل چونکا گویا کارڈ کسی امان اللہ خان کا تھا۔ لڑکی بینک سے تصدیق کر رہی تھی پھر اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ''پلیز پن کوڈ ملائیں۔''

شرجیل نے سامنے لگے کی پیڈ پر پن کوڈ سترہ سترہ پنچ کیا۔ آن لائن مشین نے اسے بینک ڈیٹا سے ویری فائی کیا اور رقم کی ادائیگی ہوتے ہی خود بہ خود مشین سے اس کی رسید نکل آئی۔ لڑکی نے رسید عدیل کو دی۔ ''تھینک یو سر۔''

جب تک یہ عمل مکمل نہیں ہو گیا عدیل کا دل تیزی سے دھڑکتا رہا تھا۔ وہ شاپرز اٹھائے باہر آئے پھر گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو عدیل نے سکون کا سانس لیا۔ شرجیل نے پوچھا۔ ''کچھ سمجھے؟''

''یہی کہ تم نے ایک ڈیبٹ کارڈ سے ادائیگی کی ہے، کیا کسی کا کارڈ تمہارے ہاتھ لگ گیا ہے؟''

شرجیل مسکرایا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نہیں سمجھے حالانکہ میں تمہیں جو سکھا رہا ہوں وہ اسی سے متعلق ہے۔''

''وہ کارڈ تمہارا نہیں تھا؟''

''نہیں اور اس کا بھی نہیں تھا جس کا ڈیٹا اس میں موجود تھا۔''

سمیرا عقب سے بولی۔ ''یعنی کارڈ اور ڈیٹا دونوں چوری کے تھے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' عدیل بولا۔ ''چلو ڈیٹا تو حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن پن نمبر کیسے حاصل کیا گیا؟''

''اس کی بھی تکنیکس ہیں۔'' شرجیل نے کہا۔ ''تم نے دیکھا ایک گھنٹے میں ہم نے لاکھ روپے کی شاپنگ کر لی

اور کوئی ہمیں چیک نہیں کر سکا۔''

عدیل کو لگا اس کا سر گھوم رہا ہے۔ ایک گھنٹے میں وہ لاکھ روپے حاصل کر کے واپس جا رہے تھے اور انہوں نے نہ کوئی تالا توڑا اور نہ کسی کو لوٹا تھا۔ شرجیل کا کہنا تھا کہ اس کا بھی نقصان نہیں ہوگا جس کا کارڈ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ وہ ثابت کر سکے گا کہ کارڈ استعمال کرنے والا وہ نہیں تھا۔ اس کے بعد بینک کی انشورنس کمپنی اس نقصان کو پورا کر دے گی۔ درحقیقت کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔ سمیرا ہنسی۔ ''ہم نے مفت میں ستانوے ہزار کی شاپنگ کر لی۔''

''لیکن یہ جرم ہے۔'' عدیل نے غیر ارادی طور پر کہا۔

شرجیل نے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ جرم نہیں ہے۔ جرم وہ ہوتا ہے جس میں آدمی پکڑا جائے۔''

''اس میں بھی پکڑا جا سکتا ہے۔''

''اس کا امکان بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اس کی تو خبر تک نہیں آتی ہے۔'' سمیرا نے کہا۔ ''ہم نے آج تک جو بھی کیا ہے اس کے بارے میں بھی کوئی خبر نہیں آئی۔ کیونکہ لٹنے والے کا نقصان پورا ہو جاتا ہے، وہ خاموش ہو جاتا ہے اور بینک اور آؤٹ لیٹس والے اپنی بدنامی کے خوف سے اسے چھپا لیتے ہیں، ان کا نقصان انشورنس سے پورا ہو جاتا ہے۔''

''اس کے باوجود تمہیں لگ رہا ہے کہ یہ جرم ہے تو تم پولیس کے پاس نہیں جا سکتے۔''

''تم سمجھ رہے ہو نا۔'' سمیرا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگر یہ جرم ہے تو تم بھی اس میں شریک ہو۔''

عدیل خاموش رہا۔ شرجیل نے اسے فلیٹ کے پاس اتار دیا تھا۔ وہ اتر کر جانے لگا تو شرجیل نے اسے آواز دی۔

''یہ اپنا شاپر تو لے جاؤ۔''

عدیل کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ آیا اور شاپر لے گیا۔ اس کے جانے کے بعد سمیرا نے شرجیل سے کہا۔ ''کہیں یہ دھوکا تو نہیں کرے گا؟''

''نہیں، یہ عام سا آدمی ہے پولیس کے پاس جانے کی ہمت نہیں کرے گا۔'' شرجیل نے یقین سے کہا۔ ''یہ بہت کام کا آدمی ہے، اس سے ہم بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

''بہ شرطیکہ یہ راضی ہوا۔''

''راضی ہوگا۔'' شرجیل نے یقین سے کہا۔ ''میں نے چارا ڈال دیا ہے، مچھلی جلد یا بدیر منہ مارے گی۔''

سمیرا کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے متفق نہیں ہے مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ پھر اس نے کہا۔ ''اگر یہ نہ مانا تو کیا میں کوشش کروں؟''

شرجیل نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھتے ہیں۔''

☆☆☆

عدیل ڈیوٹی آف کر کے نکلا تو کچھ پریشان تھا۔ آج بے پناہ رش تھا۔ اس سے کیش لیتے ہوئے دو غلطیاں ہوگئیں اور غلطیاں بھی ساڑھے سات ہزار کی تھیں۔ اس پر منیجر نے اسے طلب کر لیا اور جھاڑ پلانے کے بعد اسے اطلاع دی کہ رقم اس کی تنخواہ سے کاٹی جائے گی۔ عدیل پریشان ہو گیا۔

''سر میں گزارہ کیسے کروں گا؟''

''یہ تمہارا ہیڈک ہے۔'' منیجر نے رکھائی سے کہا۔ ''کام کے وقت تمہارا دھیان کہاں ہوتا ہے۔''

''سر سارا رش میرے کاؤنٹر پر تھا اس لیے ایسا ہوا۔''

مگر منیجر سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ عدیل کی منت سماجت پر اس نے رقم دو دو ہزار کی قسطوں میں کاٹنے کا احسان کر دیا۔ وہ تیزی سے گاہکوں کو کلیئر کرتا تھا اس لیے زیادہ تر لوگ اس کی طرف آتے تھے، یوں اس پر بوجھ بڑھ جاتا۔ اپنی فطرت کے مطابق وہ جلدی کام نمٹانے کی کوشش کرتا۔ وہ دل برداشتہ تھا کہ محنت کرنے کا یہ صلہ مل رہا تھا اور جو کام چوری کرتے تھے وہ مزے میں اور محفوظ تھے۔ وہ چار بجے آف کر کے نکلا تو سردی عروج پر تھی۔ اوپر سے آسمان پر بادل تھے جو برسنے کے لیے تیار تھے۔ بدقسمتی سے آج وہ چھتری لانا بھی بھول گیا تھا۔ بارش شروع ہوئی تو اس نے ایک دکان کے شیڈ تلے پناہ لی۔ اسی وقت ایک چھوٹی کار آ کر شیڈ کے سامنے رکی اور اس کی فرنٹ سیٹ کا شیشہ نیچے ہوا۔

''عدیل یہ تم ہو؟'' کار سے سمیرا کی آواز آئی۔

''کیسے ہو تم، یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''بارش کی وجہ سے رک گیا ہوں۔'' عدیل بولا۔ ''تم کیسی ہو؟''

''فائن، آ جاؤ میرے ساتھ چلو۔''

عدیل تیزی سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

''تھینک یو، سردی بہت ہے اور یہاں تو کوئی ٹیکسی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔''

''اس علاقے میں مشکل سے ملتی ہے۔'' سمیرا بولی۔

''سردی واقعی بہت ہے، ایک کپ چائے کے بارے میں کیا خیال ہے۔''
''نہیں تم بس مجھے کسی ایسی جگہ اتار دو جہاں سے میں ٹیکسی لے لوں۔''
''میں چھوڑ دوں گی۔'' وہ بولی اور کار ایک کیفے کے سامنے روک دی۔ عدیل نے پھر منع کیا مگر وہ اسے اندر لے گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بلاوجہ کا خرچ اس کے گلے پڑ گیا۔ وہ چھوٹے دل کا آدمی نہیں تھا مگر مالی مسائل بڑھ رہے تھے اور اس کا ہاتھ تنگ ہو رہا تھا۔ سمیرا نے چائے اور اس کے ساتھ اسنیکس کا آرڈر کیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد وہ بولی۔ ''تم فکر مت کرو بل میں دوں گی۔''
''مجھے اس کی فکر نہیں...''
''کم آن۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں تم ان دنوں مشکل میں ہو۔''
عدیل چونکا۔ ''تم کیسے جانتی ہو؟''
''میں چہرے کے تاثرات سے بتا سکتی ہوں کہ آدمی کیوں پریشان ہے۔'' سمیرا نے دعویٰ کیا۔ ''تم اس دن کے بعد شرجیل سے بھی نہیں ملے۔''
عدیل نے گہری سانس لی۔ ''میں نے اس بارے میں سوچا اور مجھے لگا کہ یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں مارا جاؤں گا۔''
''تمہارا مطلب ہے گرفتاری اور جیل تو اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔''
''امکان تو ہے، آدمی کو تقدیر بھی پھنسا دیتی ہے۔ تم یہ سب کرتی آئی ہو اس لیے ایسا سوچ سکتی ہو لیکن میرے لیے بہت مشکل ہے۔''
عدیل کی بات پر سمیرا کے چہرے کا رنگ بدلا تھا شاید یہ بات اسے تھپڑ بن کر لگی تھی مگر اس نے فوراً خود پر قابو پالیا۔ ''آج کل ایسی باتوں کی پروا کون کرتا ہے؟''
''میں کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے مجھ جیسے بہت سے لوگ کرتے ہوں گے اس لیے میں پیچھے ہو گیا۔ مگر اطمینان رکھو یہ بات ہمیشہ میرے سینے میں رہے گی اور میں کبھی کسی کے سامنے یہ راز نہیں کھولوں گا۔''
''ہمیں اطمینان کی نہیں تمہاری ضرورت ہے۔'' سمیرا بولی۔ آج اس نے تنگ جینز کے ساتھ بڑے گلے والی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور اوپر فر والی جیکٹ تھی۔ اس کے پیروں میں لیدر کے لانگ بوٹ تھے جو ہائی ہیل بھی تھے۔ یہ تمام چیزیں بہت قیمتی تھیں۔ سمیرا کہتے ہوئے خاص انداز سے آگے کی طرف جھکی۔ ''مگر ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ہو جاؤ۔ تمہاری مالی مشکلات دور ہوں۔''
عدیل اس سے نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔ ''میں محنت کر رہا ہوں شاید مجھے کوئی اچھی جاب مل جائے۔''
''ابھی تم بارہ ہزار لے رہے ہو اور اگر تمہیں دوسری جاب مل گئی تو کتنی تنخواہ مل جائے گی۔ پندرہ ہزار بہت ہوا تو بیس ہزار۔''
''میں جانتا ہوں لیکن...'' ویٹر کے آنے پر عدیل خاموش ہو گیا پھر اس کے جانے کے بعد اس نے دوبارہ بات شروع کی۔ ''میں نے کہا نا میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔''
سمیرا نے چائے بنا کر اس کے سامنے رکھی۔ ''لیکن اس میں کسی کا نقصان نہیں ہے۔''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں اندر سے خود کو آمادہ نہیں پا رہا ہوں۔''
''تم مجھے اچھے لگتے ہو۔'' سمیرا نے اچانک اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بے تکلفی سے کہا۔ ''اگر تم ہمارے ساتھ آجاؤ تو ہمارے درمیان بہت اچھی دوستی ہو سکتی ہے۔'' سمیرا نے لفظ دوستی پر زور دیا تھا۔ عدیل کا جسم سنسنا اٹھا۔ وہ نوجوان تھا اور کسی بھی لڑکی کا لمس اسے برا کیسے لگ سکتا تھا۔ پھر سمیرا کی پیشکش بہت واضح تھی۔ مگر اسی لمحے اسے مونا کا خیال آیا اور اس کی سنسناہٹ خود بہ خود ختم ہو گئی۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔
''پلیز، مجھے مجبور مت کرو۔''
سمیرا کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر بدلا... مگر وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی، اس نے لمحے میں خود کو نارمل کر لیا اور مسکرائی۔ ''جیسے تمہاری مرضی لیکن مجھے یقین ہے تم جلد ہمارے ساتھ ہو گے۔''
''ممکن ہے مگر فی الحال میں خود کو راضی نہیں کر پا رہا۔''
''میں پاس ہی رہتی ہوں۔ کیا خیال ہے آج رات کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ میں بہت اچھی کک ہوں۔''
''نہیں، میں بہت تھکا ہوا ہوں اور بھوک بھی نہیں ہے۔'' عدیل نے انکار کیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ سمیرا اس کے گرد جال سا پھیلا رہی ہے جیسے اسے ہر صورت گھیرنے کے چکر میں ہو۔ وہ بچ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ بات خراب بھی نہ ہو۔ کیونکہ شرجیل خطرناک آدمی تھا۔ اس کے پاس رہ کر عدیل کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے چائے کے

ساتھ اسنیکس لیے اور موضوع بدل دیا۔ وہ سمیرا سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ سمیرا نے بتایا کہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ ایک بہن ہے جو اپنی زندگی میں مگن ہے اور پلٹ کر اسے پوچھتی بھی نہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ جاب کرتی رہی لیکن اکیلی ہونے کی وجہ سے وہاں موجود لوگ اس پر دانت چمکانے لگتے جیسے وہ لاوارث مال ہو۔ اس نے کئی ملازمتیں بدلیں اور ہر بار اسے لوگوں کے اسی رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ تب اس کی ملاقات شرجیل سے ہوئی اور وہ اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔

''آج میں بہت اچھی جگہ رہتی ہوں۔ بے شک کرائے کی جگہ ہے مگر وہاں کوئی مجھ سے کچھ نہیں پوچھتا اور نہ ہی پاس پڑوس والے مجھ پر نظریں لگا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ میرے پاس گاڑی ہے، آزادی ہے اپنی مرضی سے اور مزے کی زندگی گزارتی ہوں۔''

''تم خوب صورت ہو جوان ہو، کیا کسی نے تم کو شادی کی آفر نہیں کی؟''

''تم کرو گے مجھ سے شادی؟''

''میں۔'' عدیل ایک لمحے کو گڑبڑایا مگر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ''میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا مگر میں کسی اور کو چاہتا ہوں۔''

سمیرا ہنسی۔ ''میں نے جس سے بھی یہ سوال کیا اس نے ایسا ہی کوئی نہ کوئی بہانہ کیا صرف شرجیل نے واضح کہا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''میں نے بہانہ نہیں کیا۔'' عدیل نے احتجاج کیا۔ ''یہ حقیقت ہے، میں اپنی کزن سونا سے محبت کرتا ہوں اور میں صرف اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہو سکتا ہے، میں نے تم کو جھوٹا نہیں کہا۔'' سمیرا نے کہا اور پرس سے ایک بڑا نوٹ نکال کر چائے کی پیالی کے نیچے رکھا اور کھڑی ہو گئی۔ عدیل اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سمیرا کے جانے کے بعد اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔

زاہد چچا سے گفتگو کے بعد اس نے جذباتی ہو کر شرجیل سے کہہ دیا تھا کہ وہ تیار ہے لیکن جب انہوں نے اسے عملی طور پر دکھایا کہ وہ کیا کرتے ہیں تو عدیل کا اقرار انکار میں بدل گیا۔ اس نے زبان سے نہیں کہا لیکن شاپنگ والے واقعے کے بعد سے عدیل شرجیل سے نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس نے اس سے لیپ ٹاپ لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ان لوگوں سے دور ہی رہنا مناسب ہوگا۔ مگر آج سمیرا کی طرف سے پیش قدمی نے اسے نئے خدشات سے دوچار کر دیا تھا۔ فلیٹ تک آتے ہوئے اس نے ایک فیصلہ کیا اور ڈبے میں بند جوگرز لے کر باہر آیا۔ اس کا رخ شرجیل کے فلیٹ کی طرف تھا۔ اس نے کال بیل بجائی تو شرجیل نے دروازہ کھولا۔ وہ حسب معمول سوٹڈ بوٹڈ تھا اور رات کے وقت اس نے سن گلاس بھی لگا رکھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''تم آج کیسے راستہ بھول گئے؟''

''میں یہ واپس کرنے آیا ہوں۔'' اس نے جوگرز کا شاپر آگے کیا۔

''آؤ اندر آؤ، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' شرجیل نے شاپر نظر انداز کر کے کہا۔ عدیل نہ چاہتے ہوئے بھی اندر چلا گیا۔ شرجیل نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''بیٹھو اور یہ بتاؤ کہ کافی چلے گی؟''

عدیل نے سر ہلایا تو اس نے کیتل سے کافی مگ میں ڈال کر اس کے سامنے رکھی۔ ''چینی اور کریم اپنی مرضی سے ملا لو۔''

عدیل نے چینی اور کریم ملائی۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تمہاری سمیرا سے ملاقات ہوئی ہے؟''

عدیل نے سر ہلایا۔ ''ہاں وہ مجھے راستے میں ملی تھی۔ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں راضی کرنے کی کوشش کرے گی مگر میں نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ بہت مشکل ہے، تم اس قسم کے لوگ نہیں ہو۔''

''آئی ایم سوری، میں نے تم سے کہا کہ میں تیار ہوں اور پھر میں پیچھے ہٹ گیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' شرجیل نے عجیب سے انداز میں کہا اور اچانک کوٹ کی جیب سے ایک پستول نکال لیا۔ عدیل ایک لمحے کو لرزا تو کافی چھلک کر گرتے گرتے بچی۔ اسے اسلحے کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا مگر اسے یہ پستول دیکھنے میں مہلک لگ رہا تھا۔ ''موسم سرد ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے اس موسم میں ڈرائیو کر کے مزہ آتا ہے۔''

''باہر بارش ہو رہی ہے۔'' عدیل نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''ایسے میں مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔'' شرجیل کھڑا ہو گیا۔ پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''آؤ چلیں۔''

''میں... میں تھکا ہوا ہوں۔'' عدیل نے انکار کرنا چاہا مگر شرجیل نے سنا نہیں، اس نے عدیل کا بازو پکڑا اور اسے

تقریباً کھینچ کر ساتھ لے گیا۔ وہ خود میں اتنی جرأت نہیں پا رہا تھا کہ اپنا بازو چھڑا سکتا۔ وہ دونوں نیچے پارکنگ میں آئے اور شرجیل نے اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل دیا۔ سردی اور بارش کی وجہ سے سناٹا تھا اور کسی نے ان کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ گیٹ کا گارڈ بھی اپنے کیبن میں تھا۔ اس نے باہر جھانکنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ شرجیل نے گاڑی باہر نکالی اور وہ شمال کی طرف جانے والی ہائی وے پر آگئے۔ اس وقت ہائی وے سنسان تھی اور شرجیل کار کی اسپیڈ بڑھانے لگا۔ عدیل بے چین ہوگیا۔ "اس موسم میں اتنی تیز رفتاری خطرناک ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے خطروں سے کھیلنا اچھا لگتا ہے۔" شرجیل بولا اور اس نے کار کی رفتار مزید بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد سڑک پہاڑوں کے درمیان بل کھانے لگی اور جب شرجیل اسٹیئرنگ کاٹتا تو کار کے پہیے سڑک پر پھسلتے تھے۔ "تم دیکھ چکے ہو کہ ہم کیا کرتے ہیں؟"

"ہاں لیکن میں نے سمیرا سے بھی وعدہ کیا اور تم سے بھی کہہ رہا ہوں کہ اس بارے میں میری زبان بند رہے گی۔ میں کسی سے ایک لفظ نہیں کہوں گا۔"

"مجھے یقین ہے۔" شرجیل نے گیئر بدل کر ایکسی لیٹر دبایا۔ "لیکن مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"میں...."

"ابھی کچھ مت کہو۔" شرجیل نے اس کی بات کاٹی۔ "مجھے توجہ سے ڈرائیو کرنے دو یہاں ذرا سی غلطی آخری غلطی بن جاتی ہے۔"

اس نے ایک موڑ کاٹا تو زور میں عدیل دروازے کی طرف گیا اور اس سے چپک گیا۔ اس طرف گہری کھائی کو بہت نزدیک دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایک لمحے کو لگا کہ کار سڑک سے اتر جائے گی اور پھر کوئی اسے گہرائی میں جانے سے نہیں روک سکے گا۔ مگر شرجیل کسی طرح اسے سڑک پر رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ عدیل نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"انجوائے۔" شرجیل نے چلا کر کہا۔ انجن اور پہیوں کا شور بہت بلند تھا اور انہیں اب اونچی آواز میں بات کرنا پڑ رہی تھی۔ "کیا تم نہیں کر رہے ہو؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرتے ہو اور مونا کو اپنانے کا پلان بنا رہے ہو۔" شرجیل نے طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے ایک اور خطرناک موڑ کاٹا۔ "بزدل آدمی کچھ نہیں کرسکتا۔ اسے پسند کی نوکری ملتی ہے اور نہ پسند کی لڑکی۔"

عدیل چونکا۔ "تم مونا کے بارے میں جانتے ہو؟"

"میں نے تمہیں اپنا رازدار ایسے ہی نہیں بنایا۔ کیا میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں جو کسی اجنبی کو اپنے کام کے بارے میں بتاؤں اور کرکے دکھاؤں۔"

"تو تم میرے بارے میں سب جان چکے ہو۔"

"بالکل۔" شرجیل نے رفتار برقرار رکھتے ہوئے ایک اور تنگ موڑ کاٹا اور گیلی سڑک پر اس کی کار پھسلتی چلی گئی۔ بالکل آخری لمحے میں اس نے کار کو کھائی میں جانے سے روکا۔ یہاں بارش ہو کر رک گئی تھی اور سڑک پر نمی موجود تھی۔ تاریکی میں کھائی کسی مہیب جانور کے منہ کی طرح کھلی جیسے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس بار عدیل زیادہ خوفزدہ ہوا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"تم دیکھ رہے ہو۔" شرجیل نے بے پروائی سے کہا۔ آگے ایک اور تنگ موڑ آ رہا تھا اور شرجیل نے رفتار میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

"وہ....وہ...." عدیل ہکلایا۔ اسی لمحے شرجیل نے اسٹیئرنگ گھمایا اور کار کے پہیے پوری طاقت سے چرچرائے۔ سڑک پر گرفت برقرار رکھنے کی کوشش میں وہ سلپ ہو رہے تھے اور جیسے ہی موڑ مکمل ہوا وہ کنارے کی طرف جانے لگے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا تھا اسی لمحے سامنے سے ایک گاڑی نمودار ہوئی تھی اور وہ تیزی سے ان کی طرف آ رہی تھی کیونکہ وہ رانگ سائیڈ پر تھی۔ عدیل تقریباً شرجیل پر جا پڑا۔ تیز روشنی کو نزدیک آتے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ شرجیل کار کو سڑک سے اترنے سے بچا رہا تھا اور اس کے پہیے کنارے لگی ریلنگ کے ستونوں سے رگڑ کھا رہے تھے۔ ریلنگ کے ستون کسی قدر خمیدہ تھے اس لیے کار کی باڈی ان سے نہیں ٹکرا رہی تھی، جب تک کار شرجیل کے قابو میں آتی سامنے سے آتی کار سر پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے پوری قوت سے بریک لگائے اور عدیل سامنے ڈیش بورڈ پر جا پڑا۔ وہ نہیں جان سکا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی شرجیل کی کار سے کیوں نہیں ٹکرائی۔ وہ اسے چھوتی ہوئی ضرور گزری تھی مگر وہ تصادم سے بچ گئے تھے۔ بہت دیر تک تو عدیل کو اپنے بچ جانے کا یقین ہی نہیں آیا اور جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے چلا کر کہا۔

"تم پاگل ہو گیا؟"

''نہیں۔'' شرجیل نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں بتانے کی کوشش کی ہے کہ خطرات میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں نے تمہیں پستول دکھایا اور تم ڈر گئے، یہ کتنا آسان کام ہے لیکن جو میں نے کیا، کیا وہ بھی آسان ہے۔''

''نہیں۔'' عدیل نے غیر ارادی طور پر کہا۔

''بس تو اس سے اندازہ لگا لو میں کیسا آدمی ہوں۔ میں نہ دھوکا دیتا ہوں اور نہ دھوکا برداشت کرتا ہوں۔ دوست یہ زندگی ہے نو رسک، نو گیم۔''

عدیل سمجھ رہا تھا کہ شرجیل اور سمیرا ہر صورت اسے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس نے شرجیل کی طرف دیکھا تو پستول کی نال اس کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر تھی۔ اس نے بے بسی سے شرجیل کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا تو وہ مسکرانے لگا۔ اس نے پستول واپس رکھا اور بولا۔ ''تم دیکھنا بس کچھ ہی عرصے میں تم اتنا کما لوگے کہ اپنے سارے خواب پورے کرسکو۔''

☆☆☆

یہ فلیٹ زیادہ بڑا نہیں تھا اور باقاعدہ فلیٹ بھی نہیں تھا۔ ایک نواحی علاقے میں ایک عمارت کے دوسرے فلور پر دو بیڈ رومز اور لاؤنج کا سادہ سا فلیٹ تھا۔ اس کے نیچے دکانیں تھیں۔ عدیل نے اپنا بیگ پٹخا اور بولا۔ ''تو ہمیں یہاں رہنا ہے۔''

''بالکل اب تمہارا وہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا، کیا ملازمت بھی چھوڑ دوں۔''

''نہیں ملازمت کرتے رہو۔'' شرجیل نے کہا۔ ''یہی تو کام آئے گی۔''

سمیرا ایک طرف بیٹھی بے نیازی سے اپنے ناخن فائلر سے ہموار کررہی تھی۔ شرجیل کی بات پر عدیل چونکا۔ ''میری جاب کام آئے گی، وہ کیسے؟''

''یہ میں تمہیں آرام سے بتاؤں گا۔'' شرجیل نے اپنا سامان ایک کمرے میں لے جاتے ہوئے کہا۔

عدیل کے پاس اس کی پیشکش قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب اس نے اثبات میں جواب دیا تو شرجیل نے واپس آکر اسے حکم دیا کہ وہ اپنا سامان لے آئے اب انہیں کہیں اور رہنا تھا۔ عدیل اپنا مختصر سامان لے آیا۔ اس کی واپسی تک شرجیل نے اپنا سامان سمیٹ لیا تھا جو ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ پر مشتمل تھا۔ وہ نیچے آئے اور روانہ ہوئے۔ عدیل نے پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں نے ہنگامی حالات کے لیے ایک ٹھکانا رکھا ہے۔ وہیں جارہے ہیں۔'' شرجیل نے کہا اور سمیرا کو کال کی۔ ''عدیل ہمارے ساتھ ہے، ہاں نمبر تو جارہے ہیں... او ہو بحث مت کرو۔ کل تم وہاں آجانا۔ اب ہمیں ذرا الگ رہ کر کام کرنا ہے۔''

آدھے گھنٹے بعد وہ اس فلیٹ میں تھے۔ سردی کی وجہ سے بازار بند تھا اور وہاں سناٹا تھا جبکہ گرمی میں وہاں بارہ بجے تک چہل پہل رہتی تھی۔ دو بیڈ رومز تھے ایک شرجیل کے حصے میں آیا اور دوسرا عدیل کو ملا۔ دونوں بیڈ روم فرنش تھے اور نرم گرم بستر پر اس کی رات اچھی گزری تھی۔ کمبل بھی بہت اچھا تھا اس لیے ہیٹر نہ ہونے کے باوجود اس میں رات گزرنے کا پتا نہیں چلا۔ کچھ دیر تو عدیل جاگتا اور سوچتا رہا مگر پھر نیند غالب آگئی۔ اس کی آنکھ کھلی اور واش روم سے فارغ ہوکر باہر آیا تو سمیرا لاؤنج کے ساتھ بالکونی میں بیٹھی ہوئی تھی اور دھوپ سینکتے ہوئے سامنے نظر آنے والی پہاڑیوں کا نظارہ کررہی تھی۔ عدیل نے شرجیل کا پوچھا تو سمیرا نے کہا۔ ''وہ ناشتا لینے گیا ہے... کیا تم سچ مچ ہمارے ساتھ ہو؟''

''ہاں ورنہ میں یہاں کیوں ہوتا۔'' عدیل نے بدمزگی سے کہا۔ ''اس نے جس طرح مجھ سے اپنی بات منوائی وہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ وہ بالکل پاگل ہورہا تھا، ایسا لگ رہا تھا اسے اپنی جان کی پروا بھی نہ ہو۔''

''وہ ایسا ہی شخص ہے۔'' سمیرا بولی پھر شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ ''تم نے میری بات نہیں مانی، میری انسلٹ کی۔''

''میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔'' عدیل نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں نے تمہیں مونا کے بارے میں بتایا تو تھا۔''

''کسی لڑکی کی اس سے زیادہ توہین کیا ہوگی کہ کسی دوسری لڑکی کو اس پر ترجیح دی جائے۔'' سمیرا نے تنک کر کہا اور منہ پھیر لیا۔ عدیل کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔ وہ کچن میں آکر چائے بنانے لگا۔ شرجیل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس نے دو کپ بنائے اور ایک سمیرا کو لاکر دیا تو اس نے خاموشی سے لے لیا۔

''آئی ایم سوری۔'' عدیل نے کچھ دیر بعد کہا۔

''اِٹس اوکے۔'' وہ بولی۔

عدیل مسکرایا۔ ''معاف کرنا، تم مجھ پر مہربان نہیں تھیں بلکہ اسکرپٹ کے تحت سب کررہی تھیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ”تم نے ٹھیک کہا، اس کے باوجود میں نے قتل کیا۔“

عدیل نے موضوع بدل دیا۔ ”تم دیکھنے میں بہت سادہ سی لڑکی لگتی ہو، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم شرجیل کے ساتھ کیسے آگئیں؟“

”تم کیسے آئے؟“ سمیرا نے کہا۔ ”کیا تمہیں اب بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔“

”اس نے پہلے خوفناک ڈرائیونگ کر کے مجھے دہشت زدہ کیا اور پھر مجھ پر پستول نکال لیا تھا۔“

”وہ چلا بھی سکتا ہے۔“ سمیرا نے کہا۔ ”میرے سامنے اس نے ایک آدمی کو شوٹ کیا تھا۔ وہ اس کے لیے خطرہ بن گیا تھا اور مخبری پر آمادہ تھا۔“

عدیل اندر سے ہل گیا... مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ”وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے، اس نے میرے کام کی جگہ کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس کا کیا مطلب؟“

”تم بہت سادہ ہو، ہم وہاں سے ڈیبٹ کارڈ ڈیٹا اور پن کوڈ حاصل کریں گے۔“

عدیل حیران ہوا۔ ”وہ کیسے، وہاں کسی قسم کی مشین لگانا ممکن نہیں ہے کیونکہ سارا سیٹ اپ پہلے سے ہوا ہوتا ہے اور پھر میں پن کوڈ نہیں دیکھ سکتا۔“

”سب ہو جائے گا۔“ سمیرا بولی۔ ”ہم پہلی بار یہ کام نہیں کر رہے ہیں۔ جلد تم طریقہ جان لوگے اور اس کے استعمال میں مہارت بھی حاصل کر لوگے۔“

”تم کب سے اس کے ساتھ ہو؟“

”تین سال سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس عرصے میں تم لوگوں نے اس قسم کے کتنے کام کیے؟“

”لاتعداد، جس لڑکے کو شرجیل نے شوٹ کیا، وہ ایک بڑے پیٹرول پمپ پر کام کرتا تھا اور وہاں سے کارڈ ڈیٹا اور پن کوڈز حاصل کر کے ہمیں دیتا تھا۔ مگر اس نے غلطی سے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ ہاتھ کیا اور وہ جان کو آگیا۔ کوئی ثبوت نہیں تھا مگر لڑکا ڈر گیا۔ وہ پولیس کے پاس جانے کو تیار تھا اور شرجیل کو اسے شوٹ کرنا پڑا۔“

عدیل اندر سے کانپ اٹھا... اگر اس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو شرجیل اسے بھی مار دیتا۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ اس سے تعلق ہی کیوں رکھا؟ مگر اسے کہاں معلوم تھا کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے۔ جب اس نے پستول نکالا تو اس کے تاثرات ہی بدل گئے تھے اور وہ سفاک دکھائی دینے لگا تھا۔ عدیل کو لگا کہ اس نے انکار کیا تو وہ اسے گولی مارنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ فلیٹ کا داخلی دروازہ کھلا اور شرجیل شاپرز لیے اندر آیا۔ اس نے شاپرز ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیے اور اعلان کیا۔ ”ناشتا حاضر ہے۔“

ناشتے میں حلوہ پوری اور بیکری کے آئٹم تھے۔ اس کے ساتھ شرجیل لنچ کے لحاظ سے بھی چیزیں لے آیا تھا۔ آج سے عدیل کی ڈیوٹی بدل گئی تھی اور اب اسے ایوننگ شفٹ میں جانا تھا۔ ناشتے کے بعد شرجیل نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور ان دونوں کو بلا لیا۔ وہ تینوں ایک ہی صوفے پر آگئے تاکہ اسکرین دیکھ سکیں۔ شرجیل نے ایک ویڈیو چلائی۔ یہ اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی ویڈیو تھی جہاں عدیل کام کرتا تھا اور ویڈیو شاید پارکنگ سے بنائی گئی تھی۔ وہاں تین منزلہ پارکنگ تھی اور ویڈیو درمیانی فلور سے بنائی گئی تھی۔ کیمرا زوم ہوا اور شیشوں کے پاس اندر کا منظر دکھائی دینے لگا... اندر خارجی راستے پر بنے ہوئے پانچ میں سے تین کیش کاؤنٹر یہاں سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کی پیڈز جن کا رخ گاہک کی طرف ہوتا ہے وہ بھی نظر آرہے تھے۔ شرجیل نے کہا۔

”دیکھو یہاں سے کی پیڈز دکھائی دے رہے ہیں۔“

عدیل نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا، اس طرح سے پن کوڈ حاصل کیا جائے گا مگر ضروری نہیں ہے کہ کیمرے سے نظر آئے، کیونکہ بہت سے لوگ چھپا کر پن کوڈز ملاتے ہیں۔“

”ہاں لیکن کچھ لوگ اسے چھپانا ضروری نہیں سمجھتے۔ صرف پن کوڈ دیکھ لینے سے کوئی کارڈ استعمال نہیں کر سکتا، اس کے لیے کارڈ ہونا بھی لازمی ہے۔ یہ لک گیم ہے۔“

”مگر یہ کریں گے کیسے، صرف کیمرے سے دیکھ کر پن کوڈز دیکھ لینا کافی نہیں ہے۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ شرجیل نے کہا اور اندر سے ایک جدید ترین آئی پیڈ لے آیا۔ ”یہ دیکھو مکمل کمپیوٹر ہے۔ تم سوئپ مشین کے بارے میں تو جانتے ہو؟“

عدیل نے سر ہلایا اس کے باوجود شرجیل نے بتانا ضروری سمجھا۔ ”سوئپ مشین ایک ایسی مشین ہوتی ہے جس کے ساتھ کسی قسم کا کارڈ لگایا جائے تو وہ اس کا ڈیٹا نکال لیتی ہے چاہے وہ پاس ورڈز سے محفوظ کیوں نہ کیا گیا ہو۔ اس مشین کا استعمال عام طور پر غیر قانونی ہے مگر یہ چور بازار میں مل جاتی ہے۔ اے ٹی ایم بھی اصل میں سوئپ مشین ہی ہوتی ہے۔ اس طرح مختلف جگہوں پر استعمال ہونے والی کارڈ

پچنگ مشینیں بھی اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر اب اس کے جدید اور چھوٹے ماڈل آگئے ہیں، یہ دیکھو۔''

شرجیل نے اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹی آئی فون سائز کی سیاہ منی سوئپ مشین نکالی اور اسے وائر کی مدد سے آئی پیڈ کی یو ایس بی سے منسلک کیا۔ پھر اس نے ایک ڈیبٹ کارڈ نکال کر سوئپ مشین کی سلاٹ میں ڈالا اور اس نے خود کار انداز میں کارڈ کا ڈیٹا اٹھا کر آئی پیڈ میں کاپی کرنا شروع کر دیا۔ شرجیل گنتی گن رہا تھا۔ ''ایک... دو... تین... چار... پانچ۔'' اس نے کارڈ سوئپ مشین سے نکال لیا۔ ''بس پانچ سیکنڈ میں اس نے ڈیٹا اٹھا لیا۔''

عدیل متاثر ہوا تھا۔ ''یہ تو بہت تیز ہے۔''

''بہت مہنگی بھی ہے، یہ دونوں چیزیں اور ان کا مخصوص سوفٹ ویئر مجھے پانچ لاکھ کا پڑا ہے۔''

''مگر اس نے تمہیں دس گنا کما کر بھی دیا ہے۔''

شرجیل نے سمیرا کی بات نظر انداز کی اور عدیل سے کہا۔ ''تمہیں اس کے استعمال میں مہارت حاصل کرنا ہوگی۔''

''مہارت کیسی، اس کا استعمال تو بہت آسان ہے۔'' عدیل نے کہا۔ ''بچہ بھی کر سکتا ہے۔''

''پستول بچہ بھی چلا سکتا ہے مگر اس کے استعمال میں بھی مہارت حاصل کرنی پڑتی ہے۔'' شرجیل نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کا فرق زندگی و موت کا فرق بن جاتا ہے۔ تمہیں ایسے استعمال کرنا ہوگا کہ کسی کو علم نہ ہو۔ اگر پکڑے گئے تو بچت مشکل ہوگی۔ اس لیے مہارت لازمی ہے۔''

''میں اسے سکھا دوں گی۔'' سمیرا نے کہا۔ ''فی الحال تم اسے طریقہ کار سمجھاؤ۔''

''تمہارے اسٹور میں زیادہ تر بڑی آسامیاں آتی ہیں کیونکہ یہاں سب کچھ مہنگا اور پوش طبقے کے لیے ہے۔ مگر ہمارے ہاں کارڈ کا استعمال کم لوگ کرتے ہیں اور زیادہ تر کیش ڈیل کرتے ہیں۔ پھر بھی اس کا رجحان پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو گیا ہے۔ تمہیں ان تین کیش کاؤنٹر میں سے کسی ایک کاؤنٹر کا انتخاب کرنا ہوگا کیونکہ یہ ہمارے کیمرے کی رینج میں ہیں۔''

''اتفاق سے میں ان ہی تینوں میں سے کسی ایک کاؤنٹر پر ہوتا ہوں کیونکہ یہ کارنر کے ہیں اور ایگزٹ کے پاس ہیں، ان پر ہی سب سے زیادہ رش ہوتا ہے۔''

''جب کوئی کارڈ دے تو تم ہمیں خبردار کرو گے۔ ہم کیمرے سے کی پیڈ کی مووی بنائیں گے۔''

''کیا تم لوگ سارا دن وہاں رہو گے؟''

''نہیں رش آورز میں دو سے تین گھنٹے ہوں گے۔ اس سے زیادہ دیر مشکل ہے۔''

''ہاں پارکنگ گارڈ چیک کرتے ہیں۔''

''ہمیں نہیں چیک کر سکیں گے مگر گاڑی سے ضرور چوکنا ہو سکتے ہیں۔'' شرجیل نے بات جاری رکھی۔ ''تمہاری طرف سے اشارہ ملنے کے بعد ہم اپنا کام کریں گے۔''

''ایک منٹ، میں اشارہ کیسے دوں گا؟''

''یہ دیکھو۔'' شرجیل نے جیکٹ سے ایک چھوٹا نصف کٹے سیب جتنا اور صورت کا آلہ نکالا۔ ''یہ ریسیور ہے اور یہ اس کا بٹن ہے۔'' شرجیل نے دوسرا آلہ نکالا جو انگوٹھی کی صورت کا تھا اس پر بڑے سائز کا سیاہ نگ لگا ہوا تھا۔ ''یہ نگ دباؤ گے تو یہ اشارہ دے گا۔'' اس نے نگ دبا کر دکھایا جس پر آلے سے دو بار بپ کی آواز آئی۔ ''ہمیں پتا چل جائے گا۔''

''او کے یہ کام میں کر لوں گا مگر یہ سوئپ مشین کیسے استعمال کروں گا۔ کارڈ مشین سامنے ہوتی ہے اور کسٹمر اسے دیکھتا ہے۔''

''یہیں تو تمہیں مہارت حاصل کرنی ہے۔'' سمیرا بولی۔ ''تم کسٹمر کو الجھاؤ گے اس کی توجہ کارڈ سے ہٹاؤ گے اور اس دوران میں اسے سوئپ مشین میں استعمال کر لو گے۔ مگر اسے شک نہیں ہونا چاہیے کہ تم نے کارڈ کہیں اور یوز کیا ہے ورنہ وہیں پکڑے جا سکتے ہو۔''

عدیل فکر مند ہو گیا۔ ''ہاں اس کا خطرہ ہے۔''

''اس کام میں بس یہی ایک خطرہ ہے۔''

''یہ خطرہ بھی کم نہیں بلکہ سارا خطرہ مجھے ہی لینا ہوگا۔'' عدیل نے اسے یاد دلایا۔ ''تم لوگ تو باہر ہو گے اور کوئی گڑبڑ ہوئی تو فرار میں دیر نہیں لگاؤ گے۔ اگر میں نے تمہارے بارے میں بتایا تب بھی پولیس تم تک نہیں پہنچ سکے گی اور میں مارا جاؤں گا۔''

''ہمارے ہاں اس بارے میں قوانین نہیں ہیں اس لیے عدالت سے سزا تو بہت مشکل ہے۔'' شرجیل نے اسے تسلی دی۔ ''باقی رہی پولیس تو اس سے نمٹا جا سکتا ہے۔ تم فکر مت کرو ہم تمہیں چھوڑ کر فرار نہیں ہوں گے۔ لیکن تم بھی ہمیں چھوڑنے کا مت سوچنا۔'' شرجیل کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''اب تمہیں سمیرا سکھائے گی۔''

شرجیل کو باہر کام تھا وہ کچھ دیر بعد چلا گیا... اس

کے جانے کے بعد سمیرا نے اسے سکھانا شروع کر دیا کہ اسے سوئپ مشین کیسے استعمال کرنی ہے۔ اس نے آئی پیڈ ایک مخصوص واسکٹ نما شیلف میں رکھ کر اسے یوں پہنایا کہ آئی پیڈ اس کی پشت پر آ گیا۔ سوئپ مشین اس سے منسلک تھی اور وہ خودکار طریقے سے کام کرتی۔ جیسے ہی اس میں کوئی الیکٹرانک کارڈ ڈالا جاتا یہ اس کا سارا ڈیٹا اٹھا کر آئی پیڈ کے مخصوص فولڈر میں کاپی کر دیتی۔ سمیرا خود اسے سب کر کے بتا رہی تھی اسی نے جیکٹ پہنائی اور پھر سوئپ مشین اس کی پتلون بیلٹ کے ساتھ ایک خاص کلپ سے لگائی۔ اس سے آسانی ہوگئی تھی کہ بنا مشین کو پکڑے اس میں آرام سے کارڈ ڈالا اور پھر نکالا جا سکتا تھا۔ پھر سمیرا اسے پریکٹس کرانے لگی کہ بہت تیزی سے کارڈ ڈالنا اور نکالنا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ سامنے کھڑے کسٹمر کو شک نہ ہو۔

''یہ سب سیکنڈوں کا کھیل ہے۔ پانچ سیکنڈ میں حساب پورا رکھنا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تمہیں اصل میں سات آٹھ سیکنڈ ملیں گے۔ اس سے زیادہ مشکل ہیں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔ سمیرا نے اسے طریقہ سمجھایا کہ کس طرح سے کارڈ استعمال کرنا ہے کہ مالک کو شک نہ ہو۔ ساتھ ہی اس کی توجہ بھٹکانی ہے۔ یہ سب بتاتے ہوئے وہ اکثر اس کے بہت نزدیک آجاتی تھی اور عدیل جھینپ جاتا۔ سمیرا نے اس کی کیفیت محسوس کر لی۔

''کم آن اس وقت ہم ٹیم ہیں، یہ ذہن سے نکال دو کہ میں لڑکی اور تم لڑکے ہو۔''

عدیل کھسیا گیا۔ ''اصل میں کبھی ایسی سچویشن سے واسطہ نہیں پڑا۔''

''اب پڑ گیا ہے۔'' سمیرا سنجیدگی سے بولی۔ ''اس لیے اسے ہینڈل کرو اور سمجھ لو کہ تم مونا کے لیے یہ سب کر رہے ہو۔''

مونا کا خیال آتے ہی عدیل سنجیدہ ہو گیا اسے لگا جیسے وہ اصل میں یہ اسی کے لیے کر رہا ہے۔ سمیرا اس کی جیکٹ درست کرتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک سال میں اتنا کما لوگے کہ کسی اچھی یونیورسٹی میں داخلہ لے سکو گے مگر میرا مشورہ کچھ اور ہے۔''

''وہ کیا؟''

''تم سول سروس کا امتحان دو۔ اصل مزے تو ان بابوؤں کے ہیں۔ میرے ابو سول سرونٹ تھے، جب تک وہ زندہ رہے ہم نے بہت مزے کیے۔''

''ہم کون؟''

''میں، آپی اور ماما۔'' سمیرا نے وضاحت کی۔ ''پہلے ماما کا انتقال ہوا، پاپا ان سے بہت محبت کرتے تھے، وہ ان کا دکھ برداشت نہیں کر سکے اور دو سال بعد وہ بھی چلے گئے۔ میں آپی کی ذمے داری بن گئی مگر وہ اس ذمے داری کو اٹھا نہیں سکیں۔'' کہتے ہوئے سمیرا کا لہجہ تلخ ہوا مگر پھر اس نے خود پر قابو پایا۔ ''سوری، میں تمہیں اپنے دکھڑے سنانے بیٹھ گئی۔''

''کوئی بات نہیں، کہہ دینے سے انسان کے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔'' عدیل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

عدیل کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی جیکٹ تلے آئی پیڈ اور بیلٹ سے سوئپ مشین منسلک تھی۔ شام کا وقت تھا اور سردیوں کی وجہ سے سورج جلدی غروب ہو جاتا تھا، اس کے بعد سردی کی شدت میں اتنا اضافہ ہو جاتا کہ لوگ صرف مجبوری میں گھر سے نکلتے تھے اس لیے شام چار سے چھ تک رش ہوتا تھا۔ وہ دو نمبر کاؤنٹر پر تھا، اس نے کوشش کی کہ اسے ایک نمبر مل جائے مگر وہ پہلے ہی کسی اور کو دیا جا چکا تھا۔ کاؤنٹر اس طرح تھا کہ ایک طرف گزرنے والا حصہ تھا جس میں شاپنگ ٹرالی آ کر لگ جاتی تھی اور عدیل ہینڈ پرائس مشین کی مدد سے خریدی ہوئی چیزوں پر لگے شاپنگ اسٹور کے مقناطیسی پرائس ٹیگ سے لگا کر اس کی قیمت براہ راست کمپیوٹر میں منتقل کرتا تھا اور خودکار طریقے سے فہرست بن جاتی۔ وہ بل دیکھ کر کسٹمر کو کل رقم بتاتا اور پھر اس سے پوچھتا کہ وہ کیش ادائیگی کرے گا یا نقد۔ اگر کسٹمر کارڈ سے ادائیگی کرنا چاہتا تو وہ اسے اپنا کارڈ دیتا جسے عدیل مشین میں ڈالتا اور گاہک سے پن کوڈ ملانے کو کہتا۔ وہ پن کوڈ ملاتا اور عدیل تصدیق کے بعد کہ اکاؤنٹ میں مطلوبہ رقم موجود ہے قیمت کاٹ لیتا اور مشین خودکار طریقے سے بل کی کاپی نکال کر دے دیتی تھی۔ ساتھ ہی پرائس لسٹ الگ سے جاری ہوتی تھی۔ اس سارے عمل میں چار سے پانچ منٹ لگتے تھے۔ اس کا انحصار خریداری پر بھی ہوتا تھا، زیادہ سامان کو کلیئر کرنے میں زیادہ وقت لگتا تھا۔

شرجیل اور سمیرا تین سے چھ بجے تک پارکنگ میں موجود رہتے۔ اس کے لیے انہوں نے یہ طریقہ نکالا کہ شرجیل گاڑی میں موجود رہتا اور سمیرا اندر آتی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا وہ گھوم پھر کر اور معمولی شاپنگ کر کے واپس چلی جاتی اور پھر شرجیل اندر آ جاتا۔ سمیرا اس کی جگہ کیمرا سنبھالتی۔ اصل میں کیمرا سنبھالنا بھی نہیں تھا کیونکہ یہ ڈیش بورڈ پر فکس

تھا اور کارڈ مشین کا کی پیڈ اس کا طے شدہ نشانہ ہوتا۔ کیمرا مسلسل کام کرتا اور جب عدیل سب دیتا تو وہ ہوشیار ہو جاتے اور کیمرے میں دیکھتے کہ وہ صحیح ریکارڈنگ کر رہا ہے یا نہیں۔ اس وقت وہ اس کی اسکرین آن کر لیتے۔ کیونکہ مسلسل اسکرین آن رہنے سے بیٹری جلدی ختم ہونے کا خطرہ تھا اس لیے اسکرین صرف ضرورت کے وقت آن کی جاتی۔ اس کے لیے کسی ایک کا کار میں رہنا ضروری تھا۔ شرجیل کی اسپورٹس کار کے باقی سارے شیشے سیاہ تھے صرف ونڈ اسکرین شفاف تھی اس لیے جب تک کوئی سامنے سے آ کر نہ دیکھتا اسے کیمرا نظر نہیں آتا اور اگر وہ دیکھتا تو اسے کیمرا رکھا ہوا نظر آتا۔

شرجیل نے عدیل کو ہدایت کی تھی کہ وہ صرف ایسے فرد کا کارڈ ڈیٹا لینے کی کوشش کرے جو حلیے سے پوش لگ رہا ہو یا اس نے بڑی خریداری کی ہو۔ تین سے چار کے درمیان اس نے بیس کے قریب کسٹمرز نمٹائے۔ ان میں سے سترہ نے کیش ادائیگی کی اور تین نے کارڈ استعمال کیے۔ ان میں سے ایک نے کریڈٹ کارڈ استعمال کیا اور دو نے ڈیبٹ کارڈ مگر وہ شرجیل کے معیار پر پورے نہیں اتر رہے تھے اس لیے عدیل نے ان کے کارڈ ڈیٹا لینے کی کوشش نہیں کی۔ پھر ایک سوٹ پوش اس کی طرف آیا۔ اس نے غیر ملکی کپڑے کا مہنگا سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس نے خاصی مالیت کی خریداری بھی کی ہوئی تھی۔ عدیل نے اس کے سامان کو پرائس مشین سے چیک کیا۔ کل رقم سترہ ہزار سات سو بیالیس روپے بنی تھی اور اس نے تقریباً تمام ہی اشیائے تعیش لی تھیں۔ عدیل نے اس سے پوچھا۔ ”سر آپ ادائیگی کارڈ سے کریں گے یا کیش؟“

جواب میں آدمی نے ڈیبٹ کارڈ اسے دیا۔ عدیل نے کارڈ لیتے ہی انگوٹھی کا نگ دبایا اور آدمی سے کہا۔ ”سر ایک بار دیکھ لیں، تمام چیزیں ہیں کوئی رہ تو نہیں گئی۔“

آدمی حیران ہوا کیونکہ عام طور سے ایسا سوال کیا نہیں جاتا ہے۔ اس نے ایک نظر ٹرالی میں موجود اشیا پر ڈالی اور بیزاری سے کہا۔ ”نہیں، ٹھیک ہیں۔“

اس دوران میں عدیل نے کارڈ سوئپ مشین میں ڈال دیا اور دل ہی دل میں گنتی گن رہا تھا اور وقت گزاری کے لیے ایسے ہی کمپیوٹر کی بورڈ کو چھیڑ رہا تھا۔ جیسے ہی اس کے حساب سے پانچ سیکنڈ پورے ہوئے اس نے کارڈ نکال لیا اور اسے پھرتی سے مشین کی سلاٹ میں ڈالا۔ پن کوڈ کا آپشن آتے ہی اس نے آدمی سے کہا۔ ”پن کوڈ پلیز سر۔“

آدمی جو ذرا پیچھے تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر کی پیڈ پر پن کوڈ دبایا۔ بینک کی طرف سے تصدیق کی گئی کہ مطلوبہ رقم موجود ہے اور عدیل نے بل کی رقم پنچ کر کے اوکے کر دیا۔ فوراً مشین سے رسید نکل آئی جس کے مطابق اس آدمی کے بینک اکاؤنٹ سے اتنی رقم کاٹ لی گئی تھی۔ دوسری رسید اسٹور کی طرف سے تھی۔ عدیل نے مشین سے کارڈ اور دونوں رسیدیں نکال کر آدمی کے حوالے کیں۔ ”تھینک یو سر۔“

وہ جواب دیے بغیر بے نیازی سے اپنی ٹرالی دھکیلتا ہوا باہر کی طرف چلا گیا۔ عدیل نے گہری سانس لی اور تب اسے احساس ہوا کہ اس موسم میں اس کے ماتھے پر پسینا آیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد سمیرا گھومتی ہوئی آئی، اس نے کچھ چیزیں لی تھیں اور جب وہ ادائیگی کرنے آئی تو اس نے آہستہ سے عدیل سے کہا۔ ”ایکسیلینٹ ورک۔“

اس دن اسے اور کوئی موقع نہیں ملا۔ وہ رات بارہ بجے آف کر کے باہر آیا تو ڈیپارٹمینٹل اسٹور کے باہر سڑک پر شرجیل اور سمیرا اس کے منتظر تھے۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی دونوں نے پُرجوش طریقے سے اسے شاباش دی۔ شرجیل نے کہا۔ ”تم نے کمال کر دیا، اتنی مہارت سے کارڈ ڈیٹا حاصل کیا کہ ہمیں بھی پتا نہیں چلا۔“

”پتا نہیں ڈیٹا آیا ہے کہ نہیں۔ میں نے اپنے طور پر پانچ سیکنڈ پورے کر لیے تھے۔“

”ٹیب دو۔“ سمیرا نے کہا تو عدیل کو دونوں جیکلس اتارنے کے لیے باہر نکلنا پڑا۔ سردی بہت تھی اس نے آئی پیڈ کی واسکٹ اتار کر جلدی سے اپنی جیکٹ پہنی اور اندر آ گیا۔ سمیرا نے آئی پیڈ کا فولڈر چیک کیا اور بولی ڈیٹا آ گیا ہے۔“

”پن کوڈ ریکارڈ ہو گیا تھا؟“

”ہاں اور میں نے زبانی بھی یاد کر لیا۔“ شرجیل نے کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تھرٹی فائیو زیرو فائیو ہے۔“

”دیکھنے میں آدمی پیسے والا لگ رہا تھا۔“

”جلد پتا چل جائے گا۔“ شرجیل نے کہا ہے۔ ”اب یہ ڈیٹا خالی کارڈ پر منتقل کرنا ہو گا۔“

”یہ کام ابھی کر لیتے ہیں۔“ سمیرا بولی۔ ”اسی مشین سے ڈیٹا خالی کارڈ میں کاپی بھی ہو جاتا ہے۔“

شرجیل نے خالی کارڈ سمیرا کے حوالے کیا اور اس نے سوئپ مشین کی مدد سے آئی پیڈ سے ڈیبٹ کارڈ کا ڈیٹا اٹھا کر

اس کارڈ میں منتقل کیا۔ اس کام میں ایک منٹ لگا۔ اس نے کارڈ مشین سے نکال کر شرجیل کی طرف بڑھایا۔ ''اب اسے چیک کرنا ہوگا۔''

شرجیل نے گاڑی کچھ دیر بعد ایک بینک کے سامنے روکی اور اتر کر اس کے اے ٹی ایم کی طرف بڑھا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو بہت پُرجوش تھا اس نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اکاؤنٹ میں ساڑھے چھ لاکھ روپے ہیں اور کرنٹ اکاؤنٹ ہے یعنی رقم نکلوانے کی حد نہیں ہوگی۔''

عدیل نے پوچھا۔ ''کیا ہم یہ رقم نکلوا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔''

''لیکن اے ٹی ایم کی حد تو ہوگی۔'' سمیرا بولی۔

''ہاں اس کی حد ہوگی لیکن یہ مسئلہ نہیں ہے، کمرشل ایریا میں تھوڑے فاصلے پر سارے بینک ہیں۔''

''تو آج ہی نہ نکال لیں؟'' سمیرا بولی۔

''نہیں آج خطرہ ہوسکتا ہے۔ سمیر الدین کا ذہن اس طرف جاسکتا ہے۔ ہاں مالک کا نام سمیر الدین ہے۔''

''تب کل نکالیں گے، زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہوگا ورنہ وہ رقم نکال بھی سکتا ہے۔'' سمیرا بے چین ہوگئی۔

''ممکن ہے مگر عجلت مناسب نہیں ہے۔'' شرجیل نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''یہ کام ہم بعد میں کرسکتے ہیں۔ فی الحال ہماری توجہ مزید ڈیٹا حاصل کرنے پر ہونی چاہیے۔ اگر ہم ایک دن میں ایک بھی ایسا ڈیٹا حاصل کرتے ہیں تو ایک مہینے بعد ہمارے پاس تیس کارڈز ہوں گے اور تب ہم ایک ساتھ ہی یہ کام کرسکیں گے۔''

عدیل نے اس کی تائید کی۔ ''اگر روز ایک بندے کا کارڈ یوز کیا اور دو تین نے شکایت کر دی تو کسی کا خیال ڈیپارٹمینٹل اسٹور کی طرف جاسکتا ہے۔ وقت گزر جائے گا تو شکایت کرنے والوں کو شاید ڈیپارٹمینٹل اسٹور کا خیال ہی نہ آئے کیونکہ اب اے ٹی ایم بہت جگہوں پر استعمال ہونے لگا ہے۔''

''اور جو استعمال کرتے ہیں وہ کیش پر اسے ترجیح دیتے ہیں۔'' شرجیل نے کہا۔ ''اس لیے بہت سی جگہوں میں اس کا امکان کم ہے کہ ڈیپارٹمینٹل اسٹور کا بھی خیال آئے گا۔ ہمیں عدیل کو محفوظ رکھنا ہے۔''

عدیل نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کتنے خالی ڈیبٹ کارڈز ہیں؟''

شرجیل نے سوچا اور بولا۔ ''پچاس سے زیادہ ہوں گے۔''

''اس کا مطلب ہے پچاس اکاؤنٹس کا ڈیٹا حاصل کیا جاسکتا ہے۔''

''کوئی حد نہیں ہے کیونکہ کارڈ بار بار یوز ہوسکتا ہے۔'' شرجیل نے کہا اور وہ روانہ ہوگئے۔ سمیرا کو اس کے گھر تک چھوڑتے ہوئے وہ آگے چلے گئے۔ وہ ایک چھوٹے فلیٹ میں رہتی تھی مگر یہ بہت پوش علاقے میں تھا اور یہاں بھی وہی رواج تھا کہ پڑوسی پڑوسی کو نہیں جانتا تھا۔ اس لیے سمیرا یہاں سکون سے رہتی تھی۔ وہ اپنے ٹھکانے پہنچے۔ شرجیل نے اسے اپنا خزانہ نکال کر دکھایا۔ ایک بریف کیس میں پچاس سے اوپر ڈیبٹ کارڈز تھے۔ ''یہ میں نے بہت مشکل سے جمع کیے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''پاکٹ ماروں سے حاصل کیے ہیں، وہ پرس نکالتے ہیں تو ان میں یہ بھی آجاتے ہیں مگر اس طرح بہت کم آتے ہیں بس میں سفر کرنے والے ڈیبٹ کارڈ کہاں رکھتے ہیں۔ کچھ ڈکیتوں سے خریدے ہیں جو لوگوں کو راہ چلتے پیدل یا گاڑی میں سوار لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بیکار ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ ڈیبٹ کارڈ جمع کرنے میں مجھے تین سال لگے ہیں اور ان پر کوئی تین لاکھ کا خرچ آیا ہے۔''

''تم کریڈٹ کارڈ کیوں نہیں لیتے؟''

''یہ بڑا گیم ہے۔'' شرجیل نے کیتلی سے کافی نکالی اور اس میں کریم ملاتا ہوا بولا۔ ''ایک دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے مگر اس میں کروڑوں کا جیک پاٹ لگ جاتا ہے، ایک ہی کارڈ سے اتنا مل جاتا ہے کہ آدمی سالوں بیٹھ کر کھائے۔ مگر اس کا استعمال آسان نہیں ہے دوسرے اس سے کیش حاصل نہیں کیا جاسکتا۔''

''کیش تو تم نے بھی نہیں لیا۔'' عدیل نے یاد دلایا۔

شرجیل ہنسا۔ ''وہ تو تمہیں دکھانے کے لیے کیا تھا۔ ورنہ ہم کیش ہی نکالتے ہیں۔ سامان کا کیا کرنا ہے اور اس میں پھنسنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اے ٹی ایم میں سمیرا نقاب پہن کر جاتی ہے اور وہاں لگے کیمرے اس کی صورت ریکارڈ نہیں کر پاتے۔ کبھی مجھے جانا ہو تو پی کیپ پہن لیتا ہوں اس میں بھی صورت چھپ جاتی ہے۔''

''ایک کارڈ کتنی بار استعمال کیا جاسکتا ہے؟''

''یہ تو میموری کارڈ کی طرح ہے جتنی بار چاہے اس پر ڈیٹا ڈالو اور جتنی بار چاہے صاف کر دو۔ جب تک کارڈ میں موجود مقناطیسی پٹی میں کوئی خرابی نہ آئے یہ کارآمد رہتا ہے۔''

''اس کے علاوہ اور کتنے کارڈز میں چوری کا ڈیٹا ہے؟''

''بس اسی میں ہے اور ایک اس میں تھا جو استعمال ہو گیا۔ دراصل چھ سات مہینے سے ہم کام نہیں کر پائے ہیں۔'' شرجیل نے اعتراف کیا۔ ''سابق پارٹنر کے بارے میں سمیرا نے تمہیں بتا دیا ہوگا، اس نے غداری کی اور اسے شوٹ کرنا پڑا۔''

عدیل کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ''قتل سنگین جرم ہے، آدمی پکڑا جائے تو مشکل سے بچتا ہے۔''

''ہاں لیکن میرے نزدیک غداری سنگین جرم ہے اور میں اسے کسی صورت معاف نہیں کرتا۔'' شرجیل کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ ''دوست اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا۔''

عدیل نے سر ہلایا۔ ''ملنے والی رقم کس حساب سے بٹتی ہے؟''

''سادہ حساب ہے چالیس فیصد میرا ہوتا ہے اور تیس تیس فیصد تم دونوں کے حصے میں آئے گا۔''

اگر شرجیل ساڑھے چھ لاکھ نکال لیتا تو صرف عدیل کے حصے میں دو لاکھ کے قریب رقم آتی۔ اس بار اس کا جسم دوسری وجہ سے سنسنا اٹھا۔ چند گھنٹے میں دو لاکھ۔ شرجیل اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے شاید اس کا خیال بھانپ لیا۔ ''یہ آغاز ہے.. تم ایک سال میں اس سے کہیں زیادہ کما لوگے۔''

''ایک سال؟'' عدیل نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کے بعد؟''

''میرا کام پورا ہو جائے گا اور تمہارا بھی ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم سب اپنی اپنی راہ لیں گے۔''

عدیل نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا کہ اسے ہمیشہ ان کے ساتھ نہیں رہنا پڑے گا۔ ''کیا جرم کی راہ چھوڑنا اتنا ہی آسان ہوگا۔''

''کیوں نہیں، تم دیکھنا ایسا ہی ہوگا۔'' شرجیل نے پورے اعتماد سے کہا۔ ''ان باتوں کو ذہن سے نکال دو۔ بس اتنا یاد رکھو کہ ہمیں ہر صورت یہ کام کرنا ہے۔''

''اگر تم لوگ ہر روز ڈیپارٹمنٹل اسٹور آئے تو یہ چیز وہاں سیکورٹی والوں کو شک میں ڈال سکتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ہر دوسرے دن چکر لگاؤ۔''

''اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔'' شرجیل نے سر ہلایا۔ ''مگر ہمیں مطلوبہ تعداد میں ڈیٹا حاصل کرنے میں وقت

لگے گا۔“

”وقت بہت ہے لیکن ہمیں احتیاط زیادہ کرنی چاہیے۔ واحد خطرہ بے احتیاطی ہے۔“

شرجیل نے کچھ دیر سوچا اور پھر مسکرانے لگا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب ایسا لگتا ہے کہ تم صحیح معنوں میں دلچسپی لے رہے ہو اس کام میں؟“

”ہاں کیونکہ یہ کام مجھے کرنا ہی ہے۔“ عدیل گہری سانس لے کر بولا۔ ”اصل خطرہ بھی مجھے ہے اور مجھے خود کو بچا کر یہ کام کرنا ہے۔“

اس رات شرجیل نے اسے اپنے بارے میں بتایا۔ اس کا تعلق سچ مچ ایک جاگیردار گھرانے سے تھا مگر جاگیرداری سے متنفر تھا۔ اس میں ایک انسان دوسرے انسان کو جس طرح ذلیل کرتا ہے اور اسے کم تر زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے اسے دیکھ کر شرجیل نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی جاگیردار نہیں بنے گا۔ اس فیصلے کے بعد وہ اپنے خاندان سے کٹ گیا اور اس کے بھائیوں نے بڑی خوشی سے اس کے حصے پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے ایک بار بھی اسے نہیں کہا کہ وہ اپنا فیصلہ بدل لے۔ ان کے نزدیک رشتے سے زیادہ زمین کی اہمیت تھی۔ ماں باپ کے بعد شرجیل پلٹ کر اپنے گھر نہیں گیا۔ اس نے بھائیوں سے تعلق توڑ لیا تھا۔ اپنی داستان سنانے کے باوجود اس نے اتنی احتیاط ضرور کی کہ نہ تو گاؤں کا بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ وہ کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے گریجویشن کیا تھا اور فلیٹ میں رہتے ہوئے اس نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے۔

”جب تم انسانوں پر ظلم کے خلاف ہو تو تم کیا کر رہے ہو؟“

”یہ کسی انسان پر ظلم نہیں ہے۔“ شرجیل نے اطمینان سے کہا۔ ”میں کسی کے گھر میں نہیں گھس رہا نہ ہی میں کسی کو لوٹ رہا ہوں۔ میں نے کہا نا کہ جن لوگوں کا نقصان ہو رہا ہے وہ انشورنس سے پورا ہو جاتا ہے۔ میں تو کسی ایسے اکاؤنٹ کو نہیں چھیڑتا جس میں کسی ملازم کی تنخواہ آتی ہو۔“

”تمہیں کیسے پتا چلتا ہے کہ کون ملازم ہے اور کون دولت مند ہے؟“

”میں اے ٹی ایم سے اسٹیٹ منٹ نکال لیتا ہوں۔ اس سے پتا چل جاتا ہے۔ اول تو ایسے لوگوں کا ڈیٹا لیتا بھی کم ہوں۔ جب ہم پیٹرول پمپ پر کام کرتے تھے تو وہاں آسانی ہوتی تھی۔ گاڑی سے پتا چل جاتا تھا کہ بندہ کس حیثیت کا ہے۔ صرف اسی کا کارڈ ڈیٹا اٹھاتے تھے جو بڑی اور مہنگی گاڑی میں ہوتا تھا۔ یہاں تھوڑا سا مشکل ہے کہ آدمی کی حیثیت کا تعین مشکل ہوتا ہے۔ عام آدمی بھی بعض اوقات ڈیبٹ کارڈ استعمال کرتا ہے۔ لیکن یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جیسے جیسے ہم ڈیٹا حاصل کرتے رہیں گے اس کی چھانٹی بھی کرتے جائیں گے اور آخر میں ہمارے پاس وہی لوگ ہوں گے جن کے پاس لمبا مال ہو۔“

”یعنی تمہارے خیال میں ایسے لوگوں کو لوٹنا جائز ہے؟“

”ہاں کیونکہ نقصان تو ان کا بھی نہیں ہو رہا اور اگر ہو تو وہ اسے برداشت کر سکتے ہیں۔“

اگلے دن شرجیل اور سمیرا اسٹور نہیں آئے تھے یعنی شرجیل نے اس کی بات مان لی تھی۔ وہ اس سے اگلے دن آئے اور اس کے بعد ایک دن چھوڑ کر آنے لگے۔ تقریباً ہر دن ہی ان کے ہاتھ کوئی نہ کوئی کارڈ لگ جاتا تھا اور وہ اسی دن اس کی تصدیق بھی کر لیتے تھے۔ آنے والے دو مہینوں میں انہوں نے انتیس افراد کا ڈیٹا چرایا اور ان میں سے پچیس افراد کو چنا تھا۔ یہ سب لاکھوں بینک اکاؤنٹ والے تھے۔ سردیوں کا سیزن اب ختم ہونے والا تھا اور وہ اس سے پہلے اپنا ہدف حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ صرف جیکٹ تلے ہی آئی پیڈ چھپا سکتا تھا۔ عام یونیفارم جو ٹی شرٹ پر مشتمل ہوتا تھا اس میں ایسی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مارچ کے آغاز میں جیکٹ کا موسم ختم ہو گیا تھا مگر وہ طبیعت خرابی کے بہانے جیکٹ پہن کر جاتا رہا۔

مگر دوسرے ہفتے یہ بہانہ بھی ختم ہو گیا کیونکہ موسم غیر متوقع طور پر گرم ہو گیا تھا اور ایسے میں جیکٹ پہننا عجیب لگتا۔ اس دوران میں وہ مزید چھ سات افراد کا ڈیٹا جمع کر چکے تھے۔ چھانٹنے کے بعد انہوں نے پینتیس افراد کا انتخاب کیا تھا۔ یہ سب بڑے اکاؤنٹس والے لوگ تھے۔ شرجیل نے ایک دن میں اے ٹی ایمز میں گھوم کر ان کے اکاؤنٹس چیک کیے تو ان میں مجموعی طور پر دو کروڑ بتیس لاکھ سے اوپر کی رقم تھی۔ عدیل تو حیران تھا، اس نے کبھی خواب میں بھی اتنی بڑی رقم کا نہیں سوچا تھا۔ شرجیل اور سمیرا بھی دنگ تھے۔ وہ سالوں سے یہ کام کر رہے تھے مگر انہوں نے بھی اتنے کم وقت میں اتنی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ فرحان جو پہلے ان کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ ہفتہ دس دن میں مشکل سے ایک کام کا کارڈ مہیا کرتا تھا۔ عدیل کی رفتار اس سے کہیں تیز تھی۔ شرجیل نے کہا۔

”اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ ڈبل کراس کرتا

رہا ہے۔ شاید اس نے الگ یہ کام شروع کر دیا تھا۔ اصل اکاؤنٹس خود رکھتا تھا اور معمولی قسم کے ہمیں پکڑا دیتا تھا۔"

سمیرا نے تائید کی۔ "مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے، تمہیں یاد ہے اس نے ساڑھے سات لاکھ کی اسپورٹس بائیک لی تھی۔ جبکہ اسے ہم نے اتنا نہیں دیا تھا۔"

"یہ ہماری بے وقوفی تھی کہ اسے چیک نہیں کیا۔" شرجیل نے ہتھیلی پر مکا مارا۔ "اس پر اعتماد کرتے رہے اور وہ اسی کا فائدہ اٹھاتا رہا۔ وہ اسی انجام کا مستحق تھا۔"

عدیل نے ہاتھ اٹھایا۔ "میں نے کوئی دھوکا نہیں کیا۔"

"ہم تمہیں جان گئے ہیں۔" سمیرا نے اسے تسلی دی۔ "دوسرے تم اس دوران میں ہمارے سامنے رہے۔ تم پر شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

سمیرا کے برعکس شرجیل اس معاملے میں خاموش رہا۔ اس نے عدیل کو تسلی نہیں دی اور نہ ہی کچھ کہا۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ "اب ہمیں وقت ضائع کیے بغیر رقم نکال لینی چاہیے۔"

"کب؟" سمیرا نے پوچھا۔

"آنے والی سیٹرڈے نائٹ۔" شرجیل نے کہا۔ "اتوار کی چھٹی کے لحاظ سے اے ٹی ایم میں اضافی رقم رکھی جاتی ہے، اس سے ہمیں آسانی ہوگی۔"

"یعنی پرسوں۔" عدیل نے سوچ کر کہا۔ "رقم کون نکالے گا؟"

"ہم تینوں۔" شرجیل نے کہا۔ "ہم کارڈ بانٹ لیتے ہیں۔ ان کے پن کوڈز یاد رکھنے ہوں گے۔"

"یہ ناممکن ہے۔" سمیرا نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک آدمی کے حصے میں درجن کارڈز آئیں گے اور اتنے کارڈز کا پن کوڈ زبانی یاد نہیں رکھا جا سکتا۔"

"اوکے، ہم چھوٹے کاغذ پر پرنٹ نکال لیں گے۔" شرجیل نے کہا۔ "سب اپنے اپنے کارڈز اور پرنٹ ساتھ رکھیں گے۔ طریقہ یہ ہوگا کہ ایک اے ٹی ایم میں جا کر ایک وقت میں تین کارڈ زیوز کرنے ہیں۔ اس کے بعد اگلے اے ٹی ایم میں جانا ہے۔"

"ایک ہی اے ٹی ایم میں سارے کارڈز استعمال کرنے میں کیا حرج ہے؟" عدیل نے کہا۔

"اس میں آدمی مشکوک ہو سکتا ہے۔" سمیرا بولی۔ "اندر بعض اوقات اے ٹی ایم کا کیمرا چیک کیا جاتا ہے اور ایک فرد مسلسل کارڈ زیوز کرے گا تو وہ مشکوک ہو جائے گا۔"

"فکر مت کرو نصف کلومیٹر کے علاقے میں ایک ہی سڑک پر دو درجن سے زیادہ اے ٹی ایمز ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"ہم ساری رقم نہیں نکلوا سکتے۔" عدیل نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "ہمیں ایک رقم طے کر لینی چاہیے اور وقت بھی۔"

"ہمارے پاس کل دو گھنٹے کا وقت ہوگا۔" شرجیل نے کہا۔ "دس سے بارہ بجے تک کا۔ اس وقت رش بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں باری کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

"اور رقم؟"

"اس دوران میں جتنی زیادہ رقم نکل جائے۔" شرجیل نے کہا۔ "ہر اکاؤنٹ سے پہلی بار رقم نکلواتے ہوئے سلپ بھی لے لینا، اس سے پتا چل جائے گا کہ کل رقم کتنی ہے اور اسی حساب سے آگے نکلواتے رہنا۔ بات کلیئر ہے۔"

عدیل اور سمیرا نے سر ہلایا۔ ابھی دو دن باقی تھے مگر وہ ابھی سے سنسنی محسوس کر رہے تھے۔ یہ دو دن سمیرا اور شرجیل کے مشکل گزرے کیونکہ عدیل کام پر جاتا رہا تھا، اب اس کی صبح کی شفٹ تھی اس لیے وہ رات کے وقت دستیاب ہوتا۔ دو دن بعد وہ شام کے وقت نکلے۔ انہوں نے کارڈز بانٹ لیے تھے اور ان کے پن کوڈز کی فہرست بھی چھوٹے پرنٹ کی صورت میں نکال لی تھی۔ سمیرا کو اس کے گھر سے پک کیا اور سب سے پہلے انہوں نے ایک ریستوران میں ڈنر کیا۔ سب نے ہلکی پھلکی ڈشز کا انتخاب کیا تاکہ بھاگ دوڑ میں مسئلہ نہ ہو اور ذہن چوکس رہے۔ مزید چست رہنے کے لیے انہوں نے چائے کافی لی تھی۔

ساڑھے نو بجے وہ ریستوران سے روانہ ہوئے اور مین کمرشل ایریا میں پہنچے جہاں ملک کے تمام اہم بینکوں کی شاخیں تھیں اسی وجہ سے وہاں مین روڈ پر پولیس مسلسل گشت کرتی تھی اور بینک گارڈز بھی مستعد رہتے تھے۔ شرجیل نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ "چلو دوستو آج ہم کروڑ پتی بن کر واپس جائیں گے۔"

☆☆☆

راجا صغیر اکبر اپنے آفس میں ٹہل رہا تھا۔ بہ ظاہر اس کا رئیل اسٹیٹ کا کام تھا مگر اس کی آڑ میں وہ زمینوں پر قبضہ کر کے اور ان کے جعلی کاغذات بنوا کر آگے فروخت کرتا تھا۔ ایک بڑے اسکینڈل میں وہ چار سال جیل میں رہ کر آیا تھا مگر جیل میں ہونے کے باوجود اس کے کام نہیں

رکے تھے۔ اس کے آدمی باہر موجود تھے جو اسی طرح سارے دھندے چلاتے رہے جیسے اس کی موجودگی میں چلاتے تھے اور وہ جیل میں رہ کر سب کنٹرول کرتا رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور دو افراد اندر آئے۔ ان میں سے ایک عام جسامت کا موٹی عینک اور داڑھی والا شخص تھا جو شلوار کرتے میں بہ ظاہر کسی مدرسے کا استاد نظر آتا تھا۔ دوسرا پتلون اور ٹی شرٹ میں تھا اور اس کا باہر نکلا پیٹ بتاتا تھا کہ اسے کھانے اور آرام کرنے سے بہت دلچسپی ہے۔ مگر یہ ان کا ظاہری روپ تھا۔ اندر سے وہ کیا تھے؟ راجا صغیر اچھی طرح جانتا تھا اور اس نے اسی لیے انہیں طلب کیا تھا۔ اس نے انہیں سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور گھنٹی بجائی۔ ایک کم عمر لڑکا اندر آیا۔

''کولڈ ڈرنک لے آ۔'' راجا صغیر نے اسے حکم دیا اور وہ چلا گیا۔

''راجا صاحب کیوں بلایا ہے؟'' کرتہ شلوار والا بولا۔

''صوفی کام ہے تبھی بلایا ہے۔''

''ہم تو بیٹھے رہتے ہیں کام ہی کب ہوتا ہے۔'' ٹی شرٹ والے نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرا۔ ''بیٹھ بیٹھ کر یہ نکل آئی ہے۔''

''شاہ جی تم اور صوفی خاص کاموں کے لیے ہو، دوسرے کاموں کے لیے بندے بہت ہیں۔''

''خاص کام آ گیا ہے؟'' صوفی نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ اس دوران میں لڑکا کولڈ ڈرنک کی بوتلیں لے آیا تھا مگر ان میں کولڈ ڈرنک نہیں بلکہ بیئر تھی۔ اس نے بوتلیں ان کے سامنے رکھیں اور چلا گیا۔ راجا صغیر نے اپنی بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی اور ایک سانس میں آدھی کر دی۔ اس نے منہ صاف کرتے ہوئے سر ہلایا۔

''ہاں، بیس دن پہلے اکاؤنٹ کھلوایا تھا۔ بارہ لاکھ کی پے منٹ آئی تھی۔ پانچ دن پہلے اس کا اے ٹی ایم کارڈ بن کر آیا اور کل رات کسی... نے ساری رقم نکال لی۔'' راجا صغیر نے خالی جگہ گالی فٹ کی تھی۔

صوفی چونکا۔ ''رقم نکال لی... کیسے؟''

''اے ٹی ایم سے، چیک بک تو میں نے بنوائی ہی نہیں تھی اس اکاؤنٹ کی اور اسے صرف رقم لینے کے لیے کھولا تھا۔''

''پھر یہ کیسے ہوا؟'' شاہ جی نے پوچھا۔ ''پے منٹ کب آئی؟''

''جس دن اے ٹی ایم کارڈ آیا اسی دن آئی تھی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ رقم نکال لی گئی ہے؟''

''ایس ایم ایس الرٹ سے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں رات ٹن تھا اس لیے موبائل دیکھا ہی نہیں، صبح دیکھا تو پتا چلا۔ بینک گیا اور رپورٹ نکلوائی تو پتا چلا کہ ہاتھ ہو گیا ہے۔''

''اے ٹی ایم کارڈ تمہارے پاس ہے؟''

صوفی کے سوال پر راجا صغیر نے اے ٹی ایم کارڈ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ ''پر رقم اے ٹی ایم سے ہی نکالی گئی ہے، میں نے رپورٹ لے لی ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' صوفی نے گہری سانس لی۔ ''کسی نے تمہارے کارڈ کا ڈیٹا اور پن نمبر حاصل کر لیا۔''

راجا صغیر نے باقی نصف بوتل دوسری سانس میں خالی کر دی اور اسے میز پر پٹخ کر بولا۔ ''صوفی میں موٹے دماغ کا آدمی ہوں اور اس وقت دماغ بھی گرم ہے اس لیے سمجھ میں آنے والی بات کر۔''

''تم نے یہ کارڈ کہیں استعمال کیا اے ٹی ایم کے علاوہ؟''

''ہاں تمہاری بھابی بچوں کے ساتھ ایک اسٹور گیا تھا وہاں ان لوگوں نے دل کھول کر شاپنگ کر لی، میرے پاس کیش نہیں تھا اس لیے کارڈ سے ادائیگی کی۔''

''بس وہیں اس کا ڈیٹا چرایا گیا ہے۔'' صوفی نے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے اسٹور والے اس کام میں شامل ہیں؟''

''ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو بندہ کیش مشین پر لگا ہو اس کا کام ہو۔ بلکہ زیادہ امکان اسی کا ہے۔ اسٹور والے ایسی حرکت نہیں کرتے۔ ان کا دھندا خراب ہوتا ہے۔''

''پر پن کوڈ کیسے لیا؟''

''جب تم نے ملایا ہوگا تب اس بندے نے یا آس پاس موجود اس کے کسی آدمی نے دیکھ لیا ہوگا۔'' شاہ جی نے سر ہلایا۔ ''آج کل ایسے دھندے ہو رہے ہیں۔ لڑکے کمپیوٹر پر چار ہاتھ مارنا سیکھ گئے ہیں تو ایسے کام کرتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے میں نے تم دونوں کو ٹھیک بلایا۔'' راجا صغیر خوش ہو گیا۔ ''معلوم کرو یہ کون ہے جس نے مجھے چونا لگایا ہے۔''

''دو دن میں... سب پتا چل جائے گا۔'' شاہ جی نے اعتماد سے کہا۔

''اگر بندہ مل جائے تو کیا کرنا ہے؟'' صوفی نے سوال کیا۔

''اسے میرے پاس لانا ہے زندہ سلامت۔''

''کوشش کریں گے اگر مرنے مارنے پر نہ تل گیا تو۔'' صوفی بولا اور وہ کھڑے ہو گئے۔ ''یاد ہے ادائیگی کہاں اور کس کو کی تھی؟''

''یہ تمہیں دو گھنٹے بعد بتا دوں گا۔'' راجا صغیر نے جواب دیا۔ اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ کام اسی لڑکے نے کیا ہے جو کیش کاؤنٹر پر تھا اور اسے اس کی صورت یاد تھی۔ اسٹور کا ایک اسسٹنٹ منیجر شفیق ریاض راجا صغیر کا جاننے والا تھا اس نے اسے کال کی اور حسبِ توقع اس نے آدھے گھنٹے میں بتا دیا کہ اس دن کاؤنٹر نمبر دو پر عدیل احمد نامی لڑکا تھا۔ پھر پوچھا۔

''اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے جناب، آپ کہیں تو ابھی فارغ کر دوں۔''

''او نہیں یار، اچھا لڑکا ہے اسے رکھو لیکن میری انکوائری کا ذکر مت کرنا۔''

''جیسا آپ کہیں۔''

''ہاں اس کی ڈیوٹی کس وقت ہوتی ہے؟''

''آج شام اس کی ڈیوٹی تھی مگر وہ آیا نہیں۔''

''کچھ پتا ہے کہاں رہتا ہے؟''

''ایک منٹ راجا صاحب، میں ریکارڈ سے چیک کر کے بتاتا ہوں۔''

''تم آرام سے چیک کرو، میں دس منٹ بعد کال کرتا ہوں۔''

☆☆☆

''تو بندہ یہاں رہتا ہے۔'' صوفی نے عمارت کی طرف دیکھا۔

''پتا تو یہیں کا ہے۔'' شاہ جی نے کہا۔ ''مگر جیسے وہ ملازمت سے غائب ہے ایسے ہی یہاں سے بھی غائب ہوگا۔''

''آؤ معلوم کرتے ہیں۔'' صوفی نے کہا تو وہ دونوں گاڑی سے اتر کر عمارت کی طرف بڑھے۔ گارڈ سے فلیٹ کا پتا سمجھا اور اوپر آئے۔ اتفاق سے سرفراز خان فلیٹ میں تھا، اس نے عدیل کا پوچھنے پر بتایا۔

''وہ تو چار مہینے ہوئے یہاں سے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

''اس کا کوئی اور اتا پتا، کوئی ملنے والا؟''

''میرے علم میں تو نہیں ہے ویسے بھی یہاں رہنے والے ایک دوسرے کے دوست نہیں ہیں اور مجھے نہیں یاد کہ اس سے ملنے بھی کوئی آیا ہو۔ اسے عدنان لایا تھا۔''

''عدنان کون ہے؟''

''وہ اسی کے ساتھ کام کرتا ہے۔ شاید وہ جانتا ہو کہ عدیل کہاں ملے گا۔'' سرفراز خان نے کہا اور پھر تجسس سے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں اور اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اپنے کام سے کام رکھو۔'' شاہ جی نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''یہ عدنان کہاں ہے اس وقت؟''

''ڈیوٹی پر ہوگا۔'' سرفراز نے بھی خشک لہجے میں کہا۔ ''میں جو جانتا تھا وہ بتا دیا۔''

وہ دونوں نیچے آئے اور راجا صغیر سے رابطہ کر کے اسے عدنان کے بارے میں بتایا۔ اس نے شفیق ریاض سے بات کی اور پھر انہیں کال کی۔ ''تم دونوں اسٹور پہنچ جاؤ، کچھ دیر میں اس کی چھٹی ہونے والی ہے۔ شفیق کو جانتے ہو نا؟''

''جانتے ہیں۔''

''وہ عدنان کے ساتھ باہر آئے گا۔''

وہ دونوں ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہنچ گئے۔ چار بجے شفٹ ختم ہوئی تو ملازمین باہر نکلے۔ اگر شفیق عدنان کے ساتھ نہ آتا تو انہیں مشکل ہوتی۔ عدنان پیدل بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا اور وہ گاڑی میں اس کے پیچھے تھے۔ ایک ویران جگہ انہوں نے اسے روک لیا۔ عدنان نوجوان لڑکا تھا، وہ ان کے تیوروں سے ہراساں ہو گیا اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے اور موبائل بھی نہیں ہے۔''

''فکر مت کر کاکا۔'' صوفی نے اسے تسلی دی۔ ''ہم ڈاکو نہیں ہیں۔ تجھ سے بات کرنی ہے، آ ادھر آ جا۔''

وہ اسے نزدیکی خالی پلاٹ میں لے آئے۔ شاہ جی نے عدیل کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ''وہ کل سے نہیں آ رہا، پہلے میرے ساتھ ہی فلیٹ میں رہتا تھا، اب کہیں اور رہتا ہے۔''

''کہیں اور کہاں؟''

''میں نہیں جانتا جی، چار مہینے پہلے جب وہ یہاں سے گیا تو اس نے سب سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا۔ اسٹور میں بھی بس اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔''

''ادھر فلیٹوں میں اور کسی سے ملنا جلنا تھا؟''

''ہاں جی ادھر شرجیل نامی بندہ تھا، وہ بھی اسی کے ساتھ یہاں سے چلا گیا۔ پہلے خود گیا بعد میں فلیٹ بھی خالی کر دیا تھا۔''

☆☆☆

شہاب عباسی پرانا پراپرٹی ڈیلر تھا۔ وہ تیس سال سے یہ کام کر رہا تھا، اس کا بزنس تو زیادہ نہیں تھا مگر اسے تمام اہم ڈیلرز جانتے تھے اور بہ وقتِ ضرورت اس سے کام لیتے تھے۔ اس کی معلومات زیادہ تھیں وہ اسی کی کمائی کھاتا تھا۔ اس کی اپنی ایجنسی تھی مگر وہ زیادہ تر باہر رہتا تھا، شام کو کچھ دیر کے لیے آتا اور پھر گھر چلا جاتا۔ ایجنسی کا کام اس کے دولڑکے دیکھتے تھے۔ اس شام بھی وہ اپنی ایجنسی پر آیا تو صوفی اور شاہ جی اس کے منتظر تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر چونکا کیونکہ راجا صغیر کے خاص کارندوں کی حیثیت سے ان کی شہرت تھی۔ وہ فکر مند ہو گیا کہ وہ اس کے پاس کیوں آئے ہیں مگر اس نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ ''صوفی صاحب، شاہ جی کیسے ہو آج اس غریب کو کیسے یاد کر لیا؟''

''عباسی صاحب ایک کام سے آئے ہیں؟''

وہ انہیں اندر لے آیا۔ ''حکم کرو جناب۔''

''ایک بندہ ہے شرجیل حیات، آپ نے اسے فلیٹ دلوایا تھا۔''

شہاب نے ذہن پر زور دیا۔ ''وہی جس کے پاس زرورنگ کی فینسی کار ہے؟''

''بالکل وہی۔''

''فلیٹ اس نے چار مہینے پہلے چھوڑ دیا تھا۔ میرے ہی پاس ہے اور میں نے ہی اسے دوبارہ رینٹ پر چڑھایا۔''

''فلیٹ کو مارو گولی، ہمیں بندے سے دلچسپی ہے۔'' صوفی نے کہا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

شہاب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد اس کا مجھ سے رابطہ نہیں ہے۔''

''تو معلوم کرو۔'' شاہ جی نے کہا۔ ''راجا صاحب کو یہ بندہ مطلوب ہے، ہر قیمت پر۔''

''ہمیں حکم ہے کہ اسے تلاش کیا جائے چاہے سارے شہر کو الٹنا پلٹنا پڑے۔'' صوفی نے اپنے مضبوط ہاتھ شہاب کے سامنے میز پر رکھے۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''میں معلوم کرتا ہوں، ویسے اس بندے سے خطا کیا ہوئی ہے؟''

''ہم کل اسی وقت آئیں گے۔'' صوفی اس کا سوال نظر انداز کر کے کھڑا ہو گیا۔

''اس کا پتا لینے۔'' شاہ جی نے کہا۔ ''صرف پتا نہیں ہونا چاہیے بلکہ بندے کو بھی اس پتے پر ہونا چاہیے۔''

''میں پوری کوشش کروں گا۔'' شہاب نے کہا لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر دکان سے نکل گئے۔

☆☆☆

سمیرا اور شرجیل بہت خوش تھے۔ انہیں توقع سے بڑھ کر کامیابی ملی تھی۔ وہ تین گھنٹے تک مختلف اے ٹی ایمز میں جا کر ڈیبٹ کارڈز سے رقم نکلواتے رہے اس کے بعد بھی کچھ اکاؤنٹس میں رقم موجود تھی مگر شرجیل نے خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ رات بہت ہو گئی تھی اور بینک گارڈز یا وہاں گشت کرنے والی فیڈرل پولیس بھی انہیں چیک کر سکتی تھی۔ رقم توقع سے زیادہ تھی۔ جب دو بجے وہ واپس آئے اور انہوں نے مزید دو گھنٹے لگا کر رقم گنی تو وہ پونے تین کروڑ سے زیادہ تھی۔ سمیرا اور شرجیل کی خوشی کی یہی وجہ تھی۔ البتہ عدیل سنجیدہ تھا۔ سمیرا نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم خوش نہیں ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''دوست تمہیں اچھا لگے یا برا، تمہیں یہ قبول کرنا ہوگا۔'' شرجیل نے کہا۔

''میں انکار نہیں کر رہا، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔''

سمیرا اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ ''میں تمہاری نیچر جانتی ہوں، مگر اب تم اس کام میں شامل ہو چکے ہو اس لیے اپنے اوپر سے یہ بوجھ اتار دو۔ دیکھو تمہارے حصے میں تقریباً اسی لاکھ روپے آئیں گے۔ تم ان سے بہت کچھ کر سکتے ہو۔''

عدیل نے سر ہلایا اور پھر ہچکچا کر بولا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ابھی سے الگ ہو جائیں؟''

''میں نے ایک سال کی بات کی تھی۔'' شرجیل نے اسے یاد دلایا۔ ''تم نے اگری کیا تھا۔''

''دیکھو یہ چھوٹی واردات نہیں ہے۔'' عدیل نے کہا۔ ''اس کا لازمی چرچا ہوگا اور پولیس رپورٹ ہوگی۔ لٹنے والے سارے بڑے لوگ ہیں اور وہ چاہیں گے کہ ان کو لوٹنے والے پکڑے جائیں۔''

''ان کا نقصان پورا ہو جائے گا۔'' شرجیل نے کہا۔

''اس کے باوجود وہ چاہیں گے کہ ہمیں پکڑا جائے اور سزا ہو۔'' عدیل نے کہا۔ ''اس لیے ہمیں چھپ جانا

چاہیے جب تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہ ہو جائے اور الگ بھی ہو جانا چاہیے تاکہ اگر کوئی ایک پکڑا جائے تو باقی محفوظ رہیں۔"

سمیرا جو ان کی گفتگو سن رہی تھی اس نے کہا۔ "ویسے عدیل اس لحاظ سے ٹھیک کہہ رہا ہے کہ ابھی تو ہمیں کچھ کرنا نہیں ہے اس لیے بہتر ہے اپنا اپنا حصہ لے کر سب الگ ہو جائیں اور جب حالات بہتر ہوں تو ہم دوبارہ مل سکتے ہیں۔"

"اب تم اس کی حمایت کر رہی ہو۔" شرجیل کا لہجہ کسی قدر طنزیہ ہو گیا۔

"کیونکہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سمیرا کا لہجہ بھی تیز ہو گیا۔

"نہیں، اس لیے کہ یہ عدیل کہہ رہا ہے۔" شرجیل نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ عدیل حیران تھا اس نے سمیرا سے پوچھا۔

"یہ تم دونوں کس قسم کی گفتگو کر رہے ہو میرے بارے میں۔"

انہوں نے رقم بانٹ لی تھی۔ سمیرا نے اپنی رقم والا بیگ اٹھایا۔ "اسی سے پوچھنا، میں جا رہی ہوں۔"

"ابھی رات بہت ہو گئی ہے۔" عدیل نے کہا۔ "تم رک جاؤ، میرے کمرے میں سو جانا، میں یہاں لاؤنج میں سو جاؤں گا۔"

"نہیں، میں چلی جاؤں گی۔" سمیرا بولی۔ "میں عادی ہوں راتوں کو بھی باہر رہی ہوں۔"

"میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔" عدیل نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"تم واپس کیسے آؤ گے؟"

"دیکھ لوں گا کوئی نہ کوئی گاڑی مل جائے گی۔" عدیل نے جوتے پہنتے ہوئے کہا اور وہ دونوں فلیٹ سے نکل آئے۔ سمیرا کی کار نیچے موجود تھی۔۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے اور گلی میں شدید سناٹا تھا۔ کچھ دیر میں فجر کی اذان ہوتی تو نمازی گھروں سے نکلتے۔ وہ سمیرا کے فلیٹ تک پہنچے تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ سمیرا نے اس سے کہا۔

"آؤ اندر آؤ، میں ناشتا بناتی ہوں۔"

"نہیں تمہیں زحمت ہو گی۔"

"کوئی زحمت نہیں ہو گی۔" اس نے کہا۔ وہ پارکنگ سے لفٹ کے ذریعے اوپر آئے۔ سمیرا کا فلیٹ بھی چھوٹا سا تھا مگر بہت صاف ستھرا اور سجا سنورا تھا۔ اس نے ہر چیز بہت اچھی اور خوب صورت لی تھی۔ عدیل نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔ "مجھے بہت شوق ہے گھر سجانے کا۔"

"گھر صرف سامان سے نہیں سجتے۔"

"پر انسان بازار میں نہیں ملتے۔" سمیرا نے آہستہ سے کہا۔ "تم بیٹھو، میں آتی ہوں۔"

وہ بیڈ روم میں گئی اور کچھ دیر بعد گھر کے لباس میں باہر آئی۔ کچن لاؤنج کے ساتھ اور اوپن تھا۔ اس نے فریج سے انڈے، ڈبل روٹی، مکھن اور جوس نکالا اور ناشتا تیار کرنے لگی۔ کچن کے ساتھ ہی چھوٹی سی میز تھی۔ سمیرا نے اس پر ناشتا لگایا۔ ناشتے کے دوران اس نے اچانک پوچھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو شرجیل سے میرا کیا تعلق ہے؟"

"میرا خیال ہے صرف کام کا تعلق ہے۔" عدیل نے کہا۔ "میں نے تم دونوں کے درمیان ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔"

سمیرا نے سکون کا سانس لیا۔ "میں تمہیں یہی بتانا چاہ رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم مجھے غلط لڑکی نہ سمجھو۔"

"شروع میں تمہارا تاثر کچھ اور تھا لیکن پھر بدلتا چلا گیا۔ اب مجھے یقین ہے تم ایک اچھی لڑکی ہو۔"

"قطع نظر اس کے کہ میں جرم کرتی ہوں۔"

"وہ تو میں اور شرجیل بھی کر رہے ہیں۔" عدیل نے کہا۔ "اس کے باوجود ہمیں گمان ہے کہ ہم اچھے ہیں تو میں تمہارے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہوں کہ تم غلط ہو۔"

"تھینک یو۔" سمیرا نے شکر گزاری سے کہا۔ "تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔"

"سمیرا تم اچھی لڑکی ہو اور اب کوئی مالی مسئلہ بھی نہیں ہے تو تم یہ راہ چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

سمیرا نے گہری سانس لی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں کس کے برتے پر یہ راہ چھوڑوں۔ ابھی مجھے شرجیل کا سہارا ہے، اگر میں انکار کرتی ہوں تو پھر میرا کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ آج کے دور میں جب ہر شخص اکیلی عورت کو کھانے کو آتا ہے شرجیل جیسے لوگ کتنے نایاب ہیں۔ میں تین سال سے اس کے ساتھ ہوں لیکن اس نے آج تک مجھے مرد کی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی میری مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ حد یہ کہ وہ مجھے چالیس فیصد دیتا ہے، اگر وہ مجھے کچھ رقم پکڑا دے اور باقی خود ہضم کر جائے تو میں اس کا کیا بگاڑ لوں گی۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ اس نے میرا تحفظ کیا اور کبھی مجھ سے اس کا صلہ نہیں چاہا۔"

عدیل متاثر ہوا تھا۔ "اس کی بعض باتوں نے مجھے بھی متاثر کیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو وہ بہت سے نام نہاد شریفوں سے اچھا ہے۔"

"اب تم بتاؤ میں کیا کروں۔ شرجیل کو چھوڑتی ہوں تو اکیلی رہ جاؤں گی اور مجھے کمانے کا اور کوئی طریقہ نہیں آتا۔

ملازمت مجھ سے ہوگی نہیں۔"

عدیل نے گہری سانس لی۔ "اوپر والے نے ہر انسان کا نصیب بنایا ہے، اس نے تمہارا جوڑا بھی بنایا ہوگا۔ جہاں تک اکیلے ہونے کا تعلق ہے تو صرف شرجیل نہیں میں بھی تمہارے ساتھ ہوں اور کسی مشکل میں تم کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں تم سے ایسا کوئی وعدہ لینا نہیں چاہتی۔" سمیرا نے اس سے آنکھیں چرائیں۔ "تم مجبوری میں شامل ہوئے ہو اور بعد میں ہم سے تعلق نہ رکھنا ہی تمہارے لیے بہتر ہوگا۔"

عدیل کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے کپ خالی کر کے میز پر رکھا۔ "اب میں چلتا ہوں، تم تھکی ہوئی ہو آرام کرو، میں بھی جا کر سوؤں گا۔"

وہ واپس آیا تو شرجیل فلیٹ میں نہیں تھا۔ نیچے اس کی گاڑی بھی نہیں تھی۔ عدیل کے پاس اضافی چابی تھی۔ وہ اندر آیا تو اس کے بیڈ پر بیگ رکھا ہوا تھا جس میں اس کی رقم تھی۔ وہ شرجیل والے بیڈروم میں آیا تو اس کی توقع کے عین مطابق شرجیل کا سامان بھی غائب تھا۔ عدیل نے اسے کال کی تو اس نے کچھ دیر بعد ریسیو کی۔ "ہیلو تم کہاں ہو؟"

"ایک اور جگہ ہوں۔" شرجیل نے جواب دیا۔

"میں تمہاری اور سمیرا کی تجویز سے متفق ہو گیا ہوں۔ کچھ عرصے کے لیے ہمیں الگ رہنا چاہیے۔"

"تب میں کہیں اور چلا جاؤں؟"

"نہیں، چاہو تو یہیں رہو، اس جگہ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا ہے یا اگر چاہو تو کہیں اور چلے جاؤ، میں تمہارا حصہ وہاں چھوڑ آیا ہوں۔"

"میں نے دیکھ لیا ہے۔" عدیل نے کہا۔ "اگر میں یہاں سے گیا تو تمہیں بتا کر جاؤں گا۔"

"تم سمیرا کے ہاں سے ابھی آئے ہو؟" شرجیل نے کسی قدر توقف کے بعد پوچھا۔

"ہاں، میں اسے چھوڑنے گیا تھا مگر اس نے ناشتے کے لیے روک لیا۔" عدیل نے اسے بتایا تو اس نے اچانک کال کاٹ دی۔

عدیل کو عجیب لگا مگر اس نے غور نہیں کیا، اسے نیند آ رہی تھی وہ سویا تو پھر اس کی آنکھ رات کے قریب کھلی تھی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور اسی وجہ سے آنکھ کھلی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آیا اور ایک ہوٹل سے کھانا کھایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس قابل ہو گیا ہے کہ چچا زاہد کی شرط پوری کر سکے۔ مگر وہ ان کو کیا بتائے گا کہ اس نے اتنی رقم کیسے حاصل کر لی؟

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے پاس وقت ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے کاروبار کر لیا ہے۔ سال پورا ہونے سے پہلے وہ مکان لے گا تو کسی کو شک نہیں ہوگا۔ ابھی تو صرف ساڑھے چار مہینے ہوئے تھے اس کے پاس ساڑھے سات مہینے کا وقت تھا۔

واپس آ کر اس نے رقم گنی۔ یہ ساری رقم پانچ ہزار، ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں پر مشتمل تھی۔ زیادہ تر پانچ ہزار کے نوٹ تھے اور ان کی بارہ گڈیاں تھیں یعنی یہ ساٹھ لاکھ کی رقم تھی۔ بیس گڈیاں ہزار کے نوٹوں کی تھیں اور باقی رقم پانچ سو کے نوٹوں کی شکل میں تھی۔ کل رقم تراسی لاکھ دس ہزار روپے تھی۔ وہ اس رقم کو بینک اکاؤنٹ میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگلے دن اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک بینک میں لاکر لیا اور رقم ایک بریف کیس میں رکھ کر اسے لاکر میں رکھ دیا۔ اسّی لاکھ رکھ کر اس نے باقی رقم اپنے پاس رکھی تھی۔ بینک سے نکل کر وہ مارکیٹ آیا یہاں اس نے کچھ خریداری کی اور پھر چچا زاہد کے گھر پہنچا۔ تین بج رہے تھے۔ مونا کالج سے آ گئی ہوگی اور ساڑھے پانچ بجے تک زاہد چچا بھی آ جاتے۔ اس نے کال بیل بجائی تو مونا نے دروازہ کھولا۔

"کیسی ہو تم؟" عدیل نے شوق سے اسے دیکھا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم کیسے آئے؟" مونا نے کسی قدر نروس لہجے میں کہا۔ عدیل نے اب محسوس کیا کہ اسے دیکھتے ہی مونا کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"کیا بات ہے، تم مجھے دیکھ کر پریشان کیوں ہو؟"

"میں پریشان... نہیں تو۔" وہ بولی اور ایک طرف ہو گئی۔ "آؤ اندر آؤ۔"

"شکریہ۔" عدیل کا لہجہ بدل گیا۔ "ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ شاید یہیں سے لوٹا دیا جاؤں۔"

مونا اسے اندر لے آئی۔ "یہاں آنے سے تمہیں کوئی منع نہیں کر سکتا ہے، یہ تمہارے چچا کا گھر ہے۔"

"یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔" عدیل نے شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ مونا نے لے کر برابر میں رکھ لیا۔ اس نے پوچھا یا دیکھا نہیں کہ وہ اس کے لیے کیا لایا تھا؟ عدیل کی خوشی ماند پڑ گئی، اس نے پوچھا۔

"کیا تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا؟"

"یہ تمہیں نہیں بتائے گی۔" خلافِ توقع زاہد چچا اندر آئے۔ عدیل کھڑا ہو گیا۔

"کیا نہیں بتائے گی؟"

"یہی کہ ہم نے اس کا نکاح شکیل سے کر دیا ہے اور

کچھ عرصے میں اس کی رخصتی ہے۔"

عدیل دم بخود رہ گیا۔ شاک نے جیسے اسے شل کر دیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ اس کے اندر اشتعال سا ابھرنے لگا۔

"چچا جان، آپ نے مجھے ایک سال کا وقت دیا تھا۔"

"ہاں لیکن تم ایک سال کیا دس سال میں بھی وہ سب نہیں کر سکتے جو میں نے کہا۔" زاہد نے کہا۔ "شکیل ریحانہ کا بھانجا ہے اس کا اپنا بزنس ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے۔"

مونا سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی بے بسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ عدیل نے کہا۔ "میں نے آپ کی شرط پوری کر دی تھی اور میں آپ کو یہی بتانے آیا تھا مگر آپ پہلے ہی وعدہ خلافی کر چکے ہیں۔"

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔" زاہد نے بے یقینی سے کہا۔

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" عدیل کا لہجہ تلخ ہو گیا اور وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ زاہد نے عقب سے کہا۔

"یہ کیا چھوڑے جا رہے ہو؟"

"مونا کے لیے کچھ چیزیں لایا تھا۔ کزن ہونے کے ناتے اتنا حق تو ہے مجھے۔" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔ اس کا ذہن گھوم رہا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ زاہد چچا اسے اتنا بڑا دھوکا دیں گے۔ وہ پیدل چلتا رہا اور جب اس کی ٹانگیں دکھنے لگیں تو ایک پارک میں بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ اس کے پاس لاکھوں روپے تھے مگر اسے لگا جیسے وہ خالی ہاتھ ہو۔ وہ بیٹھا رہا اور اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ رات ہو گئی ہے۔ پھر موبائل کی بیل نے اسے چونکایا۔ سمیرا کال کر رہی تھی اس نے کال کاٹ دی۔ سمیرا نے پھر نمبر ملایا تو اس نے پھر کال کاٹ دی اور موبائل ہی بند کر دیا۔ اس وقت وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ فی الحال یہاں سے کہیں چلا جائے گا۔ کہاں جائے گا یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ وہ فلیٹ کی طرف روانہ ہوا تاکہ اپنا سامان لے سکے۔ اس نے ایک ٹیکسی کی اور ڈرائیور کو بتایا۔

"مجھے اپنا سامان لینا ہے اور پھر تم مجھے بس اڈے پہنچا دینا۔"

کچھ دیر بعد وہ فلیٹ کے سامنے ٹیکسی سے اترا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا کہ کسی نے اسے پکارا۔

"عدیل احمد۔۔۔!"

اس نے چونک کر دیکھا۔ کچھ دور ایک اجنبی کھڑا تھا۔ حلیے سے وہ مولوی لگ رہا تھا مگر اس کے نزدیک آنے پر عدیل کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس کے تاثرات خطرناک تھے۔ عدیل نے کہا۔

"کون ہو تم؟"

صوفی نے تیزی سے کوئی سخت سی چیز عدیل کے بائیں پہلو میں چبھوئی۔ "یہ پستول ہے۔" وہ دھیمے مگر خونخوار لہجے میں بولا۔ "اب آواز نکلی تو وہ تیری آخری آواز ہوگی، چل ادھر۔"

اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا وہاں ایک ہائی لیکس کھڑی تھی۔ شاہ جی اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ عدیل نے محسوس کیا کہ وہ پھنس گیا ہے۔ اگر اس نے بات نہیں مانی تو یہ خطرناک آدمی اسے سچ مچ گولی مار دے گا۔ وہ بادلِ ناخواستہ آگے بڑھا۔ انہوں نے اسے عقبی نشست پر بٹھایا اور اس کے دائیں بائیں آ گئے۔ عدیل نے پوچھا۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"جلد تجھے پتا چل جائے گا۔" صوفی نے کہا اور ڈرائیور کو حکم دیا۔ "چل، کیا تجھے ایڈ دینا ہوگی۔"

ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ جیسے ہی گاڑی آگے نکلی، سمیرا کی کار بھی اس کے پیچھے گئی تھی۔ وہ ایک منٹ پہلے یہاں پہنچی تھی اور اس نے عدیل کو زبردستی گاڑی میں بٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جب گاڑی آگے بڑھی تو وہ اس کے پیچھے لگ گئی مگر اس نے فاصلہ رکھا تھا۔ اس نے ہائی وے پر آنے کے بعد شرجیل کو کال کی۔ اس نے خاصی دیر بعد ریسیو کی اور پرخمار لہجے میں بولا۔ "سمیرا، کیوں کال کی ہے؟"

"یہاں گڑبڑ ہے، کچھ لوگ عدیل کو زبردستی ایک ہائی لیکس میں بٹھا کر کہیں لے جا رہے ہیں۔ میں ان کے پیچھے ہوں۔"

شرجیل بولا تو اس کے لہجے میں خمار نہیں تھا مگر اس نے ردِعمل نہیں دیا تھا۔ "تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

سمیرا حیران ہوئی۔ "شرجیل، وہ ہمارا ساتھی ہے اور اس وقت مشکل میں ہے۔"

"او کے میں آ رہا ہوں، تم لوگ کس طرف جا رہے ہو؟"

سمیرا نے پوزیشن بتائی۔ شرجیل سے بات کر کے وہ پوری توجہ سے پیچھا کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ لوگ خطرناک تھے اس لیے وہ احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ اگر وہ اس کے تعاقب سے باخبر ہو جاتے تو اس کے لیے مشکل ہو سکتی تھی۔ دس منٹ بعد شرجیل نے اسے کال کر کے تازہ ترین لوکیشن پوچھی اور پھر اسے بتایا کہ وہ جلد اس کے پاس ہوگا۔

☆☆☆

راجا صغیر کے دبدبے نے کام کیا اور شہاب عباسی نے پوری کوشش کر کے اگلے دن تک معلوم کر لیا کہ شرجیل نے اگلا ٹھکانا کہاں لیا تھا۔ یہ اس کا جاننے والا اسٹیٹ ایجنٹ تھا جو اس علاقے میں کام کرتا تھا اور اس نے آسانی سے نہیں بتایا تھا۔ جب صوفی اور شاہ جی اس کے پاس آئے تو اس نے شرجیل کا پتا ان کے حوالے کیا اور بولا۔ ''راجا صاحب سے کہنا کہ میں جو کر سکتا تھا کر دیا۔''

''دیکھتے ہیں۔'' صوفی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ شفیق ریاض کے توسط سے ان کے پاس عدیل کی تصویر بھی آگئی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ عدیل اور شرجیل کا آپس میں تعلق ہے اور شرجیل کی شہرت بھی پُراسرار تھی یعنی اس کے پس منظر کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ پتے پر پہنچے تو وہاں تالا پایا۔ اب ان کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر ان کا انتظار رنگ لایا اور تقریباً آٹھ بجے عدیل ایک ٹیکسی سے اترا تھا۔ صوفی نے اسے آواز دی اور پھر گھیر لیا۔ وہ اسے لے کر راجا صغیر کے دفتر جا رہے تھے۔

اس کا دفتر کمرشل ایریا میں ایک بڑے پلاٹ پر تھا اور یہاں اس نے کسی اور کو جگہ نہیں دی تھی۔ اس کی اکثر سرگرمیاں ایسی تھیں جن کا دوسروں سے چھپانا لازمی تھا۔ سات آٹھ بجے تک یہ سارا علاقہ بند ہو جاتا تھا۔ اس لیے جب وہ عدیل کو لے کر اس کے دفتر پہنچے تو وہاں سناٹا تھا۔ راستے میں انہوں نے عدیل کے سر پر ایک غلاف چڑھا دیا تھا اور جب اسے راجا صغیر کے سامنے پیش کیا تو غلاف اتار لیا۔ راجا صغیر نے اسے غور سے دیکھا۔

''دیکھنے میں تو تو سیدھا سا لگتا ہے۔''

عدیل نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''مجھے کیوں اٹھایا ہے، میں تمہیں نہیں جانتا۔''

''اس کارڈ کو تو جانتا ہے۔'' راجا صغیر نے ڈیبٹ کارڈ اس کے سامنے پھینکا۔ ''تجھے دیا تھا نا پیمنٹ کاٹنے کے لیے۔''

''تو میں نے پیمنٹ کاٹی ہو گی۔ اس کی رسید بھی دی ہو گی۔''

''بکواس نہ کر۔'' عقب سے صوفی نے اچانک اس کی گدی پر گھونسا مارا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا، وہ اس وار کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگا تو شاہ جی نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر سیدھا کیا اور پھر جکڑ لیا۔ صوفی نے اس بار اس کے پیٹ اور سینے کو نشانہ بنایا تو تکلیف اسے ہوش میں لے آئی۔ راجا صغیر سکون سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ بلند کیا۔

''بس! مجھے بات تو کرنے دو۔ ایسا نہ ہو یہ بولنے کے قابل بھی نہ رہے۔''

صوفی رک گیا، عدیل گہرے سانس لے رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شرجیل کا خیال غلط ثابت ہوا۔ پولیس کے بجائے ان لوگوں نے پکڑ لیا تھا مگر وہ اس تک پہنچے کیسے تھے؟ راجا صغیر نے پوچھا۔ ''تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟''

''میرے ساتھ کوئی نہیں ہے اور میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔''

''تم جس جگہ کام کرتے ہو وہاں تم دو دن سے نہیں جا رہے ہو، کیوں؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''جہاں تم پہلے رہتے تھے وہ جگہ کیوں چھوڑ دی؟''

''مجھے یہاں رہنا سستا پڑتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ اس طرح نہیں مانے گا۔'' شاہ جی نے راجا صغیر کی طرف دیکھا۔ ''اسے دو گھنٹے کے لیے ہمارے حوالے کرو۔ فر فر جواب دے گا۔''

''تم ان دونوں کو نہیں جانتے۔'' راجا صغیر نے صوفی اور شاہ جی کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے ایک بار تمہیں ان کے حوالے کر دیا تو پھر ادھ مر کر واپس آؤ گے۔ مجھے تمہاری جوانی پر ترس آرہا ہے۔ شرافت سے اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو۔''

عدیل خاموش رہا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بھی شکار ہوئے تھے مگر وہ اصل میں شکاری تھے اس لیے انہوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان تک پہنچ بھی گئے۔ شرجیل نکل گیا تھا اور سمیرا اپنے گھر میں تھی۔ بدقسمتی سے وہ پھنس گیا۔ اگر اسے چند منٹ اور ملتے تو وہ بھی کہیں نکل گیا ہوتا۔ راجا صغیر نے پوچھا۔ ''اس کے پاس سے کیا نکلا ہے؟''

صوفی نے رقم، اس کا پرس اور موبائل نکال کر سامنے ڈال دیا۔ اس میں لاکر کی چابی بھی تھی۔ راجا صغیر نے پہلے موبائل اٹھایا اور اس کی فون بک دیکھی۔ اس میں دو ہی نمبر تھے یعنی شرجیل اور سمیرا کا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ سمیرا کون ہے؟''

''میری دوست ہے۔'' عدیل نے جھوٹ بولا۔ راجا صغیر نے شرجیل کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس کا نمبر حاصل کر لینے کے بعد وہ کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے عدیل سے کہا۔

''اس کھیل کا اصل دماغ شرجیل ہے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' عدیل نے اعتراف کر

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے گالیاں کہاں سے سیکھی ہیں۔ ہم گالف کورس کے قریب رہتے ہیں۔ شاید یہی ایک سبب ہوسکتا ہے

لیا۔ ''لیکن وہ کہاں ہے، میں نہیں جانتا صرف ایک نمبر ہے جس پر اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔''

''یہ چابی کسی لاکر کی ہے۔'' راجا صغیر نے چابی اٹھا کر کہا۔ ''تم نے یقیناً اس میں اپنے حصے کی رقم رکھوائی ہوگی۔ کتنی رقم آئی تمہارے حصے میں؟''

عدیل ایک بار پھر خاموش رہا تو صوفی نے اس پر گھونسے بازی کی مشق شروع کر دی۔ راجا صغیر پلٹ کر میز کے دوسری طرف جا بیٹھا اور عدیل پر ہونے والے تشدد سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اسے یقین تھا یہ لڑکا زیادہ دیر زبان بند نہیں رکھ سکے گا اور جلد شرجیل بھی اس کے سامنے ہوگا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ رقم ملے نہ ملے وہ انہیں وزن باندھ کر جھیل میں پھنکوا دے گا۔ اس کے لیے قطعی ناقابلِ برداشت تھا کہ کوئی اسے لوٹ جائے۔ وہ خود لوگوں کو لوٹتا تھا۔

☆☆☆

سمیرا کی گاڑی اس ایک منزلہ دفتر سے ذرا دور رکی ہوئی تھی۔ اس نے کال کر کے شرجیل کو محلِ وقوع بتایا۔ اس نے کہا۔ ''میں چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

سمیرا ٹینشن میں تھی کیونکہ اس نے عدیل کو یوں اندر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا کہ اس کے سر پر غلاف چڑھا ہوا تھا۔ شاید یہ لوگ عدیل سے اپنا ٹھکانا چھپانا چاہ رہے تھے۔ اسے اندر گئے ہوئے پندرہ منٹ ہو گئے تھے اور سمیرا پریشان تھی کہ اس کے ساتھ کوئی غلط سلوک نہ ہو رہا ہو۔ وقت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا اور وہ بار بار پلٹ کر آنے والی سڑک پر شرجیل کی گاڑی کا نشان دیکھ رہی تھی۔ اسے خیال نہیں آیا کہ وہ پیدل بھی آسکتا ہے اس لیے جب اس نے فرنٹ سیٹ کی کھڑکی کا شیشہ بجایا تو سمیرا اضطراری طور پر اچھل پڑی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکلی تھی۔ پھر اس نے دروازہ ان لاک کیا اور شرجیل اندر آگیا۔ حسبِ معمول وہ سوٹ میں تھا اور اس نے سن گلاس لگایا ہوا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''اس عمارت میں۔'' سمیرا نے اشارہ کیا۔ ''اسے اندر لے گئے ہیں، اس کو بھی بیس منٹ ہو چکے ہیں۔ پتا نہیں وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔''

شرجیل نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں اس کی بہت پروا ہو رہی ہے۔''

''تو کیا نہیں ہونی چاہیے۔'' سمیرا نے تلخی سے کہا۔ ''وہ ہمارا ساتھی ہے۔''

''سمیرا میں تمہیں جانتا ہوں۔'' شرجیل کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ ''تمہاری فکر ساتھی سے کچھ بڑھ کر ہے۔''

سمیرا نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''میں جو کہنا چاہ رہا ہوں تم سمجھ رہی ہو۔''

سمیرا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے بہت کوشش کی مگر میں مجبور ہو گئی۔ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ اسے کچھ ہو، یہ تصور بھی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ یہی کہلوانا چاہتے تھے نا تم مجھ سے؟''

شرجیل خاموش ہو گیا پھر اس نے کہا۔ ''تم جانتی ہو یہ کس کا دفتر ہے؟''

''نہیں۔''

''راجا صغیر اکبر کا۔''

سمیرا چونکی۔ ''وہی جو مشہور قبضہ گیر ہے؟''

''بالکل وہی اور وہ بہت خطرناک آدمی ہے، ہم اس سے نہیں ٹکرا سکتے۔''

''تم میری مدد کرنے سے انکار کر رہے ہو۔'' سمیرا غصے میں بولی۔

''ہاں، تم لوگوں نے خود طے کر لیا تھا کہ اب ہمیں

الگ ہو جانا چاہیے اور ہر ایک اپنی حفاظت کا خود ذمے دار ہو گا۔'' شرجیل نے تیز لہجے میں کہا۔ اب ہم ایک گروپ نہیں رہے اس لیے کوئی ذمے داری بھی نہیں ہے۔''

''تم گھٹیا شخص...'' سمیرا کا باقی جملہ منہ پر پڑنے والے تھپڑ سے منہ میں ہی رہ گیا۔

''تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے گولی مار دیتا۔'' شرجیل نے کہا اور کار سے اتر گیا۔ سمیرا اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر وہ چونکی اور اس نے اپنا پرس کھولا۔ اس میں ایک چھوٹا سا پستول موجود تھا۔ سمیرا نے وہ نکالا اور کار سے اتر کر تیزی سے عمارت کی طرف بڑھی۔ شرجیل سے اسے یہ امید نہیں تھی کہ وہ یوں صاف انکار کر دے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ عدیل کو بچانے کے لیے جو کر سکتی ہے وہ کر گزرے گی۔ اس نے داخلی دروازے کے پاس آ کر اسے چیک کیا تو وہ کھلا ہوا تھا۔

☆☆☆

عدیل کو لگ رہا تھا جیسے اس کی پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ اس کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا مگر وہ خاموشی سے درد برداشت کر رہا تھا۔ صوفی کے مکوں میں بہت طاقت تھی۔ شاہ جی نے اس کے دونوں بازو عقب میں کر کے اسے بے بس کر رکھا تھا۔ ہر ایک منٹ بعد رک کر صوفی سوال کرتا۔ ''شرجیل کہاں ہے؟''

دو تین بار عدیل نے نفی میں جواب دیا اور اس کے بعد وہ خاموش رہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے یہ اذیت برداشت کرنی ہی تھی کیونکہ وہ سچ مچ شرجیل کے ٹھکانے سے بے خبر تھا۔ وہ شکر ادا کر رہا تھا کہ انہوں نے سمیرا کا نہیں پوچھا۔ وہ اس کا پتا تو جانتا تھا اور کیا کہا جا سکتا کہ کب اس کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی اور وہ بول پڑتا۔ یہ لوگ اسے بہت اونچے درجے کے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ انہیں شاید رقم سے زیادہ ان لوگوں سے دلچسپی تھی جنہوں نے ان کی رقم لوٹی تھی کیونکہ جب سے وہ یہاں لایا گیا تھا اس آدمی نے جوان دونوں کا باس لگ رہا تھا ایک بار بھی رقم کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ عدیل کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون تھا اور اس کے اکاؤنٹ سے انہوں نے کتنی رقم نکالی تھی۔ انہوں نے جو سب سے بڑی رقم ایک اکاؤنٹ سے نکالی تھی وہ بائیس لاکھ روپے تھے۔ صوفی جو اسے پنچنگ بیگ کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ اسے بھی اب ترس آنے لگا تھا۔ وہ ہاتھ ہلکے رکھ رہا تھا۔

''کاکے بول دے، اصل بندہ کہاں ہے؟''

''میں... بتا چکا... ہوں۔'' عدیل نے رک رک کر کہا۔ ''ہم... الگ ہو... گئے تھے۔''

صوفی راجا صغیر کے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔ ''میرا خیال ہے لڑکا سچ کہہ رہا ہے۔ دوسرے بندے کو دوسرے طریقے سے تلاش کرنا ہو گا۔ اس کا موبائل نمبر تو ہے۔''

''ٹھیک ہے تب اسے لے جا کر جھیل والے ہٹ میں رکھو۔ جب دوسرا مل جائے تو دونوں کو ایک ساتھ جھیل میں ڈالیں گے۔'' راجا صغیر نے حکم دیا۔ صوفی سیدھا ہوا تھا کہ ایک لڑکی اچانک اندر آ گئی، اس نے پستول تھام رکھا تھا۔ وہ تیز لہجے میں بولی۔

''خبردار کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ چھوڑ دو اسے۔''

اس نے شاہ جی سے کہا تو اس نے عدیل کو چھوڑنے کے بجائے سامنے کر لیا۔

''گولی چلاؤ، پہلے اسے لگے گی۔''

''میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے۔'' سمیرا نے چلا کر کہا۔ اس کی آواز اور لہجہ کانپ رہا تھا۔ اچانک اس نے پستول اوپر کی طرف کر کے ایک فائر کیا۔ راجا صغیر کا ہاتھ میز کی دراز کی طرف جا رہا تھا وہ رک گیا۔ اس دھمکی کا اثر یہ ہوا کہ شاہ جی نے عدیل کو چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ سمیرا بے اختیار اس کی طرف آئی۔ ''تم ٹھیک ہو نا۔''

''ہاں... ہاں۔'' عدیل نے کہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی اور لڑکھڑایا تھا کہ سمیرا نے بے ساختہ اسے سہارا دینا چاہا اور اس کی توجہ ان لوگوں سے ہٹ گئی۔ شاہ جی نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا۔ اس نے اچانک سمیرا کے پستول والے ہاتھ پر لات ماری۔ اس کے بھاری بوٹ کی ضرب بہت قوت والی تھی۔ سمیرا کے ہاتھ سے پستول اڑ گیا اور اس نے چلا کر اپنی کلائی تھامی پھر لپک کر پستول اٹھانا چاہا تھا کہ شاہ جی نے بے دردی سے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور دوسری طرف پھینک دیا۔ جب تک وہ اٹھتی صوفی اسے دبوچ چکا تھا اور شاہ جی نے پستول اٹھا لیا تھا۔ سمیرا اب خوف سے کانپ رہی تھی اور عدیل اپنی تکلیف بھول کر اس کی فکر میں پڑ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم یہاں کیوں آ گئیں؟''

''یہ کیسے آئی یہاں تک؟'' راجا صغیر نے سرد لہجے میں پوچھا تو صوفی اور شاہ جی پریشان نظر آنے لگے۔ صوفی نے کہا۔

''ہم نہیں جانتے۔''

''میں ان کا پیچھا کرتی آئی ہوں۔'' سمیرا نے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس پر راجا صغیر نے

بہت سرد نظروں سے ان دونوں کو دیکھا مگر کچھ کہا نہیں اس کے بجائے اس نے سمیرا سے پوچھا۔

''تم سمیرا ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''تم نے عدیل کو کیوں پکڑا ہے؟''

''میرے اکاؤنٹ سے رقم غائب ہوئی ہے اور وہ اس نے نکالی ہے۔''

''اصل آدمی یہ نہیں ہے۔'' سمیرا نے تردید کی۔

''میں جانتا ہوں اور میں اسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''شرجیل کے بارے میں یہ یا میں نہیں جانتے۔'' سمیرا نے کہا۔ ''وہ کہاں ہے ہمیں نہیں معلوم۔''

''معلوم ہو یا نہ ہو اب تم دونوں کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔'' راجا صغیر نے ان کی قسمت کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ''انہیں لے جاؤ اور اسے تلاش کرو۔''

''مجھے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شرجیل کی آواز آئی۔ وہ دروازے پر کھڑا تھا۔ آں... ہاں کوئی نہ ہلے۔ ہاتھ اوپر، راجا جی سب سے پہلے تم ہاتھ سامنے رکھو۔''

جب راجا صغیر کے ہاتھ میز پر نہیں آئے تو شرجیل نے اچانک فائر کیا اور گولی نے میز پر رکھا دنیا کا گلوب اڑا دیا۔ شرجیل نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں دوبارہ نہیں کہوں گا۔''

راجا صغیر نے جلدی سے دونوں ہاتھ میز پر رکھ لیے۔ شاہ جی سمیرا کا پستول جیب میں رکھ چکا تھا اس نے اور صوفی نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ سمیرا اور عدیل خوش ہو گئے۔ سمیرا نے کہا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گے۔''

شرجیل نے اس کی بات نظرانداز کر کے ان تینوں کو حکم دیا۔ ''تینوں اس طرف دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ اوپر ہوں۔''

انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اب ان کا واسطہ اپنے جیسے بندے سے پڑا ہے جو ان پر گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا اس لیے انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے اور ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو گئے۔ شرجیل نے اب سمیرا سے کہا۔ ''ان کی تلاشی لو، ان کے پاس اسلحہ ہوگا۔''

''انہیں چھوڑو۔'' وہ بولی۔ ''یہاں سے نکلو۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' شرجیل نے اسے جھڑکا۔ ''جو کہہ رہا ہوں وہ کرو، ہم انہیں ایسے ہی چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔''

سمیرا بادلِ ناخواستہ ان کی طرف بڑھی۔ اس نے پہلے راجا صغیر کی تلاشی لی۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کا موبائل بھی میز پر پڑا تھا۔ صوفی کے پاس سے اس کا ریوالور نکلا اور شاہ جی کے پاس سے نہ صرف سمیرا کا بلکہ اس کا بھی پستول نکلا تھا۔ سمیرا نے اس کا پستول مع صوفی کے پستول کے میز کے دوسری طرف اچھال دیا اور اپنا پستول ہاتھ میں رکھا تھا۔ پھر وہ مڑی تھی کہ شاہ جی نے اپنی جسامت سے قطع نظر نہایت پھرتی سے گھومتے ہوئے اسے عقب سے جکڑ لیا اور ایک چھوٹا سا چاقو سمیرا کی نازک گردن سے لگا دیا۔ نہ جانے اس نے چاقو کہاں سے نکالا تھا۔ شرجیل یا سمیرا اسے چاقو نکالتے نہیں دیکھ سکے تھے۔ ''بس اب کوئی حرکت نہ کرے... پستول آہستہ سے اوپر لاؤ اور میرے بائیں ہاتھ میں دے دو۔ یاد رکھنا مجھے تمہاری شہ رگ کاٹنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگے گا۔''

شرجیل نے شاہ جی کی طرف پستول تان لیا تھا مگر وہ اس کی طرف سے بے پروا لگ رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ سمیرا کے سامنے ہوتے ہوئے وہ گولی نہیں چلا سکتا۔ اسے اصل خطرہ سمیرا کے ہاتھ میں موجود پستول سے تھا اور اس کی ساری توجہ اس پر تھی۔ شرجیل نے کہا۔ ''سمیرا تم پستول نہیں دو گی۔''

سمیرا نے بھی یہی سوچا تھا کیونکہ ایک بار پستول ہاتھ سے نکل جاتا تو سب کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اس نے ہاتھ اوپر کیا اور اچانک پستول میز کے پیچھے پھینک دیا۔ شاہ جی کے منہ سے گالی نکلی تھی اور اس نے غرا کر چاقو کی نوک سمیرا کی گردن میں چبھوئی تو وہ چلا اٹھی تھی۔ صوفی اور راجا صغیر نے ہاتھ نیچے کرنا چاہے تو شرجیل نے ان کے سروں کے اوپر ایک فائر کیا اور غرایا۔ ''اپنی جگہ رہو۔''

وہ ساکت ہو گئے۔ شاہ جی نے سمیرا سمیت میز کی طرف سرکتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھ پر گولی نہیں چلا سکتے۔''

''میں چلا سکتا ہوں لیکن میں کسی کو مارنا نہیں چاہتا۔ تم ہمیں یہاں سے جانے دو، میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گا۔ ورنہ میں راجا صغیر اکبر کے سر میں سوراخ کر دوں گا۔'' شرجیل نے کہتے ہوئے پستول راجا صغیر کی طرف کر دیا۔ ''میں تین تک گنوں گا اس کے بعد میں گولی چلا دوں گا چاہے انجام کچھ بھی ہو۔''

''یہ سمیرا کو مار دے گا۔'' عدیل نے اضطراب سے کہا۔

''اگر اس نے ایسا کیا تو اپنی موت کو آواز دے گا۔'' شرجیل بولا اور اس نے گننا شروع کر دیا۔ ''ایک... دو...''

اس سے پہلے وہ تین کہتا اچانک شاہ جی نے سمیرا کو پوری قوت سے شرجیل پر پھینک دیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ سمیرا اس سے ٹکرائی اور وہ دونوں نیچے گرے۔ شاہ جی نے میز کے پیچھے چھلانگ لگائی اور اپنا پستول اٹھا لیا مگر

اس نے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی اور ہاتھ اوپر کر کے اندازے سے شرجیل کی طرف فائر کیا۔ سمیرا جو اٹھ رہی تھی چیخ مار کر گری اور شرجیل نے اس کی چیخ پر تڑپ کر میز کی طرف فائر کیا۔ گولی چپ بورڈ میں سوراخ کرتی شاہ جی کو لگی اور اس نے بھیانک آواز نکالی۔ اس دوران میں صوفی اور راجا صغیر فرش پر گرے ہوئے میز کی طرف رینگ رہے تھے۔ راجا صغیر نے صوفی کی آڑ لے رکھی تھی۔ اس لیے شرجیل کی اگلی گولی اسے لگی۔ گولی شانے میں لگی تھی۔ وہ کراہا اور اٹھ کر میز کی آڑ میں جانے کی کوشش کی اسی اثنا میں دوسری گولی اس کے سر میں اتر گئی۔

خون اور مغز کے چھینٹے راجا صغیر پر گرے جو تقریباً میز کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ شاہ جی میز سے لگا ہوا اپنے گلے سے پھوٹنے والے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ راجا صغیر نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے ہاتھ سے پستول چھینا اور ہاتھ اوپر کر کے شرجیل پر فائر کیا۔ دو افراد کو نشانہ بنا کر وہ کچھ بے پروا ہو گیا تھا اور اس نے میز کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی کہ راجا صغیر کی چلائی گولی اس کے سینے میں اتر گئی۔ شرجیل ڈگمگایا مگر آگے بڑھا اور اس نے راجا صغیر کے نظر آنے والے سر کے اوپری حصے کو نشانہ بنایا۔ گولی اوپر سے سر میں اتر گئی اور وہ پلٹ کر دیوار سے ٹکرایا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ شرجیل نے کوٹ ہٹا کر اپنا زخم دیکھا جو دل سے ذرا نیچے تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے آیا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور اسی حساب سے اس کے جسم سے جان نکل رہی تھی۔

سمیرا کے پاس سے گولی گزری تھی اور اس نے اضطراری چیخ ماری تھی۔ جیسے ہی کمرے میں دھڑا دھڑ گولیاں چلنا شروع ہوئیں وہ رینگتی ہوئی عدیل تک آئی اور وہ دونوں مخالف سمت میں دیوار سے لگے صوفے کے پیچھے گھس گئے۔ عدیل کی حالت کسی قدر بہتر تھی۔ جب فائرنگ رکی تو اس نے سر نکال کر دیکھا۔ شرجیل کھڑا ہوا ڈگمگا رہا تھا۔ عدیل تیزی سے صوفے کے عقب سے نکل کر اس کے پاس آیا۔ سمیرا اسے روکتی رہ گئی تھی۔ اس نے شرجیل کو سہارا دیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”دیکھو ان میں سے کوئی زندہ تو نہیں ہے۔“

شرجیل جھول رہا تھا۔ عدیل نے اسے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ سمیرا بھی نکل آئی، اس نے شرجیل کا زخم دیکھا اور بولی۔ ”تمہیں اسپتال لے جانا ہوگا۔“

”دیکھو ان میں سے کوئی زندہ تو نہیں ہے۔“ اس نے پھر عدیل سے کہا تو وہ میز کی طرف بڑھا۔ صوفی مر چکا تھا۔ راجا صغیر بھی مر گیا تھا البتہ شاہ جی زندہ تھا، گولی اس کے گلے کو چیرتی گزر گئی تھی۔ عدیل نے اس کے بارے میں بتایا تو شرجیل ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور سمیرا کے منع کرنے کے باوجود وہ میز تک آیا، اس نے شاہ جی کے سر پر پستول کی نال رکھ کر فائر کیا اور وہ بھی مر گیا۔ سمیرا نے منہ پھیر لیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شرجیل ان میں سے کسی کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ شاہ جی کا کام تمام کر کے اس نے کہا۔ ”یہاں سے نکلو، پولیس آنے والی ہوگی۔“

عدیل نے شرجیل کو سہارا دیا اور وہ باہر آئے تو سناٹا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دفتر میں ہونے والی فائرنگ کی آواز باہر تک نہیں آئی تھی۔ اس لیے کسی نے سنا نہیں اور پولیس کو اطلاع نہیں دی تھی۔ سمیرا بھاگتی ہوئی گئی اور اپنی کار لے آئی۔ انہوں نے شرجیل کو اندر بٹھایا۔ اچانک عدیل کو خیال آیا۔ ”میرا پرس اور موبائل اندر ہے ایک منٹ، میں لے کر آتا ہوں۔“

”جلدی کرو شرجیل کو اسپتال لے جانا ہے۔“

عدیل اندر کی طرف لپکا تو سمیرا نے شرجیل سے کہا۔ ”یہ تم نے کیا کیا، تم واپس کیوں آئے؟“

”میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آئی ایم سوری، میں نے تمہیں تھپڑ مارا۔“

”تم نے ٹھیک کیا، میں نے بدتمیزی کی تھی۔“ سمیرا کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

”مجھے کہیں چھوڑ دینا، میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔“

”نہیں، تمہیں اسپتال لے جائیں گے۔“ اس نے کہا۔ اس دوران میں عدیل اندر سے اپنی چیزیں لے آیا تھا۔ ”چلو ہمیں کسی بڑے سرکاری اسپتال جانا ہوگا، چھوٹے اور نجی اسپتال گولی کا کیس نہیں لیتے ہیں۔“

سمیرا نے کار آگے بڑھا دی۔ شرجیل عقبی نشست پر تھا، اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ ”میری بات سنو۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔“ سمیرا نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کچھ ہوا تو میں کبھی خود کو معاف نہیں کروں گی۔“

شرجیل اب گہری سانسیں لے رہا تھا۔ ”میں شاید نہ بچوں، ایک پتا سن لو۔“

”تم ابھی چپ رہو۔“ عدیل نے کہا۔

”میری بات سنو۔“ شرجیل کا لہجہ سخت ہو گیا۔ اس نے ایک پتا بتایا۔ ”اسے یاد کر لو، میرے حصے کی رقم اور میری ساری جمع کی ہوئی رقم اس پتے پر ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو وہ تم دونوں کی ہوگی۔“

”پلیز ایسی باتیں مت کرو۔“

”کسی گندے نالے کے پاس گاڑی روکنا۔“
”کیوں؟“
”سوال مت کرو، میرے پاس وقت نہیں ہے۔“
سمیرا نے چند لمحے بعد ایک سیوریج کے نالے کے ساتھ کار روکی تو شرجیل نے کھڑکی سے اپنا پستول نالے میں اچھال دیا۔ دس منٹ بعد وہ ایک بڑے سرکاری اسپتال کے ایمرجنسی... شعبے کے سامنے تھے۔ شرجیل نے ان سے کہا۔ ”تم لوگ جاؤ میں خود چلا جاؤں گا۔“ وہ کہتے ہوئے نیچے اتر گیا۔
”میں بھی آتا ہوں۔“ عدیل نے کہا۔ ”تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔“
”نہیں تم سمیرا کے ساتھ جاؤ، اسے تمہاری ضرورت ہے۔ جاؤ اس سے پہلے کوئی آئے اور مجھے تمہارے ساتھ دیکھے یہاں سے چلے جاؤ۔“ اس نے اپنا پرس اور چابیوں کا گچھا عدیل کے حوالے کیا۔ ”میری شناخت سامنے نہیں آنی چاہیے۔“
سمیرا رو رہی تھی مگر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ عدیل نے پلٹ کر دیکھا۔ شرجیل لڑکھڑاتے قدموں سے ایمرجنسی کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے سمیرا سے کہا۔ ”وہ بچ جائے گا، وہ بہت باہمت ہے۔“
”وہ بہت عظیم ہے۔“ سمیرا نے کہا اور کار سڑک کے کنارے روک دی۔ ”آج مجھے پہلی بار پتا چلا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن اس نے کبھی نہیں کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں تب وہ خاموشی سے پیچھے ہو گیا مگر جب مجھے خطرے میں دیکھا تو بچانے آ گیا۔“
”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، اس کی کئی باتوں سے مجھے لگا کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے مگر اس کا اظہار نہیں کرتا۔“ عدیل نے کہا۔ اس نے سمیرا سے پوچھا نہیں کہ وہ کسے پسند کرتی ہے۔ ممکنہ طور پر اسے جواب معلوم تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سمیرا کے فلیٹ پر تھے۔ صبح تمام ٹی وی چینلز پر راجا صغیر اور اس کے دو آدمیوں کے قتل کی خبر چل رہی تھی۔ البتہ کہیں شرجیل کا ذکر نہیں تھا۔ اس کے بارے میں خبر خاصی دیر بعد صرف ایک پٹی کی صورت میں آئی کہ رات گئے خود اسپتال پہنچنے والا پراسرار زخمی آج صبح زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گیا۔ پولیس اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ پولیس نے ان واقعات کو آپس میں نہیں جوڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے شک نہیں تھا کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق تھا۔ راجا صغیر مشہور شخصیت تھی اور اس کے قتل کو دشمنی کا نتیجہ قرار دیا جا رہا تھا۔ سمیرا کو ان باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ شرجیل کو یاد کر کے رو رہی تھی اور عدیل اسے دلاسا دے رہا تھا۔
جب سمیرا کی حالت سنبھل گئی تو عدیل اسے چھوڑ کر اس پتے پر گیا جو شرجیل نے بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے کچھ ہونے کی صورت میں وہ وہاں سے اس کی جمع کی ہوئی رقم لے کر آپس میں بانٹ لیں۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جو پوش علاقے میں تھا۔ عدیل کو نہیں معلوم کہ یہ گھر شرجیل کا اپنا تھا یا کرائے کا۔ رقم اسے الماری میں رکھے ایک بیگ میں ملی اور یہ اس رقم سے خاصی زیادہ تھی جو شرجیل کا حصہ بنتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس میں وہ ساری رقم شامل تھی جو اس نے اب تک کمائی تھی۔ وہ واپس آیا اور اس نے رقم سمیرا کے سامنے رکھ دی۔ اس نے کہا۔ ”یہ تمہاری ہے۔“
”شرجیل نے کہا تھا کہ یہ رقم ہم دونوں کی ہوگی۔“
”شاید اس نے کسی اور وجہ سے ایسا کہا ہو۔“ عدیل نے سرد آہ بھری۔ ”تمہیں پتا ہے جب تم مجھے کال کر رہی تھیں تو میں کس کیفیت میں تھا؟“
”نہیں، جب تم نے سیل آف کیا تو میں پریشان ہو کر گھر سے نکل آئی۔ مجھے لگا کہ تمہارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔“
”گڑبڑ یہ نہیں تھی۔“ عدیل نے کہا پھر اس نے بتایا کہ مونا کا نکاح ہو گیا ہے اور زاہد چچا نے اس سے جو وعدہ کیا تھا وہ توڑ دیا۔ ”میں انہیں بتانے گیا تھا کہ میں نے ان کی شرط پوری کر دی ہے۔ جب حقیقت سامنے آئی تو میں بتا نہیں سکتا کہ میری کیا حالت ہوئی تھی۔“
”شکر ہے میں نکل آئی ورنہ وہ تمہیں لے جاتے اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔“
”شرجیل کو تم نے کال کی تھی؟“
”ہاں، میں نے اس سے مدد مانگی تھی وہی اس صورتِ حال میں مدد کر سکتا تھا۔ مگر اس نے راجا صغیر کا دفتر دیکھا تو وہ انکار کر کے چلا گیا۔“
”اور تم اندر آ گئیں۔“ عدیل نے کہا۔ ”تم نے ایسا کیوں کیا؟“
”میں نہیں جانتی، لیکن میں تمہیں خطرے میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔“ سمیرا نے سر جھکا کر کہا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“
”پتا نہیں۔“ عدیل نے گہری سانس لی۔ ”شاید کہیں اور چلا جاؤں اور تم کیا کرو گی؟“
”میں کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”میں کمزور ہوں، پہلے شرجیل کا سہارا تھا اب وہ بھی نہیں رہا۔ پتا نہیں کیا کروں گی؟“

"میں تو تمہارا سہارا بننے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟" سمیرا بے ساختہ بولی۔ "کیوں نہیں بن سکتے؟"

"میں تم کو پہلے ہی انکار کر چکا ہوں۔"

"جب دوسری بات تھی اور اب تو صورتِ حال ہی بدل گئی ہے۔" سمیرا نے کہا پھر ہمت کر کے بولی۔ "عدیل دیکھا جائے تو ہم دونوں کا ہی کوئی نہیں ہے تو کیا ہم ایک دوسرے کا سہارا نہیں بن سکتے۔"

عدیل نے اسے دیکھا۔ "میں کوئی دعویٰ نہیں کروں گا لیکن میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔"

"یہی بات میں بھی کہوں گی۔" سمیرا بولی۔ "میں کوئی اچھی لڑکی نہیں ہوں لیکن اللہ گواہ ہے میں نے ہمیشہ اپنی عزت کی حفاظت کی ہے۔"

عدیل نے سمیرا کا ہاتھ تھام لیا۔ "اب میں تمہاری حفاظت کروں گا۔"

☆☆☆

ایئرپورٹ پر عدیل اور سمیرا اپنے تین بچوں کے ساتھ انٹرنیشنل آرائیول لاؤنج سے باہر آ رہے تھے۔ سات سال میں یہاں بہت کچھ بدل گیا تھا، نہیں بدلے تھے تو لوگ نہیں بدلے تھے۔ وہی نفسا نفسی اور بھاگ دوڑ تھی، ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر تھی۔ انہوں نے ایک وائٹ کیب لی اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ سات سال پہلے وہ ملک سے نکلے تھے۔ وہ پہلے مڈل ایسٹ اور پھر وہاں سے ایک یورپی ملک چلے گئے۔ وہاں عدیل نے بزنس کر لیا۔ دولت ان کے پاس تھی اس لیے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ دو سال پہلے انہیں وہاں کی شہریت مل گئی اور ان کے بچے پیدائشی وہاں کے شہری تھے۔ سات سال بعد انہیں خیال آیا کہ ایک بار وطن جا کر دیکھنا چاہیے۔ ملک کے حالات اچھے نہیں تھے اس کے باوجود وہ چلے آئے۔

ڈرائیور جوان العمر آدمی تھا مگر بڑھی شیو اور آنکھوں کے گرد حلقوں سے پریشان حال لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ عدیل کو جانا پہچانا لگا۔ وہ ہوٹل پہنچے اور جب وہ ان کا سامان اتار رہا تھا تو عدیل کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ تو عدیل نے سمیرا سے کہا۔ "تم لوگ اندر جاؤ، میں اسے فارغ کر کے آتا ہوں۔"

وہ بیل بوائے کے ساتھ اندر چلے گئے تو عدیل ڈرائیور کے پاس آیا اور پرس نکالتے ہوئے بولا۔ "ڈالرز میں ادائیگی سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں جناب، آپ دے سکتے ہیں۔"

عدیل نے اسے کرایہ اور معقول ٹپ دی اور پھر پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے دوست؟"

"شکیل سعد۔" اس نے کہا تو عدیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"تبھی جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ مجھے پہچانا، میں عدیل احمد ہوں۔"

وہ چونکا۔ "عدیل... مونا کے چچازاد...؟"

"بالکل وہی۔" عدیل نے سر ہلایا۔ "مونا کیسی ہے اور زاہد چچا۔"

"آپ کو نہیں معلوم خالہ اور خالو تو دو سال پہلے گزر گئے۔"

عدیل کو دھچکا لگا۔ اس نے زیرِ لب اناللہ پڑھا اور بولا۔ "افسوس کہ مجھے پتا نہیں چلا۔ میں ملک سے باہر تھا۔"

"خالو آخری وقت میں آپ کو یاد کر رہے تھے۔" شکیل بتاتے ہوئے جھجکا۔ "وہ آپ کے ساتھ کی گئی زیادتی پر پشیمان بھی تھے۔"

"اللہ ان کی مغفرت کرے، میرے دل میں اب کوئی ملال نہیں ہے۔" عدیل نے کہا پھر پوچھا۔ "تم... تم تو بزنس کرتے تھے پھر یہ کیب...؟"

"حالات کی گردش۔" شکیل نے سرد آہ بھری۔ "میرا اپنا سنگ دانے کا بزنس تھا، گودام میں آگ لگ گئی اور سب ختم ہو گیا۔ اب تک قرض اتار رہا ہوں۔"

"بہت افسوس ہوا۔" عدیل نے کہا۔ "تم کہاں رہتے ہو؟"

"مونا کے گھر میں، مشکل وقت میں سر چھپانے کا یہی آسرا تھا۔"

"میں اور بیوی بچے آئیں گے تمہارے گھر۔"

"کیوں نہیں جناب، آپ مونا کے کزن ہیں۔" شکیل نے خوش ہو کر کہا۔ "وہ بہت صابر ہے، بہت ہمت سے میرا ساتھ دے رہی ہے۔"

"اللہ تم دونوں کی مشکلات آسان کرے۔" عدیل نے ایک بار پھر اس سے ہاتھ ملایا۔ جب وہ اندر جا رہا تھا تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جانے سے پہلے مونا اور شکیل کے لیے اس سے جو ہوا وہ کر کے جائے گا۔ یہ فیصلہ کر کے اس کے دل کو سکون ملا تھا۔ شاید اس طرح اس کے کیے کا کفارہ ادا ہو جائے۔